الفرقان
لکھنؤ

۱۹۷۷

مدیر

محمد منظور نعمانی

خلافت راشدہ اور ہندوستان

از:- مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

خلافت راشدہ کے دور میں ہندستان میں اسلامی غزوات وفتوحات، عمارات وانتظامات، عرب کے مسلمان ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان عرب میں صحابہ وتابعین کی آمد اور ان کے حالات اس طرح پر جمع کیے گئے ہیں کہ اس ملک میں خلافت راشدہ کے مقدس دور کا صحیح اور واضح نقشہ پہلی بار نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قیمت -/۱۲

خلافت امویہ اور ہندوستان

اموی دور کے اسلامی ہند کی صحیح اور مفصل تاریخ جس میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اتنے تھوڑے عرصے میں اس ملک میں کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۶۲ قیمت -/۳۰

معاشرتی مسائل دین فطرت کی روشنی میں

یعنی انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل۔ شادی بیاہ مع تعدد ازدواج طلاق ووراثت وغیرہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیگر مذاہب واقوام کے معاشرتی قوانین کے تقابلی مطالعہ کیساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

مصنف مولانا برہان الدین سنبھلی قیمت -/۱۲

منصب نبوت اور اس کے عالیمقام حاملین

از مولانا سید عبدالسلام ندوی

جس میں بنی نوع انسان اور تمدن انسانی پر نبوت کے احسانات، انبیاء کرام کی امتیازی خصوصیات، نبوت کے پیدا کردہ ذہن ومزاج اور طریقہ فکر، نبوت کے تیار کردہ انسانی نمونوں، نیز نبوت محمدی کے لافانی کارنامے اور ختم نبوت کی ضرورت واہمیت اور اس کے دور رس اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت -/۱۴

سلسلۂ تجدید دین کی تین کتابیں

مصنفہ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم

ان کتابوں میں از سر نو پورے دین کو کھری کھری صاف کستھ میں پیش کیا گیا ہے کہ اسی پر نہ صرف آخرت کی نجات کا وعدہ ہے بلکہ دنیا کی بھی انفرادی واجتماعی، معاشی تمام پریشانیوں سے نجات کی یہی اکیلی راہ ہے۔

(۱) تجدید دین کامل (معروف جامع المجددین) اس اعتبار سے دین ودنیا کی انفرادی صلاح واصلاح قیمت -/۷ (۲) تجدید تعلیم وتبلیغ۔ اس میں اجت سماجی اصلاح پر بحث ہے۔ قیمت -/۵ (۳) تجدید اس کتاب میں معاشی یا رزقی مسائل پر اسلامی دایمانی کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت -/۷

کیا ہم مسلمان ہیں؟

ایک سوال۔ جس کا جواب آنکھوں کو اشکوں سے اور قلب کو سوز وگداز سے بھر دیتا ہے۔ اخلاص، رقت اور سوز ودو ڈوبا ہوا۔ تاریخی صداقتوں کا ذکر جمیل۔ تین حصوں میں مکمل قیمت

تعبیر نامہ خواب

علامہ ابن سیرین کی مشہور ومعروف کتاب تعبیر الرؤیا ترجمے کے ساتھ۔ قیمت -/۵۰

التکشف عن مہمات التصوف

مؤلفہ: حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح مولانا موصوف کے چند اہم رسائل میں سے ہر طبقہ کے مہا علمیہ کو جن کو فن تہذیب نفس یعنی تصوف سے زائد اس شاہکار تالیف میں جمع کر دیا گیا ہے۔ کم استعداد وا استعداد والوں اور اہل علم تینوں طبقوں کے مہمات کو رکھا گیا ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۰۲

قیمت مجلد تیس روپے -/۳۰

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے بعد اب نئی شرح اس طرح ہوگی بحری ڈاک سے : ۲ پونڈ ہوائی ڈاک سے : ۴ پونڈ	ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ	سالانہ چندہ ہندوستان سے : -/۱۵ پاکستان سے : -/۲۵ بنگلا دیش سے : -/۱۶ فی شمارہ ۱/۵۰

جلد (۴۵) | بابت ماہ جنوری ۱۹۷۷ء مطابق محرم الحرام ۱۳۹۷ھ | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری کوئی اطلاع ۳۰ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آ جانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

مولوی [illegible] منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر [illegible] الفرقان [illegible] لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمہ :-

ہندوستان کا شاید کوئی لکھا پڑھا مسلمان نہ ہوگا جس نے مولانا دریابادی مرحوم کا نام نہ سنا ہو اور ان کے کام سے کچھ واقف نہ ہو ـــــ ابھی ۶ جنوری کو ایک طویل علالت کے بعد مولانا نے وفات پائی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون اللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ وعافہ واعف عنہٗ واکرم نزلہٗ ووسع مدخلہٗ وتقبل حسناتہٗ وتجاوز عن سیّاٰتہٖ۔

راقم سطور کو اس کا بے حد افسوس و قلق ہے اور رہے گا کہ اپنی موجودہ بیماری اور معذوری کی وجہ سے نہ تو مولانا مرحوم کی نماز جنازہ میں شرکت کر سکا اور نہ ان کو آخری غسل دے سکا جس کی انھوں نے معلوم ہوا ہے کہ تمنّا بھی فرمائی تھی۔ یفعل اللّٰہ ما یشاء ویحکم ما یرید۔

جہاں تک یاد آتا ہے راقم سطور نے مولانا مرحوم کو پہلی بار اسی شہر لکھنؤ میں اب سے ۴۵-۴۶ سال پہلے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا تھا۔ میں مولانا موصوف کے پاس مقیم تھا۔ ایک صاحب مولانا سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ کھدر کی شیروانی پر گہرے براؤن رنگ کا کھدر ہی کا عبا پہنے ہوئے تھے، سر پر کھدر ہی کی کشتی نما ٹوپی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر کسی نے بتلایا کہ یہ "صدق" کے اڈیٹر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی۔ اے ہیں۔ نام برسوں پہلے سے سنا تھا اور مضامین بھی رسالوں، اخباروں میں دیکھے اور پڑھے تھے لیکن

زیارت کی نوبت جہاں تک یاد ہے اس سے پہلے نہیں آئی تھی۔

یہاں یہ ذکر کردینا بے محل نہ ہوگا کہ سنہ ۲۰ و ۲۱ء میں خلافت کی تحریک نے مسلمانوں پر جو غیر معمولی اور محیر العقول اثرات ڈالے تھے۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کالجوں، یونیورسٹیوں کے سیکڑوں گریجویٹس نے پوری مولویانہ داڑھیاں رکھ لی تھیں اور کوٹ پتلون اتار کر کھدر کی شیروانی اور اس کے اوپر کھدر ہی کا عبا پہننا شروع کردیا تھا۔ یہ غالباً مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا اثر تھا انھوں نے یہی لباس اختیار فرمالیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم نے بھی اسی زمانہ میں عبا پہننا شروع فرمایا ہوگا۔ جو قریباً آخر تک اُن کا معمول رہا۔

لکھنؤ کی اس پہلی ملاقات کے بعد غالباً اگلے ہی سال بریلی سے "الفرقان" جاری ہوا اور مولانا کا ہفتہ وار اخبار "صدق" پابندی سے مطالعہ میں آنے لگا۔ اس وقت سے مولانا سے واقفیت بڑھی اور اُن کی یہ خصوصیت پوری طرح علم میں آئی کہ دین کے بارے میں وہ کتنے حساس اور باحمیت ہیں اور مغربی تمدن و معاشرت اور مغربی فلسفہ کے کتنے بڑے اور کیسے محقق ناقد ہیں ـــــ اسی دور میں مولانا سے تعلق بڑھا اور کبھی کبھی خط کتابت بھی ہونے لگی۔

اب سنہ تو یاد نہیں اسی کے قریبی زمانہ میں غالباً مولانا ہی کے ایماء سے دریاباد کے کچھ مسلمانوں نے تقریر کے لیے دریاباد مجھے مدعو کیا۔ مولانا نے سفارشی خط بھی لکھا۔ میں نے اسی لالچ میں یہ دعوت منظور کرلی کہ اطمینان سے مولانا سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ وہاں پہونچ کر مولانا ہی کے یہاں قیام ہوا اور انھیں کا مہمان بنا۔ بڑی عنایت فرمائی ـــــ صبح چائے ناشتہ سے فارغ ہوکر فرمایا، میرا روزانہ کا معمول یہ ہے کہ اس وقت سے لکھنے پڑھنے کے کام کے لیے الگ بیٹھ جاتا ہوں، دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھاتا ظہر کی نماز کے لیے اٹھتا ہوں اور ظہر کے بعد عصر تک پھر اپنے کام میں لگا رہتا ہوں اس وجہ سے دوپہر کے کھانے میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہوسکوں گا اس میں آپ مجھے معذور سمجھیں۔ اب انشاء اللہ عصر کی نماز کے وقت ملاقات ہوگی اور اس کے بعد پورے اطمینان سے بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔ ـــــ مولانا کی اس بات سے میرے دل میں اُن کی قدر و عظمت اور زیادہ بڑھ گئی۔ در اصل وہی شخص زندگی کا قدر شناس اور کامیاب ہے جو اپنے وقت کی قدر کرے اور اللہ کی دی ہوئی اس نعمت سے فائدہ اٹھاکر زیادہ سے زیادہ کام لے لے۔ ہمارے اکابر میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اس میں امتیاز رکھتے تھے یہ عاجز وہاں کے اصولوں سے کچھ واقف تھا اور اس طرز عمل کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس لیے مولانا دریابادی کی اس بات کا مجھ پر اچھا ہی اثر پڑا۔

عصر کے بعد اطمینان کے ساتھ بیٹھنا ہوا اور اس صحبت میں مولانا نے اپنی کچھ سرگذشت سنائی جس کا خلاصہ یاد رہ گیا ہے۔ بتلایا کہ میرا گھرانہ الحمد للہ اچھا دیندار اور مذہبی گھرانہ تھا۔ والد ماجد راسخ العقیدہ دیندار تھے ؎۔ گھر کے اس ماحول کی وجہ سے میرا حال بھی الحمد للہ شروع ہی سے اچھا تھا پھر ایک وقت آیا کہ مغربی تعلیم اور فلسفہ کے اثر سے میں "بے یقینی بلکہ الحاد" تک پہونچ گیا۔ میرے والد ماجد مرحوم قدرتی طور پر اس سے بہت متاثر اور متفکر تھے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم سے ان کا اچھا تعلق تھا میری بھی اُن کے ہاں کبھی کبھی آمد و رفت ہوتی تھی۔ والد صاحب میرے بارے میں ان کو بھی لکھتے تھے، میں جب الہ آباد اُن کی خدمت میں جاتا تو بڑے حکیمانہ انداز میں میرے خیالات کی اصلاح کی کوشش کرتے ایک دفعہ میں ان کے یہاں پہونچا تو انھوں نے مجھے "مثنوی مولانا روم" مطالعہ کے لیے دی جو غالباً اسی زمانہ میں بہت خوبصورت چھپ کر آئی تھی۔ مولانا دریابادی نے بتلایا کہ الحاد و مادیت سے روحانیت اور خدا پرستی کی طرف میرے ذہن کو سب سے پہلے "مثنوی" کے مطالعہ نے موڑا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل بہ منزل مزید توفیق اور رہنمائی ملتی رہی۔ اسی صحبت میں مولانا نے اپنے ابتدائی دور کا ایک فوٹو بھی دکھلایا۔ اگر مولانا خود نہ بتلاتے تو ہرگز یقین نہ آتا کہ یہ تصویر اُن کی ہو سکتی ہے۔

مولانا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو شخصیتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ایک مولانا محمد علی مرحوم اور دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ حضرت تھانویؒ سے ان کے تعلق کی تاریخ اور تاثر کی پوری نوعیت ان کی کتاب "حکیم الامت" سے معلوم ہو سکتی ہے۔

مولانا نے اتنا لکھا کہ اُن کے معاصرین میں شاید ہی کسی نے اتنا لکھا ہو، لیکن ان کا سب سے

؎ مولانا کے والد ماجد کا اسم گرامی عبد القادر تھا عہدہ کے لحاظ سے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مکہ معظمہ میں عین ایام حج میں وفات پائی اور مولانا کے دادا اپنے دور کے ممتاز عالم مفتی مظہر کریم تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور اسی کی وجہ سے دوسرے متعدد علماء کرام کے ساتھ ان کو بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔

بڑا کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے۔ چونکہ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور خاصکر یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور توراۃ و انجیل وغیرہ صحف قدیمہ کی شروح اور اُن سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کا انھوں نے خاص اہتمام فرمایا تھا اس لیے اُن کی تفسیر میں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو دوسری تفسیروں میں نہیں ملتیں اور قرآن پاک کے سمجھنے میں اُن سے بڑی مدد اور رہنمائی ملتی ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا کی یہ تفسیر ان کی نظر ثانی کے بعد صرف گیارہ پارے تک ان کے سامنے شائع ہو سکی لیکن مولانا مرحوم اب سے بہت پہلے نظر ثانی کا کام پورا کر چکے تھے۔ خدا کرے باقی حصے بھی بجلد چھپ کر طالبان علوم قرآن کے ہاتھوں میں آجائیں۔

معلوم ہوا ہے کہ اردو تفسیر کے علاوہ مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر پر بھی نظر ثانی کا کام پورا کر لیا تھا لیکن اس کا کوئی حصہ شائع نہیں ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ اس کی طباعت و اشاعت کا کوئی سامان بھی غیب سے پیدا فرمائے۔ وما ھو علیہ بعزیز۔

دوسرے بہت سے علماء و مصنفین کی طرح بعض مسائل کے بارہ میں مولانا دریابادی مرحوم بھی اپنی کوئی انفرادی رائے رکھتے تھے شخصیت سے قطع نظر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جمہور علماء امت کی رائے سے اختلاف میں سخت خطرہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی لغزشوں اور غلطیوں کو معاف فرمائے اس کے رحم و کرم سے یہی امید کی جاتی ہے۔

مولانا مرحوم کی ایک وصیت اور پیغام راقم سطور کو مولانا مرحوم کی صاحبزادیوں کا یہ پیغام پہونچا ہے کہ مولانا یہ وصیت فرما گئے ہیں کہ جن لوگوں سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ کبھی رہا ہو ان تک ان کا یہ پیغام کسی طرح پہونچا دیا جائے کہ اگر مولانا مرحوم سے ان کی کوئی حق تلفی یا دلآزاری ہوئی ہو تو وہ اللہ کے لیے معاف فرما دیں اور دعائے مغفرت فرمائیں۔ یہ عاجز اپنی طرف سے بھی ان سب حضرات سے یہی گزارش کرتا ہے جن کی نظروں سے یہ سطریں گذریں۔ کسی مومن بندہ کے لیے اخلاص سے مغفرت کی دعا اور اپنے حق کو معاف کر دینا اتنی بڑی نیکی ہے کہ کیا عجب اللہ تعالیٰ اسی ایک نیکی پر خود اُس بندہ کی بھی مغفرت فرما دے۔

ضروری اطلاع الفرقان کا آئندہ شمارہ فروری و مارچ کا مشترکہ شمارہ ہوگا جو مارچ میں شائع ہوگا

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

(تلخیص مفاوضات رشیدیہ)

مولانا حکیم سید اشرف علی سلطان پوری کے نام

بعد رمضان آپ کا قصد ہے، حق تعالیٰ خیر و عافیت سے لاوے۔ مگر بندہ بوجہ ضعف گوشت قابل اس کے نہیں کہ کوئی مجھ سے ملے۔ دوسرے آپ کے دوست بھی بعد رمضان اگر آویں منع نہیں کرتا ہوں۔ اور آپ کے عم بزرگوار کے واسطے میں دعا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ ان کو صحت دیوے۔ مگر ایسے وقت یہ یاد آجاتا ہے کہ ؏

تو بخویشتن چہ کردی کہ بہ کس کنی نظیری[1]

نہایت شکر حق تعالیٰ کا کرتا ہوں کہ آپ کو توفیقِ ذکر عطا فرمائی۔ ذکر حق تعالیٰ کا اگرچہ غفلت کے ساتھ ہو بڑی نعمت ہے۔ فاذکرونی اذکرکم کا مژدہ ایسا نہیں کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دولت رکھی جاوے۔ حق تعالیٰ کا مذکور ہونا اگرچہ کسی درجہ کا ہو۔ دو جہاں کی دولت سے فائق ہے۔ اور جو مقدر ہے تو ترقی بھی حق تعالیٰ محض اپنے فضل سے فرما دے گا۔ ذکر و شغل کسب ہے، اور کچھ حالت کا پیدا ہونا وہب و عطیہ حق تعالیٰ کا ہے۔ ہر چند کسب کو وہب لازم نہیں مگر بظاہر کسب سبب وہب کا ہے اور وعدہ حق تعالیٰ یہ ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

[1] (ترجمہ) اے نظیری تو نے اپنے ساتھ کیا بھلائی کی جو کسی دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔

(جو لوگ ہماری راہ میں جد و جہد کرتے ہیں ہم ان لوگوں کو ہدایت عطا فرما دیتے ہیں) پس بندہ کسی حال مایوس نہ ہو اور اپنا کام جس قدر ہو سکے کرتا رہے۔ اس میں کوتاہی نہ کرے اور امید کامیابی کی قوی رکھے۔ اَنَا عِندَ ظَنِّ عَبدِی بِی[1] پر نظر کرکے امیدوار رہے تو حسب وعدہ کسی وقت مراد پاوے گا۔ بعض کبار (بعض بڑے لوگوں) کو عین وقت موت کے مدعا حاصل ہوا۔ اور جس قوم کی حُب (محبت) کسی کے دل میں ہے تو اس کے ساتھ ہونا خود نص سے ثابت ہے۔ اَلمَرءُ مَعَ مَن اَحَبَّ[2]۔ پس زمرۂ سالکین و ذاکرین میں آپ کا منسلک و شمول ہونا تو خود بدیہی (ظاہر) ہے۔ اور تمنا، خیر اور ذکر بھی موجود ہے۔ اب فضل لا متناہی کی امید ہے ؎

تا یار کرا خواہد و میلش بکدام ست

رَزَقَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکُم حُبَّہٗ[3] — آمین

در باب اجازتِ بیعت معذور ہوں کہ مشائخ کرام نے ایک شرط ایسی لگا دی ہے کہ جس سے جرأتِ اجازت نہیں پاتا ہوں۔ اگرچہ اس (کو) لکھتے ہوئے حجاب ہوتا ہے مگر بناچاری لکھنا پڑا۔ اگر حق تعالیٰ کو منظور ہے یہ وقت بھی آ جاوے گا[4]، اور یہ بھی بندہ کو یقین ہے کہ آپ (اجازت کے) طالب نہیں۔ اس لیے آپ اس تحریر پر شرمندہ نہ ہوں گے۔ "حزب البحر" کی آپ کو اجازت ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ جو حالت اُس طرف سے پیش آوے اس پر شکر کرے اور التجا کرتا رہے۔ پھر امید ہے کہ خطا نہ ہوگی۔ ہر وقت طلب میں رہے۔ غفلت کا علاج یہی ہے کہ اپنے کام کو التزام سے کرتے رہو۔ جب ذکر قایم ہو جائے گا پھر غفلت طاری نہ ہوگی بندہ دعا گو ہے۔

---

[1] (ترجمہ) "میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوتا ہوں" یہ حدیث قدسی ہے۔

[2] (") "انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے اس نے محبت کی"

[3] (") "اللہ ہمیں اور تمہیں اپنی محبت عطا فرمائے"

[4] بعد کو اجازت بیعت مولانا حکیم اشرف علی سلطان پوری کو دیدی گئی جیسا کہ اگلے مکتوب سے واضح ہے۔

دعا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کفیل و کارساز ہے۔

آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ مددگار ہے۔ اُسی پر نظر چاہیے۔ جو لوگ آپ سے حسن عقیدت رکھتے ہیں اور بیعت ہونا چاہتے ہیں ان کو آپ ضرور بیعت کر لیا کریں اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اور حسب برداشت اور مناسب حال وظائف حدیث شریف میں جو آئے ہیں ان کو بتا دیا کریں۔ بندہ بھی دعا کرتا ہے۔

اپنے دوست مرزا برکت علی صاحب سے بعد سلام مسنون کہہ دیجیے کہ حَسْبُنَا اللّٰہ ونعم الوکیل کو پانچسو مرتبہ بعد نماز عشاء پڑھ لیا کریں

آپ کو عوام کے اخذ بیعت کی وجہ سے اجازت کی ضرورت ہے۔ اس میں کچھ آناضرور نہیں آپ ان کو گناہوں سے توبہ کرا کر حدیث شریف کے وظائف میں سے جو مناسب ہو بتا دیا کریں اور اس قسم کے آدمیوں کو ذکر و شغل کی تعلیم کی حاجت نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو ایسی تلقین نامناسب ہے۔ البتہ اگر کوئی اس کے قابل ہو اور محنت کرتا معلوم ہو تو اس کی بیعت کے لیے بھی آپ کو اجازت ہے۔ اس کو جہراً بارہ[۱۲] تسبیح کے ذکر کی تعلیم کر دیا کریں۔ یا اس کے حال کے مناسب جو کچھ ہو بتا دیا کریں اور اگر (استعداد کے اعتبار سے) زیادہ درجہ کا آدمی ہو جس کو آپ لکھتے ہیں کہ میں نہ سنبھال سکوں گا تو ایسے کو اوروں پر چھوڑ دیا کرو۔ جو اس کے اہل ہیں وہ آپ سنبھال لیں گے۔ شرائط بیعت جو آپ نے لکھے ہیں وہ تو ہم میں بھی نہیں، پھر اس کی وجہ سے لوگوں کو توبہ سے کیوں کر باز رکھا جاوے۔ پس آپ کو اجازت ہے — بندہ آپ کے واسطے دعا کرتا ہے — حق تعالیٰ مدد فرمائے۔ آمین!

آپ کے احوال و اشغال سے مسرور ہوا۔ حق تعالیٰ ترقی بخشے۔ اسی کو آپ التزام سے کرتے رہیں جو کچھ اس وقت کرتے ہیں — اللہ تعالیٰ کے کسی نام کو دنیاوی منفعت کے واسطے پڑھنا میں پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ بعض بزرگوں نے یا باسطُ اس مطلب کے واسطے پڑھا ہے اور یہ

اَمر فی نفسہٖ جائز بھی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نام کو تحصیلِ معاش کا ذریعہ بنانا میں آپ کے واسطے پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کارساز ہے اس پر نظر (رکھنی) چاہیے۔ وہ سب کام درست کر دے گا۔ میں دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ خلقت کے اور ہم سب کے حال پر رحم فرماوے۔

زوجۂ دائم الحبس بغیر طلاقِ شوہر کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی اور اس کو حکم زوجۂ مفقود کا نہیں دیا جا سکتا۔ اول تو اس کا حال معلوم ہے۔ وہ مفقود نہیں، دوسرے یہ کہ زوجۂ دائم الحبس اس کے پاس جا سکتی ہے۔ کیوں کہ جو شخص دائم الحبس ہے وہ جزائر میں بھیجا جاتا ہے۔ اس کی زوجہ اس کے پاس جا سکتی ہے۔

اوراد و اشغال میں بوجہ دنیاوی تفکرات کے زیادہ اثر نہیں معلوم ہوتا، مگر آپ جو کچھ کرتے ہیں کرتے رہیں۔ کیوں کہ وہ اوراد و اشغال بھی (کچھ نہ کچھ) اثر سے ہرگز خالی نہیں ہیں۔ اخذِ بیعت کے واسطے کچھ طریقہ (اور قاعدہ) معلوم کرنے کی حاجت نہیں۔ مگر خیر جب آپ ملیں گے دیکھا جاوے گا۔ معاش کے واسطے اللہ پاک کا نام پڑھنا آپ کے لیے ہرگز مناسب نہیں جو کچھ تقدیر سے پیش آوے اس پر راضی رہنا ہی بڑا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا جملہ امور کے لیے کافی ہے۔ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (جو توکل کرے اللہ پر بس اللہ اس کے لیے کافی ہے) حکم ناطق ہے۔ بس یہی وظیفہ اور یہی عمل کافی ہے۔ میں آپ کے لیے دعاء خیر کرتا ہوں۔

خدمتِ عیال کرنا اور ان کے واسطے سعی کرنا اور مشقت اٹھانا بحسنِ نیت سب عبادت ہے۔ اس میں آپ کی مصروفیت موجبِ خوشنودیٔ حق تعالیٰ ہے اور یہ سب ترقیٔ درجاتِ اخروی ہے۔ اور شغل اشغال بعد اس کے جس قدر ہو سکیں وہ نفل ہیں۔ سو آپ کی مشغولی ضائع نہیں جس قدر ہو سکے کام کرتے رہیں۔ بندہ دعا گو اپنے دوستوں کا ہے اور کوئی اختیار و قدرت نہیں رکھتا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کے واسطے بھی خیر و خوبی دارین میں ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بعد انقضاء سرما یہاں ہو جاویں۔ غالباً دو تین یوم کے حرج میں کوئی عیال پر دشواری نہ ہوگی۔ اگر یہ بھی کسی وجہ سے مشکل ہو تو بذریعہ خط کے مطلع کریں بندہ کو جو کچھ کہنا ہے بذریعہ خط کے کہہ دیجیے۔

چونکہ میں بالکل اعمیٰ (نابینا) ہو گیا ہوں اور لکھنے پڑھنے سے عاجز اس واسطے اب لکھ نہیں سکتا" اور دوسرے سے لکھوانے میں تکلف ہوتا ہے۔ بندہ کو کچھ یاد نہیں کہ آپ کو کیا شغل بتایا تھا۔ بہر حال آپ وہی اپنا شغل کرتے رہیں جس قدر ہو سکے ۔۔ بندہ دعا گو ہے۔ اس میں ہرگز دریغ نہیں۔ اور خواب میں جو آپ نے دیکھا کہ یہ بندہ آپ کے مکان پر گیا[1] یہ خود دلیل قرب اور اتحاد کی ہے۔ التفات کرنا اور توجہ کرنا قرب میں ضروری نہیں ہوتا۔ اور آپ کا متوجہ نہ ہونا یہ بھی بوجہ بے تکلفی اور اتحاد کے ہے کہ اول ملاقات میں توجہ اور رغبت ہوتی ہے اور بعد چند روز کے قلب میں محبت راسخ ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ تکلف ظاہری نہیں رہتا۔ مگر باطن میں محبت راسخ ہوتی ہے۔ یہی تعبیر آپ کے خواب کی ہے۔ ہرگز پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے۔

میں آپ کے حصول مقاصد دینی و دنیوی کے لیے دست بہ دعا ہوں اور مجھ سے آپ صاحبوں کے ساتھ کیا سلوک ہو سکتا ہے؟ بہر حال میں دست بہ دعا ہوں اور دعا خیر سے مجھے دریغ نہیں۔ حق تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں وہی سب کا کفیل اور کارساز ہے۔

---

[1] مولانا سلطانپوری نے یہ خواب دیکھا تھا کہ حضرت گنگوہی ان کے مکان پر تشریف لائے ہیں اور ان کی جانب ملتفت نہیں ہیں۔ اور خود مولانا سلطان پوری کی توجہ بھی حضرت کی طرف مبذول نہیں ہے۔ خواب کا یہ مفہوم حضرت گنگوہی کے مکتوب گرامی ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ "لوہے سے انسان حصول معاش میں بھی فائدہ اٹھاتا ہے اس سے اس کی دوسری ضرورتیں بھی پوری ہوتی ہیں اور وہ اس کی صنعتوں میں بھی کام آتا ہے۔ ہر صنعت لوہے سے وجود میں آتی ہے یا کم از کم اس میں لوہا ضرور استعمال میں آتا ہے"[1]۔

لوہے سے قدیم انسان نے جتنا فائدہ اٹھایا دور جدید کے انسان نے اس سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر اس سے فرد اور سماج کو نقصان نہ پہنچے تو شریعت اسے منع نہیں کرتی۔ قرآن مجید کے الفاظ سے ہر دور میں لوہے کی افادیت اور صنعت کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت واضح ہوتی ہے اس میں اس سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب بھی ہے۔

حضرت داؤدؑ کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا:۔

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (سبا: ۱۱)	ہم نے اس کے واسطے لوہے کو نرم کر دیا اور کہا کہ وہ بڑی بڑی زرہیں بنائے اور ان کے حلقوں کا صحیح اندازہ کرے اور یہ کہ وہ نیک کام کریں (یاد رکھو) کہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے میں دیکھ رہا ہوں۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ○ (الانبیاء: ۸۰)	اور ہم نے تمھارے ایک لباس کی صنعت (زرہ سازی) اس کو سکھائی تاکہ تمھاری لڑائی کے وقت تمھاری حفاظت ہو سکے تو کیا تم اس کا شکر ادا کرو گے؟

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صنعت و حرفت ایک پیغمبر جیسی شخصیت کے وقار کے بھی منافی نہیں ہے اور اسے اختیار کرنے کے بعد بھی انسان خدا کا صالح ترین بندہ بن سکتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام معمولی انسان نہیں تھے بلکہ ایک بڑی سلطنت کے فرماں روا تھے۔ انھیں اپنے دور میں جس طرح

---

[1] زمخشری: الکشاف عن حقائق التنزیل تفسیر آیت مذکور

کی صنعت کی ضرورت تھی اسے انھوں نے ترقی دی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ آج کے صنعتی تقاضے مختلف ہیں ان تقاضوں کو پورا کرنا قرآن مجید کے منشاء کے عین مطابق ہوگا۔

اللہ تعالےٰ نے سمندر میں بے پناہ دولت رکھی ہے۔ قرآن مجید نے اس سے فائدہ اٹھانے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ انسان اتھاہ سمندروں میں جہاز رانی کے قابل ہوا جس کی وجہ سے وہ بے شمار فوائد حاصل کر رہا ہے۔ خدا کی اس نعمت پر اسے سجدہ شکر بجالانا چاہیے۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل: ۱۴)

وہی ہے جس نے سمندر کو تابع کر دیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں (وسیع) سمندر کو پھاڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں (یہ اس لیے ہے کہ) تم اس کا فضل تلاش کرو اور اسی کا شکر ادا کرو۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید نے بتایا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کا حکم دیا اور انھوں نے کشتی بنائی۔ اسی کشتی کی وجہ سے وہ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے طوفان سے محفوظ رہے۔ (ہود: ۳۷-۴۴)

قرآن مجید صنعت و حرفت کی کتاب نہیں ہے جس میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہو لیکن ان ارشادات سے اس کا رجحان ظاہر ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بڑے بڑے پیغمبروں نے بھی اپنے وقت کی صنعت سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں دولت کے بے پناہ خزانے رکھے ہیں۔ اسی میں سونا چاندی، تانبہ، پیتل، لوہا، کوئلہ اور دوسری قیمتی معدنیات موجود ہیں اور اسی کے نیچے تیل جیسی سیال دولت بہہ رہی ہے۔ قرآن مجید نے کہیں بھی ان سے استفادہ سے منع نہیں کیا ہے بلکہ ان میں انسان کی معاش کا سامان ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اسے پوری اجازت ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ — ہم نے تمھیں زمین میں اقتدار بخشا اور تمھارے

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ٥

معاش کے سامان اس میں رکھ دیے بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے:۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ٥ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ٥

(الحجر: ۲۰-۲۱)

ہم نے زمین میں تمہارے لیے اسباب معاش رکھ دیے ہیں اور اس میں وہ مخلوقات بھی ہیں جن کے رازق تم نہیں ہو (بلکہ ہم ہیں) اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے موجود ہیں اور ہم اسے ایک متعین مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

زمین سے غلہ، اناج، پھل، سبزیاں اور انسان کی غذا کا جو دوسرا سامان پیدا ہوتا ہے اسے قرآن مجید نے اللہ تعالےٰ کے ایک بڑے احسان کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ٥ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ٥ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ٥ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ

(عبس ۲۴-۳۲)

انسان اپنی غذا پر غور کرے۔ ہم نے پانی زور سے برسایا۔ پھر زمین کو اچھی طرح پھاڑ دیا اور اس میں اناج اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ میوہ اور گھاس پیدا کیا اس میں تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے زندگی کا سامان ہے۔

ایک جگہ زمین سے حاصل ہونے والی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے پر اس طرح اُبھارا گیا ہے۔

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ٥ وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا مِنَ الْعُيُونِ ٥ لِيَأْكُلُوا مِن ثَمَرِهِ

ان کے لیے یہ ایک بڑی نشانی ہے کہ مردہ زمین کو ہم نے زندہ کر دیا۔ اس سے اناج پیدا کیا جس سے وہ کھاتے ہیں ہم نے زمین میں کھجور اور انگور کے باغات پیدا کیے اور اس میں چشمے بہائے تاکہ وہ اس کے

وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (یٰس ۳۳-۳۵)	پھل کھائیں۔ ان کے ہاتھوں نے اسے نہیں بنایا۔ پس یہ کیوں نہیں شکر کرتے ؟

ایک اور موقع پر خدا کے ان احسانات کا حق ادا کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الانعام: ۱۴۲)	وہی ذات ہے جس نے ایسے باغ پیدا کیے جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور ایسے بھی جو ٹٹیوں پر چڑھائے نہیں جاتے اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ ان سب کے پھل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اس نے زیتون اور انار پیدا کیا جو ایک دوسرے مشابہ بھی ہیں اور جدا جدا بھی جس وقت وہ پھل دیں ان کے پھل کھاؤ جس دن ان کو کاٹو تو ان کا حق ادا کرو بے جا خرچ نہ کرو۔ اسراف کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

اس طرح قرآن مجید نے یہ تصور دیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس زمین میں بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں۔ انسان کو ان سب نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے البتہ وہ اس کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ خدا اور بندوں کے حقوق نہ فراموش کر بیٹھے۔

زراعت انسان کا قدیم ترین ذریعہ معاش ہے۔ اسلام کا رجحان اس کو ترقی دینے کا رہا ہے چنانچہ اس کی اس نے ترغیب بھی دی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے کار اور غیر مزروعہ زمین کو جو بھی شخص آباد کرے وہ اسی کی ہے۔ البتہ جبر وظلم سے دوسرے کی جائداد پر قبضہ کا کسی کو حق نہیں ہے۔

من احییٰ ارضا میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق[1]	جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے اور ظالم کا کوئی حق نہیں ہے

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع۔ باب الغصب بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد، مالک۔

ایک اور حدیث میں ہے :-

من عمر ارضا لیست لاحد فھو احق بھا قال عروۃ و قضی بہ عمر فی خلافتہ[1]

جو شخص ایسی زمین آباد کرے جو کسی کی نہ ہو تو وہی اس کا حق دار ہوگا۔ عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے (بھی) اپنی خلافت میں اسی کے مطابق فیصلہ کیا تھا۔

ان احادیث کی بنا پر فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ حکومت کی اجازت سے جس طرح ایک مسلمان غیر مزروعہ زمین پر (جس کا کوئی مالک نہ ہو) قبضہ کر سکتا ہے اسی طرح ایک ذمی بھی قبضہ کر سکتا ہے[2]

اسلام نے دولت کے جن ذرائع کو ناجائز قرار دیا ہے ان میں دھوکے، فریب، رشوت ستانی ذخیرہ اندوزی اور ایسے تمام طریقوں سے منع کیا ہے جو غیر اخلاقی ہیں اور جن میں دوسرے کو نقصان پہنچا کر فائدہ اٹھانے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں :-

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ...... عن بیع الغرر[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکے کے کاروبار سے منع فرمایا!

ایک مرتبہ آپ نے غلّہ کے ایک ڈھیر میں ہاتھ ڈالا تو اندر سے بھیگا ہوا غلّہ نکلا۔ آپ نے غلّے کے تاجر سے پوچھا کہ یہ اندر سے گیلا کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا۔ بارش میں بھیگ گیا تھا۔ آپ نے فرمایا "پھر اسے اوپر کیوں نہیں کر دیا تاکہ لوگ دیکھ کر خریدتے؟ اس کے بعد ارشاد فرمایا :-

من غش فلیس منی[4]

جو شخص دھوکہ دے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں

رشوت ستانی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے :-

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب المساقاۃ، بحوالہ بخاری [2] ہدایہ، کتاب احیاء الموات [3] مشکوٰۃ، کتاب البیوع باب المنھی عنہا من البیوع، بحوالہ مسلم [4] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب المنھی عنہا من البیوع، بحوالہ مسلم

لعن رسول اللہ الراشی والمرتشی[1] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی۔ رشوت دینے والے پر بھی اور رشوت لینے والے پر بھی۔

ذخیرہ اندوزی کو شریعت نے بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا یحتکر الا خاطی[2] — گناہگار انسان ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

الجالب مرزوق والمحتکر ملعون[3] — جو تاجر غلہ باہر سے بازار میں لائے اللہ اسے رزق دیتا ہے اور جو ذخیرہ اندوزی کرے اس پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث ہے:۔

من احتکر طعاماً اربعین یوما یرید به الغلاء فقد بری من اللہ وبری اللہ منه[4] — جو شخص چالیس دن تک اس خیال سے غلہ کا ذخیرہ کر رکھے کہ قیمت چڑھ جائے تو اللہ سے اس کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اللہ بھی اسے چھوڑ دیتا ہے۔

اسلام نے کسب دولت کے بعض ذرائع کو بالکل ناجائز قرار دیا ہے۔ ان ذرائع کے اختیار کرنے کی وہ کسی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ اس کی نمایاں مثال سود کی ہے اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ تجارت کے ذریعے ہونے والی آمدنی تو حلال اور طیب ہے لیکن سود سے جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ حرام اور ناپاک ہے۔

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو (البقرہ: ۲۷۵) — اللہ تعالیٰ نے لین دین اور تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام فرمایا۔

---

1. مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الامارہ، باب رزق الولاۃ وہدایاہم بحوالہ ترمذی، ابوداؤد
2. مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب الاحتکار بحوالہ مسلم
3. 〃 〃 〃 بحوالہ ابن ماجہ، دارمی
4. 〃 〃 〃 بحوالہ رزین

تجارت سے انسان اپنی معاشی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اور دوسروں کی خدمت بھی کرتا ہے۔ وہ خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور ملک اور سماج کی معیشت کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ لیکن سود دولت مند کی دولت میں اضافہ کرتا اور غریب کو غریب تر بناتا ہے۔ ایک سود خوار معاشرے کے ضرورت مند اور کمزور طبقات کو نقصان پہنچا کر خود دولت سمیٹتا ہے اور دوسروں کی اقتصادی حالت کو تباہ کر کے ترقی کرتا ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ غریب ابھرنے نہ پائے اور ہمیشہ اس کا دست نگر رہے محتاج رہے۔ وہ اس کی غربت اور لاچارگی ہی سے فائدہ اٹھاکر ترقی کرتا ہے۔ اسلام اس رجحان کا سرے سے مخالف ہے۔ وہ غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ہمدردی اور لطف و محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے دولت دی ہے وہ ناداروں اور محتاجوں کی مدد کریں۔ یہی بات قرآن مجید نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (البقرہ: ۲۷۶)

اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات و خیرات کو بڑھاتا ہے اور وہ کسی ناشکرے اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام نے ایک طرف غریبوں کی مدد پر ابھارا، ان کی کفالت کی ذمہ داری لی اور ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا۔ دوسری طرف سود خواروں کے خلاف سخت اقدام کیا۔ ان کو ہدایت کی کہ جو لوگ ان کے قرض میں پھنسے ہوئے ہیں ان سے وہ صرف اصل رقم واپس لے سکتے ہیں۔ زیادہ کا ان کو حق نہیں ہے۔ اس میں بھی انھیں اپنے قرض داروں کے ساتھ ممکنہ رعایت کرنی ہوگی سختی اور بداخلاقی ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ سود کے احکام کے ذیل میں قرآن مجید نے فرمایا:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود (دوسروں کے ذمے) باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن اگر تم توبہ کرتے ہو

رُءُوسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۞ وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲۷۸-۲۸۰)

تو تمہیں اصل مال مل جائے گا، نہ تو تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی دوسرا تم پر ظلم کرے اگر وہ تنگ دست ہے تو اس کی گشایش اور آسانی تک مہلت دو۔ اگر تم جانو، تو بہتر یہ ہے کہ تم اسے بخش دو۔

قرآن مجید کے نزدیک سود خواری سب سے بڑا سماجی اور اخلاقی جرم ہے۔ اسی وجہ سے اس نے کسی بھی اخلاقی خرابی کے سلسلے میں وہ سخت رویہ نہیں اختیار کیا جو سود خواری کے سلسلے میں اختیار کیا، اور اسے مٹانے کے لیے سود خواروں اور مہاجنوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ احادیث میں بھی سود کو سب سے بڑی سماجی اور اخلاقی بُرائی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

حضرت جابر روایت کرتے ہیں:-

لعن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰو وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال ھم سواء[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ سود کھانے والے پر اور سود کھلانے والے پر، اس کی کتابت کرنے والے پر اس کے گواہوں پر اور آپ نے فرمایا گناہ میں سب برابر ہیں۔

ایک دوسری حدیث ہے:-

درھم ربٰو یاکلہ الرجل وھو یعلم اشد من ستۃ وثلٰثین زنیۃ[۲]

سود کا ایک درہم جسے انسان جانتے بوجھتے کھاتا ہے وہ چھتیس بار زنا کرنے سے بھی سخت ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:-

الربٰو سبعون جزءً ایسرھا

سود کھانا ستر حصے گناہ ہے۔ ان میں کا

---

[۱] مشکوٰۃ کتاب البیوع، باب الربٰو بحوالہ مسلم

[۲] ؍ ؍ ؍ بحوالہ احمد، دارقطنی، بیہقی

ان ینکح الرجل امہ[1] — سب سے چھوٹا حصہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔

اسلام نے شراب اور جوے کو بھی حرام قرار دیا ہے اس لیے ان ذرائع سے ہونے والی آمدنی بھی اس کے نزدیک حرام ہے۔ شراب کے نشہ میں بسا اوقات انسان اچھے اقدامات بھی کر گزرتا ہے۔ اہل عرب کی نظر ان ہی اقدامات پر تھی۔ اس لیے وہ اسے کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اسے کیف و سرور اور تفریح ہی کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو اعلیٰ اخلاق کے اظہار کا ذریعہ بھی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ شراب پینے کے بعد وہ بالعموم دل کھول کر سخاوت کرتے اور اپنا مال لٹاتے تھے۔ اسی طرح جوے سے ہونے والی آمدنی کو بھی وہ غریبوں اور ناداروں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ اس پہلو سے شراب اور جوا ان کے نزدیک قومی خدمت اور اس کے فائدہ کا ذریعہ تھا۔ قرآن مجید نے کہا کہ دنیا کی ہر چیز میں اس قسم کے فوائد ڈھونڈے جا سکتے ہیں لیکن کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ فرد اور معاشرہ پر بحیثیت مجموعی اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں؟ اگر اس کا نفع اس کے نقصان سے زیادہ ہو تو وہ جائز ہوگا اور اگر اس میں ضرر کا پہلو غالب ہو تو وہ حرام ہوگا۔ شراب اور جوے کے مضرات ان کے فوائد سے زیادہ ہیں اس لیے خدا کی شریعت میں وہ حرام ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرہ: ۲۱۹)

وہ تم سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں ان سے کہو کہ ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے۔

اس کے بعد ان کی قطعی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب گندے شیطان کے کام ہیں لہذا تم اس سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب الربوٰ بحوالہ ابن ماجہ، بیہقی

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ ۹۰-۹۱)

جوے کے ذریعے تمہارے درمیان بغض اور دشمنی پیدا کرے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے تو کیا اب تم اس سے رک جاؤ گے۔

شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال آدمی کو اپنے فرائض سے غافل کر دیتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ خدا اور بندوں کے حقوق ٹھیک طریقہ سے ادا کر سکے۔ ایسا شخص معاشرہ کے لیے ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس پر کسی بھی معاملہ میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

نشیات کے استعمال کے بعد آدمی اپنے ہوش و حواس کبھی کھوئے جب بھی بہر حال وہ اپنی فطری حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اس کے اندر جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے قابو ہونے لگتا ہے۔ یہیں سے بسا اوقات جھگڑے اور اختلافات شروع ہوتے ہیں اور سوسائٹی کے امن و سکون کو غارت کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کے امن، چین اور سکون کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد میں صبر و تحمل اور قوت برداشت پائی جائے۔ یہ اوصاف کسی نشہ پرور قوم میں پیدا نہیں ہو سکتے۔

شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال انسان کے دل و دماغ اور اس کی صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ جو قوم اس کی عادی ہو جائے اسے لازماً اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

شراب کے استعمال سے حدیثوں میں سختی سے منع کیا گیا ہے اور اس پر بڑی وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو نصیحت کی

ولا تشربن خمراً فانہ راس کل فاحشۃ[1]

تم شراب ہرگز مت پیو اس لیے کہ وہ بے حیائی کی جڑ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ولا یشرب الخمر حین یشربھا

جس وقت آدمی شراب پیتا ہے اس

---

[1] مشکوٰۃ، باب الکبائر و علامات النفاق بحوالہ احمد

وھو مومن [1] وقت وہ مومن نہیں رہتا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام سب سے پہلے جس میدان میں سرنگوں ہوگا وہ شراب ہے (اس کے ماننے والے بے تکلف اسے استعمال کرنے لگیں گے۔) صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں صریح ممانعت کردی ہے تو اس کے ماننے والے اس کی جرأت کیسے کریں گے۔ آپ نے فرمایا:۔

یسمونھا بغیر اسمھا	اس کا نام بدل دیں گے اور اسے حلال
فیستحلونھا [2]	کرلیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:۔

کل مسکر خمر وکل مسکر حرام ومن	ہر نشہ آور چیز پر 'خمر' کا اطلاق ہوتا ہے
شرب الخمر فی الدنیا وھو یدمنھا	اس لیے سب ہی نشہ آور چیزیں حرام ہیں۔
لم یتب لم یشربھا	جو شخص دنیا میں مستقل شراب پیے اور توبہ نہ کرے
فی الآخرۃ [3]	تو آخرت میں وہاں کی شراب نہیں پیے گا۔

بعض لوگ شراب کو ٹھنڈے ملکوں کی ایک ضرورت سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر ان کے نزدیک سردی کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ شراب سے جو سرور اور تازگی ملتی ہے وہ انسان کی قوت کار کو بڑھاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی شراب کے بہت سے 'فوائد' بیان کیے جاتے ہیں لیکن اسلام ان 'فوائد' کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک کسی بھی صورت میں شراب کا استعمال صحیح نہیں ہے۔

دیلم حمیری نے، جن کا تعلق یمن سے تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم لوگ ایک تو ٹھنڈے علاقے کے رہنے والے ہیں اور دوسرے یہ کہ ہمیں محنت و مشقت کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ہم لوگ گیہوں سے ایک مشروب تیار کرتے ہیں۔ اس سے اپنے سخت کاموں کے لیے توانائی بھی

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، باب الکبائر وعلامات النفاق بحوالہ بخاری ومسلم

[2] " کتاب الرقاق، باب الانذار والتحذیر

[3] " کتاب الحدود، باب الخمر ووعید شاربہا بحوالہ مسلم

حاصل ہوتی ہے اور سردی کے مقابلہ میں مدد بھی ملتی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا۔ ہاں! آپ نے فرمایا تو پھر اس سے بچو۔ انھوں نے عرض کیا کہ لوگ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے فرمایا اگر وہ اسے ترک نہ کریں تو تم ان سے جنگ کرو۔[1]

طارق بن سوید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے استعمال کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انھیں منع فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا میں تو اسے دوا کے لیے تیار کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ شراب کا استعمال خود ایک بیماری ہے وہ اس سے شفا کیا ہوگی؟[2]

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو شراب کے استعمال ہی سے منع نہیں کیا بلکہ اس بات کی بھی اس نے اجازت نہیں دی کہ کسی کے پاس شراب ہو تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یتیم کے مال کو ضائع کرنے سے شریعت نے سختی سے روکا ہے لیکن یہی مال شراب کی شکل میں ہو تو حکم ہے کہ اسے تلف کر دیا جائے۔ حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ ایک یتیم جو ہماری نگرانی میں تھا اس کی شراب ہمارے پاس تھی۔ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ ایک یتیم کی شراب ہے۔ اسے کیا کیا جائے۔ آپ نے فرمایا اسے بہا دو۔[3]

شراب کی خرید و فروخت اس سے مالی استفادے، اس کے پینے پلانے اور اس کے سلسلے کسی بھی پہلو سے تعاون کو حدیثوں میں قابل لعنت فعل قرار دیا گیا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

لعن رسول اللہ فی الخمر عشرۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلے
عاصرھا ومعتصرھا وشاربھا	میں دس آدمیوں پر لعنت بھیجی (کسی دوسرے کے
وحاملھا والمحمولۃ الیہ وساقیھا	لیے) اس کے نچوڑنے والے پر، اپنے لیے اس کے
وبائعھا واکل ثمنھا والمشتری	نچوڑنے والے پر، اس کے پینے والے پر، اس کے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الحدود، باب بیان الخمر ووعید شاربھا بحوالہ ابوداؤد

[2] " " حوالہ بالا بحوالہ مسلم۔

[3] " حوالہ بالا۔ بحوالہ ترمذی

لها والمشتری له[1]	لیجانے والے پر اس شخص پر جس کے لیے وہ لے جائی جائے اس کے پلانے والے پر اسکے بیچنے والے پر اسکی قیمت کے کھانے والے پر اسکے خریدنے والے پر اور اس شخص پر جس کے لیے وہ خریدی جائے۔

قرآن مجید نے شراب کے ساتھ جوے کے بارے میں بھی کہا کہ اس میں نفع سے زیادہ نقصان ہے (البقرہ ۲: ۲۱۹) اور پھر دونوں ہی کو اس نے ایک ساتھ حرام قرار دیا (المائدہ ۵: ۹۰) بہت سی حدیثوں میں بھی دونوں کی حرمت کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔

ان الله تعالیٰ حرم الخمر والمیسر والکوبة وقال کل مسکر حرام[2]	اللہ تعالیٰ نے شراب، جوا اور آلات لہو و لعب کو حرام کر دیا۔ آپ نے فرمایا ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهی عن الخمر والمیسر والکوبة والغبیراء[3]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے، جوے سے، آلات لہو و لعب سے اور غبیراء (شراب کی ایک قسم) سے منع فرمایا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا یدخل الجنة عاق ولا قمار ولا منان ولا مدمن خمر[4]	جنت میں نہ تو ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا داخل ہوگا۔ نہ جوے باز، نہ احسان جتانے والا اور نہ ہمیشہ شراب پینے والا

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال بحوالہ ترمذی وابن ماجہ

[2] ، کتاب اللباس، باب التصاویر بحوالہ بیہقی

[3] ، ، ، بحوالہ ابوداؤد

[4] ، کتاب الحدود، باب بیان الخمر ووعید شاربها بحوالہ دارمی

جوئے کی بہت سی شکلیں عرب میں رائج تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک کر کے ان سب سے منع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جوا کھیلنے کی کسی کو دعوت دینا بھی ایک جرم ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ آدمی صدقہ و خیرات کرے۔ چنانچہ آپ کا حکم ہے۔

من قال لصاحبہ تعال اقامرك فليتصدق (بخاری)	جو شخص اپنے ساتھی سے یہ کہے کہ آؤ جوا کھیلیں تو اسے صدقہ کرنا چاہیے۔

یہ صدقہ اس لیے ہے کہ جس مال کے لالچ میں انسان نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کرنا چاہا اس کی محبت کم ہو اور دھوکے اور فریب سے دولت سمیٹنے کی جگہ خرچ کرنے کا جذبہ اس میں پیدا ہو۔
یہ تو چند مثالیں ہیں اصولی طور پر اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ مال کمانے کے لیے تمام ناجائز اور جھوٹے طریقے چھوڑ دیے جائیں اور صرف جائز طریقے اختیار کیے جائیں۔ قرآن مجید کا حکم ہے:۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۱۸۸)	اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ اور اسے حکام تک (بطور رشوت) نہ پہنچاؤ تاکہ جانتے بوجھتے ناحق لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم کھا جاؤ۔

جیسا کہ علماء نے لکھا ہے چوری، خیانت، غصب، دھوکا اور فریب، ظلم و جبر، رشوت اور جھوٹے عہد کے ذریعے دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا یا سود، قمار، شراب اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ ان کے ذریعے دولت حاصل کرنا یہ سب باطل طریقے سے مال کھانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسلام نے ان سب سے منع کیا ہے۔

اسلام نے اکتساب مال کے ان ہی طریقوں کو جائز قرار دیا ہے جن سے کسی دوسرے فرد کو نقصان نہ پہنچے اور معاشرہ بحیثیت مجموعی اقتصادی لحاظ سے ترقی کرے۔ دوسروں کا استحصال کر کے اور معاشرے کو نقصان پہنچا کر دولت حاصل کرنا اس کے نزدیک ناجائز اور حرام ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ	اے ایمان والو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ الا یہ کہ آپس کی خوشی سے تجارت ہو اور اپنے آپ کو قتل

مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء: ۲۹) — نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔

یہاں قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ تم ناحق طریقہ سے دوسروں کا مال نہ کھاؤ بلکہ یہ کہا کہ تم اپنا مال آپس میں باطل طریقہ سے نہ کھاؤ۔ اس سے وہ اپنے ماننے والوں کے اندر یہ احساس پیدا کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کے مال کو اپنا مال سمجھیں اور اسے برباد کرنے اور اس پر ناجائز طور پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

فرمایا۔ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شخص دوسرے کو نقصان پہنچا کر فائدہ اٹھاتا ہے وہ پورے معاشرے کو تباہ کرتا ہے۔ وہ چاہے عارضی طور پر معاشی آسودگی اور راحت محسوس کرے لیکن جب معاشرے کی اقتصادیات تباہ ہوں گی تو وہ خود بھی اس کے انجام بد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس کے بعد قرآن مجید نے ان لوگوں کو سخت وعید سنائی ہے جو ناحق دوسروں کا مال کھاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (النساء: ۳۰) — جو شخص تم میں سے ظلم و زیادتی کے ساتھ یہ کرے گا اسے ہم جلد ہی جہنم میں داخل کریں گے اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

احادیث میں بھی بڑی شدت کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے کہ آدمی حلال و حرام کی تمیز کے بغیر دولت سمیٹنے لگ جائے اور اس کے لیے مکر و فریب، جور و ظلم اور ہر طرح کے ناجائز طریقے اختیار کرنے لگے۔ حضرت واثلہ بن اسقعؓ کہتے ہیں:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من باع عیبا لم یبینہ لم یزل فی مقت اللہ ولم تزل الملئکۃ تلعنہ ؎ — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کوئی عیب دار چیز بیچے اور اس سے خریدار کو باخبر نہ کرے تو وہ ہمیشہ خدا کے غضب کا شکار رہتا ہے اور فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔

؎ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب المنہی عنہا من البیوع بحوالہ ابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من اخذ من الارض شبرا بغیر حق لخسف بیوم القیامۃ الی سبع ارضین[1] — جو شخص بالشت بھر زمین بھی ناحق طریقے سے لے گا وہ قیامت کے دن سات زمینوں کی تہہ تک دھنسا دیا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یاتی علی الناس زمان لایبالی المرء ما اخذ منہ امن الحلال ام من الحرام[2] — لوگوں پر ایک وقت آئے گا جب کہ آدمی اس کی پروا نہیں کرے گا کہ جو مال اس نے حاصل کیا ہے وہ حلال طریقے سے ہے یا حرام طریقے سے۔

جو شخص حرام طریقے سے مال کھائے اور اس سے دادِ عیش دیتا پھرے، احادیث میں اسے بہت سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ مال حرام سے پرورش پانے والا جسم جہنم ہی کا سزاوار ہے۔ حضرت جابرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

لایدخل الجنۃ لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من الحرام فالنار اولی بہ[3] — جنت میں وہ گوشت نہیں جائے گا جو حرام سے تیار ہوا ہے۔ جو گوشت حرام سے تیار ہو تو جہنم ہی اس کی زیادہ مستحق ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حرام مال کھانے والا جب مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی مدد نہیں کرتا اور اس کی دعائیں اس وقت بھی نہیں سنی جاتیں جبکہ دعائیں قبول کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پاک اور طیب ہے اس لیے وہ پاک ہی چیزوں کو قبول بھی کرتا ہے اس نے ایمان والوں کو اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے چنانچہ اس نے رسولوں سے کہا:۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب البیوع باب الغصب۔ بحوالہ بخاری

[2] " " باب الکسب وطلب الحلال۔ بحوالہ بخاری

[3] " " بحوالہ احمد، دارمی، بیہقی

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا

اے رسولو! پاک اور حلال چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو

یہی بات اس نے اہل ایمان سے کہی ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ

اے ایمان والو جو حلال اور پاک چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں انھیں کھاؤ۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:۔

ثم ذكر الرجل يطيل السفر اشعث اغبر يمد يده الى السماء يارب يارب ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام فانى يستجاب لذالك[1]

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا ذکر کیا جس کا سفر لمبا ہوتا ہے اس کے بال الجھے ہوئے اور کپڑے غبار آلود ہوتے ہیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے اے میرے رب! اے میرے رب! (تو میری مدد کر لیکن) اس کا کھانا حرام مال کا، پینا حرام مال کا، کپڑے حرام مال کے اور اس کی پرورش حرام مال سے۔ تو اس حالت میں اس کی دعا کیسے سنی جائے گی؟

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ حرام مال کھانے والے کی عبادت مقبول نہیں ہوتی۔ اس سے خیر و برکت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے صدقے سے اس کے گناہ نہیں دھلتے اور اسے وہ اپنے بعد چھوڑ جائے تو اس کے عذاب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا يكسب عبد مال حرام فيتصدق منه فيقبل منه ولا ينفق منها فيبارك فيه

بندہ حرام مال کما کر جو صدقہ کرتا ہے وہ قبول نہیں کیا جاتا اور اس سے جو خرچ کرتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال، بحوالہ مسلم

ولا یترکہ خلف ظہرہ الا کان زادہ الی النار	اسے اپنے بعد جب چھوڑ جاتا ہے تو اس کے جہنم تک پہنچنے کا سامان ہو جاتا ہے۔
ان اللہ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن وان الخبیث لا یمحو الخبیث[1]	اللہ تعالیٰ بدی کو بدی (مال حرام) سے نہیں مٹاتا بلکہ وہ بدی کو نیکی کے ذریعے مٹاتا ہے۔ جو چیز خود ہی ناپاک ہے وہ کسی دوسری ناپاک چیز کو مٹا نہیں سکتی۔

اسلام کے نزدیک جائز ذرائع آمدنی ہی کسی مال کو حلال اور پاک بناتے ہیں اور اسی پر انسان کا قانونی اور اخلاقی حق بھی ہے۔ جو مال ناجائز ذرائع سے حاصل کیا جائے اسے وہ حرام اور ناپاک سمجھتا ہے اس طرح کے ناپاک مال پر وہ انسان کا حق تسلیم نہیں کرتا۔ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما انا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجۃ من بعض فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشیء من حق اخیہ فانما اقطع لہ قطعۃ من النار[2]	میں بھی ایک انسان ہی ہوں اور تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو۔ اس میں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو اور اپنی بات زیادہ بہتر طریقے سے پیش کر سکے جس کی بنیاد پر میں اس کے بیان کے مطابق فیصلہ کر دوں۔ اس طرح اگر میں کسی کو اس کے بھائی کا تھوڑا سا حق بھی دے دوں تو اسے سمجھنا چاہیے کہ اسے میں جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جھوٹے دعوے اور جھوٹی وکالت کے ذریعے عدالت سے جو فیصلہ کرایا جائے وہ کسی ناجائز مال کو جائز نہیں بنا دیتا اور انسان کے لیے وہ حلال اور طیب نہیں بن جاتا

[1] مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب البیوع۔ باب الکسب وطلب الحلال بحوالہ احمد وشرح السنۃ

[2] کتاب الامارہ باب الاقضیہ والشہادات۔ بحوالہ بخاری ومسلم

جو شخص اس طرح غلط تدابیر سے مال حاصل کرتا ہے وہ آخرت کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اگر آدمی میں خدا کا خوف ہو تو وہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائے گا لیکن اپنی تجوری بھرنے کے لیے دوسرے کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو آدمیوں نے ایک وراثت کے بارے میں دعوےٰ کیا۔ دونوں میں سے ہر ایک کا دعوےٰ تھا کہ وہی اس کا وارث ہے لیکن کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا اگر میں تم میں سے کسی کے بھی حق میں فیصلہ کر دوں اور وہ اس کا جائز حقدار نہیں ہے تو سمجھ لے کہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔ یہ سنکر دونوں اپنے حق سے دستبردار ہو گئے اور ہر ایک نے کہا کہ آپ میرا حصہ میرے ساتھی کو دے دیجیے۔ آپ نے فرمایا۔ ایسا نہ کرو بلکہ دونوں اس کو تقسیم کر لو اور قرعہ اندازی کے ذریعے ایک ایک حصہ لے لو۔ اس میں جو کمی بیشی ہو اسے نظر انداز کر دو اور اپنے بھائی کے لیے اسے جائز قرار دے دو۔[1]

یہ ہے وہ ذہن جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جب یہ ذہن پیدا ہو جائے تو آدمی حرام ذرائع اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ (ماہنامہ "زندگی" رام پور کے شکریہ کے ساتھ)

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ۔ کتاب الامارۃ ۔ باب الاقضیۃ والشہادات ۔ بحوالہ ابو داؤد

مولانا محمد تقی امینی
ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خطاب عیدُ الاضحیٰ

یہ خطاب عید الاضحیٰ کے دن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرات! آج ہماری دوسری عید ہے۔ پہلی عید کی طرح یہ عید بھی دنیا کے تہواروں اور میلوں سے مختلف ہے۔ اس میں ایک نہایت اہم عہدنامہ پر دستخط کی تجدید و یاددہانی ہوتی ہے جس پر دستخط کے بغیر کوئی شخص مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

اس عید میں جس اہم عہدنامہ پر دستخط کی تجدید و یاددہانی ہوتی ہے وہ اصول و صداقت کے مقابلہ میں جذبات و خواہشات کی قربانی کا عہدنامہ ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش اس کے جذبات و خواہشات کی آزمائش ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے نہیں گھبراتا۔ پہاڑوں کی چٹانوں سے ہراساں نہیں ہوتا۔ درندوں کے مقابلہ سے منہ نہیں موڑتا لیکن نفس کی ایک معمولی سی خواہش اور جذبات کی ادنیٰ سی کشش کا کبھی وہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آپ تعجب کریں گے کہ دنیا ہزار ترقی کے باوجود خواہشات و جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوئی تدبیر نہ سوچ سکی اور ہزار ایجادات کے باوجود عقل کو خواہشات پر فتحمند بنانے کے لیے کوئی مشین نہ ایجاد کرسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کی عکاسی کے لیے اس نے جو آئینہ تیار کیا ہے اس میں کائنات کا عکس تو بڑی حد تک نظر آگیا لیکن انسان ہی کا صحیح عکس اس میں نہ نظر آسکا۔ انسان کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے براہیمی نظر کی ضرورت ہے جو سائنٹفک دنیا کے پاس نہیں ہے۔ ؎

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینہ میں بنا لیتی ہے تصویریں

عہدنامہ پر دستخط کی تجدید و یاددہانی کا ذکر اس آیت میں ہے

لن ینال اللّٰہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم[1]	اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہونچتا ہے نہ خون اس کے حضور جو کچھ پہونچ سکتا ہے وہ تمہارا تقویٰ (دل کی نیکی) ہے

یہ دل کی نیکی یا تقویٰ کب حاصل ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون[2]	جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو کامل نیکی کے مرتبہ کو نہ پہونچ سکو گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بڑھ کر صحابۂ کرامؓ کو کون محبوب ہو سکتا ہے لیکن جب اصول و صداقت کے قربان ہونے کا اندیشہ نظر آیا تو انھوں نے جذبات و خواہشات کو کس طرح قربان کیا اس کی وضاحت چند مثالوں سے ہوتی ہے۔

(۱) جسد اطہر سے روح مبارک پرواز کر جانے کے بعد مسجد نبوی میں صحابۂ کرام ایک سخت آزمائش سے دوچار ہوئے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی محبت کے جوش میں کسی طرح رسول اللہ کے وصال کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور قسم کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ کا وصال نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں ابوبکرؓ نے ایک طرف عشق و محبت کے تقاضہ میں کمی نہ آنے دی کہ حجرۂ مبارک میں داخل ہو کر رُخ زیبا سے چادر اُٹھائی۔ سر نیاز جھکایا بوسہ دیا اور رو رو کر فرمایا۔

بابی انت وامی طبت حیاً ومیتاً	میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ زندگی اور موت دونوں میں پاکیزہ رہے۔

دوسری طرف مسجد میں آئے عمرؓ کو سمجھایا صحابہؓ کو روکا اور اصول و صداقت کی راہ کو اس طرح واضح کیا کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اسلام زندگی و توانائی سے بھرپور نظر آنے لگا۔ چنانچہ حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

الا من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللّٰہ	جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا وہ خود سن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا ہے

[1] حج ۵۶ [2] آل عمران ۱۰۶ [3] بخاری باب فضل ابی بکر

فانہ حی لا یموت[1]　　اور جو شخص اللہ کی بندگی کرتا تھا تو بیشک اللہ زندہ ہے اس کے لیے موت نہیں ہے۔

اور خلافت کی سب سے پہلی تقریر میں اصول وصداقت کے مقابلہ میں جذبات وخواہشات کو قربان کرنے کا انداز اس طرح سمجھایا:۔

لوگو۔ میں تمھارا امیر بنا دیا گیا ہوں۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ سچائی امانت ہے۔ جھوٹ خیانت ہے تم میں کمزور میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کی شکایت دور نہ کر دوں اور قوی میرے نزدیک کمزور ہے جبتک اس سے حق نہ لے لوں[2]۔

(۲) حضرت عمرؓ نے اُس درخت کے کاٹنے کا حکم دیا جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں بیعت لی تھی۔

لانھم کانوا یذھبون یصلون تحتھا فخاف علیھم الفتنۃ[3]　　کیونکہ لوگ جا کر اس کے نیچے نماز پڑھتے تھے جس سے فتنہ کا اندیشہ تھا۔

اپنے محبوب کی طرف منسوب چیزوں سے محبت طبعی امر ہے جس کی رعایت ضروری ہے اور کبھی اس قدر عقلی بن جاتی ہے کہ ہوشمند اس کے ذریعہ قوت حاصل کرتا ہے لیکن عام حالت میں یہ محبت اگر اس حد تک تجاوز کر جائے کہ اصول وصداقت اور شرعی احکام کے مراتب نہ قائم رہ سکیں یا سیاسی بازیگر اس سے کھیلنا شروع کر دیں تو یہ مستقل فتنہ بن کر ہلاکت وبربادی کا پیغام ثابت ہوتی ہے چنانچہ حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

انما ھلک من کان قبلکم بھذا یتبعون آثار انبیاءھم فاتخذوھا کنائس وبیعا[4]　　تم سے پہلے لوگ اس کی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ وہ انبیاء کی نشانیوں کے پیچھے پڑے پھر انھوں نے ان کو عبادت خانے بنا لیے۔

---

[1] بخاری باب فضل ابی بکر۔

[2] البدایہ والنہایہ جز باب اعتراف سعد بن عبادہ ماقالہ الصدیق فی یوم السقیفۃ [3] الاعتصام شاطبی ج فصل قد یکون اصل العمل مشروعا ص۹۳ [4] ایضاً

رسول اللہ کے بعد فتنۂ ارتداد (دین سے پھر جانے کا) زمانہ ختم ہو چکا تھا جس میں سندان عشق کی نمود ضروری تھی اور ابوبکرؓ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ اگر رسّی کی زکوٰۃ بھی رسول اللہ کو دیتے تھے اور مجھے نہ دیں گے تو میں جہاد کروں گا۔ اب جام شریعت کی حفاظت کا زمانہ تھا جس میں جام وسندان باختن کا مظاہرہ تھا۔ اور عمرؓ درخت کو کاٹ دینے میں حق بجانب تھے کہاں معمولی رسّی کی زکوٰۃ نہ دینے پر جہاد کا اعلان اور کہاں ذات اقدسؐ سے مشرف درخت کے نیچے نماز پڑھنے پر ہلاکت وبربادی کا پیغام؟

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

ایک ہاتھ میں شریعت کا جام ہے اور دوسرے ہاتھ میں عشق کا سندان ہے۔ ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس نے اصول وصداقت کی خاطر جذبات وخواہشات کو قربان کرنا سیکھا ہو۔

(۳) حضرت عمرؓ کو کوفہ کی حکومت کے لیے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو قوی امانت دار اور مسلمان ہو۔ ایک شخص نے عرض کیا

خدا کی قسم میں آپ کو ایک ایسا ہی آدمی بتاتا ہوں جو قوی۔ امانت دار اور مسلمان سب کچھ ہے اور بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔

پوچھا وہ کون ہے۔ جواب دیا عبداللہ آپ کے صاحب زادے ہیں۔

یہ سن کر فرمایا فاتلک اللہ[1] (اللہ تمہیں محروم کرے یہ تم نے کیسی بات کہدی؟

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

(۴) یرموک کی لڑائی میں حضرت خالد بن ولیدؓ اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور ابوعبیدہؓ بن جراح ان کے ماتحت افسر تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ کو معزول کر کے ابوعبیدہؓ بن جراح کو سپہ سالار مقرر کیا اور خالدؓ کو ان کے ماتحت کر دیا۔ یہ فرمان عین اس وقت پہونچا جبکہ لڑائی آخری مرحلہ میں پہونچ کر فتح ہونے والی تھی ابوعبیدہؓ فرمان خلافت کے مطابق فوراً سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر فتح کا کریڈٹ خود حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس فرمان کو چھپایا اور خالدؓ

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الاربعون

کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں تک کہ فتح کے آثار نمایاں ہو گئے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اور موقع پا کر فتح کا کریڈٹ خود کیوں نہ حاصل کر لیا تو جذبات و خواہشات کی قربانی دینے والے نے جواب دیا۔

ماسلطان الدنیا اسریں وماللدنیا اعمل — میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور نہ دنیا کے لیے عمل کرتا ہوں۔

ادھر یرموک کی فتح کے بعد جب یہ خبر پھیلی کہ اس عظیم جنگ کے فاتح کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا گیا تو لوگوں کے اندر سخت بے چینی پیدا ہوئی اور بعض نے خالدؓ کو ابھارا کہ آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیں آپ کے ساتھ کافی لوگ ہیں مگر خالد نے اس قسم کی ہر بات ماننے سے انکار کر دیا اور برضا و رغبت ابو عبیدہ بن جراح کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہے۔ اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا۔

انالا اقاتل فی سبیل عمر ولکن فی سبیل رب عمر — میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں۔

اوپر کی چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ہماری ملی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے یہ سب کچھ جو آپ نے دیکھا وہ اصول و صداقت کے مقابلہ میں جذبات و خواہشات کی قربانی کا نتیجہ تھا جس کا عہد ہر مسلمان سے لیا جاتا ہے اور جس پر دستخط کی تجدید و یاد دہانی ہر سال آج کی ہماری عید میں ہوتی رہتی ہے۔ قربانی کے وقت چھری جو جانور کی گردن پر چلتی ہے وہ دراصل نفس کی گردن پر چلائی جاتی ہے جس سے جذبات و خواہشات کی قربانی مقصود ہوتی ہے۔ اسی بناء پر قرآن میں ہے۔

کہ اللہ کو نہ اس کا گوشت پہونچتا ہے اور نہ خون پہونچتا ہے بلکہ اس کے پاس دل کی بات پہونچتی ہے۔

نفس کی گردن پر چھری چلانے کے بعد پھر دوست کے کوچہ میں پہونچنے کے لیے زیادہ فاصلہ نہیں طے کرنا پڑتا۔

یک قدم راہ راست و دیگر راہ نیست — یک قدم بر نفس نہ دیگر قدم بر کوئے دوست

علم و فن کی ترقی کے اس دور میں قربانی کی حقیقت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس پر طرح طرح سے اعتراض کرتے ہیں ان کی خدمت میں بس اتنی گذارش ہے ؎

اے کمال سخن کے دیوانو — ماورائے سخن بھی ہے ایک بات

مولانا محمد ارشد اعظمی۔ بنارس

حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری (م [illegible]ھ)

بعض جدید و قدیم مآخذ کی روشنی میں

قدرت الٰہی کا یہ حیرت انگیز نظام ہے کہ ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا سبب ہوتی ہے، اگر ایک جانب کوئی چمن اجڑتا ہے تو دوسری طرف دوسرا گلشن آباد ہوتا ہے، یہی ہوتا آیا ہے اور دنیا نے اس نظام الٰہی کو پہلے بھی دیکھا اور اب بھی دیکھ رہی ہے اور تا قیامت دیکھے گی، چنانچہ اسی قانون خداوندی کے مطابق جب حملۂ تیموری کی فتنہ پردازیوں اور ہلاکت خیزیوں سے مغرب میں "دلی" کی علمی و تمدنی اور معاشرتی و ثقافتی دنیا میں بادِ خزاں کے تند و تیز جھونکے چل رہے تھے تو دوسری جانب دیار پورب کے شہر "جون پور" میں علم و فن تہذیب و تمدن کے چمن زار میں بہار آئی ہوئی تھی، شرقی سلطنت کے تاجدار "شاہ ابراہیم شرقی (م ۸۴۴ھ)" کے حسن انتظام و اہتمام اور علم دوستی و علماء نوازی اس کی فیاضی اور دریا دلی سے "جون پور" اہل فضل و کمال کا مرجع اور مسکن بن گیا تھا۔ وہاں کے قصبات و قریات میں بھی تعلیم و تعلّم کی درسگاہیں قائم ہو چکی تھیں اور رشد و ہدایت کی مسندیں بچھ چکی تھیں، علم و اخلاق کے متوالے اور بادۂ توحید کے مستانے دور دراز مقامات سے کھنچے چلے آ رہے تھے، اور یہ دیار روحانی مرکز ہو گیا تھا، ان آنے والوں میں قافلہ سالار اور عظمت کے مینار ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ (م ۸۴۹ھ) کی ذات والاصفات بھی تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔ "اُن (قاضی صاحب) کے فضل و کمال سے مشرق کی ساری زمین لہلہا اُٹھی، کڑہ سے لیکر غازی پور تک یکساں فیض جاری ہوا، مولانا قطب الدینؒ ابوالغیب بن نور الدینؒ ملا شیخ عبدالملک عادل

فاروقی" شیخ محمد عیسیٰ جون پوریؒ جیسے علماء اُن کے تلامذہ میں تھے"۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے ارشد تلامذہ میں" حضرت شیخ محمد عیسیٰ جون پوریؒ" کی ذات گرامی بڑی عظمت کی حامل ہوئی ہے، یاد الٰہی میں مستغرق، اللہ تعالیٰ کی محبت میں دیوانے، عبادت وریاضت کے متوالے، یقین وتوکل کی دولت سے بہرہ ور غرض جامع کمالات آپ کی ہستی تھی، حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ آپ کا تذکرہ بایں الفاظ شروع فرماتے ہیں کہ:۔

شیخ محمد عیسیٰؒ از کبار مشائخ جون پور است، واز صادقان راہ خدا است صاحب مقامات علیہ واحوال سنیہ وھو ممن یتفق علیٰ ولایتہ وعظمۃ وکرامتہ[1]

شیخ محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ جون پور کے مشائخ کبار اور راہ خدا کے اصحاب صدق وصفا میں سے ہیں، بلند درجات ومقامات اور بہترین حالات کے حامل ہیں، اور وہ اُن حضرات میں سے ہیں جن کی ولایت وعظمت وکرامت پر اتفاق ہے،

ایسی باکمال شخصیت اگر عموماً تاریخی مآخذ آپ کے یک جائی تفصیلی حالات سے خالی ہیں، میں نے کدوکاوش کے بعد بعض قدیم وجدید کتب اور رسائل ومقالات کی روشنی میں کچھ تفصیلات مرتب کی ہیں جو پیش کی جا رہی ہیں،

(۱) ولادت وطفولیت

جب تیموری حملے اور فتنے سے پریشان ہو کر روحانی قافلے شیراز ہند جون پور چلے آرہے تھے تو اُن میں ایک بزرگ صاحب تذکرہ کے والد ماجد حضرت شیخ احمد عیسیٰ دہلوی بھی تھے، اور انہی کے ہمراہ صاحب زادہ محترم صاحب تذکرہ حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاجؒ بھی تشریف لائے، اس وقت آپ کی عمر گرامی ۱۰ سال کی تھی[2]، تاریخ ولادت کی تصریح سے مؤرخین خاموش ہیں، والد محترم حضرت شیخ احمد عیسیٰ دہلویؒ کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ:۔ از اکابر دہلی است[3]" یعنی دہلی کے اکابر اور باعظمت لوگوں میں سے تھے، اس لحاظ سے حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ کی نشوونما اور تربیت بہترین انداز پہ ہوئی ہوگی اور پھر شیراز ہند میں علماء وصلحاء کی

له ٢ه اخبار الاخیار ص ۱۸۰، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵، ٣ه اخبار الاخیار ص ۱۸۰

نیک صحبتیں میسر ہوئیں جس سے علمی استعداد اور باطنی صلاحیت کو ابھرنے اور نکھرنے کے مزید مواقع ملے،

(۲) ارادت و بیعت آپ صغر سنی ہی میں فطری سعادت کی بناء پر حضرت شیخ ملا فتح اللہ اودھی سے بیعت ہو گئے اور آپ کی صحبت و ہم نشینی سے فیضیاب ہونے لگے ملا فتح اللہ اودھیؒ کی نگاہ جوہر شناس نے آپ کی عالی استعداد کو بھانپ لیا اور حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ

(۳) تحصیل علم کو مشورہ دیا کہ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے علم دین حاصل کریں، حضرت شیخؒ نے اس مشورہ پر عمل فرمایا اور ملک العلماء سے علوم شرعیہ کی تحصیل و تکمیل فرمائی۔[۱]

قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ نے اپنے اسی تلمیذ رشید کے لیے "شرح اصول بزدوی" تا بحث امر تالیف فرمائی[۲]۔ قاضی اطہر صاحب مبارکپوری رقمطراز ہیں کہ:۔

آپ (یعنی شیخ محمد عیسیٰ جونپوریؒ) نہایت ذہین و ذکی تھے، اس لیے قاضی صاحبؒ نے بھی اُن کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور اسی شاگرد عزیز کے لیے "اصول بزدوی کی شرح تا بحث امر" تحریر فرمائی، قاضی صاحبؒ اُن سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔[۳]

اس سے استاذ کی شفقت و محبت اور خصوصی عنایت کا پتہ چلتا ہے اور شاگرد کے علمی شوق اور محنت و لگن کا اندازہ ملتا ہے، اور درحقیقت انھیں امور سے تحصیل و تکمیل ہوتی ہے۔

---

[۱] [۲] اخبار الاخیار ص ۱۸۰، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵، [۳] معارف جون ۱۹۷۱ء اعظم گڑھ، اس سلسلہ میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں کہ: فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی حنفیؒ (متوفی ۴۸۲ھ) کی کتاب "الاصول فی الفقہ" اصول فقہ پر نہایت مشہور اور جامع کتاب ہے، مگر الفاظ و عبارات میں اجمال و ابہام کی وجہ سے کافی مشکل ہے، اس لیے بہت سے علماء و فقہاء نے اس کے شروح و حواشی لکھے، آٹھویں صدی میں جو مشکل پسندی کا دور شباب ہے اس کے شروح و حواشی کا زور تھا اور خود "اصول بزدوی" ہندوستان میں بہت رواج پذیر تھی۔ جونپور میں قاضی صاحب کے معاصر مولانا فقیہ جیرتیؒ اس کے رموز و نکات کے خصوصی ماہر اور مشہور مدرس تھے، اور بیسیوں بار اس کا درس دے چکے تھے، اسی بناء پر قاضی صاحبؒ نے اپنے تلمیذ عزیز شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوریؒ کی خاطر اصول بزدوی کی ایک شرح بحث امر تک تحریر فرمائی تھی، معارف جون ۱۹۷۱ء اعظم گڑھ۔

(۴) احسان و تصوف

علوم شرعیہ کی تحصیل کے بعد حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے مگر پھر بعد میں اس کو ترک کر کے اپنے شیخ طریقت اور مرشد ملا فتح اللہ اودھیؒ کی خدمت و صحبت میں رہنے لگے اور علائق دنیا سے علاحدہ ہو کر عبادت و ریاضت کی دنیا آباد کی۔[۷] اقبال احمد صاحب جون پوری لکھتے ہیں کہ:-

> شیخ محمد عیسیٰ بن تاجؒ بعد فراغت علوم ظاہری صفائی باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور ایسی کوشش فرمائی اور اس قدر مراقبہ فرمایا کہ گردن کی ہڈی ٹھڈی اور سینہ سے چپک گئی تھی، اور اس قدر شغل باطن میں مصروف رہے کہ بارہ سال تک آپ نے پیٹھ زمین سے نہیں لگائی، استغراق کے عالم میں بیٹھے رہتے تھے۔ نماز پنجگانہ با جماعت اور نماز جمعہ کی جب آپ کو اطلاع دی جاتی تھی تو آپ حجرہ سے باہر تشریف لاتے تھے، ہمیشہ سر بگریباں رہتے تھے اور بجز اللہ کے اور کچھ نہ جانتے تھے کہ یہ کون ہے؟ اور میں کون ہوں؟ اور کہاں ہوں؟ بجز استغراق سر اونچا نہ فرماتے۔[۸]

اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:-

> حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ پر شغل باطنی اور تصفیۂ قلب کا اس قدر اور اتنا غلبہ تھا کہ آپ کو اپنے ارد گرد کی چیزوں کی بھی خبر نہیں ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز آپ کی بیٹھنے کی جگہ پر درخت کی پتیاں جمع ہو گئیں تو آپ نے خادم سے دریافت فرمایا کہ یہ پتیاں کہاں سے آ گئی ہیں؟ خادم نے عرض کیا کہ حضور! آپ کے قریب ہی میں جو درخت ہے یہ پتیاں اسی کی ہیں، تب اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے قریب کوئی درخت بھی ہے۔[۹]

(۵) رجوع عام

سلوک و احسان کی راہ میں آپ نے جو مجاہدے کیے اور جو غیر معمولی ریاضتیں کیں ان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تصفیہ باطن اور تزکیۂ نفس کی دولت عطا فرما کر جذب و استغراق کی کیفیت عطا فرمائی اور آپ جون پور کے اولیاء کبار میں شمار ہونے لگے، مولوی رحمان علی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

---

[۷] سعادت جون ۱۹۰۱ء [۸] تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۲۰۶، [۹] اخبار الاخیار ص ۱۸۰

تا آنکہ از کبار مشائخ جون پور شہرت پذیرفت [10]

حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاجؒ کی طرف اللہ کی مخلوق کا مرجوعہ بڑھا اور بہت سے لوگ آپ کے جاں نثار و عقیدت مند ہو گئے۔ بہت سے علماء و صلحا نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور اللہ کے بیشمار بندوں نے آپ سے فیض پایا، اور دیار پورب کے باشندوں نے آپ کی ولایت و کرامت عظمت و فضیلت پر اتفاق کر لیا۔ بڑے بڑے عہدے دار منصب دار، جاگیر دار، امراء و وزراء، سب کی جبین عقیدت آپ کے لیے جھک گئی۔ خود سلطنت شرقیہ کے تاجدار، دیار پورب کے والی، ابراہیم شاہ شرقی، محمود شاہ شرقی، حسین شاہ شرقی، تینوں حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ کے بہت ہی زیادہ معتقد تھے [11]

قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں کہ :-

> شیخ محمد بن عیسیٰؒ ابراہیمی دور کے علمائے کبار و مشائخ عظام میں تھے، اُن کے لیے سلطان محمود شاہ نے ان کی خانقاہ کے قریب جامع مسجد (جامع الشرق، بڑی مسجد) تعمیر کی، جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ کے دور میں ہوئی۔ [12]

ایک دن حضرت عیسیٰ تاجؒ اپنے حجرہ کی گِل کاری کر رہے تھے کہ سلطان حسین حاضر خدمت ہوا، شیخؒ نے ہاتھ دھو کر مصافحہ و معانقہ کرنا چاہا مگر سلطان حسین نے اُس حال میں مصافحہ و معانقہ کی خواہش کی آپ نے اُس کی خواہش پوری کر دی، سلطان کے کپڑے میں مٹی لگ گئی، اُس کی یہ عقیدت تھی کہ اُس نے وصیت کی کہ اُس کو اُسی کپڑے کا کفن دیا جائے [13]

(۶) یقین و توکل اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ کو یقین کامل اور اعتماد و توکل اور قناعت پسندی کی دولت سے نوازا تھا، اور ان صفات میں آپ کی ایک خاص امتیازی شان تھی جو اللہ کے خاص بندوں ہی کو ملا کرتی ہے، ایک تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ :-

> حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ چالیس سال گوشہ نشین رہے، اور تمام عمر توکل میں گذار دی [14]

---

[10] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵،
[11] [12] معارف، جنوری ۱۹۹۵ء
[13] معارف جنوری ۱۹۹۵ء
[14] تاریخ جون پور ص ۲۰۶،

اور ایک دوسرے مؤرخ کا بیان ہے کہ :-

دونوں بادشاہوں (ابراہیم شاہ، محمود شاہ) نے بارہا خدمت کرنی چاہی مگر انھوں نے ہمیشہ استغنا اور بے نیازی ظاہر کی، دوسرے حکام کے ہدایا و تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے[۱۵]

چنانچہ ایک روز ابراہیم شاہ شرقی نے کچھ روپے اور چند کپڑے بھیجے آپ نے قبول نہ فرمایا اور جواب میں یہ رباعی ارشاد فرمائی،

من دلق خود با طلس شاہاں نمی دہم | من فقر خود بملک سلیماں نمی دہم
در رنج و فقر در دل گنجے کہ یافتم | ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم[۱۶]

ترجمہ :- میں اپنی گدڑی کو لباس شاہانہ کے بدلے نہیں دے سکتا اور اپنی قناعت پسندانہ و فقیرانہ زندگی کو میں سلطنت سلیمانی کے بدلے بھی نہیں دے سکتا، فقر و مشقت کا جو خزانہ میں نے اپنے دل میں اکٹھا کیا ہے تو میں اس فقر کے غم کو شاہی آرام و راحت سے بھی نہیں بدل سکتا۔

اسی طرح ایک مرتبہ سلطان (حسین) نے اُن کے صاحبزادے شیخ حبیب اللہ سے درخواست کی کہ آپ اپنے والد محترم اور اُن کے متعلقین اور خانقاہ کے واردین و صادرین کے اخراجات کے لیے کچھ جاگیر قبول کرلیں، شیخ محمد عیسیٰؒ نے سنا تو سلطان کی خاطر سے خاموش رہے مگر جب سرکاری کارپرداز غلہ اور خطیر رقم لے کر حاضر خدمت ہوئے تو اُن کے دل میں الجھن پیدا ہوگئی اور فرمایا کہ حبیب اللہ اس غلہ کو کھانے کے بعد خاک کھائے گا۔ کہتے ہیں کہ اُسی سال شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہوا۔[۱۷]

اور قاضی اطہر صاحب مبارکپوری تو حسین شاہ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ :-

سلطان اُن کی بڑی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے[۱۸]

غرضیکہ حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاجؒ علائق دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھے، گوشہ نشینی اور عبادت الٰہی اور یاد خدا میں استغراق ہی آپ کا سب کچھ تھا وہ اسی میں مست و متوالے رہا کرتے تھے اسی وجہ سے آپ کی محویت و فنائیت کا عجیب ہی عالم تھا۔

---

۱۵ معارف جون ۱۹۷۶ء   ۱۶ تاریخ شیراز ہند ص ۲۰۰   ۱۷ ۱۸ معارف جنوری ۱۹۶۵ء

(۷) کرامات اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کے مظاہر ہیں، چنانچہ حضرت شیخ عیسیٰ تاجؒ سے بھی کرامتوں کا ظہور ہوا ہے، اس وقت ہم صرف دو واقعہ پیش کرتے ہیں ایک واقعہ تو شرقی تاجدار سلطان حسین کا ہے اور دوسرا واقعہ علمی تاجدار ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کا ہے، ان دونوں واقعوں سے حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاجؒ کے روحانی کمالات اور کرامات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، مورخین کا بیان ہے کہ:۔

سلطان بہلول لودھی نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد جونپور کی تسخیر کا قصد کیا، سلطان حسین کو معلوم ہوا تو اُس نے شیخ عیسیٰؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو مطلع کیا، آپ نے فرمایا کہ "قاصد محروم و مقہور است" اس کے بعد بہلول لودھی کی جونپور کی طرف پیش قدمی سے پہلے ہی خود سلطان اُس سے جنگ کے لیے نکلا مگر قنوج میں شکست کھا کر جونپور واپس آیا اور شیخ محمد عیسیٰؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر رنج و الم کا اظہار کیا، آپ نے فرمایا بات وہی ہوئی، اگر بہلول جنگ کا ارادہ کرتا تو وہ محروم ہوتا تم نے یہ کام کیا تو وہ بات تم پر پوری ہوئی، آخر میں سلطان حسین لودھیوں کے مقابلہ میں شکست کھا کر بہار میں پناہ گزیں ہوا تو شیخ صدر الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی، انھوں نے جواب دیا کہ "انداختۂ خواجہ محمد عیسیٰ را نمی توانیم برداشت" یعنی شیخ محمد بن عیسیٰؒ کے ٹھکرائے ہوئے کو ہم نہیں اٹھا سکتے۔[۱۹]

اسی طرح دوسرا واقعہ یہ ہے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ کے معاصرین میں مولانا فقیہ حیرتیؒ منقولات و معقولات کے زبردست عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تھا۔ بیسیوں بار "اصول بزدوی" کا درس دے چکے تھے، ایک بار قاضی صاحبؒ اور مولانا فقیہ کے درمیان ایک علمی مسئلہ پر مباحثہ ہوا جس میں قاضی صاحبؒ کو کامیابی ہوئی۔ اس موقع پر بھی قاضی صاحبؒ نے علمی فروتنی اور اپنے تلامذہ کے اعتراف کا مظاہرہ فرمایا۔ "اخبار الاصفیاء" کی روایت کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

ایک مرتبہ سلطان نے طے کیا کہ کل قاضی شہاب الدین اور مولانا فقیہ حیرتیؒ سر دربار مباحثہ

---

[۱۹] معارف جنوری ۱۹۷۵ء بحوالہ تجلی نور ص ۲۳ تا ۲۴ ج ۱

وہ مناظرہ کریں اور اس مناظرہ میں جو عالم غالب ہوگا وہی دربار کا صدر نشین ہوگا اتفاق سے مولانا نقیہ حیرتیؒ کے کئی تلامذہ اس وقت جون پور میں موجود تھے جو ان کو علمی مدد پہنچا سکتے تھے، اور قاضی صاحبؒ علم تازہ اور حوصلہ بلند رکھنے کے باوجود تنہا تھے اس لیے متفکر تھے، خیال آیا کہ اپنے پرانے شاگرد شیخ محمد بن عیسیٰؒ کے پاس چلنا چاہیے، جو علم و روحانیت کے جامع ہیں، اور ترک و تجرید کی زندگی اختیار کر چکے ہیں، چنانچہ اُن کے پاس جاکر فرمایا کہ "ہمارا شاگرد اس وقت کام نہیں آئے گا تو کب آئے گا؟ تم نے تو کتابوں کی دنیا سے کنارہ کشی کر کے کنج تنہائی اختیار کر لیا ہے اس لیے باطنی توجہ سے کام لو۔ "حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ نے عرض کیا حضرت! آپ کا علم خود آپ کی مدد کرے گا۔ آج کی رات کو کتابوں کے صندوق میں ہاتھ ڈالیے جو کتاب پہلے ہاتھ میں آجائے اُس کا مطالعہ کیجیے اس کا دیکھنا کافی ہوگا اور آپ کو کامیابی ہوگی" استاذ نے شاگرد کے کہنے پر عمل کیا تو انھیں کی کتاب "الارشاد" (خود نوشت نحوی رسالہ) ہاتھ میں آئی اس لیے ابتدا میں تامل ہوا مگر پھر شیخ محمد بن عیسیٰؒ کی ہدایت کے مطابق اس کا مطالعہ کیا اتفاق سے ایک مشکل مقام آگیا جو دو گھنٹہ میں حل ہوا پھر "اصول بزدوی" کا مطالعہ کیا، قاضی صاحبؒ کا خیال تھا کہ مولانا حیرتیؒ اس کتاب کو تقریباً بیس بار پڑھا چکے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کا کوئی مسئلہ زیر بحث آجائے، دوران مطالعہ اس میں بھی ایک مشکل مقام آیا جو صبح ہوتے ہوتے حل ہوا۔ دوسرے دن دربار میں علماء و فضلاء جمع ہوئے اور سلطان ابراہیم کے سامنے دونوں میں مناظرہ ہوا جس میں قاضی صاحبؒ منصور و مظفر ہوئے[۳۱] اور کیوں نصرت و ظفر ہمرکاب نہ ہوتی کہ حضرت شیخ محمد عیسیٰؒ کی روحانی توجہ کام کر رہی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "استاذ" اپنے عزیز "شاگرد" کی ولایت اور کرامت کو تسلیم کیے ہوئے تھے۔

اگرچہ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ نے شرف بیعت اور خرقۂ خلافت نیز ملک العلماء کا خطاب خاص، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے حاصل فرمایا[۳۲] مگر اپنے تلمیذ رشید حضرت شیخ محمد بن عیسیٰؒ سے بھی بہت زیادہ فیض پایا، جو خود مستقل ایک دلیل کمال ہے۔

(۸) شجرۂ بیعت

حضرت شیخؒ کا شجرۂ بیعت اس طرح ہے:-

مخدوم محمد عیسیٰ تاج جون پوری من شیخہ شیخ فتح اللہ اودھی

۳۱ے معارف جون ۱۹۷۱ء بحوالہ اخبار الاصفیا ورق ۲۰، ۳۲ے بزم صوفیہ ص ۵۲۶

من شیخہ شیخ صدر الدین طبیب من شیخہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی من شیخہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ اسرارہم الیٰ اخرہم۔[۲۲]

(۹) وصال عرصۂ دراز تک اللہ کی بے شمار مخلوق کو فیضیاب اور روحانیت کا درس دینے کے بعد ۱۴ ربیع الاول ۸۰۶ھ کو یہ درخشاں آفتاب جون پور کی سرزمین میں غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔[۲۳] مزار مبارک شہر جونپور میں ہے[۲۴] نور اللہ مرقدہٗ۔

---

[۲۲] برہان دہلی اگست ۱۹۶۶ء مقالہ "شاہ طیب بنارسیؒ" از محمد ارشد اعظمی۔ [۲۳] معارف جون ۱۹۷۱ء، تاریخ شیراز ہند ص ۲۳

[۲۴] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵

نوٹ:۔ یہاں پر ضمناً ایک بات عرض کردینی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج جون پوریؒ کے والد محترم کا اسم گرامی "احمد عیسیٰ" تھا اور حضرت شیخؒ کا نام نامی "محمد عیسیٰ" تھا مگر تاریخی ماخذ اور تذکروں میں بعض جگہ "محمد بن عیسیٰ" ملتا ہے کہیں پر "عیسیٰ بن تاج" لکھا ہوتا ہے کہیں پر "عیسیٰ تاج" مذکور ہوتا ہے کسی جگہ "شیخ محمد عیسیٰ" عنوان لگا ہوتا ہے تو اس سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کیونکہ اصل اسم شریف تو "محمد عیسیٰ" ہی ہے اور بعض بعض مقامات پر جو "محمد بن عیسیٰ" تحریر ہوتا ہے تو اسی بنا پر کہ والد محترم کا اسم مبارک "عیسیٰ" تھا ہی، اس لیے اُن کی طرف منسوب کردیا، ہاں "تاج" پر غور کرنا ضروری ہے کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں ملتی ہے، مضمون نگار کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ والد گرامیؒ تو ممتاز شخصیت کے مالک تھے ہی اور خود حضرت شیخؒ اپنے دور کے اولیاء کبار اور صوفیائے عظام میں ہونے کی وجہ سے "سرتاج اولیاء" اور حلقۂ صوفیاء کے "تاجور" تھے اس مناسبت سے حضرت شیخؒ "تاج الاولیاء" اور "تاجور" سے عیسیٰ تاجؒ اور عیسیٰ بن تاج معروف ومشہور ہوگئے ہوں، تذکرہ نگار محمد ارشد اعظمی نے اپنے رفیق محترم مولانا نور الحسن صاحب بنارسی کے ہمراہ جنوری ۱۹۷۶ء حضرت شیخؒ کے مزار پُر انوار کی زیارت کی ہے۔

محمد ارشد عفی اللہ عنہ ۱۲/۱۲/۷۶ء

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مکتوبِ لندن

[الفرقان میں اس کا ذکر نہیں آیا کہ عزیزی مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ دینی محنت کے سلسلہ میں گذشتہ سال کے اچھے تجربہ کی بنا پر امسال پھر انگلستان چلے گئے ہیں اور لندن میں مقیم ہیں۔ ان کا یہ تازہ ترین مکتوب انشاء اللہ ناظرین کی دلچسپی اور افادیت کا باعث ہوگا۔ مدیر]

محترمی و معظمی اباجی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ صادر ہوا اور یہ جان کر بڑا اطمینان ہوا کہ ضعف خصوصاً دماغی ضعف کی وہ کیفیت جس کی وجہ سے چند ماہ کے لیے الفرقان کی اشاعت کے التواء کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ الحمد للہ وہ کیفیت اب باقی نہیں رہی اور اس لیے التواءِ اشاعت کا خیال بھی ترک کر دیا گیا — جس اللہ کے کرم سے یہ ضعف اتنی تیزی کے ساتھ قوت میں بدل گیا، ان شاء اللہ ٹانگ کے بارے میں بھی اس کے کرم کی کوئی ایسی ہی صورت نمودار ہوگی۔ اور کسی دن کے خط سے اس طرح کی خوشخبری موجب شکر و مسرت بن کر آئے گی۔

اللہ کی مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے؟ یہاں آنے کے بعد یہ بات طے سی نظر آتی تھی کہ ان شاء اللہ اس دفعہ رابطہ کے سفر کے ساتھ آپ کا یہاں کا بھی سفر ہوگا۔ سرور صاحب وغیرہ لکھتے ہی رہتے تھے، میرے آنے پر ان کے اندر یہ تقاضہ اور بڑھ گیا اور امید یہ تھی کہ آپ کی آمادگی کو بھی میرے یہاں ہونے سے قوت ملے گی۔ مگر اللہ کی مرضی کہ یہ عارضہ پیش آگیا اور رابطہ کا بھی سفر نہ ہو سکا۔

یہاں اب بھرپور سردی شروع ہو چکی ہے۔ ۱۸ر کو موسم کی پہلی برف باری بھی ہو گئی اور اچھی طرح ہوئی۔ میرے لیے یہ عمر کا پہلا مشاہدہ اور تجربہ تھا۔ بہت دلچسپی سے دیکھا اور سمجھا اور واقعی

دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ آسمان سے سفید پھول سے برستے ہوئے۔ میں اس منظر کو کھلی جگہ میں دیکھنے کے لیے پارک تک پہنچ گیا تھا، جو قیام گاہ سے بالکل قریب ہے۔ زمین سے آسمان تک سفید ہی سفید ہی نظر آتی تھی۔ اور کوئی چیز جس پر برف رک سکتی ہو سفید کے سوا کسی رنگ میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہر کار چاہے اس کا رنگ کچھ ہی کیوں نہ ہو اپنی چھت پر برف کی براق تہ لیے گھوم رہی تھی۔ رات میں کسی وقت یہ برف باری شروع ہوئی تھی۔ صبح کو نو دس بجے آ کر رکی یعنی برف کی بارش پانی کی بارش میں تبدیل ہوئی۔ سڑکوں پر تو ٹریفک کی وہ دھوم رہتی ہو کہ برف بیچاری زیادہ دیر نہیں ٹک سکتی تھی لیکن جہاں کسی ایسی پگھلنے والی چیز کا گزر نہیں تھا وہاں دو دن تک برف کی تہ جمی رہی سورج اس دن سے آج تک نہیں نکلا ہے۔ یعنی پانچ دن پورے ہو رہے ہیں۔ مجھے ابھی تک یہاں سردی سے پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس برف باری کے اگلے دو دن یعنی ۱۸ اور ۱۹ کی سردی ایک حد تک پریشان کن بنی۔ کل سے الحمد للہ وہ بات بالکل ختم ہو گئی معتدل سردی ہے۔

گزشتہ سال یہاں کے اصل باشندوں کو گرمی سے جس قدر بدحال دیکھا تھا اس کی وجہ سے یہ خیال تھا کہ ان لوگوں کو سردی زیادہ نہیں لگتی ہو گی مگر اب کی بار سردی میں دیکھنے کا موقع ملا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ اتنا ہی پہننا اوڑھنا یہ لوگ کرتے ہیں جتنا ہم کرتے ہیں اور چہرے اور چال سے سردی ماننے کی جو علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ ان میں بھی خوب دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر یہ سردی یہاں کی زندگی کی سرگرمی کو ذرا بھی سرد نہیں کرتی۔ کوئی فرق ابھی تک کسی بات میں محسوس نہیں ہوا۔ سوائے رات کے درمیانی ۸۔ ۹ گھنٹوں کے (کہ رات اس وقت سولہ گھنٹے کی ہو رہی ہے) ہر وقت ایک دوڑتی بھاگتی زندگی ہے۔ اتوار کے دن جا کے اسے سکون میسر آتا ہے اور ایک سناٹے کی سی کیفیت بھی دیکھنے میں مل جاتی ہے۔ اب دو تین دن بعد (۲۵ دسمبر کو) کرسمس ہے۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا تہوار، اس کو منانے کا انداز بھی دیکھنے کو ملے گا۔ کم سے کم ایک ہفتے کی چھٹی اکثر لوگوں کو ملتی ہے، دوکانیں تک تین چار دن بند رہیں گی۔ جیسے ہمارے یہاں عیدیں ہوا کرتی ہیں زور شور سے خریداریاں ہو رہی ہیں، رہی اپنی عید بقر عید تو اس کا یہاں سوائے ان مقامات کے پتہ بھی نہیں چلتا، جہاں نماز پڑھنے والے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ بہت سے نہیں بھی پڑھتے۔ ایک تعداد تو ایسی ہے جسے کچھ خبر ہی نہیں باقی بہت سے

اس لیے نہیں پڑھتے کہ کام سے چھٹی نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ شاید مسلمانوں کی لامرکزیت کا ہے کہ وہ ایک مدت سے یہاں لاکھوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود عید بقرعید میں بھی کسی نوعیت کی اجتماعی چھٹی کا حق نہ پا سکے —— اوپر مثال کے طور سے عید کی خریداری کا ذکر آجانے سے بات دوسری طرف کو نکل گئی ورنہ میں کرسمس کے ذیل میں یہ تذکرہ کرنا چاہتا تھا کہ چھٹی کے اس عمومی موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے یہاں کے اہل تبلیغ نے ایک بڑا اجتماع گلاسگو میں طے کر رکھا ہے۔ چھٹی کے پہلے تین دن ۲۴، ۲۵، ۲۶ رمیں یہ اجتماع ہوگا۔ اور اُس کے بعد حسب دستور دور اور قریب کی جماعتوں کی روانگی۔ گلاسگو لندن سے کوئی چار سو میل کے قریب ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے علاقے کا اہم مقام ہے۔ سردی کچھ زیادہ ہوتی ہے مگر سنا ہے کہ آب و ہوا بہت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ ہوسکتا ہے میرا بھی جانا ہو جائے۔ اگر ہوا تو وہاں کا کچھ حال لکھ سکوں گا۔

اس اجتماع کی "محنت" کے سلسلے میں کل شام سے ایک جماعت ہماری مسجد میں آئی ہوئی ہے۔ سب طلبا ہیں زیادہ تر نوعمر، پانچ ملیشیا کے، ایک لیبیا کا اور ایک سب سے نوعمر ہم لوگوں میں کا۔ آخر والے کو چھوڑ کر سب سائنس یا طب کے طالب علم ہیں۔ لیبیائی طالب علم کو ابھی دو یا تین ماہ قبل میں نے پہلی بار یہاں کے مرکز میں دیکھا تھا۔ کسی جماعت کے لیے وہ اپنا نام لکھانے کو کھڑا ہوا تھا۔ یہاں کے ایک طالب علم کو کم سے کم جس شکل و صورت میں ہونا چاہیے تھا اُس میں وہ بہرحال تھا۔ ویسے چہرے پر نیک طبعی کے آثار تھے۔ اُس دن کے بعد سے شاید پرسوں ہی میں نے اُسے اس جماعت میں دیکھا ہے۔ چہرہ پر نہایت خوبصورت سبزۂ آغاز والی ڈاڑھی ہے۔ اور نیک طبعی کا وہ نور جو پہلے دن محسوس ہوا تھا اب بہت ہی ظاہر و باہر اور جاذب ہے۔ یہی حال ملیشیائی طلبا کا ہے۔ لگتا ہے جیسے خدا نے سیدھے آسمان سے فرشتے اتارے ہوں۔ دین اور دینیات کے سلسلے میں انھیں جو کچھ بتایا گیا ہے اُس کا بیان ایسے یقین اور ذوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی ایمانی سادگی اور پختگی پر رشک آتا ہے۔ اس زمانے میں اور وہ بھی انگلستان کے کالجوں میں، اس نوعیت کا ایمان پیدا کر دینا ایک معجزے سے کم نہیں معلوم ہوتا۔

انہی تبلیغی برکات میں سے یہاں کا ایک نومسلم یونانی نوجوان ہے، جسے میں یہاں آکر پہلے دن سے دیکھ رہا ہوں۔ عمر بیس سال سے زیادہ ہرگز نہ ہوگی، ابھی سبزہ آغاز ہوا ہے صحت، صورت اور مردانہ

حسن و جمال کے اعتبار سے ہزاروں میں ایک اللہ نے جس طرح ظاہر سے نوازا تھا سال ڈیڑھ سال پہلے نور باطن سے بھی ایسے ہی بھرپور طریقے پر نواز دیا۔ جس جوش کے ساتھ اس کی رگوں میں بھرا ہوا خون دوڑتا ہوگا اُسی طرح کا جوش اُس کے جذبۂ عبدیت اور جذبۂ دعوت پر طاری رہتا ہے۔ اُسے بس دو ہی فکروں میں کوشاں اور غلطاں و پیچاں دیکھا۔ ایک یہ کہ وہ خدا کو اسی دنیا میں پالے اور دوسرے یہ کہ کس طرح ایمان اور جنت و دوزخ کا یقین اپنی دسترس کے سارے انسانوں کے دلوں میں اُتار دے۔ خاص کر سب سے پہلے اپنے ماں باپ کے۔ میں جب سے آیا ہوں اُسے ابتلاء میں دیکھ رہا ہوں۔ ایک طرف تبدیلی مذہب پر ماں باپ کی ناراضگی، دوسرے معاش کی تنگی جو ایک لمبے تبلیغی سفر کی بدولت کام چھوٹ جانے پر ہوئی۔ مگر اس کے ایمان میں ذرہ برابر کمزوری کسی وقت نہیں دیکھی۔ بس اللہ کی دین ہے کہ ایک یونانی عیسائی کی اولاد کو ایمان کی یہ دولت نصیب ہوئی ہے۔ آپ کا تشریف لانا نہیں ہو سکا ورنہ میں سوچتا تھا کہ اس نوجوان سے مل کر آپ کا جی بہت خوش ہوگا۔ خدا کرے صحت کامل طور پر بحال ہو جائے اور آپ جلد یہاں کا سفر فرما سکیں۔ والسلام

فضائل نکاح

از مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی — اس کتاب میں اسلام میں شادی کی حقیقت اور اس کے فضائل، شادی و بیاہ سے متعلق اسلامی نظریے کی وضاحت اور اس موقع پر ہونے والی غلط رسوم کا رد کیا گیا ہے۔ قیمت ۱/۵۰

فضائل روزہ

اس کتابچہ میں روزہ کی فضیلت اور اس کے فضائل قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت آسان زبان میں اختصار کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت ۴۰ پیسے

فضائل اخلاق و اخلاص

اشاعت اسلام میں عبادات اربعہ کے مظاہروں سے زیادہ اخلاق کی پاکیزگی معاشرت و سادگی اور معاملات میں راستی کو دخل رہا ہے — جناب ابن غوری صاحب نے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مدظلہ کی کتب سے اس مواد کو حاصل کر کے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ قیمت ۱/۷۵

مسائل سجدہ سہو

یوں تو فقہ و مسئلہ مسائل کی تمام کتب میں مل جاتے ہیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جس میں صرف سجدہ سہو کے مسائل بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت -/۲

رکعات تراویح

مؤلفہ: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی — پر زور دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تمام عالم اسلام میں فاروق اعظم کے زمانہ سے برابر بیس یا بیس سے زائد رکعتوں پر عمل درآمد رہا ہے۔ قیمت -/۲

فریب تمدن

جس میں مغربی تمدن کے اخلاقی و معاشرتی پہلوؤں کا مفصل جائزہ مستند اعداد و اسناد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

قیمت -/۱۲

تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ رح

حضرت سید احمد شہید رح کے جد اعلیٰ اور عہد عالمگیری کے ممتاز شیخ اور عارف باللہ حضرت سید شاہ علم اللہ کا تذکرہ اور ان کے ممتاز خلفاء اور نامور فرزندوں کے حالات زندگی۔ قیمت -/۵

تذکرہ مولوی محمد ہارون کاندھلوی رح

مرتبہ مولانا محمد ثانی حسنی — حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رح کے جواں مرگ صاحبزادے مولوی محمد ہارون کاندھلوی رح کے حالات و واقعات، صفات و کمالات۔ قیمت -/۳

مکاتیب گیلانی

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح اپنے زمانے کی چیدہ شخصیتوں میں ہیں جو تبحر علمی، وسعت مطالعہ، غیر معمولی ذکاوت، مثالی حافظہ، اخذ نتائج اور طرز نگارش میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے علم کا ایک بڑا حصہ آپ کے مکتوبات میں موجود ہے۔ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے ان مکتوبات کو اس کتاب میں جمع کیا ہے۔ قیمت -/۸

دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے سفر مغرب اقصیٰ (مراکش) کے تجربات، تاثرات، مشاہدات اور جذبات اور کیفیات کا دل آویز مرقع۔ قیمت -/۶

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

جس میں برزخ اہل قبر، دوزخ اہل دوزخ، قیامت، حشر و نشر، حساب و کتاب، شفاعت اور اعراف والوں کے مفصل حالات قرآن و حدیث کی روشنی میں درج کیے گئے ہیں۔ قیمت -/۶

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ

Regd. No. L.LW/NP-62

Monthly AL FURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 45 NO. 1 JANUARY 1977 Phone : 25547

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

اور

مسئلہ نزولِ مسیح و حیاتِ مسیح

از

مولانا محمد منظور نعمانی

قیمت 3/-

کتب خانہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ

سید جلال الدین عمری

ذرائعِ دولت

اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نے انسان کو معاشی جد و جہد کی آزادی ہی نہیں بلکہ ترغیب بھی دی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ من مانے طریقے سے مال جمع کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اس کو تمام غلط اور ناجائز طریقے چھوڑنے پڑیں گے اور صحیح اور جائز ذرائع پر قناعت کرنی ہوگی۔ اسلام نے جن ذرائع آمدنی کو مباح قرار دیا ہے ان میں تجارت بھی ہے۔ اس نے تجارت کو پسند کیا اور مختلف طریقوں سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جو تاجر اپنی تجارت میں دیانت و امانت سے کام لے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء[1]	سچا اور امانت دار تاجر (قیامت کے دن) نبیوں صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

صنعت و حرفت بھی اکتساب مال کا ایک جائز ذریعہ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں اس ذریعے کو پسندیدہ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اسے اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن مجید نے لوہے کی اہمیت اور نوعِ انسانی کے لیے اس کی افادیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید آیۃ ۲۵)	ہم نے لوہا اتارا اس سے جنگ کا سامان بھی تیار ہوتا ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فائدے بھی ہیں۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال بحوالہ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ دارمی۔ دارقطنی

Regd. No. L.LW/NP-62

Monthly **AL FURQAN** 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 45 NO. 1 JANUARY 1977 Phone : 25547

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

اور

مسئلہ نزولِ مسیح و حیاتِ مسیح

از

مولانا محمد منظور نعمانی

قیمت -/3

کتب خانہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	۱۵/-
پاکستان سے	۲۵/-
بنگلادیش سے	۱۶/-
فی شمارہ	۳/-

الفرقان لکھنؤ
ماہنامہ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح اس طرح ہوگی

بحری ڈاک سے	۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے	۴ پونڈ

جلد (۴۵) | بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۷۷ء مطابق صفر و ربیع الاول ۱۳۹۷ھ | شمارہ (۲، ۳)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانا چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

ضروری اطلاع

آئندہ شمارہ ـــــ چوتھا انتخاب نمبر ـــــ وفیات نمبر

گذشتہ تین سالوں ۷۴ء-۷۵ء-۷۶ء میں الفرقان کا انتخاب نمبر شائع ہوتا رہا ہے ان تین نمبروں میں الفرقان کے آغاز (۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء) سے لیکر ۱۳۸۰ھ (قریباً ۱۹۶۰ء) تک کے وہ مضامین شائع ہو چکے ہیں جن کا اس انتخابی سلسلہ میں شائع کرنا مفید سمجھا گیا ـــــ چونکہ یہ اندازہ تھا اور ہے کہ الفرقان کے موجودہ ناظرین میں خاصی بڑی تعداد ایسے حضرات کی ہے جو پندرہ سولہ سال سے برابر اس کا مطالعہ کر رہے ہیں اس لیے انتخاب نمبروں کا سلسلہ تیسرے انتخاب نمبر پر ختم کر دیا گیا تھا اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان تینوں نمبروں میں الفرقان کے ان تعزیتی مضامین میں سے کوئی بھی نہیں لیا گیا جو دین و ملت کے اکابر و مشاہیر یا بعض اقارب اور اعزہ کی وفات پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے ـــــ ناظرین کرام میں سے بعض مخلصین نے گذشتہ سال ہی مشورہ دیا تھا کہ اسی طرح ایک انتخاب نمبر وفیات کے سلسلہ کے مضامین کا بھی شائع کیا جائے اُس وقت اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا تھا بعد میں غور و فکر کے بعد یہی طے کیا گیا کہ چوتھا انتخاب نمبر وفیات کے سلسلہ کے مضامین کا شائع کیا جائے۔

گذشتہ تینوں انتخاب نمبر سال کی دوسری سہ ماہی (اپریل، مئی، جون) کے مشترک شمارے کی صورت میں شائع ہوئے تھے "وفیات نمبر" کے لیے بھی یہی طے کیا گیا ہے۔

یہ شمارہ جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے فروری اور مارچ کا مشترک شمارہ ہے۔ اب اس کے بعد انشاء اللہ "وفیات نمبر" ہی آپ کو ملے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ وہ جون کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے لیکن اگر کتابت و طباعت کے مراحل طے ہونے میں تاخیر ہوئی تو ممکن ہے کہ جون کے وسط یا آخر میں آپ تک پہونچ سکے ـــــ لہذا

ناظرین کرام اب جون سے پہلے کسی شمارہ کا انتظار نہ فرمائیں۔

اندازہ یہ ہے کہ وفیات نمبر کے صفحات کم از کم ۲۰۰ ہوں گے۔ یہ بھی حسب سابق الفرقان کے خریداروں کو ان کی خریداری کے حساب میں جائے گا۔ دوسرے حضرات کے لیے اس کی قیمت پانچ روپے ہوگی ——

نوٹ:- جو حضرات حفاظت کے خیال سے یہ ضخیم نمبر رجسٹری سے منگانا چاہیں وہ اپنے خریداری نمبر کے حوالہ کے ساتھ دو روپے رجسٹری فیس دفتر کو ارسال فرمادیں —— سادہ ڈاک سے روانہ کیا ہوا شمارہ ڈاک سے ضائع ہو جانے کی صورت میں دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

ناظم —— دفتر الفرقان لکھنؤ

وفیات نمبر کی ایک جھلک

الفرقان کے چوتھے انتخاب نمبر میں ملک و ملت کی جن عظیم، جلیل القدر اور زیادہ گار شخصیتوں کے حادثۂ وفات پر لکھے جانے والے مضامین شامل کیے جا رہے ہیں ان میں سے چند سند رجہ ذیل ہیں:-

۱- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح
۲- داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس رح
۳- شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح
۴- عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رح
۵- حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رح
۶- علامہ سید سلیمان ندوی رح
۷- سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح
۸- حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری رح
۹- حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری رح
۱۰- حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رح
۱۱- مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رح
۱۲- سلطان عبدالعزیز ابن سعود
۱۳- شاہ فیصل بن عبدالعزیز رح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

اس عاجز نے اب سے چار پانچ سال پہلے جنوبی افریقہ کے بعض مخلصین کی دعوت پر وہاں کا سفر کیا تھا اور ایک مہینہ سے زیادہ قیام رہا تھا ـــــ اس سفر اور اس کے مشاہدات و تاثرات کا تذکرہ الفرقان میں بھی کیا گیا تھا ـــــ وہاں مسلمانوں میں اک بڑی تعداد ہندوستانی گجراتی نسل کے مسلمانوں کی ہے اور یہی وہاں کے مسلمانوں میں مختلف حیثیتوں سے اہم اور ممتاز عنصر ہے۔ ان میں اچھی خاصی تعداد میں ایسے افراد اور خاندان بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی خوشحالی اور مالی ثروت کے ساتھ دین کی دولت سے بھی بھرپور نوازا ہے۔ ان میں ڈربن کا ایک خاندان ہے جس کے ہر فرد کے نام کے ساتھ آخر میں "صالح جی" ہوتا ہے۔ مثلاً احمد صالح جی، محمد صالح جی اور عبدالرزاق صالح جی وغیرہ (اپنے بندوں کے باطن کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن اس عاجز نے اس خاندان کے جتنے چھوٹے بڑوں کو دیکھا ان کے بارے میں دل نے یقین کیا کہ یہ سب "عباد اللہ الصالحین" میں سے ہیں ـــــ یہ پورا خاندان "تبلیغی کام" سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔

آخر دسمبر ۶۹ء میں ڈربن سے اس خاندان کے ایک بھائی کا تار ملا کہ

"عبدالقادر صالح جی اور اسمٰعیل صالح جی ڈاکوؤں کی گولی سے سخت زخمی ہو گئے ہیں ان کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کیجیے۔"

میں نے تار سے جواب دیا اور زخمی بھائیوں کا حال دریافت کیا ـــــ گذشتہ مہینہ جنوری کے دوسرے ہفتہ میں بھائی عبدالرزاق صالح جی اور ایک دوسرے محترم دوست مولانا عبدالحق عمر جی کے خطوط ملے جن میں حادثہ کی بڑی ہی دردناک تفصیل تھی ـــــ لکھا تھا کہ صالح جی خاندان کی ایک

دوکان ایک دیہی علاقہ میں تھی (یہاں دیہی علاقوں میں اس طرح کی دوکانوں کا عام رواج ہے) اور یہاں ۲۴ر دسمبر کو کرسمس کی وجہ سے جو یہاں کا سب سے بڑا تیوہار ہے سال کے سب دنوں سے زیادہ خرید و فروخت ہوتی ہے، چنانچہ اس دن، دن بھر خرید و فروخت کا سلسلہ چلتا رہا رات کو عشار کی نماز کا وقت آجانے پر ان لوگوں نے دوکان بند کی اور سب عشار کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، جماعت سے نماز شروع ہو گئی۔ یہ لوگ سجدے میں تھے کہ دو چار ڈاکو جو ریوالور وغیرہ سے مسلح تھے آ گئے اور انھوں نے سجدہ ہی کی حالت میں اللہ کے ان بندوں پر گولیاں چلا دیں۔ ان میں سے ایک احمد یوسف صالح جی وہیں شہید ہو گئے۔ دوسرے عبدالقادر صالح جی اور تیسرے نوجوان اسمٰعیل صالح جی سخت زخمی ہوئے ۔۔۔۔۔ ان خطوط میں یہ بھی تھا کہ اسمٰعیل صالح جی اور عبدالقادر صالح جی علاج کے لیے اسپتال پہونچا دیے گئے۔

بعد میں شروع فروری میں ملنے والے اس گھرانے کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ عبدالقادر صالح جی ۳۰ دن ہسپتال میں موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہ کر اور یہ پوری مدت بے ہوشی میں گذار کے اپنے بیٹے مرحوم احمد یوسف صالح جی سے جا ملے (اللہ تعالیٰ ان دونوں شہیدوں کو اپنی خاص رحمت سے نوازے)۔ تیسرے زخمی اسمٰعیل صالح جی علاج کے بعد اللہ تعالیٰ کے کرم سے صحت یاب ہو گئے اور الحمد للہ زندہ و سلامت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں الحمد للہ یہ یقین نصیب ہے کہ اس عالم کا پورا انتظام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور یہاں جو کچھ ہوتا اُس کے علم میں اور اس کی نگاہ کے سامنے بلکہ اُسی کے حکم سے ہوتا ہے اور وہ "حکیم" ہے۔ اس کا کوئی حکم اور کوئی فعل اور فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا ۔۔۔۔ اسی ایمان و یقین کی بنا پر دماغ سوچنے لگا کہ اس دردناک سانحہ میں (جو یقیناً اللہ کی مشیت اور اس کے حکم سے ظہور پذیر ہوا) کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

۔۔۔۔ اللہ کے بندے نماز کا وقت آجانے پر اپنا کاروبار بند کر کے اللہ ہی کے حکم کی تعمیل میں جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور ٹھیک اُس وقت جب وہ سجدہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں زمین پر پیشانی رکھے "سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان ربی الاعلیٰ" عرض کر رہے تھے (جو کسی بندہ

کا بہتر سے بہتر حال ہو سکتا ہے) ٹھیک اسی حالت میں اُن پر گولیاں چلیں۔ ان میں سے ایک تڑپ تڑپ کر اسی وقت وہیں جاں بحق ہو گئے اور دوسرے نے تیئیس دن بے ہوشی اور بظاہر شدید کرب و اذیت کی حالت میں گذار کر جان جان آفریں کے سپرد کی ——— تو ذہن شدید تاثر کے ساتھ سوچنے لگا کہ ایسے دردناک سانحہ کی کیا حکمت ہو سکتی ہے، اور ایسے واقعات کی کیا توجیہ خاص کر ایسے مظلوم شہیدوں کے متعلقین کے لیے باعث تسکین ہو سکتی ہے؟

قرآن و حدیث ہی کی روشنی میں دل میں آیا کہ نبوت و صدیقیت کے بعد بندوں کے لیے شہادت سب سے بلند مقام و مرتبہ ہے۔ اس کی بلندی کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس تمنا کا اظہار فرماتے تھے کہ میں راہِ خدا میں شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندگی ملے اور پھر شہید کیا جاؤں، اور پھر زندگی عطا ہو اور پھر شہید کیا جاؤں۔ (لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلَ، ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلَ) اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شہید ہونے والے بندے اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات اور نوازشات کو دیکھ کر جو شہادت کے صلہ میں ان کو عطا ہوں گی اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ پروردگار ہمیں پھر دنیا میں بھیج دے تاکہ وہاں پھر شہید ہو کر آئیں ——— بہرحال "شہادت" بلند ترین مرتبہ اور مقام ہے مگر دنیا کے خاص انقلابات اور حالات کی وجہ سے بدر و اُحد جیسے شہادت فی سبیل اللہ کے میدان اور معرکے مدتوں سے بند ہیں لیکن شہادت فی سبیل اللہ کی اس قسم اور صورت کے امکانات قرن اول کی طرح آج بھی ہیں بلکہ کبھی کبھی واقعات کی شکل میں ظاہر بھی ہوتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعا اور تمنا کے نتیجہ میں اُن کو نصیب فرمائی۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں واقعہ روایت کیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دعا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ	اے اللہ! مجھے شہادت فی سبیل اللہ نصیب فرما
وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِکَ	اور میری موت تیرے رسول پاک کے شہر مدینہ منورہ میں ہو

آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا تو عرض کیا "ابا جان یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ راہ خدا میں شہید ہوں اور آپ کی وفات مدینہ میں ہو؟"[1]

[1] اُن کا خیال تھا کہ شہادت تو صرف جنگ کے میدانوں میں ملتی ہے، اور اب مدینہ بلکہ سارا عرب "دارالاسلام" بن چکا اس لیے یہاں اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں سے جنگ کا امکان ہی نہیں رہا اس لیے انھوں نے مدینہ میں شہادت کو بعید از امکان و قیاس سمجھا۔

آپ نے فرمایا: "اللہ اگر چاہے گا تو ایسا ہی ہوگا" —— اللہ تعالیٰ نے حضرت فاروق اعظمؓ کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ آپ مسجد نبوی میں نماز پڑھا رہے تھے ایسی حالت میں ایک بدبخت (ابو لؤلؤ) مجوسی نے آپ پر زہر میں بجھائے ہوئے خنجر سے وار کیا اسی کے نتیجے میں چوتھے دن آپ واصل بحق ہو گئے —— اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی "شہادت فی سبیل اللہ" کی ایک صورت ہے۔ اسی طرح سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی جنگ کے میدان میں نہیں مدینہ منورہ میں اپنے مکان ہی پر قرآن مجید کی تلاوت فرماتے ہوئے شہید کیے گئے، علیٰ ہٰذا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے شہید کیے گئے۔ اور بلاشبہ ان اکابر کی شہادت کا درجہ ہزاروں اُن شہیدوں سے بڑا ہے جو جنگ کے میدانوں میں شہید ہوئے —— اور جیسا کہ عرض کیا گیا اِس شہادت کا دروازہ قرن اوّل کی طرح آج بھی کھلا ہوا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو شہادت کا بلند مرتبہ نصیب فرمانا چاہتا ہے تو اس طرح کے واقعات ظہور میں آتے ہیں اور کسی بدبخت درندہ صفت انسان کو اس کا ظاہری وسیلہ بنا دیا جاتا ہے۔

یہ بات دل میں آنے کے بعد الحمد للہ اطمینان نصیب ہو گیا کہ جس سانحہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ بظاہر وہ بڑا دردناک سانحہ ہے اور اُس پر متعلقین کا رنج و غم انسانی فطرت کا تقاضہ اور برحق ہے بلکہ باعث اجر بھی ہے، لیکن جن پر یہ سانحہ گذر گیا اللہ تعالیٰ کے کرم سے پوری امید ہے کہ ان کے حق میں یہ اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص عنایت ہے، اُن کو تو وہاں پہونچ کر تمنا ہوگی کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں اور پھر اسی طرح سجدہ کی حالت میں ہم پر گولیاں چلیں اور تڑپ تڑپ کر دوبارہ شہید ہوں۔ اور انشاء اللہ آخرت میں پہونچ کر ہم بھی اُن کا یہ حال اور مقام دیکھ لیں گے اور ہمارے دلوں میں حسرت پیدا ہوگی کہ کاش! ہم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے نوازا ہوتا۔

بہ چونکہ اس طرح کے ظالمانہ اور دردناک واقعات مختلف شکلوں میں جگہ جگہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اس لیے اس سانحہ پر اللہ تعالیٰ نے جو دل میں ڈالا ناظرین "الفرقان" کے لیے قلم بند کرا دیا گیا۔ دعا ہے کہ ایسے سانحات سے متاثر ہونے والے بندوں کے لیے یہ سطریں تسکین و تسلی کا وسیلہ بنیں۔

اپنا حال

الحمد للہ اب اس لائق ہو گیا ہوں کہ قاعدہ کے مطابق بیٹھ کر رکوع سجدے کے ساتھ نماز ادا کر لیتا ہوں ابتداءً اس میں بہت مشقت ہوتی تھی، اب بفضلہ تعالیٰ وہ بات بھی نہیں ہے — چھڑی کے سہارے کچھ تکلیف اور تکلف کے ساتھ چار پانچ سو قدم اب چل بھی لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس میں برابر ترقی ہو رہی ہے — یہاں کے تبلیغی مرکز والی مسجد میں ہفتہ وار درس قرآن کا جو سلسلہ جاری تھا (جو کبھی کبھی الفرقان میں بھی شائع کیا جاتا تھا) اس بیماری کی وجہ سے شروع رمضان مبارک سے وہ بند ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اب اپنے کو اس لائق محسوس کر رہا ہوں کہ وہ پھر جاری ہو جائے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ عنقریب ہی درس کا سلسلہ فی الحال اپنے مکان ہی پر جاری کیا جا سکے گا۔

بلڈ یوریا یا بخار وغیرہ کا الحمد للہ اب کوئی اثر باقی نہیں ہے۔ جسم میں کمزوری کی جگہ قوت و توانائی آرہی ہے — البتہ ایک نئی بات یہ پیدا ہو گئی ہے کہ بلڈ پریشر کبھی کبھی بڑھ جاتا ہے۔ جس کو ڈاکٹر بہت اہمیت دیتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے اس کی وجہ سے میں خود کوئی خاص اذیت یا کمزوری محسوس نہیں کرتا تاہم علاج جاری ہے۔

افسوس ہے کہ اس شمارہ کے لیے بھی میں خود کچھ نہیں لکھ سکا۔ نگاہ اولیں کے صفحات میں جو کچھ آپ پڑھیں گے وہ بھی املاء کے طور پر لکھا یا ہے لیکن امید ہے کہ انشاء اللہ اس شمارہ کے بعد حسب سابق خود بھی لکھ سکوں گا۔ ناظرین کرام دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ صحت تامہ اور عافیت دائمہ نصیب فرمائے اور باقی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گذارنے کی توفیق دے۔

از سلسلہ خواجہ نصرت اللہ ملکاپوری

"صراط مستقیم" کی تشریح و تعیین

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تفسیر کا ایک اقتباس

[گزشتہ سے پیوستہ شمارہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حادثۂ وفات پر جو تعزیتی نوٹ لکھا گیا تھا اس میں حضرت ممدوح کی تفسیر "معارف القرآن" کا بھی ذکر کیا گیا تھا، اسی تفسیر کا ایک اقتباس جو مختصر ہونے کے ساتھ نہایت نافع سمجھا گیا۔ ذیل میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں۔]

اھدنا الصراط المستقیم ایک جامع اور اہم دعا ہے جو انسان کو سکھائی گئی ہے۔ انسان کا کوئی فرد اس سے بے نیاز نہیں۔ دین اور دنیا دونوں میں صراط مستقیم کے بغیر فلاح اور کامیابی نہیں، دنیا کی الجھنوں میں بھی صراط مستقیم کی دعا نسخۂ اکسیر ہے مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ "بتلا دیجیے ہم کو راستہ سیدھا"

سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہو اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو، افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور تفریط کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں صراط مستقیم کا پتہ دیا گیا ہے جس کی دعا اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے صراط الذین انعمت علیھم "یعنی راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا" اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کی تفصیل ایک دوسری آیت

میں اس طرح آتی ہے الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین یعنی وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، مقبولان بارگاہِ الٰہی کے یہ چار درجات ہیں۔ جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی امت میں سب سے زیادہ رتبے کے ہوتے ہیں جن میں کمالاتِ باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں ان کو اولیا کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنھوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دے دی، اور صلحا وہ ہیں جو شریعت کے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دیندار کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریقے سے صراط مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراط مستقیم ہے، اس کے بعد آخری آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے ارشاد ہے

غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ۔ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستے سے گم ہو گئے، مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں احکام الٰہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفریط) کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا کہ دنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاء علیہم السلام کی توہین کرتے تھے اور ضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دین کے معاملہ میں غلط راستے پر پڑ گئے اور دین کے مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہو گئے، جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے کہ انھیں خدا بنا لیا ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاء کی بات نہ مانیں انھیں قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں۔ اور دوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنا لیں۔

آیت کا حاصل یہ مطلب ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اغراض نفسانی کے تابع اور بدعمل اور دین میں تفریط کرنے والوں کا ہے۔ اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گمراہ اور دین میں

غلو (افراط) کرنے والوں کا ہے بلکہ ان کے درمیان کا سیدھا راستہ چاہتے ہیں، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط اور جو شہوات اور اغراض نفسانی کے اتباع سے نیز شبہات اور عقائد فاسدہ سے پاک ہے۔

صراط مستقیم کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں کے مجموعہ سے ملتا ہے

یہاں ایک بات قابل غور ہے اور اس میں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے وہ یہ کہ صراط مستقیم کی تعیین کے لیے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ صراط الرسول یا صراط القرآن فرما دیا جاتا جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیونکہ پورا قرآن درحقیقت صراط مستقیم کی تشریح ہے اور پوری تعلیمات رسول اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر صورت میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراط مستقیم کے تعیین کے لیے اللہ تعالیٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراط مستقیم کو اس طرح متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو، قرآن کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ محض کتاب انسانی تربیت کے لیے کافی نہیں؛ اور نہ یہ فرمایا کہ رسول کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقا اس دنیا میں دائمی نہیں، اور آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لیے صراط مستقیم جن لوگوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے ان میں نبیین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیے گئے، جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین،

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتہ دیا، کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی امتوں کی طرح میری امت بھی سہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہو گی، تو صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ وہ کون سی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا ہے اس میں بھی کچھ رجال اللہ ہی کا پتہ دیا گیا ہے، فرمایا

"ما انا علیہ واصحابی" یعنی حق پر وہ جماعت ہو گی جو میرے اور میرے صحابہ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہو سکتی، بلکہ رجال ماہرین کی صحبت اور اُن سے سیکھ کر حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت انسان

کا معلم اور مربی انسان ہی ہو سکتا ہے محض کتاب معلم یا مربی نہیں ہو سکتی، بقول اکبر مرحوم ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی، آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے، نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینیری کی کتابوں کے محض مطالعہ سے کوئی انجینیر بنتا ہے، اسی طرح قرآن و حدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لیے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے۔ قرآن و حدیث کے معاملہ میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمہ یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں، یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے، اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسول کو معلم بنا کر بھیجنا اور صراط مستقیم کو متعین کرنے کے لیے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لیے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلقہ احکام موجود ہیں۔ دوسرے رجال اللہ، یعنی اللہ والے، ان سے استفادہ کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصول پر رجال اللہ کو پرکھا جائے جو اس معیار پر نہ اتریں ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے۔ جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہو جائیں تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا بڑا سبب

یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لے لیا، رجال اللہ سے قطع نظر کر لی، ان کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیار حق سمجھ لیا اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کر لی اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

(ماخوذ معارف القرآن جلد اول صفحہ ۹۱ تا ۹۴)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

(تلخیص مفاوضات رشیدیہ)

منشی ظفر احمد صاحب کے نام[1]

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ — بعد سلام مسنون آنکہ چند روز گذرے کہ آپ کا خط آیا۔ فرصت جواب لکھنے کی نہ ملی۔ اب مختصراً لکھتا ہوں کہ .... سحر کا ہونا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ خلاف عقل ہے اور نہ خلاف نقل۔ کیوں کہ آپ بشر تھے۔ بیمار بھی ہوتے تھے اور زہر کا اثر بھی ہوا۔ اور سحر بھی ایک نوع کا مرض ہے کہ خارج سے اثر بدن میں پیدا ہوتا ہے۔ سو اس کا انکار عقل نہیں کر سکتی اور صحاح احادیث اس میں خود موجود ہیں۔ اگرچہ خبر واحد ہی سہی، مگر خبر واحد بھی موجب علم و طمانیت کی ہے جس کے انکار سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کافر نہ ہو۔ تعجب ہے کہ اپنے باہمی معاملات تمام اخبار احاد پر یقین کے ساتھ جاری ہوتے ہیں۔ کوئی تواتر خبر پر موقوف نہیں کرتا۔ سرکاری احکام ملازم و رعایا پر جو جاری ہوتے ہیں اس میں بعذر عدم تواتر کوئی اس کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ خبر واحد کو یقین جان کر تعمیل ہوتی ہے۔ اور بصورت عدم تعمیل سزا اور جرمانہ ہوتا ہے۔ کوئی عذر عدم تواتر کا نہ پیش کرے، نہ قبول

---

[1] یہ دو مکتوب گرامی منشی ظفر احمد صاحب کے نام ہیں۔ منشی ظفر احمد صاحب کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ یہ دونوں مکتوب بہت اہم اور علمی و نفعی ہیں۔ اہل علم کے لیے ان دونوں خطوں کا مطالعہ بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔ اوسط الفہم حضرات بھی اگر ان خطوط کا بار بار بغور مطالعہ کریں گے تو اصل مفہوم تک رسائی مشکل نہ ہوگی۔

ہو اور نہ اس سزا کو کوئی ظلم جانے۔ مسائل شرعیہ میں اپنی رائے ناقص کے خلاف جان کر عذر ات وحدتِ خبر پیش ہوتے ہیں۔ یہ کس قدر دور از انصاف ہے۔ اور روایتِ عن کو جملہ اکابر و اصاغر علماء محدثین و فقہاء و عقلاء بشرط ثبوت لقا، بلکہ امکانِ لقاء (کی صورت میں بھی) متصل قرار دیتے ہیں اور اپنے فنِ درایت میں معتبر جانتے ہیں۔ اور اس وقت کے "خام طبعان" کا فن درایت اس کو غیر متصل اور غیر معتبر قرار دیوے، (یہ) کس قدر نادانی ہے۔ ہاں البتہ یہ وحدتِ خبر کا عذر اور سندِ معنعن (کا عذر) بڑا حیلہ، اہل بطالت کو ہاتھ آیا ہے، اپنی بےخبری پر عمل کرنے کے لیے — تمام مسائل عملیہ الّا ماشاء اللہ اخبار احاد اور معنعن سے ثابت ہوئے ہیں۔ پس جس کو چاہا خلافِ طبع بعید جان کر رد کر دیا اور آزاد ہو بیٹھے۔ معاذ اللہ تعالیٰ۔ مگر اہل علم و عقل کے نزدیک یہ دونوں عذر (خبرِ واحد اور معنعن کا عذر) مردود ہیں۔ اپنے مروّج معاملات کو خود عاقل تامل کر کے دیکھے — اور بخاری اور مسلم کی (طرف) نسبت (کرکے) جو لکھا ہے کہ اخبار احاد سے یقین حاصل نہیں ہوتا خود (قائل کا اپنا من گھڑت) لغو قول ہے۔ اس سے (خبرِ واحد اور معنعن سے) اگر علم قطعی نہیں تو ظن غالب (جو کہ بحکم یقین ہے) حاصل ہوتا ہے خود اپنے معاملات کو شاہد اس امر کا قرار دے کر دیکھو — جب تک حدِ تواتر کو خبر نہ پہنچے، واحد ہی ہوتی ہے۔ کون سے معاملہ میں سَو اور پچاس مخبروں کی خبر پر معاملہ کا حصر کیا جاتا ہے؟ علی ہذا جو معنعن پر شبہ ہے (تو) پہلا (راوی) جو عن سے روایت کرتا ہے اگر حدثنا کہے گا تو کیا نفع ہو گا؟ کیوں کہ اگر بزعم سامع صادق ہے تو اس کی عن کو بھی صادق جانا جائے گا۔ کیونکہ لقاء موجود، صدق و عدالت موجود اور اگر احتمالِ کذب ہے تو حدثنا کہہ کر بھی کذب بول سکتا ہے پھر حدثنا سے کیا نفع ہوا؟ (لہذا، (معنعن پر) یہ شبہ محض وہم ہے۔ معنعن وہاں توقف میں رہتا ہے کہ لقائے راوی ممکن نہ ہو اور راوی پر احتمال حذفِ اسناد کا ہو بسبب اس کی (معلوم) عادت کے۔ نہ (کہ) مطلقاً ہر جگہ — یہ تو فنِ درایت تھا، مگر یہ فن درایت نیا ایجاد ہوا ہے کہ معنعن کہیں معتبر نہ ہو — پھر ہشام بن عروہ پر امام مالکؒ کا جرح نقل کرنا خود بے اصل اور نادانی ہے۔ ہرگز امام مالکؒ نے ان کو کاذب نہیں کہا۔ بلکہ یہ ناقل اپنی نقل میں سراسر کاذب ہے۔ اس واسطے کہ امام مالکؒ اپنی کتاب مؤطا میں جا بجا ہشام بن عروہ سے روایت فرماتے ہیں۔ اپنی روایت کی نہایت تعدیل و توثیق فرماتے ہیں کہ میری کتاب کے تمام راوی ثقہ اور عدول

ہیں۔ اگر ہشام کو وہ کاذب کہتے تو گویا کتاب مؤطا کو بعض کذابین کی روایت سے تالیف کرتے ــــ

لاحول ولا قوۃ الا باللہ ــــ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

کتاب مؤطا کو تم خود دیکھ لو کہ کس قدر روایات ہشام سے اس میں موجود ہیں۔ پھر (ہشام کے لیے) ایسا سخت کلمہ امام مالکؒ کی طرف نسبت کرنا خود جھوٹ اور خطائے فاحش ہے (صادق و) عاقل کا کام نہیں ــــ اور جس نے بخاری و مسلم کو دیکھا ہے ادنیٰ فہم و عقل کے ساتھ وہ بھی جان سکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ سحر کی خبر دینا، جناب فخر عالم علیہ السلام کی اخبار و اطلاع سے ہے کہ آپ خود فرماتے ہیں کہ مجھ کو حق تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ مجھ پر یہودی نے سحر کیا ہے۔ اب اہل اسلام کے نزدیک خبر رسول کی تو قطعی اور اپنی حس و مشاہدہ سے بھی زیادہ قطعی ہے کہ بلا واسطہ رسول کی زبان سے سننا مثل وحی کے ہے۔ اور (یہ سننا) مشاہدہ سے بھی ازید (بہت زیادہ) یقین میں ہوتا ہے۔ مگر نہ معلوم کس جاہل کا یہ فن درایت ہے کہ مشاہدہ اپنا تو یقینی اور خبر رسول کی کاذب، غیر معتبر ہوتی ہے۔ اور خبر رسول کو وہمی یا خیالی یا اعتقاد فاسد قرار دیا جاتا ہے ــــ توبہ توبہ اس عقیدۂ فاسدہ سے کہ رسول کی بات کو وہمی اور خیالی تصور کرکے خلاف اپنی عقل فاسد کے جان کر رد کر دیں اور تکذیب کریں۔ آپ ہی فرما دیں کہ (اس صورت میں) وحی کا آنا، جبرئیل اور ملائکہ کا اخبار دینا، برزخ و حشر و نشر، عذاب آخرت، وجود جہنم و جنت وغیرہا صدہا امور کہ جن کو (بہت سوں کی) عقل قبول نہیں کرتی اور حواس سے محسوس نہیں ہوتے ان کا غیر معتبر ہونا لازم آتا ہے کیوں کہ یہ نہ معقول ہیں نہ محسوس ــــ چاہیے کہ خیالات پر محمول ہو کر قابل رد ہوں۔

.... اور ان کا یہ قول کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نسیان اور ضعف طبع لاحق ہو گیا، خلاف عقل ہے۔ یہ دوسری کم فہمی ہے کیوں کہ آپ کو نسیان بھی ہوتا تھا اور سب بشر کو کم و زیادہ نسیان عارض ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ نقصان عقل نہیں　　آپ کو امور دنیا میں خیال ہوتا تھا کہ کر لیا ہے، حالانکہ نہ کیا تھا یا نہیں کیا حالانکہ کر لیا تھا۔ مگر یہ اول وہلہ (شروع میں) میں خیال ہوتا تھا پھر بغور حقیقت حال واضح ہو جاتی تھی۔ یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ پھر اس خیال پر قایم و راسخ بھی رہتے تھے۔ یہ ہرگز نہ کہیں ہوا اور نہ کسی نے لکھا۔ بلکہ اول یوں خیال گذرا

آخر وہ خیال رفع ہو کر اصل حال معلوم ہو گیا۔ اور یہ حال اب بھی عقلاء کو ہوتا ہے اور آپ کو بھی ہوتا تھا۔ مگر امور دنیا میں (ہوتا تھا) کہ جس سے کوئی نقصانِ فہم و عقل لازم نہیں آتا اور (نسیان) امور تبلیغ میں، یہ ہرگز کبھی نہیں ہوا اور نہ اس کی گنجائش تھی۔ کیوں کہ وحی آئی اور فوراً اس کو لکھا دیا۔ چنانچہ یہ عادت ناشیہ تھی کہ جب کوئی حکم آیا اس کی فوراً تبلیغ کر دی۔ اس میں گنجائش نسیان کی ہرگز نہ تھی کہ جس سے کوئی لا یعقل شبہ نقصان تبلیغ کا اپنی ناقص طبع میں پیدا کرے۔

اور بقاء اس مرض (سحر) کی ایک سال تک جو لکھی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حالت سال بھر رہی۔ بلکہ یہ حالت نسیان چالیس روز تک رہی اور چھ ماہ تک ضعف (بوجہ) مرض کچھ زیادہ اور سال بھر تک کچھ کم یہاں تک کہ بعد سال کے بالکل اثر دفع ہو گیا جیسا کہ نقاہت، مرض شدید کی وجہ سے برس یا کم و بیش رہتی ہے۔ سوان روایات میں نہ تعارض ہے اور نہ کوئی ایسی بات ہے جو عقل کے خلاف ہو۔ ایسا مرض شدید جو روح حیوانی پر صدمہ پہنچائے، برس روز تک ضعف اس کا رہنا محال نہیں۔ بلکہ کثیر الوقوع ہے۔ پس سال بھر کا ضعف نہ کسی احکام تبلیغ میں خلل ڈالتا ہے اور نہ چالیس روز تک نسیان اور ضعف قوت کا رہنا کوئی حرج لاتا ہے (اس لیے) کہ عقل آپ کی تمام تھی اور فہم و علم بحال خود تھا جیسا دیگر امراض میں ہوتا ہے، اور اول دہلہ نسیان امور معاشیہ میں ہوتا تھا، آخر تامل سے رفع ہو جاتا تھا اور امور تبلیغ میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ (اس صورت کو) کون عاقل غلط اور غیر ممکن تصور کر سکتا ہے۔ پس صاحب سفر السعادت یا دیگر علماء کا قول کسی وجہ سے اہل فہم کے (نزدیک) خلافِ فہم نہیں۔ اگرچہ کسی کو بادی الرائے میں کسی سفیہ (بیوقوف) کی طرف سے خدشہ دلانے سے شبہ ہو جائے۔ نہ یہ امر محال ہے اور نہ کذب و تہمت ہے اور نہ اس کی حق تعالیٰ نے تکذیب فرمائی۔ ...... (اِنْ يَقُولُونَ اِلَّا كَذِبًا) (یہ جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں بولتے)۔ ...... بلکہ حق تعالیٰ نے ان کفار کی تکذیب فرمائی ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسحور و مجنون خارج از عقل بتلا کر ان کے حکم کو رد کرتے تھے۔ کیوں کہ یہی وجہ مسحور و مجنون کہنے کی تھی۔ کہ ان کی بات (ان کے نزدیک) عقل سے خارج بلکہ قولِ جنون ہے، یہ معنی نہ تھے کہ ان کو مرض ہو رہا ہے۔ کیوں کہ مریض عاقل کی بات کو کون غیر معتبر کہتا ہے۔ اسی واسطے کبھی مسحور کہتے تھے یعنی بے عقل معاذ اللہ اور کبھی مجنون اور کبھی ساحر،

کبھی شاعر کہہ دیتے تھے۔ فی الواقع وہ (لوگ) خود مجنون لاعقل تھے۔ عند الشحراء (جادوگروں کے نزدیک) (مقرر و مسلم ہے کہ) ساحر مسحور نہیں ہوتا۔ یعنی ساحر پر سحر نہیں ہو سکتا۔ اور شاعر کبھی مجنون اور مسحور نہیں ہوتا۔ کہ شاعری کو شعور تام لازم ہے ــــ پس حق تعالیٰ ان ظلمہ (ظالموں) کے قول جنون کو رد فرماتا ہے کہ ہمارا رسول مجنون و مسحور نہیں۔ نہ یہ کہ کوئی اثر سحر نہیں ہوا۔ اثر سحر ہونے میں یہ حکمت تھی کہ ساحر ہونا آپ کا جو کفار افواہاً بیان کرتے تھے رد ہو جائے۔ کیوں کہ ساحر مسحور نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ آیت وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراً۔ اہل نیچر کی مکذّب ہے کہ اپنی عقل مالیخولیا کو مقتدی بنائے بیٹھے ہیں۔ البتہ اس مسحوریت کا انکار ہے کہ خارج از عقل کر دیوے اور مجنون بنا دے۔ نہ یہ کہ مرض اور زہر اور سحر نبی پر اثر نہیں کرتا ــــ نہیں بلکہ مثل اسباب مرض مادی اور زہر کے سحر کبھی باذنہ تعالیٰ اخلاط مزاج میں اثر پیدا کرتا ہے۔ نبی پر ہو یا غیر نبی پر ــــ اس خبر میں تردد کرنا یا اس کو خلاف عقل جاننا یا اس کے راوی کی تکذیب کرنا بندہ کے نزدیک بجز بے عقلی اور بے دینی کے کوئی وجہ نہیں رکھتا۔ آپ کو مخلص جان کر یہ تحریر کیا گیا ہے ورنہ اہل نیچر کو اپنی ناقص عقل کے مقابل میں کسی کی تحریر نافع نہیں۔		والسلام

از بندہ رشید احمد عفی عنہ، بگرامی خدمت منشی ظفر احمد صاحب بعد سلام مسنون آنکہ۔ خط آیا۔ حال معلوم ہوا ــــ مسئلہ اضحیہ (قربانی) میں علماء کا خلاف ہے کہ ابو حنیفہؒ اور احمد رحمہما اللہ کے نزدیک بکرا بکری ایک سال تمام کا کافی ہے ــــ اور دُنبہ نصف سال سے زیادہ کا ہو تو کافی ہے۔ اگرچہ تمام سال کا نہ ہو اور شافعیؒ کے نزدیک بکری بکرا دو سال تمام کے ہوں اور دُنبہ سال بھر کا ہو تو درست ہے۔ اس سے کم ناجائز ــــ حدیث میں جذع اور مُسنّہ کا لفظ آیا ہے۔ اور جذع کے ترجمہ میں جو خلاف ہوا ہے، ترجمۂ لغوی میں خلاف ہوا ہے۔ اس پر مدار مسئلہ کا ہے پس جس نے جذع کے معنی سال سے کم کا کیے ہیں اور مُسنّہ کا ترجمہ پورے سال کا ــــ وہ تو مثل ابی حنیفہؒ اور احمدؒ کے عمل کرتا ہے اور جو جذع سال تمام اور مُسنّہ دو تمام کا کہتا ہے وہ مثل شافعیؒ کے عمل کرتا ہے ــــ اور یہ لغت عرب کا ہے

اور دونوں مجتہدوں کے پاس حجت (موجود) ہے۔ لہذا احوط مذہب شافعیؒ کا ہے اور وسعت ابوحنیفہؒ اور احمدؒ کے مذہب میں ہے رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ـــــ اور حدیث میں عمر کا بیان بصراحت کہیں وارد نہیں ہوا۔ مجتہدین اشارات اور اختلاف الفاظ سے حجت لاتے ہیں۔ پس آپ نے جو احادیث نقل کی ہیں، ان احادیث میں عمر کا بیان نہیں۔ فقط جذع اور مُسنّہ اور عُشود اور عناق کے الفاظ ہیں اور احادیث، فریقین کے لیے سند ہیں۔ بوجہ ترجمہ کے خلاف ہوا ہے احتیاط بہتر ہے۔ جو امام ابوحنیفہؒ کے موافق عمل کرتا ہے اس پر (بھی) اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ تشبہ ہے، خواہ عبادات میں ہو ـــــ خواہ عادات میں ہو، خواہ لباس میں ـــــ جوزئی (ہیئت) کسی کافر فاسق کی ہے اس میں مشابہت منع ہے، اور منع بقدر مشابہت کے ہے۔ کہیں کفر، کہیں فسق، کہیں مکروہ تنزیہیہ ـــــ لہذا لباس نصاریٰ سے کفر لازم نہیں آتا۔ البتہ بعض لباس میں کراہت اور بعض میں حُرمت ہے ـــــ اور یہ حدیث ابوداؤد کی من تشبہ بقوم الخ صحیح ہے اور اس کے شواہد ہیں اور مسئلہ متفق علیہ ہے اور اس کے بہت نظائر حدیث وفقہ میں موجود ہیں ـــــ تحت السُّرۃ (ناف کے نیچے) اور فوق السُّرۃ (ناف کے اوپر) ہاتھ باندھنے کی دونوں حدیثیں ضعیف ہیں اور صحابہ کا عمل دونوں طرح پر ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ امر واسع ہے جس طرح عمل کرے درست ہے اور ایک حدیث تحت السُّرۃ کی صحیح ہے۔ اور ایک حدیث فوق السُّرۃ کی بھی صحیح ہے۔ غرض دونوں درست اور ثبوت میں مساوی ہیں۔ اور عادت ورواج کے موافق تحت السُّرہ ادب سے اوفق (زیادہ موافق) ہے لہذا اس کو مُرجّح کہتے ہیں ـــــ اور مسح رقبہ (گردن کا مسح) علاحدہ کرنے کی کوئی حدیث نہیں۔ البتہ مسح رقبہ میں احادیث ضعاف ہیں کہ مجموع ان کا حَسَن کو پہنچتا ہے اور قابل عمل ہے ـــــ رفع یدین قبل قنوت کی حدیث بندہ کو صحیح نہیں ملی ـــــ البتہ تکبیر قبل قنوت منقول ہے یہ مشکل الآثار میں طحاویؒ نے نقل کیا ہے۔ صحاح کے راوی عمدہ ہیں۔ اس واسطے ان کو ترجیح ہے۔ اگر دیگر کتب کے بھی یہی راوی ہوں یا مثل ان کے تو وہ بھی مقبول ومعمول ہوں گی۔ اور مسائل عملیہ میں جو احادیث مختلفہ وارد ہیں اور مجتہدین کا اختلاف ترجیح ہے اس میں کنج کاؤ (تحقیق وتفتیش) بہتر نہیں کہ خواہ مخواہ نزاع میں پڑنے اور باہم تفسیق وتکفیر کرنے کا موجب ہے۔ لہذا اس میں شرح وبسط کرنے کی حاجت نہیں۔ والسّلام

از افادات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ

احوال اور اعمال

ہمارے حضرت مولانا حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جہاں اور بہت سی اصلاحات فرمائی ہیں وہاں ایک زبردست اصلاح یہ فرمائی کہ لوگ حضرت کے پاس اولیاء کے احوال کے متعلق لکھ کر پوچھتے تھے حضرت مولانا جواب دیتے تھے کہ بھائی احوال غیر اختیاری اور عمل اختیاری ہے اختیاری کی فکر کرنا چاہیے اور غیر اختیاری کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے اور پھر احوال تو اعمال کے تابع ہیں جن لوگوں کو احوال ملے ہیں۔ اعمال ہی کے بدولت ملے ہیں اب لوگ چاہتے ہیں کہ کرنا ورنا کچھ نہ پڑے اور احوال اولیاء کے سے حاصل ہو جائیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کامل سے جب کوئی راستہ پوچھے گا تو وہ یہی بتائے گا کہ علم کا اتباع کرو احکام شرع پر عمل کرو۔

اب جو اصلاح نہیں ہو رہی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ علماء عوام کے مذاق کے موافق تقریر کرنے لگے ہیں مرض کچھ ہوتا ہے بیان کچھ ہوتا ہے۔ ضرورت چاہے کسی اور بیان کی ہو مگر عوام الناس جس مضمون کی فرمائش کر دیں علماء اسی کو بیان کرتے ہیں علماء تابع ہو گئے ہیں اور عوام الناس کو متبوع بنا لیا ہے عوام الناس نے اتباع کرنا چھوڑ دیا اور اصلاح ہوتی ہے اتباع سے جب اتباع ختم اصلاح ختم۔

مسلمانوں میں اور حکماء فلاسفہ میں یہی فرق ہے کہ مسلمان نبی کا اتباع کرتے ہیں اور حکماء اپنی عقل کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ لوگ نبی کا انکار نہیں کرتے۔ ان کو نبی مانتے ہیں مگر عوام الناس کے لئے اور اپنے متعلق کہتے ہیں کہ ہم کو نبی کی ضرورت نہیں ہے ہمارے لیے رہبری کے سلسلہ میں عقل کافی ہے۔

جانتے ہوئے اتباع کیوں نہیں کرتے؟ کبر کی وجہ سے۔ اتباع کرنا کوئی آسان چیز نہیں ہے۔

اگر یہ معیاری اور ٹکسالی چیز نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ فاتبعونی نہ فرماتے دوسرے کا اتباع کرنا نفس کے لیے موت ہے۔

میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام اتارا اور فرما بھی دیا کہ مِن لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ کہ یہ کلام ایسی ذات کی طرف سے ہے جو علم و حکمت والی ہے تو کیا اس کلام میں علم و حکمت کی باتیں نہ ہوں گی؟ پھر ہم کو کسی اور سے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟

کامل اپنا اتباع نہیں کراتا بلکہ نصوص کا اتباع کراتا ہے اور یہ جتنا مشکل ہے کوئی چیز اتنی مشکل نہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ لوگ حال کے واسطے حضرت مولانا کو لکھتے تھے۔ اور اس کے لیے پریشان تھے حضرت مولانا فرما دیتے تھے کہ عمل کرو عمل کا حکم ہے۔ احوال تو اعمال کے تابع ہیں جو شخص احوال کے چکر میں پڑ کر اعمال سے بے توجہی برتتا ہے تو احوال بھی ختم ہو جاتے ہیں اور اعمال کی بھی توفیق اس کو نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ لوگ یہاں آتے ہیں اور اپنے ذہن میں کچھ تخیل باندھے رہتے ہیں اور اسی پر ڈٹے رہتے ہیں۔ کتنا ہی سمجھاؤ مگر اس سے نہیں نکلتے۔ لوگ بزرگی کسی اور چیز کو سمجھتے ہیں عمل کو نہیں سمجھتے۔ حالانکہ جتنے بزرگ ہوئے ہیں سب عمل ہی کی وجہ سے ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی پہلے کے بزرگوں نے ایسے لوگوں کو اپنے مجالس سے نکال دیا ہے۔ امام غزالیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ عوام الناس کو ذکر و شغل نہیں بتانا چاہیے کیونکہ اس سے ان پر احوال طاری ہوں گے اور یہ لوگ علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کو سمجھ نہ سکیں گے بس گمراہ ہو جائینگے لہٰذا ان لوگوں کو سیدھے سیدھے نماز روزے میں لگائے رکھنا چاہیے۔ جو کچھ پانا ہوگا اسی سے پالیں گے۔

گمراہی کا سبب یہی ہے کہ انبیاء کا اتباع چھوڑ دیا گیا ہے اور نفس کا اتباع کیا جا رہا ہے اور جو لوگ عقل کے اتباع کے دعوے دار ہیں وہ عقل بھی نفسانی عقل ہے کیونکہ اتباع نبی نہ ہونے کی وجہ سے عقل کا نور بھی سلب ہو چکا ہے۔ خوب خوب ٹھوکریں کھا رہے ہیں مگر انبیاء کا اتباع نہ کریں گے اپنی من مانی ہی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آدمی کو اپنی چیز اچھی لگتی ہے

خواہ واقع میں وہ کتنی ہی بری ہو۔ ایک عورت کا بیٹا بالکل دبلا اور کالا سیاہ تھا مگر پھر بھی وہ محبت میں بڑی تعریف سے کہتی تھی کہ میرا لاڈلا ایسا ہے جیسے چیونٹا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے راستہ کے علاوہ تمام راستے بند ہیں اور کوئی راستہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہیں ہے بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے۔

اس زمانہ میں موجودہ مشائخ کا یہ طرز ہو گیا ہے کہ اس راستہ میں جو لوگ آنا چاہتے ہیں ان کو کچھ ذکر و شغل بتا دیتے ہیں۔ جس سے ان کو کچھ یکسوئی وغیرہ حاصل ہو جاتی ہے بس اسی کو وہ لوگ مقصود سمجھ لیتے ہیں لیکن ہمارے حضرت مولاناؒ کے یہاں اتباع کی تعلیم تھی۔ مگر اپنا اتباع کرانا مقصود نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع مقصود تھا۔

اتباع بہت بڑی چیز ہے اس کا درجہ اور اس کی فضیلت کبھی انسان پہلے نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ اتباع نہ کرے پھر جب اتباع کی فضیلت ہی کا اندازہ بغیر اتباع کیے نہیں ہو سکتا تو اس کے برکات و ثمرات کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے اتباع کرنے کے بعد ہی اس کی فضیلت سمجھ میں آتی ہے اور اس کی قدر معلوم ہوتی ہے اور برکات و ثمرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ اتباع کی قدر پہچانتے تھے چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو دو چیزیں بہت پسند ہیں ایک تو دعوت کا کھانا اور دوسرے مقتدی بن کر نماز پڑھنا واقعی مقتدی بن کر نماز پڑھنے میں کس قدر اتباع ہے کہ اپنا جو کچھ بھی جی چاہ رہا ہو کچھ نہیں کر سکتے بلکہ امام کے اشارہ پر چلنا ہو گا جب تک امام کھڑا ہے خود بھی کھڑے ہیں جب وہ رکوع میں جائے جب ہی خود بھی رکوع میں جا سکتے ہیں میں تو کہا کرتا ہوں کہ آدمی پانچ وقت دل سے مقتدی بن کر نماز پڑھ لیا کرے تو اسی سے اس کا نفس تو ختم ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ اتباع کر کے دیکھو پھر اس کے برکات و ثمرات نظر آئیں گے جو لوگ مشائخ کا اتباع کرتے ہیں وہ تھوڑے ہی دنوں میں فائز المرام ہو جاتے ہیں! پھر یہ کہ اتباع کرنے والے کو تو مزا ہی مزا ہے اس کے ذمہ کوئی ذمہ داری نہیں آئی گئی سب آگے چلنے والے پر اس کے لیے تو بس یہ ہے کہ چپ چاپ پیچھے پیچھے چلا چلے۔ یہی وجہ

تھی کہ مولانا قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو دعوت کا کھانا اور مقتدی بن کر نماز پڑھنا پسند ہے کیونکہ مہمان کو کچھ فکر نہیں ہوتی کہ کھانا کم پڑے گا کہ زیادہ ہوگا وہ تو بس بے فکر رہتا ہے اور کھانے کی تیاری کی ساری ذمہ داری میزبان کے سر۔ اسی طرح مقتدی کو کیا ہے؟ جپ چاپ ہاتھ باندھے امام کے پیچھے مزے سے کھڑے ہیں اور امام بچارا خود اپنی نماز کا بھی ذمہ دار ہے اور تمام مقتدیوں کی نماز کا ضامن (الامام ضامنٌ) سب آئی گئی بچارے امام ہی کے سر جاتی ہے! لہٰذا اتباع کرنے والا تو بڑے آرام میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے فاتبعونی فرماکر ہم سب پر معاملہ کو کس قدر آسان فرمادیا کہ بس آنکھ بند کر کے حضورؐ کا اتباع کرتے چلے جائیں اور مقصود تک رسائی کا راستہ طے ہوتا جائے گا۔

بیشک جو لوگ اتباع کرتے ہیں وہ اس کی برکات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی اللہ و رسول سے محبت رکھنے والے اور اتباع کرنے والے موجود ہیں۔ غالباً ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ شادی سے پہلے عورت کو ایک نظر دیکھ لو تاکہ نکاح کے بعد ناپسند نہ نکلے۔ ایک جگہ شادی تھی لڑکا لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر لڑکی والے اس میں اپنی توہین سمجھ کر پس و پیش کر رہے تھے جب لڑکی کو معلوم ہوا اور یہ حدیث بھی معلوم ہوئی تو اس نے کہا کہ جب حضورؐ کا یہ ارشاد ہے تو اس پر ہماری عزت و ناموس سب قربان لڑکے سے کہو کہ ہم کو آکر دیکھ لے۔ دیکھا آپ نے کیسی متبع سنت لڑکی تھی۔ واقعی اصل اتباع کا امتحان اسی وقت ہوتا ہے جہاں نفس کے خلاف پڑ رہا ہو اور محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے آدمی اتباع کرے۔

ایک عالم دریا کے اس پار تھے دوسری جانب کنارے پر کسی نے چھینک کر الحمد للہ کہا۔ ہوا کا کچھ ایسا رُخ تھا کہ آواز ان عالم نے سُن لی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص چھینک کر الحمد للہ کہے تو جواب میں یرحمک اللہ کہنا چاہیے چنانچہ انھوں نے کشتی والے والے کو دو پیسے دیے اور صرف جواب دینے کے لیے اس پار گئے اور جا کر اس چھینکنے والے والے سے کہا کہ یرحمک اللہ اس پر آسمان سے آواز آئی کہ جاؤ تم نے دو پیسہ میں جنت خریدلی۔ دیکھا آپ نے حضورؐ کے اتباع کا یہ ثمرہ ملا۔

ایک صحابی ایک جگہ گورنر تھے ایک بار کھاتے ہوئے کوئی لقمہ گر گیا آپ نے اس کو اٹھایا اور صاف کر کے کھا لیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ عجمی لوگ ہیں ایسا کرنا اچھا نہیں سمجھتے !! آپ یہاں کے حاکم ہیں ایسا کیجیے گا تو یہ لوگ حقیر و ذلیل سمجھیں گے۔ ان صحابیؓ نے فرمایا کہ یہ لوگ کچھ بھی سمجھیں ہم حضورؐ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اب مسلمانوں کی اسی میں فلاح ہے کہ بس سیدھا سادھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع شروع کر دیں اور در در کی ٹھوکریں کھانا چھوڑ دیں۔ مسلمانوں کے لیے اتباع نبوی ہی میں دونوں جہاں کی فلاح ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے کامیابی کا کوئی راستہ نہیں۔

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے

روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رخ بھی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

- اناج کی ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔
- مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فیصد کی شرح سے ترقی ہوئی جبکہ پچھلے سال کی اس مدت میں یہ صرف تین فیصد تھی۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصدی زیادہ صنعتی پیداوار متوقع ہے۔
- اپریل سے ستمبر ۱۹۷۶ء تک کے عرصے میں ۱۹۷۵ء کی اس مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار ۱۶٫۴ فیصد بڑھی ہے۔
- اپریل سے اکتوبر ۱۹۷۶ء تک کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں ۳۳٫۹ فیصد کا قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور اسی مدت میں درآمدات میں ۹ فیصد تک کمی ہوئی ہے۔
- بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکے کا ذخیرہ حصول آزادی کے بعد پہلی بار ۲,۵۰۰ کروڑ روپیے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔
- پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے۔
- روپے کی قوت خرید میں ۱۷ سے ۲۱ فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لیے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

DAVP. 76/886

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کا خاندان

(ایک سرسری جائزہ، ایک اجمالی نظر)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہندستان کے ان عظیم الشان اکابر میں سے ہیں جن پر ارضِ ہند بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس عظیم شخصیت کے فیوض و برکات ہند و سندھ میں تو تھے ہی، تمام عالمِ اسلامی اور دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک طرف باکمال محدث اور فقید المثال فقیہ تھے تو دوسری طرف ایک ماہرِ رموزِ تصوف محقق صوفی اور بلند پایہ مفکر و متکلم بھی تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا جن میں مولانا نور اللہ بڈھانویؒ، خواجہ امین اللہ ولی اللّٰہی کشمیریؒ، شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیدی صاحبِ تاج العروس شرحِ قاموس اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ الحاج نواب رفیع الدین خاں فاروقی مرادآبادیؒ جیسے حضرات بھی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ایک عبقری (پیدائشی باکمال) انسان تھے۔ ان کا آبائی سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اور ان کی ننھیال کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے متصل ہوتا ہے۔ ان کی ددھیال اور ننھیال میں بڑے بڑے پاکیزہ نفوس، اربابِ علم و عرفان اور اصحابِ قلم و علم گذرے ہیں۔

یہ بات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تقریباً تمام تذکرہ نویس لکھنا بھول گئے ہیں کہ وہ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا شیخ محمد پھلتیؒ تھے جو ایک بلند مرتبہ صوفی اور درویش تھے۔ حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور مجاز تھے۔ ان کی عفت مآب

صاحبزادی فخر النساء حضرت شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ تھیں۔ شیخ محمد کے صاحبزادے شاہ عبید اللہ پھلتی، حضرت شاہ ولی اللہ کے حقیقی ماموں اور خسر تھے۔ ان کا مقام بھی مشائخ پھلت میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیم فاروقیؒ بھی جامع کمالات بزرگ تھے انھوں نے اپنے بھائی شاہ ابو الرضا محمد اور خواجہ خُرد کے علاوہ مشہور ماہر علوم عقلیہ میر زاہد ہرویؒ سے بھی اخذ علوم کیا تھا۔ انھوں نے سلسلۂ قادریہ مجددیہ میں حافظ سید عبد اللہ اکبر آبادیؒ سے اور سلسلۂ ابو العلائیہ میں خلیفہ ابو القاسم اکبر آبادیؒ سے نیز سلسلۂ چشتیہ میں سید عظمت اللہ چشتی اکبر آبادیؒ سے فیض حاصل کیا تھا۔ شاہ عبد الرحیمؒ کے والد شیخ وجیہ الدینؒ بھی بڑے دیندار، پابند وضع، ذی علم اور شجاع شخص تھے۔ ددھیال اور ننھیال کے علمی اور روحانی ماحول نے حضرت شاہ ولی اللہ کی سیرت پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ آپ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیم فاروقیؒ نے آپ کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دس سال سے کم عمر تھی کہ حافظِ قرآن مجید ہوئے، اور اس کے بعد سولہ سال کی عمر تک تمام علوم عقلیہ و نقلیہ سے فراغت حاصل کرلی۔ فراغت کے بعد جبکہ آپ کے والد ماجد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا تو ان کی جگہ سترہ سال کی عمر میں مسند نشینِ علم و معرفت ہوئے، اور صد ہا تشنگانِ علوم اور طالبانِ معرفت کو فیض یاب کیا۔ آپ نے مدرسہ رحیمیہ کو ترقی دی اور دہلی کے اندر کارِ تعلیم و تدریس کو فروغ دیا۔ اپنے والد کی وفات کے ۱۲-۱۳ سال کے بعد سنہ ۱۱۴۳ھ میں بغرض حج و زیارت و تحصیل علم حصولِ تحدیث آپ حجاز مقدس چلے گئے۔ وہاں دو سال رہے اور شیخ ابو الطاہر مدنی کردیؒ وغیرہ جیسے مشہور و معروف محدثین سے اخذ فیض کیا۔ آپ کے اندر جو خداداد ذہانت اور ذکاوت تھی اس کو دیکھ کر وہاں کے اساتذۂ حدیث بہت خوش ہوئے اور انھوں نے آپ کی طباعی کا بڑے اچھے الفاظ میں اظہار کیا۔

حجاز مقدس سے واپس آکر بھی حضرت شاہ صاحب درس دیتے رہے، لیکن اب آپ کی مشغولیت تصنیف و تالیف میں زیادہ ہوگئی۔ آپ کی تصانیف میں ازالۃ الخفاء اور حجۃ اللہ البالغہ وہ دو بہترین کتابیں ہیں جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ان کے علاوہ بھی درجنوں کتابیں اور رسائل آپ نے تصنیف کیے۔ ہر فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے خصوصاً حدیث، تفسیر اور فقہ و تصوف میں ان کو بڑا درک حاصل تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تصوف میں جو کتابیں لکھیں ان میں ایک محققانہ شانِ اجتہاد جھلک رہی ہے۔ "توحید وجودی" اور "توحید شہودی" کے مسائل پر بھی آپ نے لکھا اور اس نزاع کو "نزاع لفظی" قرار دیا۔ تمام مشائخ طریقت سے حسنِ ظن پیدا کرنے کے لیے آپ نے اپنی تصنیفات میں پوری پوری کوشش فرمائی۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، قول الجمیل، ہمعات، ہوامع، تفہیمات الٰہیہ، خیر کثیر، بدور بازغہ اور قرۃ العینین وغیرہ کتابیں آپ کی بلندیٔ استعداد اور بلند پایہ بصیرت پر شاہدِ عدل ہیں۔ آپ نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جس کا نام فتح الرحمٰن ہے وہ بھی اتنا معیاری ہے کہ جس کی نظیر فارسی زبان کے کسی ترجمہ میں نہیں ملتی۔ اس فارسی ترجمہ اور اس کے فوائد میں جو رموز اور مصالح ہیں ان کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے قرآن مجید کی متعدد تفاسیر اور متعدد تراجم کا مطالعہ کیا ہو۔

آپ نے "فوز الکبیر" اصولِ تفسیر میں ایک رسالہ لکھا جو حجم و ضخامت کے لحاظ سے کم اور معانی کے لحاظ سے بہت جامع اور پُر مغز ہے۔ اس کا عربی ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ اس رسالہ سے حضرت شاہ صاحب کی تفسیر قرآن کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے مغلیہ دور کے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ان کی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی نے اپنے زمانے کے بعض بادشاہوں کو بھی دعوت نظامِ عدل دی ہے اور ان کے سامنے انتظامِ ملک و مال کا نقشہ پیش فرمایا ہے۔ آپ کے وہ خطوط جو اس وقت کی سیاست کے آئینہ دار ہیں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو عقلِ معاد کے ساتھ ساتھ عقلِ معاش سے بھی کافی و وافی حصہ ملا تھا۔

آپ کے روحانی مسترشدین بھی کافی تعداد میں تھے جن میں حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کی حیثیت سب میں ممتاز ہے۔ حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا تھے۔ تصوف و معرفت میں آپ کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ خلیفہ و مجاز تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ آپ کے تمام علوم ظاہری و باطنی

کے حامل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد شاہ محمد عاشق پھلتیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ذریعہ علوم ولی اللّٰہی زیادہ سے زیادہ اشاعت پذیر ہوئے۔

شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ماموں زاد بھائی بھی ہیں، برادر نسبتی بھی ہیں، شاگرد بھی ہیں اور مرید وخلیفہ بھی ——— وہ حجاز مقدس میں شاہ صاحب کے ساتھ حدیث کے درس میں بھی شریک رہے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے مسودات کو جمع کیا اور بڑی لگن سے ان کی تبییض وترتیب میں حصہ لیا۔ یہ کام انھوں نے شاہ صاحب کی حیات میں بھی کیا اور بعد کو بھی ——— وہ خود بھی صاحب تصنیف تھے۔ رسالہ سبیل الرشاد سلوک میں ان کا بہترین شاہکار ہے[1]۔

شاہ محمد عاشق نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مکاتیب کے جمع کرنے کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ شروع میں ان کے صاحبزادے شاہ عبدالرحمٰن، شاہ صاحب کے خطوط ومکاتیب جمع کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد خود شاہ محمد عاشق پھلتی نے اس کام کو بڑی محنت وجانفشانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مجموعہ کے سیاسی مکتوبات احقر کے اردو ترجمہ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی سلمہٗ کے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو چکے ہیں ——— بقیہ دو سو سے زائد علمی اور دینی مکتوبات احقر کے ترجمہ، مقدمہ اور حواشی کے ساتھ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز پنچکوئیاں روڈ نئی دہلی کے اہتمام سے عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زندگی کے حالات پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی ایسی معلومات سامنے آئیں گی جو ان خطوط کے علاوہ اُن کی تصنیفات میں کہیں نہیں ملتیں۔

حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائیوں کی تعلیم وتربیت میں بھی بڑا حصہ لیا۔ ۱۱۷۶ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ کا وصال ہوا تو اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اپنے والد ماجد سے بھی بہت کچھ پڑھ چکے تھے مگر حضرت شاہ محمد عاشق کی تربیت نے آپ کی علمی وروحانی استعداد میں جلا پیدا کی۔

---

[1] کتب خانہ قاضی شہر رامپور اور رضا لائبریری رامپور میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زوجۂ ثانیہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ پہلی زوجہ کے بطن سے شیخ محمد تھے جنھوں نے بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں وفات پائی اور بڈھانہ کی جامع مسجد کے ایک گوشہ میں مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے تین حقیقی بھائی اور تھے جن کے اسماء مبارک یہ ہیں:

(۱) شاہ رفیع الدین عبدالوہاب (۲) شاہ عبدالقادر (۳) شاہ عبدالغنی۔

یہ سب بھائی علمی استعداد اور ذہانت و ذکاوت نیز بلندیٔ اخلاق اور پابندیٔ شرع میں یگانۂ روزگار تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے مسند علم و عرفان پر بیٹھ کر اپنے والد ماجد کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور مریدوں کی بہت بڑی تعداد چھوڑی۔ ان میں سے چند نمایاں شخصیتوں کے نام یہ ہیں:۔

اُن کے تینوں چھوٹے بھائی، دو برادرزادے یعنی شاہ محمد اسمٰعیل شہید اور شاہ مخصوص اللہ نیز دو نواسے یعنی شاہ محمد اسحٰق فاروقی محدثؒ (مہاجر) اور مولانا محمد یعقوب فاروقی محدث (مہاجر) ان کے علاوہ شاہ غلام علی دہلویؒ، مولانا مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلویؒ، رشید الملت مولانا رشید الدین دہلویؒ، مولانا کرم اللہ محدث دہلویؒ، مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی ثم کانپوریؒ مولانا حسین احمد ملیح آبادیؒ وغیرہم ——— حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے اجازتِ حدیث پانے والوں میں منجملہ اوراکابر کے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ بھی ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ کی تصانیف اور رسائل بھی ان کی اعلیٰ واکمل علمی استعداد کی اطلاع دینے والے ہیں۔ ان میں تحفۂ اثنا عشری اور تفسیر عزیزی کی تو نظیر نہیں ملتی۔ دیگر کتب بھی حقائق و معارف سے لبریز ہیں۔ افسوس کہ آپ کے بہت سے مسودات اور خطوط انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ۸۰ سال کی طویل عمر پائی۔ زندگی کے آخری کئی سال ظاہری بصارت جاتی رہنے سے اور دیگر امراض کے غلبہ کی بناء پر آپ درس و تدریس سے معذور ہو گئے تھے اور آپ کے بھائیوں، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے مسندِ درس کو سنبھال لیا تھا۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پیدا کی ہوئی تعلیمی و تدریسی، تالیفی اور تصنیفی سرگرمیوں

میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

آپ کے سب سے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی تھے جو خود تو زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن اپنے صاحبزادے شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی کی وجہ سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے بھی دیگر تصانیف کے علاوہ اردو زبان میں قرآن کے ترجمے کیے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ان ترجموں میں بڑی لطافتیں اور بہت سی خوبیاں ہیں جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان ترجموں میں ہندی الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

ایک بات یہ قابل ذکر ہے کہ ان چاروں بھائیوں میں عمر کے لحاظ سے جو سب سے چھوٹا تھا اس نے سب سے پہلے انتقال کیا۔ اور سب سے بڑے نے سب سے آخر میں۔ درمیانی دو بھائیوں کا انتقال بھی اسی ترتیب سے ہوا یعنی شاہ عبدالقادر صاحب کا پہلے اور شاہ رفیع الدین صاحب کا بعد کو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بعد ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ نے اپنے نانا کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ سے پندرہ سال پہلے ۱۲۵۸ھ میں وہ ہجرت فرما گئے تھے[1]

ان کے باکمال تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ جن میں مفتی عبدالقیومؒ ابن مولانا عبدالحیؒ بڈھانویؒ، شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ، قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ، صاحب مظاہر حق نواب قطب الدین خاں دہلویؒ، مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، مولانا عالم علی نگینوی ثم مرادآبادیؒ اور مولانا نذیر حسین محدثؒ وغیرہم بھی شامل ہیں۔ ان میں مولانا شاہ عبدالغنی فاروقی مجددیؒ کا سلسلۂ فیض بہت وسیع ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے انھی سے خانقاہ شاہ غلام علی میں درس حدیث حاصل کیا تھا۔

---

[1] انشاء اللہ مستقبل قریب میں حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی اور ان کے بھائی حضرت شاہ محمد یعقوبؒ پر ایک مستقل مقالہ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ نسیم احمد فریدی

سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ، گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، میرٹھ میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ، مراد آباد میں مولانا عالم علیؒ اور رامپور میں مولانا حسن شاہ محدثؒ بعدہٗ مولانا محمد شاہ محدثؒ نے درس حدیث کا سلسلہ تادیر جاری رکھا۔ آخر میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت مولانا نانوتویؒ کے دو باکمال شاگردوں یعنی راس الاذکیا، حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کے ذریعہ تشنگان علم حدیث کو حوض ولی اللّٰہی سے بڑی سیرابی و شادابی حاصل ہوئی۔ ان حضرات کے ذریعہ ہندستان کے ہر ہر صوبے اور ہر ہر گوشے کے علاوہ بیرون ہند میں بھی فیوض ولی اللّٰہی کا سلسلہ پھیلتا رہا۔ آخر دور میں ولی اللّٰہی علمی خاندان سے تعلق رکھنے والے حضرات میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقی عمر امروہیؒ، وقار المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلویؒ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد محدثؒ وغیرہم نے عرب و عجم میں اپنی تصنیفی و تدریسی خدمات سے ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کے افراد کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ ان کے تعلیمی مستفیدین کے علاوہ روحانی مسترشدین کا حلقہ بھی آفاق گیر ہے۔ اور آج بھی دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ اسلامیہ عربیہ امروہہ، مدرسہ شاہی مراد آباد کے علاوہ میرٹھ، منظفر نگر، گلاؤٹھی، خورجہ، سنبھل، علی گڑھ، نگینہ، بریلی، شاہجہانپور، مئو ناتھ بھنجن مبارک پور، سرائے میر، بنارس نیز بہار و بنگال، گجرات اعلاقہ حیدر آباد دکن، بھوپال، ٹونک صوبہ مدراس اور پاکستان کے تمام تدریس حدیث کے ادارے اور اہل حق کی مشہور درسگاہیں سب سلسلۂ ولی اللّٰہی سے وابستہ و مربوط ہیں۔ اور بقول حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم برصغیر (ہند و پاکستان) میں اہل سنت و جماعت کا کوئی ایسا دینی و تعلیمی ادارہ اور تدریس قرآن و حدیث کا مدرسہ باوجود تفتیش و تلاش کے معلوم نہ ہو سکا جس کا تعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سلسلہ سے نہ ہو۔

ترجمہ: مولانا شمس الحق ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

مصنوعی تہذیب

ایک صاحب شعور مومن کی نظر میں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی ایک عربی تقریر کا ترجمہ

[رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی گزشتہ مہینے محرم کے آغاز میں، امارات عربیہ متحدہ کے مرکز ابوظبی کے رئیس قضاء شرعی سماحۃ الشیخ عبدالعزیز آل مبارک کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تھے، ۳ محرم کو وہاں کے ایک بڑے اجتماع میں جو گورنر ہاؤس میں منعقد کیا گیا تھا جس میں اہل علم، اساتذہ و اصحاب ثقافت اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کی بڑی تعداد شریک تھی۔ مولانا نے خطاب فرمایا جو وہاں کی زبان عربی میں تھا۔۔ اس خطاب بہ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے کاغذ پر منتقل کیا گیا، یہ اصل عربی خطاب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے اسی مہینے صفر کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ الفرقان کے لیے اس کا ترجمہ دار العلوم کے استاذ مولانا شمس الحق صاحب نے فرمایا ہے۔ جس کے لیے ادارہ ان کا ممنون ہے۔ ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں۔۔]

حمد و ثنا کے بعد۔۔ محترم دوستو اور بھائیو!
عرب مورخین نے تاریخ اسلام کے ایک واقعہ کا بار بار ذکر کیا ہے جس کو ہم جلدی میں سرسری

طور پر پڑھ جاتے ہیں، حالانکہ یہ واقعہ بڑا توجہ طلب، معنی خیز اور حکمت سے لبریز ہے، اور اس کا مطالعہ ہمیں بڑی سنجیدگی اور غور سے کرنا چاہیے، اس وقت میں اپنی گفتگو کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتا ہوں، اس لیے کہ اس کا ہمارے موضوع سے بڑا گہرا اور دور رس تعلق ہے، یہ واقعہ موجودہ بیجا اور کھوکھلی تہذیبوں کے بارے میں ایک باشعور و غیرت مند مومن کے نقطہ نظر کو واضح و متعین کرتا ہے۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ میں یہ واقعہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، میں نے جب اس واقعہ کو پڑھا اور اس کی وسعت و گہرائی پر غور کیا تو تصویر حیرت بن کر رہ گیا، معلوم نہیں اس واقعہ کے مطالعہ میں آپ کے ساتھ بھی یہ بات پیش آئی یا نہیں؟

ایسا بہت ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی واقعہ کو پڑھ کر عجیب و غریب نتائج نکالتا ہے اور اس کی وسعت و گہرائی پر انگشت بدنداں ہو جاتا ہے، دوسرے بہت سے لوگ اس کو روا روی میں پڑھ جاتے ہیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، چاہے وہ پہلے پڑھنے والے سے زیادہ وسیع المطالعہ ہوں اور تاریخ پر ان کی گہری نظر ہو۔

اس واقعہ کو عرب مورخین نے اپنے مزاج و عادت کے مطابق بڑی سادگی اور اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کی تفصیل و گہرائی میں نہیں گئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایرانی سپہ سالار رستم نے ہمارے امیر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے جو ایرانی محاذ پر اسلامی فوج کے کمانڈر تھے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں میں سے ایک شخص کو بھیج دیں، جس سے وہ اس جنگ کے اسباب و وجوہ معلوم کرے جو بے سان و گمان چھڑ گئی ہے ان کے تو حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ عرب کے یہ بدو جنھیں تن ڈھکنے کے لیے کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لیے خشک روٹی بھی نصیب نہیں ان سے اس طرح برسر پیکار ہوں گے، عرب تو صدیوں سے دنیا سے الگ تھلگ صحرا میں زندگی گذارنے پر قانع تھے پھر اچانک یہ صورت حال کیونکر پیش آئی، یہ لوگ تو دنیا سے الگ تھلگ اور سادہ زندگی گذارنے پر قانع تھے انھیں ملک گیری اور پاس پڑوس کی حکومتوں پر لشکر کشی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اپنی طویل تاریخ میں جب اس وقت وہ روم و فارس سے جنگ آزما ہوئے تو دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اہل روم و ایران جن سے براہ راست مقابلہ تھا حیران و ششدر تھے کہ یہ بلائے ناگہانی کہاں سے آ پڑی۔

بہر کیف حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ربعی بن عامر کو رستم کے پاس بھیجا، رستم نے اپنے

دربار کو ایسا سجایا تھا، بلکہ مرعوب کرنے کے لیے ایسے غیر معمولی طریقے اپنائے تھے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے۔ اس نے اپنے دربار کو سنہرے گاؤ تکیوں، ریشمی فرش و فروش اور جگمگاتے ہوئے ہیرے جواہرات سے سنوار رکھا تھا، غرض یہ کہ زیب و زینت کے جو بھی اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا کر لیے تھے اور خود تاج پہن کر سونے کے تخت پر بیٹھا تھا، اس حال میں حضرت ربعی بن عامر دربار میں داخل ہوئے وہ صحرا سے نکل کر آئے تھے ایسے ٹیپ ٹاپ اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایسی سجاوٹ سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس آن بان کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ جاتے، مگر انھوں نے تو کچھ اور ہی سبق پڑھا تھا ان کے دل کی دنیا اس دربار کی جگمگاہٹ سے کہیں زیادہ تابناک و منور تھی دربار کا یہ حسین منظر ان کو بچوں کا کھلونا معلوم ہو رہا تھا، وہ انتہائی وقار و تمکنت کے ساتھ رستم کے پہلو میں اس اطمینان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے جیسے اپنے کسی بے تکلف رفیق دوست کے ساتھ بیٹھے ہوں۔

گفتگو شروع ہوئی رستم نے پوچھا آپ کے آنے کا مقصد اور غرض و غایت کیا ہے؟ حضرت ربعی بن عامرؓ نے نہایت سنجیدگی و متانت کے لہجہ میں فرمایا۔ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے کہ بندوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی کی طرف بلائیں اور ان کو دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت اور کشادگی کی طرف لائیں، مختلف مذاہب کے ظلم و جور سے نجات دلا کر اسلامی عدل و انصاف میں داخل کریں، خدا نے ہم کو اپنا دین لیکر اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے کہ ان کو خدا کی طرف بلائیں اور اس کی دعوت دیں۔

دوستو اور بھائیو میرا یہ منشا نہیں کہ اس سادہ و معنی خیز واقعہ کے تینوں اجزاء کی تشریح و وضاحت کروں میں اس وقت قصہ کے صرف ایک جز کی وضاحت و تشریح کرنا چاہتا ہوں، اس باشعور مرد مومن نے رستم کو اس وقت مخاطب کیا جب وہ شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کی انتہائی منزل پر ہے راحت و آسائش کے سارے اسباب مہیا تھے مگر یہ بندۂ خدا کہتا ہے کہ۔ دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف لائیں۔ مجھے ان کے اس جملہ پر کہ " بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف بلائیں "۔ حیرت و تعجب نہیں نہ ان کے اس جملے پر حیرت ہے کہ ۔" مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کریں " یہ تو ان مسلمانوں کے لیے ایک

بدیہی حقیقت تھی جن کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا عقیدہ بٹھایا تھا اور ایمان و یقین کا بیج بویا تھا، اور کفر و شرک اور فسق و فجور کو ان کے لیے مبغوض بنا دیا تھا، وہ بندگان خدا شرک و بت پرستی اور انسان کی اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے سر خمیدگی کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کو اس سے گھن آتی تھی، ان کا ذوق سلیم اس سے ابا کرتا تھا۔

حضرت ربعی بن عامرؓ پر یہ حقیقت بھی عیاں تھی کہ ایران کے بادشاہوں اور حکمرانوں نے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرتے ہیں جو خدا بندوں کے ساتھ کرتا ہے — وہ برتاؤ نہیں جو آقا غلام کے ساتھ کرتا ہے — لوگ ان کے سامنے جھکتے ہیں زمین بوس و سجدہ ریز ہوتے ہیں، ان کے عوام کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہوں اور حکام کا طبقہ عام انسانوں سے بلند و برتر اور مقدس ہے، ان کی رگوں میں خدائی خون جاری ہے۔

اور ان مردان حق کا ایمان و عقیدہ یہ تھا کہ پاک و مقدس صرف خدا کی ذات ہے اور دین اسلام ہی برحق و سچا خدائی دین و قانون ہے، اس کے علاوہ جو بھی ادیان و مذاہب پائے جاتے ہیں وہ حقیقت سے بہت دور اور ظلم و جور کا سرچشمہ بن چکے ہیں، وہ انسانوں کو انسانوں ہی کا غلام و پرستار بناتے ہیں، انسانی کنبہ کو دینی پیشواؤں اور راہبوں کے تابع کرتے ہیں اور ان کو ایسی پابندیوں، بیڑیوں اور پھندوں میں جکڑتے ہیں جس کا خدا کی طرف سے کوئی ثبوت نہیں۔

ان بندگان خدا نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو سنا اور پڑھا تھا۔ (الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل یأمرهم بالمعروف وینهاهم عن المنکر ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم إصرهم والاغلال التی کانت علیهم۔[۱]

جو لوگ کہ ایسے رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔

---

[۱] سورۂ اعراف آیۃ ۱۵۷

انھوں نے خدا کا یہ فرمان بھی سنا تھا۔ (یا ایھا الذین آمنوا إن کثیرًا من الاحبار والرھبان لیاکلون أموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللّٰہ)[1] اے ایمان والو بہت سے عالم و درویش لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

انھوں نے یہ آیات قرآنی پڑھی تھیں اور ان پر ایمان لائے تھے اور جن ادیان و مذاہب سے وہ واقف تھے مثلاً روم کے نصرانی، فارس کے مجوسی اور مدینہ کے یہودی، ان کے اندر قرآن کے بیان کیے ہوئے ان حقائق کو دیکھ رہے تھے۔ ان آیات و تعلیمات کی روشنی میں اگر ربعی بن عامرؓ یہ فرماتے کہ ہم بندوں کو دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف بلانے اور نکالنے کے لیے آئے ہیں تو حیرت کی بات نہیں تھی اس لیے کہ یہ انھوں نے پڑھا تھا اور اس آخرت پر ایمان رکھتے تھے جس کو وسعت لامحدود اور بقاء و دوام حاصل ہے، وہ اس جنت پر ایمان رکھتے تھے جس کی نعمتوں، راحتوں اور وسعت کی کوئی حد نہیں۔

انھوں نے قرآن کریم میں جس کا ایک ایک فرمان ان کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا۔ یہ پڑھا تھا کہ لپکو اور بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے۔ جو احکام خداوندی کا پاس و لحاظ رکھنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے، انھوں نے غزوۂ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا تھا کہ۔ اس جنت کی طرف بڑھو جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے۔ اور یہ بھی فرماتے سنا تھا کہ جنت کے اندر ایک کوڑے بھر کی جگہ بھی دنیا و ما فیہا سے افضل و بہتر ہے۔ اس نبوی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں اگر وہ کہتے کہ ہم ان کو دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف نکالنے آئے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی اس لیے کہ ان کو یہی سبق پڑھایا گیا تھا۔

تعجب و حیرت ان کے اس جملہ پر ہے کہ "دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف لائیں"۔
وہ کون سی تنگی تھی جس میں اہل فارس گھٹ رہے تھے، اور وہ کیا وسعت تھی جو عربوں کو حاصل تھی کہ ربعی بن عامرؓ نے ان سے بے تکلف فرمایا کہ اے بدنصیب و دکھ درد کے مارے ہوئے ایرانیو! ہم تم کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت و کشادگی میں لانا چاہتے ہیں۔

کیا عرب جس حال میں تھے وہ وسعت کہلانے کے لائق تھی، اور ایرانیوں کو جو عیش و تنعم

---

[1] سورۃ توبہ آیۃ ۳۷

حاصل تھا اس کو تنگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ پھر ان کے اس جملے کا آخر راز کیا ہے؟ آئیے ہم تاریخ کے صفحات میں اس حقیقت کو تلاش کریں، اس لیے کہ تاریخ وہ دو ٹوک حقیقت پیش کرتی ہے، عربوں، رومیوں اور ایرانیوں کی تاریخ مرتب و مدون ہے اس میں شک و شبہات کی گنجائش نہیں، اس کو سچے اور ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے اس کو مختلف روایتوں اور معتبر طریقوں سے تائید بھی حاصل ہے، اگر عرب وسعت و کشادگی اور خوشحالی کی زندگی گذار رہے تھے تو یہ بات ان راویوں سے پوشیدہ و مخفی نہیں تھی کہ تاریخ اس سے سکوت اختیار کرتی، اسی طرح ایرانی اگر عسرت و تنگی کی زندگی گذار رہے تھے تو یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے اور تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ رومی و ایرانی نہایت خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی گذار رہے تھے بلکہ دل کھول کر داد عیش دے رہے تھے، دنیا کا دامن ان کے لیے وسیع و کشادہ تھا اور ان کی زندگی سامان راحت و آسائش سے بھری ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سدا بہار تھی۔

دوسری طرف عربوں کی زندگی اس کے بالکل برعکس تھی، وہ سادہ اور موٹی جھوٹی زندگی گذارنے کے عادی تھے، یہ حضرت عمر فاروقؓ کا عہد خلافت تھا اور مسلمان اپنی عربی اسلامی فطرت پر قائم تھے، تہذیب و ثقافت کا دائرہ ابھی تک اتنا وسیع و پرپیچ نہیں ہوا تھا، جتنا بعد کے زمانہ میں ہوا۔ خود خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کی زندگی بھی نہایت سادہ و زاہدانہ تھی اور عام مسلمانوں کی بھی۔

عربوں کی اس زندگی کو رومی و ایرانی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انھیں بدوی اور پسماندہ سمجھتے تھے انھیں ان کی عسرت و تنگی پر ترس آتا تھا جب تصویر کا صحیح رخ یہ ہے اور عربوں کی وسعت اور ایرانیوں کی تنگی کی حقیقت وہ ہے جس کی تفصیل اوپر گذری۔ تو ہم اس مردِ مومن کے جملہ پر (کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالنے کے لیے آئے ہیں) غور کریں اس کی گہرائی میں جائیں اور جائزہ لیں کہ اہل فارس کس تنگی و گھٹن میں مبتلا تھے جس پر اس عرب مسلمان نے اظہار افسوس کیا، اور وہ کون سی وسعت و فراخی تھی جو عربوں کو میسر و حاصل تھی جس پر اس صحابی جلیل نے تشکر و امتنان کے لہجہ میں اظہار فخر کیا۔ کیا ان کا

قول شاعرانہ لن ترانی اور مبالغہ پر مبنی تھا، حاشا وکلا مبالغہ آرائی عربوں کا مزاج نہیں تھا وہ حقیقت پسند تھے، اسلام نے امت مسلمہ کے کسی فرد کو اس کی اجازت نہ دی تھی کہ وہ فخر و غرور کا مظاہرہ کرے اور شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے کام لے وہ مبالغہ آمیزی اور مہمل و بے معنی باتیں کرنے سے بہت بلند و برتر تھے، بے لاگ و دو ٹوک بات کرنا ان کی سرشت و مزاج میں داخل تھا۔

جب حقیقت یہ ہے تو پھر آخر وہ کون سی تنگی تھی جو ان کو نظر آرہی تھی، وہاں کی صورت حال تو یہ تھی کہ ایران کی اس عظیم و پرشکوہ شہنشاہی کی حدود میں داخل ہوتے ہی ان کی شان و شوکت آرائش و زیبائش اور انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا، انھوں نے وہاں عیش و تنعم کے گرانقدر ساز و سامان، تہذیب و تمدن کی پوری جلوہ گری، ساز و نغمہ کی سحر آفرینی و فتنہ سامانی دیکھی تھی۔ آنکھوں کو خیرہ و چکاچوند کر دینے والے اس تمدن کو دیکھا تھا جو عروج و ترقی کے آخری نقطہ پر تھا، اہل فارس نے اپنی ذہانت و نکتہ آفرینی اور صدیوں کے تجربہ اور بے شمار ساز و سامان اور زبردست فتوحات سے اس میں چار چاند لگا دیے تھے، اس ملک میں بڑے بڑے شہر اور پرشوکت عمارتیں تھیں، ہرے بھرے باغات اور دلفریب پارک تھے، خوبصورت و دیدہ زیب بازار تھے، انوکھے اور دور دراز ملکوں سے حاصل کیے ہوئے سامان تھے۔

دوستو اور بھائیو۔ یہ عرب آخر کس قماش و کس خمیر کے لوگ تھے جو ان دلکش مناظر و مظاہر کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اور یہ حسن و جمال جسے دیکھ کر انسان دیوانہ ہو جائے ان کی نگاہوں میں جچتا نہیں تھا، ان کے اس جملہ پر کہ "اے اہل فارس ہم کو خدا نے بھیجا ہے کہ تم کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف لائیں" ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن اگر ہم ذرا غور کریں اور وسعت و تنگی کے ان کے معیار کو سمجھ لیں تو یہ حیرت دور ہو جائے گی، وہ مردان خدا ان بادشاہوں اور حکام کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے عقلمند و دانا انسان اس گڑیا کو دیکھتا ہے جس کو خوبصورت و عمدہ کپڑے پہنا دیے گئے ہوں، ربعی بن عامر ان امراء و حکام کو ان مورتیوں کی طرح دیکھ رہے تھے جو بڑی مہارت سے بنائی گئی ہوں اور ان کے بنانے والوں نے اچھی طرح ان کے نوک و پلک درست کیے ہوں، مگر مورتی تو مورتی ہی ہے پتھر کی ہو یا سمنٹ و چونے کی، نہ اس میں روح و زندگی ہے نہ چلنے پھرنے کی قوت و طاقت، ایرانی امراء و حکام کی حالت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

حضرت ربعی بن عامرؓ لشکر اسلام کے ایک فرد تھے وہ رستم کو اس نظر سے دیکھ رہے تھے جیسے سونے کے پنجرے میں کوئی پرندہ پلا ہوا ہو، اسی طرح کسریٰ (یزدجرد) جس کو انھوں نے ابھی تک دیکھا نہیں تھا ان کے نزدیک ایک بلبل وطوطا یا کسی اور خوبصورت چڑیا کی طرح تھا، بے وہ بہر حال قید میں۔ یہ چڑیا پنجرے میں رہتی ہے پنجرا سونے کا ہے اس کی تیلیاں سونے کی ہیں چڑیا جن برتنوں میں کھاتی پیتی ہے وہ بھی سونے کے ہیں، مگر وہ کھلی ہوئی فضا میں آزادی کے ساتھ اڑنے اور پر پھیلانے کی نعمت سے محروم ہے۔

آپ بتائیں کہ کوئی بھی انسان جو زندگی کی قیمت اور حقیقت سے واقف ہے، آزادی وشعور کی لذت سے واقف ہے، علم وعقل کی قیمت سے واقف ہے، کیا یہ انسان جس کو خدا نے انسانیت کا شرف بخشا ہے وہ اس مقید پرندے کو رشک و لالچ کی نظر سے دیکھے محض اس لیے کہ وہ سونے کے پنجرے میں ہے اور پیچ مکان بلکہ اون کے خیمہ میں رہتا ہے، بلکہ ہم اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ کیا ہم کسی پالتو کتے پر رشک کریں گے؟ وہ کتا جسے اس کا یورپین آقا عمدہ عمدہ کھانے اور میوے کھلاتا ہے اس کو دودھ پلاتا ہے اس کو سونے کا پٹکا پہناتا ہے اس کو نرم وگداز بستر پر سلاتا ہے۔

دوستو اور بھائیو۔ حضرت ربعی بن عامرؓ رستم، کسریٰ (یزدجرد) اور ایرانی حکومت کو بالکل اسی نظر سے دیکھ رہے تھے جس نظر سے ہم پالتو پرندہ کو سونے کے پنجرے میں دیکھتے ہیں یا کسی یوروپین کے پالتو کتے کو اس کی گود میں اور موٹر میں دیکھتے ہیں۔

محترم دوستو اور بھائیو! اس کا راز یہ تھا کہ حضرت ربعی بن عامرؓ جس دین پر ایمان رکھتے تھے، جس دعوت کے حامل تھے، وہ جس شخصیت کے مالک تھے، اور جس خدا کے تابع فرمان تھے، وہ قرآن جس کو انھوں نے پڑھا تھا اور جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا، اس پر ان کو ناز تھا، ان کی ایک ایک رگ میں ایمانی حرارت کی لہر دوڑ رہی تھی، وہ ان اقدار و معانی اور ان حقائق پر نازاں تھے جو اس ظاہری حسن وجمال سے کہیں بلند تھے، یہی وجہ تھی کہ ایرانیوں کا یہ سحر آفریں تمدن ان کو متاثر نہ کر سکا اور اس کی فتنہ سامانیاں ان پر اپنا جادو نہ چلا سکیں، وہ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ رستم چاہے جتنا بڑا سپہ سالار اور قائد وحکمراں ہو مگر وہ آگ کی پوجا کرتا ہے، وہ اپنے نفس کا غلام

ہے ایسے ہی جیسے اپنے آقا (یزدجرد) کا غلام ہے اور اپنی عادات و خواہشات کا غلام ہے۔

مسئلہ صرف رستم یا کسی ایک جنرل یا گورنر کا نہیں تھا بلکہ تمام اہل فارس کا اپنے آقاؤں کے ساتھ بشمول "یزدجرد" یہی معاملہ تھا، یزدجرد نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اپنی خواہشات کا غلام ہے یا اپنے غلاموں کا غلام ہے کہ ان کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا تھا، اس کی نقل و حرکت انھیں کے کاندھوں پر ہوتی تھی، وہ کسی اعتبار سے بھی ایک آزاد انسان نہ تھا، بلکہ وہ ایسا انسان تھا جس کو خواہشات نے غلام بنا رکھا تھا، عادات و اطوار نے غلام بنا رکھا تھا، رسم و رواج نے غلام بنا رکھا تھا۔ وہ ادنیٰ حیوانی جذبات کا غلام تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ "یزدجرد" ان دو بڑے بادشاہوں میں سے ایک تھا، جنھوں نے دنیا کے متمدن و ترقی یافتہ حصوں کو تقسیم کر لیا تھا۔ ایران کا "کسریٰ" روم کا "قیصر"

اسلامی فتوحات کے سلسلے میں تاریخ کا میرا تازہ مطالعہ یہ ہے کہ ایرانی بادشاہت رومی بادشاہت سے بڑھی ہوئی تھی، ہندوستان کے متعدد صوبے ایرانیوں کے زیر فرمان تھے ان میں سے بعض ایسے صوبے بھی تھے جو ہندوستان کے اندرونی علاقہ میں واقع تھے۔ لیکن اس صاحب شان شوکت بادشاہ کے بارے میں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب وہ اپنے پایۂ تخت "مدائن" سے جان بچا کر بھاگا ہے اور پناہ گزینی و فرار کی حالت میں تھا اس وقت بھی اپنے ساتھ ایک ہزار باورچی لیے ہوئے تھا۔ ایک ہزار باورچی۔ کیا آپ کو یقین آئے گا؟ اور ایک ہزار "گویے" اس کے ساتھ شکروں اور چیتوں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ہزار خدام بھی تھے، اس کے باوجود وہ نہایت رنج و غم کے ساتھ آہ سرد بھر کر کہتا تھا کہ افسوس میں اپنے ساتھ خدم و حشم اور کارکنوں کی تھوڑی تعداد لے سکا، اور لوگوں سے کہتا تھا کہ میں تعزیت اور دلجوئی کا مستحق ہوں، کیا ایسے شخص کو آزاد و خوش بخت کہا جا سکتا ہے؟ خود مختار و با ارادہ کہا جا سکتا ہے؟ مورخین نے لکھا ہے کہ اسی حالت فرار میں جب اس نے ایک بوڑھی عورت کے یہاں پناہ لی اور بڑھیا نے اس کو کھانا پیش کیا اور یہ بھانپ کر کہ یہ کوئی بادشاہ و معزز شخص ہے اظہار افسوس کیا۔ اس نازک گھڑی میں بھی جبکہ جان کے لالے پڑے تھے یزدجرد نے کہا کہ مجلس رقص و سرود کے بغیر یہ کھانا میرے حلق سے اتر نہیں سکتا۔ ان کی خواہشات کی بندگی و غلامی اور ناروا عادات کی پابندی اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ وہ طاؤس و رباب کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتے تھے، ہمیں یاد ہے کہ اہواز کا بادشاہ "الہرمزان" جب قید ہوا اور خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کی خدمت میں مدینہ منورہ لایا گیا تو اس وقت

حضرت عمرؓ مسجد کے اندر اپنی ٹوپی کا تکیہ بنائے ہوئے سو رہے تھے لوگوں کی آواز سنکر بیدار ہو گئے اور ہرمزان و حضرت عمرؓ کی گفتگو شروع ہوئی، دوران گفتگو میں ہرمزان کو پیاس لگی اور اس نے پانی مانگا ایک موٹے سے بڑے پیالے میں پانی لایا گیا۔ پیالہ کو دیکھ کر ہرمزان نے کہا کہ میں پیاسا مر جاؤں گا مگر اس جیسے بھدے پیالہ میں پانی نہیں پی سکتا۔ پھر دوسرے پیالہ میں پانی لایا گیا تو اس نے پانی پیا۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی، تم کو خدانے اسلام کی یہ دولت عطا فرمائی جس نے تم کو ہزار بندگیوں سے نجات دی، تمھیں ان بتوں سے نجات دی جنھیں انسان خود بناتا ہے، اپنے ہاتھوں سے تراشتا ہے اور اسی کا غلام بن جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "أتعبدون ما تنحتون" کیا تم ان کو پوجتے ہو جنھیں خود تمھارے ہاتھوں نے بنایا ہے۔ دوستو ہماری بہت سی ایسی عادتیں ہیں جن کو ہم خود اختیار کرتے ہیں اور پھر اس کے پابند و غلام بن جاتے ہیں، انسان اس وقت تک معزز نہیں ہو سکتا جب تک ایک خاص طرز کے مکان میں نہ رہے، مخصوص معیار کا کپڑا نہ پہنے، تراش خراش و ٹیپ ٹاپ کا لحاظ نہ رکھے، اس کے پاس فلاں فلاں ساز و سامان، فرنیچر اور لباس ہونا چاہیے، ہم جس زمانہ کی بات کر رہے ہیں اس میں یہی سب تو ہو رہا تھا جو آج ہم کر رہے ہیں۔ ایرانی کسی بڑے آدمی کو جس کی ٹوپی ایک لاکھ سے کم کی ہو عار دلاتے تھے، اور جو متوسط درجہ کا ہوتا اس کی ٹوپی پچاس ہزار کی ہوتی، ان کے رؤسا کا صرف پٹکا پچاس ہزار کا ہوتا تھا، یہ عرف و معیار لوگوں کی ایجاد ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کا پابند نہیں بنایا۔

یہ مغربی تہذیب و تمدن، خود ساختہ رسم و رواج، بے معنی پابندیاں اور گڑھی ہوئی اصطلاحات جن کو اہل یورپ نے اور ان کے وفادار شاگردوں نے خود سے اپنے اوپر لاد لیا ہے، اس کا سرچشمہ کیا ہے، یہ پابندیاں کہاں سے آئیں جن کو ہم نے ضروری سمجھ لیا ہے، آج ہم اس مغربی تہذیب کے سامنے اس سراب صحرا اور حباب دریا کے سامنے بلکہ صحیح معنوں میں اس لاشۂ بے جان و متعفن کے سامنے جسے یورپ اپنے کاندھوں پہ لیے پھر رہا ہے اور سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے کہاں ڈالدے ہم اس کے سامنے سپر انداز ہو گئے اور فطرت کی اس سادگی سے دور و تہی دست ہو گئے جس میں عرب

مشہور تھے اور جو امت مسلمہ کے پیشواؤں اور مربیوں نے مسلم قوم کو عطا کیا تھا، جیسے حضرت عمرؓ بن الخطاب[1] حضرت ربعیؓ بن عامر اپنی دوربینی، قوت ایمانی اور علمی گہرائی کی وجہ سے اگو وہ بہت سے علم و تمدن کے دعوے داروں کی نگاہ میں تنگ نظر تھے) ان لوازمات کو جنھیں ایرانیوں نے اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا، طوق و سلاسل، بیڑوں کی بیڑیاں اور گلے کا پھندا سمجھ رہے تھے، وہ اس سے پوری طرح واقف نہ تھے مگر جتنا جانتے تھے وہ بہت تھا اور شہادت کے لیے کافی تھا۔ اور اسی اعتماد و بنیاد پر انھوں نے کہا کہ اے ایرانیو! اللہ نے ہم کو بھیجا ہے کہ تم کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالیں، تمھاری خود بینی تم کو دھوکے میں نہ ڈالے، ظاہری نمود و نمائش تمھیں فریب نہ دے، تم پنجرہ میں زندگی گزار رہے ہو، پنجرہ بہر حال پنجرہ ہے چاہے وہ سونے ہی کا کیوں نہ ہو اور خواہ وہ خوبصورت قیمتی شیشے کا بنا ہوا ہو اور وسعت میں کسی شہر کے برابر ہو لیکن ہے تو وہ پنجرہ ہی۔ جیل خانہ کیا ہے؟ وہ قید خانہ کیوں کہلاتا ہے؟ کیا وہ وسیع نہیں ہوتا؟ کیا اس میں کمرے نہیں ہوتے جو عام طور پر متوسط طبقہ کے لوگوں کو میسر نہیں ہوتے، اس سب کے باوجود وہ قید خانہ ہی کہلاتا ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص جیل میں رہنا پسند نہیں کرتا چاہے وہاں لطف و راحت کے کتنے ہی سامان مہیا ہوں، اور خواہ وہ کتنا ہی کشادہ اور وسیع ہو، اس میں پارک و چمن ہوں، جھیل و تالاب ہوں، اور میوزیم و تفریح گاہیں ہوں۔

دوستو۔ یہ صاحب فہم و ذکا اور باشعور عرب مسلمان جو احساس کمتری کا شکار نہیں تھا، جو شکست خوردگی اور خود اعتمادی کے فقدان سے بالکل محفوظ تھا، وہ مرد مومن اگر اس وقت تک زندہ ہوتا تو مغربی تہذیب کی تقلید اور عیش و تنعم کی اس زندگی کو، جو عرب، اور بہت سے اسلامی ملکوں کے مسلمان گزار رہے ہیں اسی نظر سے دیکھتا جس نظر سے رومی و ایرانی تمدن کو دیکھا تھا، اور ان پر ایسے ماتم کرتا جیسے اس نے رومیوں اور ایرانیوں پر ماتم کیا تھا، اور فکر و آرزو کرتا کہ ان کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف لائے، جیسے اس نے رومیوں اور ایرانیوں کے لیے تمنا کی تھی۔

---

[1] حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عرب عاملوں کو، جو عجمی ملکوں میں رہتے تھے لکھا تھا کہ تم عجمیوں کی خو بو اختیار کرنے سے بہت بچنا تم دھوپ میں رہنے کی عادت رکھو کہ وہ عربوں کا حمام ہے، تم معد بن عدنان کا رہن سہن اپناؤ، موٹا جھوٹا کھاؤ اور موٹا جھوٹا پہنو۔ (رواہ البغوی عن عثمان النہدی)

یہ عرب مسلمان آزادی کی وہ پر لطف زندگی گذار رہا تھا جو اسلام نے عطا کی تھی اور جس نے اسے تنگ و محدود اور گھٹتی ہوئی دنیا سے نکالا تھا، پیٹ اور مادہ پرستی کی دنیا، اغراض و خواہشات کی دنیا، بندگی و بندہ سازی کی دنیا، — اسلام نے ان کو مٹنے والی دنیا، فانی، افکار و امراض اور غم و آلام کی بے لطف دنیا سے نکال کر وسیع و لامحدود دنیا میں پہنچا دیا تھا، وہ تھی ایمان و یقین کی دنیا، قلب و روح کی دنیا، قربانی و دستگیری کی دنیا، عدل و مساوات کی دنیا، رحم و کرم کی دنیا، دلبری و اخلاص کی دنیا، بقاء و دوام کی دنیا، وہ دنیا جس میں تکدر و بے لطفی نہیں، جس میں خوف و اندیشہ نہیں، رنج و غم نہیں،

حضرت ربعی بن عامرؓ کو دنیا کی یہ وسعت اور اس کا وہ لطف و مزہ حاصل تھا جس سے رومی و ایرانی دونوں محروم تھے، اور ان کو روم و ایران کا تمدن اور ان کی زندگی ایک تنگ پنجرہ معلوم ہو رہی تھی، جس میں ایک آزاد، بوحوصلہ مند انسان اور صاحب عقل و شعور مومن کا دم گھٹنے لگے، جیسے مچھلی کہ اگر اس کو پانی سے نکال دیا جائے تو چاہے کتنے ہی گداز و ملائم بستر، یا سونے کی شاندار ڈبیا میں رکھ دیا جائے مگر اس کا دم گھٹنے لگے گا۔

حضرات یہ تو ایک بادیہ نشین مسلمان کا نقطۂ نظر تھا جس نے تپتی ہوئی ریت اور جھلستے ہوئے صحرا کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا، مگر ہم پڑھے لکھے اور مہذب و شائستہ لوگوں کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ پروفیسرو، یونیورسٹیوں کے لکچررو، تعلیم و تربیت کے علم بردارو، صحافیو اور یورپ کا دورہ کرنے والو، بتاؤ کہ ہم اس موجودہ بے روح اور کھوکھلی تہذیب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ ہمارے نقطۂ نظر اور اس صحرا نشین مردِ مومن کے نقطۂ نظر میں کوئی مناسبت ہے؟ جو دنیا سے اتنا واقف نہ تھا جتنا ہم واقف ہیں۔ جس کی تاریخ پر ایسی گہری نظر نہ تھی جیسی ہماری ہے، وہ قوموں کے حالات و تجربات سے اتنا واقف نہیں تھا جتنا ہم واقف ہیں، اس نے نہ فلسفہ پڑھا تھا اور نہ ہماری آپ کی طرح اس پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کا راز یہ ہے کہ اس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور دین اسلام نے اعتماد و خودداری، ایمان و جوانمردی کی دولت بھر دی تھی، انھیں دنیا کی بے بضاعتی کا یقین اور حقیقت شناسی کا جوہر عطا کیا تھا، یہ مردِ مومن اس وقت کی موجودہ دنیا کے سپہ سالار اعظم "رستم" جس کے نام سے دل لرزتے تھے کسریٰ کے بعد اس کا جاہ و جلال تھا، ایران کے تمام سپہ سالار دل

اور حکام پر اسی کا سکہ چل رہا تھا، اس سے وہ بوریہ نشین اور صحرا نورد مومن، جرأت و بے باکی اور حقارت و استخفاف سے بھرپور لہجہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ رستم مجھے تم پر ترس آتا ہے، تمہاری حالت زار سے میرا دل بھر آتا ہے، تم بے معنی رسوم و رواج کے پھندوں میں جکڑے ہوئے ہو، تم دنیا کی تنگی میں ہو اور ہم عرب جن کے جسم نیم برہنہ، تلوار کی نیامیں بوسیدہ و کرم خوردہ، کپڑے پھٹے ہوئے پیوند زدہ اور جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں، اس سب کے باوجود ہم جنت میں ہیں اور عیش کی زندگی گذار رہے ہیں اور تم عذاب جہنم کی زندگی گذار رہے ہو۔

بھائیو! آخر کس قوت و طاقت، کس جذبہ و حوصلہ نے ان سے یہ جرأت مندانہ اور طاقتور بات کہلوائی، وہ کیا جوہر تھا جس نے ان سے یہ جھنجھوڑنے اور لرزہ براندام کر دینے والا جملہ کہلوایا — یہ ان کی ایمانی طاقت، ان کی خود اعتمادی اور اس پیغام و تعلیم کا کرشمہ تھا جس سے خدا نے ان کو نوازا تھا۔

دوستو ہم میں کتنے ایسے لوگ ہیں، خدارا آپ بتائیں کہ ہماری یونیورسٹیوں اسکولوں، دفتروں، شعروادب اور صحافت کے میدان میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو کسی یوروپین یا امریکن کو اس لب و لہجہ میں مخاطب کر سکیں، جو ہمارے ہی خوشہ چیں ہیں ہم ہی ان کو پال رہے ہیں۔ اگر یہ پٹرول نہ ہوتا جو آپ کے جزیرہ میں ابل رہا ہے، تو کسی امریکن و یوروپین کو یہ قوت و غلبہ ہرگز نہ حاصل ہوتا، وہ یوروپین جن کے ایمان و اخلاق اور خود شناسی کا دیوالیہ ہو چکا ہے، جو اس وقت اخلاقی جذام میں مبتلا ہے اور جس کی وجہ سے اس کی تہذیب و ثقافت، تعفن و بدبو کا شکار ہے، اور اس کی سمجھ میں اس کا کوئی علاج نہیں آرہا ہے اور نہ وہ اس پر کوئی کنٹرول کر پا رہا ہے، وہ ایک ہوشیار، خود غرض اور نفع خور تاجر ہے، وہ مدتوں پہلے اپنی گردن سے عیسائیت کا قلادہ اتار چکا ہے، حسن اخلاق، انبیاء کرام، اور آسمانی مذاہب سے تعلق کا اس کا آخری دھاگہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم اس کو اکرام و اعزاز اور تقدس و معبودیت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور خود کو، اپنی تہذیب کو، اخلاقی قدروں اور اپنے ذہن کو، ان کی تہذیب و قدروں کے سامنے حقیر سمجھتے ہیں، اور اس کے سامنے اس طرح بے حقیقت ہو جاتے ہیں جیسے سورج کے سامنے شبنم پگھل جاتی ہے، یا آگ کی لو کے سامنے موم پگھل جاتا ہے۔

یہ عرب مسلمان جس نے اپنے جوہر کو پہچانا، اپنے پیغام کی قیمت و اہمیت کو پہچانا وہ "رستم"
سے کہتا ہے کہ خدا نے ہم کو بھیجا ہے کہ اس کے بندوں کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف
نکالیں۔ ان کا یہ جملہ ایسا قیمتی و باوزن ہے کہ پہاڑ بھی اس کو نہیں سہار سکتے اور سمندر پر رکھ دیا
جائے تو وہ دھواں دھواں ہو جائے، تو دل و ضمیر پر کیا گذرے گی۔ دعوت اسلامی کے دور اول
میں ایک باشعور مرد مومن اپنے عہد کی بے جان تہذیبوں کی طرف جس نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا
آج بھی ایک باشعور و صاحب ایمان شخص کو اپنے عہد کی بے حقیقت اور حقیر تہذیبوں کو اسی نظر
سے دیکھنا چاہیے۔

دوستو۔ آج ہم آپ سے بس اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں، اور اس جگمگاتے اور خوبصورت شہر
میں جو اچانک صحرا سے نکل کر گل بداماں ہو گیا، اور ترقی و عروج کو پہنچ گیا، میں اس مرد مومن کا یہ جملہ
بطور تحفہ و امانت پیش کرتا ہوں۔ یہ صدا میں نے یہاں لگائی ہے مگر میری آرزو و تمنا یہ ہے کہ یہ آواز
دنیا کے کونے کونے میں گونج جائے۔ اللھم اشھد

عربوں کو اور مشرق و مغرب میں جہاں کہیں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ انھیں اس موجودہ بے جان
اور کھوکھلی تہذیب کو جو ہمارے گرد و پیش چھائی ہوئی ہے، اسی مومنانہ اور خود دارانہ نظر سے
دیکھنا چاہیے، ہم کوئی طفیلی اور مجہول النسب لوگ نہیں ہیں۔ ہم اچانک زمین سے نہیں نکل
آئے ہیں کہ ہمارا کوئی حسب نسب اور جڑ بنیاد نہ ہو، ہم ایسے نہیں کہ ہمارا کوئی ورثہ و سرمایہ
نہ ہو، ہماری کوئی تہذیب و تاریخ نہ ہو، نہ ہمارے اسلاف ہوں نہ شرف و منزلت۔ نہیں
ایسا ہرگز نہیں۔ دوستو ہم ہر فضل و کمال سے مالا مال بلکہ نہال ہیں، ہم ساری دنیا کے اتالیق ہیں
قوموں کے رہبر و رہنما ہیں ہم وہ ہیں کہ۔ ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مگر دوستو اس وقت دل تھام کر یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ؎

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

ہم پر مغربی تہذیب کا ایسا جادو چلا ہے، کہ ہم استاذ سے شاگرد بن گئے ہیں، کل ہم ستاروں کو
نشان راہ بتاتے تھے، اور آج ہم خود ہی یورپ کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں، ہماری

باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں ہے، دوستو یہ کتنی دل خراش حقیقت ہے کہ پردہ کے پیچھے سے ڈوری ہلائی جارہی ہے اور ہم مداری کے بندر کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔

خدا ہمارے مسلمان عرب مؤرخوں کی قبر کو نور سے بھر دے۔ جنھوں نے ہمارے لیے اس جادو داں جملے کو محفوظ کر دیا۔ یہ جملہ ہمارے اسلاف کی بلند ہمتی اور قوت ایمانی کی سچی تصویر پیش کرتا ہے، جنھیں خدا نے اسلامی پیغام سے نوازا تھا اور انھیں اس پر فخر و ناز تھا اور وہ اسے ہر شئے سے افضل و برتر سمجھتے تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو چیز اس سرچشمہ سے نہیں نکلتی یا اس سے اس کا رشتہ و تعلق نہیں اس کی نہ کوئی قدر و قیمت ہے نہ اس کو ثبات و دوام ہے۔

دوستو اور بھائیو موجودہ تہذیبوں کے مقابلے میں، اور اس چیلنج کے مقابلے میں۔ جو اس تہذیب اور موجودہ فلسفوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے، ہمارا ابھی وہی موقف ہونا چاہیے جو اس مرد مومن کا تھا۔ ہمارا موقف ایک بلند قامت انسان اور باعزت غیور اور خود دار شخص کی طرح ہونا چاہیے جس کو اپنی شخصیت اور اپنے پیغام پر ناز ہو، جو اپنی عقل سوجھ بوجھ اور خدا داد صلاحیتوں سے کام لیتا ہو، جو اس تہذیب کے تسلیم کرنے اور اس کے رد کرنے میں آزاد و مختار ہو، اس کی مفید و بے ضرر چیزوں کو (جو اس کے مقاصد اور قدروں سے میل کھاتی ہوں اس کے منافی نہ ہوں بلکہ مزید قوت و طاقت پہنچاتی ہوں نہ کہ اس کے ڈھانچہ کو کمزور و کھوکھلا کرتی ہوں) اپنائے اور اس کی مضر چیزوں سے بے تعلق رہے، ان کے مقابلہ میں ہمارا موقف ایک بالشتیہ کا سا نہ ہونا چاہیے جو خود اعتمادی کی دولت کھو چکا ہو، اور دولت ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہو، ہر قوت و طاقت کے سامنے سپر انداز ہو جاتا ہو، اسے زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو، خطر پسندی، مہم جوئی اور حوصلہ مندی کی صلاحیتوں سے محروم ہو اور، حقیقت پسندی، جدت آفرینی اور قیادت و پیشوائی کے جوہر سے خالی ہو، ایسا شخص موجودہ بے روح تہذیب کو اس طرح للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہے، جیسے کوئی چھوٹا بچہ، دامن کوہ میں کھڑا اس کی چوٹی کو دیکھ رہا ہو اور تمنا کرے کہ کاش اس پر چڑھ سکتا۔

میں اپنی گفتگو کا سلسلہ شاعر اسلام "ڈاکٹر محمد اقبال" کے شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں

انھوں نے اس پڑھے لکھے مسلم نوجوان کو مخاطب کیا ہے جو مغربی تہذیب سے مرعوب مسحور ہو کر اپنی شخصیت کھو بیٹھا ہے اور اس کی وسعت و گہرائی، اور اسرار و رموز اور خوابیدہ صلاحیتوں سے ناواقف ہو کر مادیت کا دلدادہ و شیدائی ہو گیا ہے اور موت کے خوف میں زندگی گذار رہا ہے۔ ذرا غور سے سنیے اقبال کیا کہہ رہے ہیں ؎

بینی جہاں را خود را نہ بینی! 　　تا چند ناداں غافل نشینی؟
نور قدیمی شب را بر افروز 　　دست کلیمی در آستینی
بیروں قدم نہ از دور آفاق 　　تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید 　　مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند 　　آدم بمیرد از بے یقینی

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھیے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت .. .. لکھنؤ

وقفۂ اشاعت .. .. ماہانہ

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر کا نام .. .. محمد منظور نعمانی

قومیت .. .. ہندوستانی

پتہ .. .. ۱۳۱- نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ ۱

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۷۷ء　　　(دستخط) محمد منظور نعمانی

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تقلید

مثبت و منفی پہلو

(حمد و صلاۃ، نیز تمہید کے بعد) "تقلید" کے اصطلاحی معنیٰ جیسا کہ متعدد علمائے اصول، مثلاً امام غزالیؒ نے "المستصفیٰ" میں اور ملا محب اللہ بہاری نے "مسلم الثبوت" میں بیان کیے ہیں۔ "دوسرے کی بات (حسن ظن کی بنا پر) بلا دلیل مان لینے کے ہیں"۱؎ یہ صورت ممکن ہے حساس خودی رکھنے والے افراد کو انسانی عظمت یا بالفاظِ صحیح اپنی عظمت اور فکری حریت کے بظاہر منافی، بلکہ اسلام نے جو تفکر و تدبر کا حق دیا ہے اس کے بھی خلاف نظر آئے، لیکن اس کھلی ہوئی حقیقت کا انکار کیسے کیا جائے کہ "تقلید" عام انسانوں کی ایک عملی ضرورت ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ عظیم اکثریت بلکہ غالباً زیادہ صحیح تعبیر یہ ہو کہ ہر انسان اکثر حالات میں "تقلید" ہی کی سواری پر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا اور منزل سے ہم کنار ہوتا ہے۔ یہی طرزِ عمل اس خاکدان کو آباد اور بارونق رکھنے کا ذریعہ، چہل پہل اور اس کی ہمہ جہتی ترقی کا سبب ہے۔ ورنہ اگر تمام لوگوں کو زندگی کی ہر ضرورت کے بارے میں اور اس کے ہر شعبے کے سلسلے میں کامل مہارت حاصل کرنے پر مجبور کیا جاتا تو معمورۂ ارضی میں خاک اڑتی نظر آتی اور آبادیوں کی جگہ ویرانے ہی ہر طرف دکھائی دیتے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دنیا کی ساری نیرنگیاں اور رعنائیاں

۱؎ المستصفیٰ ۱ صفحہ ۳۸۷/۲، مسلم الثبوت مع الشرح فواتح الرحموت صفحہ ۴۰۰/۲ - دونوں کی تعبیروں میں اگرچہ تھوڑا فرق ہے لیکن مفہوم یہی نکلتا ہے۔

درحقیقت ثمرہ ہیں تقلید کا یعنی "دوسروں کی اصابت رائے پر اعتماد کرتے ہوئے بے چون وچرا عمل پیرا ہو جانے کا"۔ یہ مریض کا طبیب کی بات ماننا، مقدمہ کے ہر فریق کا اپنے مشیر قانونی (وکیل یا بیرسٹر) کی رائے پر، اسی طرح مکان بنوانے والے کا آرکیٹکٹ، یا انجینیر کی صلاح پر چلنا، متعلم کا معلم کی راہنمائی قبول کرنا، روزمرہ پیش آنے والے بے شمار شواہد میں سے چند ہیں۔

جب عمرانی اور تمدنی ضرورتوں میں، جن کے اصول ہمارے ہی جیسے انسانوں کے وضع کیے ہوئے ہیں، اس طریقہ کو اپنائے بغیر زندگی کی گاڑی دو قدم نہیں چل سکتی تو یہ کہنا یا سمجھنا کہ شرعی امور میں ہر شخص، یا اشخاص کی غیر معمولی تعداد، اس درجہ خود کفیل ہے کہ اس کے بارے میں اسے دوسروں پر اعتماد کرنے کی چنداں ضرورت نہ پڑے گی اور براہ راست وہ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے، اسلامی اصول اور شریعت کے سرچشموں سے احکام واوامر اخذ کرنے کے لائق اور اور اس کے لیے پوری طرح اہل ہے، غیر حقیقت پسندانہ بات بلکہ خود فریبی ہوگی یا پھر شریعت کی وسعت وپنہائی اور اس کے اصولوں کی گیرائی وگہرائی سے بے خبری کی دلیل۔

براہ راست شرعی مآخذ سے، کسی کی تقلید کیے بغیر احکام کا استنباط، کتنا طویل الذیل اور دشوار کام ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے اس وقت کم از کم ان اہم اور ضروری علوم وفنون کی اجمالی فہرست پیش کر دینا اور ان کا مختصر تعارف کرانا شاید بے محل نہ ہوگا۔ جو اس راہ کے مسافروں کے لیے ناگزیر ہیں، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور قیمتی تصنیف "عقد الجید"[1] میں علامہ بغوی کا جو کلام اس بارے میں نقل فرمایا ہے یہاں اس کا پیش کر دینا کافی ہوگا۔

"المجتهد من جمع خمسة انواع من العلم علم كتاب الله عز وجل وعلم سنة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم۔ واقاويل علماء السلف من اجماعهم واختلافهم وعلم اللغة وعلم القياس وهو طريق استنباط الحكم من الكتاب والسنة اذا لم يجده صريحًا في نص كتاب او سنة او اجماع فيجب أن يعلم من علم الكتاب الناسخ والمنسوخ والمجمل والمفسر والخاص

[1] عقد الجید ص ۵-۶

والعام والمحکم والمتشابه، والکراهة والتحریم والاباحة والندب والوجوب ویعرف من السنة هذه الاشیاء ویعرف منها الصحیح والضعیف والمسند والمرسل ویعرف ترتیب السنة علی الکتاب وترتیب الکتاب علی السنة حتی لو وجد حدیثا لا یوافق ظاهره الکتاب یهتدی الی وجه محمله فان السنة بیان الکتاب ولا یخالفه ......
وکذلک یجب أن یعرف من اللغة ما أتی فی کتاب أو سنة فی أمور الاحکام وینبغی أن یتحرج فیها بحیث یقف علی کلام العرب فیما یدل علی المراد من اختلاف المحال والأحوال...... ویعرف أقاویل الصحابة والتابعین فی الأحکام ومعظم فتاوی فقهاء الأمة حتی لا یقع حکمه مخالفا لأقوالهم فیکون فیه خرق الاجماع .... وإذا جمع هذه العلوم وکان مجانبا للأهواء والبدع مدرعا بالورع محترزا عن الکبائر غیر مصر علی الصغائر جاز له ...... ان یتصرف فی الشرع بالاجتهاد والفتوی"

"مجتہد وہ ہے جو پانچ قسم کے علوم کا جامع ہو۔ کتاب اللہ کا علم، سنت رسول کا علم، علمائے سلف کے اقوال ان کے اختلافات اور اجماعات کا علم، عربی زبان کا علم، اور قیاس کا علم، جو کہ کتاب سنت سے مسائل مستنبط کرنے کا اس وقت واحد ذریعہ ہوتا ہے جبکہ صراحۃً قرآن کریم، حدیث نبوی اور اجماع امت میں اس کا حل موجود نہ ہو۔ اس وجہ سے یہ بھی ضروری ہے کہ ان علوم کے علاوہ ناسخ و منسوخ مجمل و مفسر و خاص و عام، محکم و متشابہ، نیز مکروہ، مباح، مستحب اور وجوب سے بھی کامل واقفیت ہو۔ اور سنت نبوی کے بارے میں بھی ان سب امور کا اسے پورا علم ہو، مزید براں یہ کہ حدیث کی مختلف اقسام مثلاً صحیح ضعیف مسند اور مرسل سے پوری طرح باخبر ہو۔ مجتہد کو سنتِ رسول اور کتاب اللہ کے مراتب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اگر کہیں کوئی حدیث ایسی نظر آئے جو بظاہر کتاب اللہ سے موافقت نہ رکھتی ہو تو اس کے صحیح محمل پر محمول کرنے کی راہ پا سکے کیونکہ یہ مسلم بات ہے کہ سنت نبوی سے کتاب اللہ کی توضیح و تشریح ہوا کرتی ہے تو دونوں میں مخالفت کا کیا سوال؟ اسی طرح زبان و بیان کی ان لفظی باریکیوں کا جاننا بھی ضروری

ہے جو قرآن و حدیث کے اندر ملحوظ ہیں۔ اس لیے مجتہد کے لیے زبان کی گہرائیوں تک اترنا ضروری ہے تاکہ کلام عرب میں "احوال و ظروف" کے اختلافات سے ایک ہی لفظ کی مراد میں جو اختلاف واقع ہو جاتا ہے وہ ان سب پر مطلع ہو کر حقیقی مفہوم و مراد تک پہنچ سکے۔ اسی طرح احکام سے متعلق صحابہ و تابعین کے اقوال کیا ہیں، اور جمہور فقہاء امت کے فتاوی کیا کیا ہیں؟ ان سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس کا فیصلہ ان اقوال کے خلاف نہ ہو، اور خرق اجماع لازم نہ آئے۔ الغرض جب یہ تمام علوم جس کسی شخص میں جمع ہو جائیں پھر اس کے ساتھ وہ ہوا و ہوس اور بد عادتوں سے بھی محفوظ ہو، اور اعلیٰ درجہ کا متقی و پرہیزگار، یعنی گناہ کبیرہ سے بچتا اور صغائر پر اصرار نہ کرتا ہو تو اس شخص کے لیے جائز ہوگا کہ وہ اجتہاد اور فتویٰ کے ذریعہ شرعی مسائل کا استنباط و استخراج کرے۔"

اور پھر اس اجمال کی تفصیل پر اگر نظر کر لی جائے تو یہ راہ اور زیادہ دشوار معلوم ہونے لگتی ہے مثال کے طور پر "کتاب اللہ کے علم" کے مفہوم میں آیات کے لغوی معنیٰ و مفہوم، تمام تفصیلات و مشکلات کے ساتھ جاننے کے علاوہ، ان سے مستخرج احکام کی علتوں اور مقاصد نیز اسالیب کلام سے واقف ہونا بھی شامل ہے مزید برآں الفاظ و معانی کے اعتبار سے مختلف اقسام، مثلاً اشارہ، صراحت، منطوق، مفہوم، نحوی، ظاہر، نص، خفی، مشکل، مجمل، مفسّر، عام، خاص، مطلق، مقید، مشترک، مأوّل نیز حقیقت اور اس کے اقسام (مثلاً مستعملہ، مہجورہ، متعذرہ۔) اور مجاز وغیرہ سے پورے طور پر نہ صرف باخبر ہونا بلکہ ہر ایک کے محل اور اس کی قدر (یعنی یہ کہ کس قسم سے ظنی حکم مستفاد ہوتا ہے اور کس سے قطعی، اور تعارض کی شکل میں کس کو کس پر ترجیح دی جائے گی، یہ اور ان جیسے تمام امور) کی کامل معرفت بھی ضروری ہے، اور یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ "قرآن مجید میں آیاتِ احکام صرف پانچ سو ہیں" قابل غور ہے، کیونکہ اوّل تو اس عدد میں بھی خاصہ اختلاف ہے، چنانچہ امام ابو یوسف سے گیارہ سو اور عبداللہ بن مبارک سے نو سو کا عدد منقول ہے اور اگر پانچ سو کا عدد ہی اختیار کر لیا جائے تو اس کا مطلب علامہ فتوحی کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ دلالت مطابقی (راست طریقہ پر دلالت) کے طور پر احکام پانچ سو آیات سے معلوم ہوتے ہیں ورنہ جیسا کہ علامہ طوفی نے بیان فرمایا (جسے افغانستانی عالم ڈاکٹر موسیٰ "توانا" نے نقل کیا ہے)۔ صحیح تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی آیت ایسی ہو جس سے کوئی نہ کوئی

حکم مستنبط نہ ہوتا ہو (قل أن یوجد فی القرآن الکریم آیة لا یستنبط منها شئ من الأحکام)[1]

مزید برآں کہ امام شافعیؒ نے مجتہد کے لیے پورے قرآن مجید کا حافظ ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے[2]

اور مشہور فقیہہ امام ابو اسحاق شاطبیؒ نے قرآن فہمی کے لیے (زمانۂ جاہلیت کے) عربوں کی عادات و اعتقادات اور احوال کا جاننا بھی ناگزیر بتایا ہے، کیونکہ اس کے بغیر قرآن مجید کے بہت سے مقامات کا سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔[3]

اور "سنت کے علم" کا دائرہ اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے، اس کے اندر مذکورہ بالا امور کے علاوہ حدیث کی سند (رجال و رواۃ کے احوال) جاننا نیز حدیث کے مراتب، صحیح، ضعیف، پھر صحت کے مدارج اور اس کے اقسام متواتر، مشہور، مستفیض، عزیز، غریب وغیرہا اسی طرح ضعف کے اقسام اور وجوہ ضعف مثلاً ارسال، انقطاع، جہالت راوی، تفرد، اضطراب، شذوذ، نکارت، وضع وغیرہ پر کامل اطلاع ضروری ہے، اسی تنوع اور ذیلی در ذیلی قسموں کی وجہ سے حدیث کا فن مشکل ترین فنون میں شمار کیا جاتا ہے، اور یہ ہفت خواں طے کیے بغیر کوئی بھی احادیث سے احکام و مسائل استنباط کرنے کی پوری صلاحیت کا حامل نہیں ہو سکتا، پھر آیاتِ احکام کی طرح احادیثِ احکام کی تعداد میں بھی خاصا اختلاف ملتا ہے، پانچ سو سے لیکر پانچ لاکھ تک کی تعداد کا ذکر ملتا ہے، امام احمدؒ سے اس بارے میں جب دریافت کیا گیا تو انھوں نے چار لاکھ اور ایک روایت کی رو سے پانچ لاکھ حدیث کے حفظ کو فقیہہ بننے کے لیے کافی قرار دیا۔[4]

ان سطروں سے اچھی طرح یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ہر شخص کے بارے میں براہ راست قرآن و سنت سے احکام معلوم کر سکنے کی توقع رکھنا عملاً محال اور اس کا انھیں مکلف کرنا عالم کو ویران کر ڈالنے کے مرادف ہے۔ سچ کہا ہے حجة الاسلام امام غزالیؒ نے:-

......تکلیفه (العامی) طلب رتبة الاجتهاد محال لأنه
یؤدی أن ینقطع الحرث والنسل وتتعطل الحرف والصنائع

---

[1] بحوالہ الاجتہاد ص۱۰ [2] الموافقات ص۳۵۱-۳۵۲ ج۳ للامام الشاطبیؒ [3] ارشاد الفحول ص۲۲۳ للشوکانی مسلم الثبوت ص۳۶۳ ج۲ لمحب اللہ البہاری، اعلام الموقعین ص۵ ج۱ للحافظ ابن قیمؒ المسودہ ص۵۱۵-۵۱۶ لآل ابن تیمیہ (بحوالہ الاجتہاد ص۱۰۵)

ویؤدی الی خراب الدنیا لو اشتغل الناس جملتھم بطلب العلمؒ

"ترتبۂ اجتہاد حاصل کرنے کا ہر کس و ناکس کو مکلف بنانا امر محال ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آخر کار کھیتی کسانی کا سلسلہ منقطع ہو جائے، صنعت و حرفت تباہ ہو جائے اور یہ معمورۂ عالم کسی خرابہ میں تبدیل ہو جائے۔ تمام کے تمام لوگ اگر طلب علم میں منہمک ہو جائیں گے تو اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلے گا؟"

بلکہ عوام کو اجتہاد کرنے کی دعوت دینا ان کے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالنے کا سبب بھی بن سکتا ہے، کیونکہ وہ احادیث مختلفہ اور آیات منسوخہ وغیرہ اور اختلاف علماء کی ظاہری شکل (جو کہ بادی النظر میں مہیب نظر آتی ہے) دیکھ لینے اور ان کے درمیان تطبیق کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی بنا پر نفس شریعت اور صاحب شریعت سے ہی بدگمان ہو سکتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اسلام ہی چھوڑ سکتے ہیں، (اعاذنا اللہ منہ) اور یہ خطرہ صرف ذہنی اور خیالی نہیں رہ گیا ہے بلکہ واقعات کی شکل میں بھی رونما ہو چکا ہے جیسا کہ مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشاعت السنۃ (۲ جلد ۱۱ ص ۵۳) میں ذکر کیا ہے (جسے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے اپنے رسالے "سبیل الرشاد" (ص ۱۶-۱۱۷) میں نقل کیا ہے) "پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔ ان میں بعض عیسائی ہو جاتے ہیں اور بعض لا مذہب" غالباً انہی مصالح کی بنا پر خالق فطرت نے عام انسانوں کو احکام شرعیہ کے استنباط و استخراج کا حکم دینے کے بجائے (جو تکلیف مالا یطاق کا مصداق ہوتا) انھیں اہل علم سے احکام دریافت کرنے کا حکم دیا۔

...... فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (سورۃ النحل)

اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھ لیا کرو۔

اس آیت کا شان نزول اگرچہ خاص ہے لیکن بقاعدہ "العبرۃ لعموم المعانی لا لخصوص المواد" آیت کا حکم عام ہے (جس کی تفصیل کتب تفسیر مثلاً روح المعانی ص ۱۴۳ ج ۱۴ میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

لہ المستصفی ص ۳۸۹ ج ۲

اس کے علاوہ آیت سورۂ نساء "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" سے بھی متعدد صحابہ وتابعین نیز علماء متاخرین نے ("اولی الامر" کا مصداق اہل علم وفقہ کو قرار دیتے ہوئے) ان کی اتباع کا حکم اخذ کیا ہے۔ جسے متعدد مفسرین نے اپنے تفسیروں میں نقل کیا ہے (جن میں علامہ شوکانی، صاحب "تفسیر فتح القدیر"[1] اور نواب صدیق حسن خاں صاحب "تفسیر فتح البیان" بھی شامل ہیں) اور نبیٔ فطرت نے بھی ارشاد فرمایا ہے "انما شفاء العی السوال" اس فرمان کے پس منظر میں جو واقعہ آتا ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عام آدمی کا اپنے طور پر (پیش آمدہ مسائل میں غور وفکر کرکے) حکم بیان کر دینا نہ صرف یہ کہ مطلوب نہیں بلکہ مذموم ہے، پورا واقعہ اس طرح ہے:-

"عن جابر قال خرجنا فی سفر فأصاب رجلاً منّا حجر فشجّه فی رأسه ثم احتلم فسأل اصحابه فقال هل تجدون لی رخصة فی التیمم قالوا ما نجد لك رخصة وأنت تقدر علی الماء فاغتسل فمات فلما قدمنا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم أخبر بذلك فقال قتلوه قتلهم اللہ ألا سألوا اذ لم یعلموا فانّما شفاء العی السوال انما کان یکفیه أن یتیمّم ویعصّر او یعصّب"[2]

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا ہم ایک سفر میں گئے ہوئے تھے، ہم میں سے ایک صاحب کو پتھر لگ گیا جس سے ان کا سر زخمی ہو گیا اسی حالت میں انھیں غسل کی ضرورت پیش آگئی۔ ان صاحب نے ساتھیوں سے مسئلہ دریافت کیا کہ آیا وہ تیمم کر سکتے ہیں یا نہیں، ساتھیوں میں سے بعض نے فرمایا کہ تم تو پانی کے استعمال پر قادر ہو، اس لیے ہمارے خیال میں تمھارے لیے تیمم جائز نہیں ہے اس پر اس شخص نے غسل کر لیا اور وفات پا گیا جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچے اور واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا، اللہ انھیں سمجھے جنھوں نے اس کو جان سے مروا دیا۔ انھیں معلوم نہیں تھا تو دریافت کر لیتے کہ جہالت کا واحد علاج دوسرے سے دریافت کرکے علم حاصل کرنا ہی ہے۔ شخص مذکور کے لیے تیمم کافی تھا اور زخم پر پٹی باندھ لیتا۔"

---

[1] فتح القدیر ص ۴۵۵/ج ۱، فتح البیان ص ۳۸۳/ج ۲ و ص ۳۶۳/ج ۲ [2] ابوداؤد ص ۴۹/ج ۱

چنانچہ امور شرعیہ میں صحابہ کے زمانے سے لیکر آج تک بلا انقطاع، تقلید (یعنی حسن ظن کی بنا پر دوسرے کی بات بلا دلیل مان لینا اور صحیح سمجھ کر اس پر عمل کرنا) جاری ہے جس کے ذکر سے صحیح احادیث کی کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ حدیث کی سب سے زیادہ صحیح اور مستند کتاب (جسے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" بجا طور پر کہا جاتا ہے یعنی) امام بخاری کی "الجامع الصحیح" میں متعدد مواقع پر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مجرد اقوال سے استدلال کیا گیا ہے جس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات اس کے اہل ہیں کہ ان کی باتیں بلا دلیل قبول کی جا سکتی ہیں؛ تطویل سے بچنے کے لیے یہاں بخاری سے صرف ایک موقعہ کا حوالہ دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے، "کتاب الوضوء" میں فرماتے ہیں:

قال جابر بن عبد اللہ اذا ضحك فی الصلوٰۃ اعاد الصلوٰۃ ولم یعد الوضوء۔ وقال الحسن ان من اخذ من شعرہ واظفارہ او خلع خفیہ فلا وضوء علیہ وقال ابو ھریرۃ لا وضوء الا من حدث ...... وقال طاؤس ومحمد بن علی وعطاء واھل الحجاز لیس فی الدم وضوء وعصر ابن عمر بثرۃ فخرج منھا دم فلم یتوضاء وبزق ابن ابی اوفی دما فمضی فی صلوٰتہ وقال ابن عمر والحسن فی من احتجم لیس علیہ الا غسل محاجمہ۔[1]

یہاں اس سے بحث نہیں (اور نہ یہ ہمارے موضوع سے ہی متعلق ہے) کہ مختلف اقوال کی موجودگی میں وجہ ترجیح کیا ہوگی اور کس قول پر عمل کیا جائے؟ بتانا یہ ہے کہ قابل اعتماد شخص کے قول کو بلا دلیل جائے قابل استناد سمجھا گیا۔ یہیں سے یہ ضرورت بھی سامنے آتی ہے کہ پراگندگیٔ فکر و عمل سے بچنے بچانے کے لیے کسی ایک فقیہ عالم (کہ جس کے علم و فہم اور دیانت و امانت نیز اصابت رائے کا بارہا تجربہ ہو چکا ہو، اور جو پیش آمدہ تمام یا اکثر مسائل اور ضرورتوں کا شرعی حل بتا سکتا ہو) کو منتخب کر لیا جائے اور اسی کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی کوشش کی جائے۔ اس ضرورت سے تقلید شخصی کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ اسی کا رواج ہو تا گیا، اس طرز کے حسن و قبح یا صحت و عدم صحت سے بحث کرنا اس وقت نہ مقصود ہے نہ موضوع کے

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۲۹۔

لیے ناگزیر۔ لیکن عملاً ہوتا یہی رہا ہے کہ صحابہ و تابعین کے زمانہ سے لیکر آج تک ایک علاقہ میں عموماً ایک دو مخصوص عالموں کا انتخاب کر کے ان کے فتاوی اور اقوال پر عمل کیا گیا اور انھیں گویا مستند (اتھارٹی) تسلیم کیا گیا۔ جیسا کہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" وغیرہ میں رقمطراز ہیں:

فعند ذلك صار لكل عالم من علماء التابعين مذهب على حياله فانتصب في كل بلد امام مثل سعيد بن المسيب وسالم بن عبد الله بن عمر في المدينة وبعدها الزهري والقاضي يحيى بن سعيد وربيعة بن ابي عبد الرحمان فيها وعطاء بن ابي رباح بمكة وابراهيم النخعي والشعبي بكوفة والحسن البصري بالبصرة وطاؤس بن كيسان باليمن ومكحول بالشام فاظماء الله اكباداً الى علومهم الخ[1]......

انھیں حالات میں علماء تابعین میں سے ہر ایک عالم کا اپنا ایک الگ مسلک اپنے انداز کا بن گیا۔ اور ہر شہر کا اپنا ایک امام بن گیا۔ مثلاً سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ بن عمر مدینہ میں جن کے بعد وہیں زہری اور قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمان بھی امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ مکہ میں عطاء بن رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس بن کیسان اور شام میں مکحول امامت کے منصب پر فائز رہ کر تشنگان علم دین کی سیرابی کا سامان فراہم کرتے رہے۔

ایسے علماء کی اس مرکزی حیثیت کے قیام نے بہت فائدہ پہنچایا اور بہت سے فتنوں کے دروازے بند کر دیے۔ مثلاً ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کم سے کم ان علاقوں کے اکثر عوام اختلاف آراء اور پراگندہ ذہنی کی وجہ سے جس ابتلاء کا شکار ہوتے اس سے بچ گئے۔ نیز یہ ہوا کہ عقیدہ کی حفاظت کے ساتھ مطلوبہ اعمال میں بھی استقامت آسان ہو گئی۔ یہ اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے مصالح کے حصول اور مفاسد سے مامون رہنے کی غرض سے بیشتر، بلکہ تمامتر علماء کبار نے استنباط و استخراج کی صلاحیت نہ رکھنے والے افراد کے لیے کسی اہل کی تقلید کو ضروری قرار دیا، مثلاً علامہ بغوی

[1] الانصاف ص۱ وحجۃ اللہ ص۱۳۹-۱۴۰

جن کا طویل کلام اوپر ذکر ہو چکا ہے فرماتے ہیں:

ویجب علیٰ من لم یجمع ھٰذہ الشرائط تقلیدہ فیما یعن لہ ..... من الحوادث[1]

جس شخص میں یہ شرائط مجتمع نہ ہوں اس پر لازم ہے کہ وہ نو پیش آمدہ مسائل میں تقلید اختیار کرے۔

پھر کچھ زمانہ کے بعد بہت سے علوم و معروف مصالح اور تقاضوں کی بنا پر ائمہ اربعہ کی تقلید میں انحصار کو مناسب بلکہ بعض حالات میں ضروری قرار دینے ہی میں حکماء امت کو خیر نظر آنے لگی چنانچہ حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "حجۃ اللہ" میں نہایت زور و قوت کے ساتھ اس کی افادیت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

ومما یناسب ھٰذا المقام التنبیہ علیٰ مسائل ضلت فی بوادیہا الأفہام وزلت الأقدام وطغت الأقلام معہا أن ھٰذہ المذاہب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتد بہ منہا علیٰ جواز تقلیدہا الیٰ یومنا ھٰذا وفی ذٰلک من المصالح ما لا یخفیٰ لا سیما فی ھٰذہ الأیام التی قصرت فیہا الھمم جدا وأشربت النفوس الھویٰ وأعجب کل ذی رأی برأیہ[2]

"اس موقع پر کچھ ایسی باتوں کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق ان مسائل سے ہے جن میں غور و فکر کی بے راہ روی پائے ثبات کی لغزش اور قلم کی جسارت کی روایات وابستہ رہی ہیں۔ ایک مسئلہ منجملہ ان مسائل کے یہ ہے کہ یہ چاروں مسالک جو باقاعدہ طور پر مدوّن اور موجود ہیں اس بات پر پوری امت یا امت کا بڑا طبقہ آج بھی متفق ہے کہ ان کی تقلید جائز ہے۔ اس کے فوائد ظاہر ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ ہمتیں نہایت ہی درماندہ ہو چکی ہیں اور نفوس ہوا و ہوس کا شکار ہیں اور ہر شخص (جو ذرا بھی شدبد رکھتا ہے) من مانی کو ہی پسند کر رہا ہے"

یہاں شاہ صاحب اتنے ہی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ تقلید کو حرام کہنے والوں کے کلام کی توجیہ بلکہ ایک طرح سے ان کی تردید کرتے ہیں اور اپنی دوسری کتاب "عقد الجید" میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

---

[1] عقد الجید ص۸ [2] حجۃ اللہ ص۱۵۹

"اعلم أن فی الأخذ بھذہ المذاھب الاربعة مصلحة عظیمة وفی الاعراض عنھا کلھا مفسدة کبیرة"[1]

پھر اس کے بعد اپنے دعوے کو متعدد وجوہ سے ثابت اور بیان کیا ہے پورا بیان مطالعہ کے لائق ہے (تطویل کے خوف سے یہاں سب نقل نہیں کیا جاسکا) اسی کتاب میں آگے چل کر تقلید کی ایک قسم کو "واجب" قرار دیتے ہیں[2]۔

بایں ہمہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح دیگر بہت سی مفید چیزوں میں کچھ مضر پہلو بھی نکل آتے ہیں اسی طرح اس میں بھی نظر آسکتے ہیں۔ مثلاً تقلید کے بارے میں غلو، اور حد اعتدال سے تجاوز کی خرابیاں اور ان پر دلالت کرنے والے واقعات رونما ہوئے جنکی وجہ سے متعدد علماء، تقلید کو ناپسندیدہ بلکہ ناجائز قرار دینے پر مصر ہو گئے۔ اور تقلید کے مخلص حامیوں کو بھی ان پہلوؤں پر نکیر کرنا پڑی چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی پہلو پر ایسی تنقیدیں کیں جن سے بہت سے لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ شاہ صاحب نفس تقلید ہی کے مخالف ہیں، حالانکہ ان کے پورے کلام کا جائزہ لینے والوں پر یہ حقیقت مخفی نہیں رہنی چاہیے کہ موصوف نفس تقلید کے مخالف نہیں بلکہ اس میں غلو اور حد سے تجاوز کرنے والوں پر تنقید فرماتے ہیں، جس کا حق ہر ایک مصلح اور خیر خواہ کو ملنا ہی چاہیے۔

تقلید کا ایک "تاریک" پہلو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس سے احساس کمتری پیدا ہوا اور آزادیٔ فکر و خیال متاثر ہوئی۔ نیز ذہنی بالیدگی اور نشو و نما کے عمل میں فتور آیا۔ لیکن راقم سطور جہاں تک سمجھ سکا ہے۔ دراصل "تقلید" میں خیریت سمجھنے اور اس پر اصرار کرنے کا سبب ہی یہ ہوا کہ فکری و علمی بلندی کا فقدان اور تحقیق و تلاش میں ژرف نگاہی کا قصور پہلے رونما ہو چکا تھا اس کے بعد تقلید پر اصرار ہوا (اگرچہ تقلید کرنے والے ترتیب کو معکوس سمجھتے ہیں)۔

جیسا کہ اوپر شاہ صاحب کے کلام میں گزرا "لاسیما فی ھذہ الایام التی قصرت فیھا الھمم جدا" (خاص طور سے اس زمانہ میں جبکہ ہمتیں بری طرح درماندہ ہو چکی ہیں)

[1] عقد الجید ص۳۶　　[2] (الفناس ۸۳

مزید برآں یہ کہ معلوم اور نامعلوم اسباب کی بنا پر قدرتی طور پر بھی بعض وہ صلاحیتیں مفقود ہوتی چلی گئیں جو اجتہاد کے لیے ناگزیر تھیں مثلاً قوت حفظ (کہ اُس زمانہ کے واقعات آج افسانہ معلوم ہوتے ہیں) تاہم اس ضرورت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا (اور خدا کا شکر ہے کہ علماء حق نے اپنے اس فرض منصبی سے کبھی گریز نہیں کیا) کہ ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین سابقین کے بیش قیمت ذخیرہ کی افادیت اور اہمیت کے اعتراف بلکہ ممکن حد تک اس سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ اپنی موجودہ صلاحیتوں سے کام لیکر آج کے علماء انفرادی طریقہ پر نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر اپنے زمانہ کے مسائل اور تقاضوں کا شرعی حل دریافت کرنے میں کسی زمانہ کے علماء سے پیچھے نہ رہیں ورنہ انکی یہ کوتاہی ناقابل تلافی و معافی جرم ٹھہرائی جانے کی مستحق ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ عصر حاضر کی ترقیوں اور ٹکنولوجی کے محیر العقول کارناموں نے جو بہت سے نئے فقہی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ انھیں حل کرنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ ژرف نگاہی اور دقت نظری نیز جدید معلومات کی فراہمی کی ضرورت ہوگی، اور یہ آخری شرط، عصری علوم کے ماہرین کے تعاون کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی لہٰذا ان مسلم ماہرین پر بھی ایک طرح کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی معلومات سے علماء شریعت کو باخبر کر کے ان کی مدد کریں اور اس ضروری کام میں انھیں اپنا تعاون دے کر ملت کو راہ صواب دکھانے میں شریک ہوں۔

خدا کرے یہ آواز صدا بہ صحرا نہ ثابت ہو اور ملت کے یہ دونوں بازو اسے اوج ثریا تک لے جانے کا ذریعہ بنیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

سید جلال الدین عمری

ذرائع دولت

اسلام کا نقطۂ نظر

[نوٹ:- اسی عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کا ایک مضمون الفرقان کے گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ مندرجہ ذیل مختصر مضمون گویا اسی کا تکملہ ہے۔ مدیر]

اسلام نے جن چیزوں کو صراحت کے ساتھ حرام یا حلال قرار دیا ہے ایک مسلمان کے نزدیک ان کی حلت و حرمت ہر بحث سے بالاتر ہے لیکن جن چیزوں کی حلت و حرمت کی اس نے صراحت نہیں کی ہے ان کے بارے میں ہمیں قیاس سے کام لینا پڑتا ہے کہ آیا وہ حلال کے دائرے میں آتی ہیں یا ان پر حرام کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان میں بعض چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن کی حلت و حرمت کا آدمی قطعی فیصلہ نہ کر سکے بعض پہلوؤں سے وہ حلال معلوم ہوں گی اور بعض پہلو ان کی حرمت کو ظاہر کر رہے ہوں گے۔ اس صورت میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی احتیاط کا رویہ اختیار کرے اور جب تک ان کی حلت کا یقین نہ ہو ان پر عمل نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی حلال چیزوں ہی کو نہیں بلکہ ایسی چیزوں کو بھی قبول کرنے لگتا ہے جن کی حلت میں شبہ ہو تو حرام چیزوں کے بارے میں بھی اس کی نفسیات تبدیل ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر محرمات سے دوری اور ان سے اجتناب کا وہ شدید جذبہ باقی نہیں رہتا جو ان سے بچنے اور دور رہنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ محرمات کے ارتکاب میں بھی کوئی قباحت نہیں محسوس کرتا۔

زندگی کے اور معاملات کی طرح ذرائع دولت پر بھی اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ جو ذرائع دولت مشتبہ ہوں اور جن کی حلت کا یقین نہ ہو ایک مسلمان کو ان سے احتراز ہی کرنا چاہیے ورنہ

یہ اس احتیاط کے منافی ہوگا جو شریعت کو مطلوب ہے۔ اس مسئلے میں حضرت نعمان بن بشیر کی روایت بہت مشہور ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:۔

الحلال بیّن والحرام بیّن وبینهما مشتبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشك ان یرتع فیه الا ان لکل ملك حمی الا وان حمی الله محارم

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ اور غیر واضح ہیں جن کو بہت سے انسان نہیں جانتے جو شخص شبہات سے پرہیز کرے وہ اپنے دین اور عزت و آبرو کو بچالے گا اور جو شبہات میں پڑ جائے وہ ان سے آگے بڑھ کر حرام میں پڑ جائے گا۔ اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو بادشاہ کی محفوظ چراگاہ کے آس پاس اپنی بکریاں چرائے۔ اس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ کسی وقت اس میں بکریاں چرنے لگ جائیں۔ ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے سن لو اللہ کی یہ محفوظ چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں (جن کے قریب کسی کو نہیں جانا چاہیے۔)

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب [1]

سن لو جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب جب وہ درست ہو تو سارا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور جب اس میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سن لو گوشت کا یہ ٹکڑا دل ہے۔

اس میں ایک بڑی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ انسان کے ذہن وفکر کی اصلاح ہو اور وہ صحیح رخ پر سوچنے لگے۔ اگر اس کے دل میں خدا کا خوف

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب الکسب بحوالہ بخاری و مسلم

اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا ہو جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ کُھلی معصیتوں سے بچے گا بلکہ مشتبہات سے بھی اس کا دامن پاک ہو گا۔ لیکن اگر دل و دماغ خدا اور آخرت کے احساس سے خالی ہوں تو آدمی حیلوں اور تدبیروں کے ذریعے دین کے سارے حدود توڑ پھینکے گا۔

ایک اور حدیث ہے۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد رکھا ہے۔

دَعْ مَا يُرِيبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيبُكَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَانِيْنَةٌ وَاِنَّ الْكِذْبَ رِيبَةٌ ؎	جو چیز تمہیں شک میں ڈال دے اسے چھوڑ دو اور وہ چیز اختیار کرو جو شک و شبہ میں نہ ڈالے۔ سچائی سے سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے اور جھوٹ سے دل کو خلجان ہوتا ہے۔

یہ حدیث بھی اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ آدمی کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس کے بارے میں اس کا دل یہ کھٹک محسوس کر رہا ہو کہ وہ حق ہے یا نہیں؟ اسے وہی کام کرنا چاہیے جس کے بارے میں اسے شرح صدر ہو کہ وہ حق ہے اور خدا کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔ ایک مومن کا جو مزاج ہوتا ہے اور اسے جو سوجھ بوجھ اور فہم و بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ سے ناحق پر اس کا دل ٹھک نہیں سکتا۔ اسے حق و صداقت ہی پر اطمینان ہو گا۔ اس لیے کسی مسئلے پر ایک مومن کا اطمینان بھی اس کے حق ہونے کی ایک دلیل ہے اور جب تک یہ اطمینان حاصل نہ ہو اسے اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ (ماہنامہ "زندگی" رامپور کے شکریہ کے ساتھ)

؎ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب بحوالہ احمد، ترمذی، نسائی

مکتوب لندن (بقیہ صفحہ ۸۰)

برابر ہوتی رہی جس کا تجربہ گزشتہ سال نہ ہوا تھا۔ شاید گرمی اور سردی کے موسم کا فرق ہو۔ سو اب سردی بھی معلوم ہوتا ہے اپنا شباب کھو چکی۔ ڈیڑھ ہفتے سے بے رنگ ہے اور آج تو صرف یہ کہ سردی کم ہے بلکہ موسم کی کیفیت ہی بدلی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اب مستقل والی سخت سردی گئی۔ کبھی کبھی کا دورہ ہوا کرے تو اور بات ہے۔ دعاؤں کی بڑی ضرورت ہے صحت کی موجودہ کیفیت کے ساتھ یہاں رہنا بالکل بے کار لگ رہا ہے۔ والسلام

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

صحابۂ کرامؓ ــــ اور ــــ ارتداد

یہ عنوان الفرقان جیسے دینی رسالوں کے قارئین کے لیے چونکا دینے والا بلکہ بہت سے لوگوں کے جذبۂ دینی کو ٹھیس پہنچانے والا ہو سکتا ہے۔ راقم سطور کبھی اپنا یہ احساس چھپانا مناسب نہیں سمجھتا کہ وہ بھی اسے زبان قلم پر لاتے ہوئے جھجھکتا بلکہ ڈرتا رہا، لیکن، جیساکہ آئندہ سطروں سے معلوم ہو گا ضرورۃً اسے گوارا کر لیا گیا ہے۔

مگر حیرت کا مقام ہے بلکہ افسوس کی جگہ ہے کہ ادھر عرصہ سے ایک خاص طرز فکر کو عام کرنے کی کوششوں نے امت کے ایک طبقہ کا ایسا ذہن بنا دیا ہے جو اس طرح کے عنوانات بلکہ اسی قسم کی بے باکانہ گفتگو کرنے میں نہ صرف کوئی حرج نہیں سمجھتا بلکہ ایسے سوالات اٹھا کر صحابۂ کرام کی محبت و عظمت سے سرشار قلوب کو ارتیاب و شکوک میں دانستہ یا نادانستہ طور پر مبتلا کرنا دین کی خدمت خیال کرتا ہے، حالانکہ ان قدسی صفات نفوس کی عظمت و محبت ایمان باللہ و بالرسول کا لازمی تقاضہ ہے کیونکہ ان حضرات ہی کے توسط سے ہمیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کا علم ہوا اور ان پر ایمان لانے کی ضرورت کا پتہ چلا۔ اسی بنیاد پر مشہور محدث ابوزرعہؒ رازی کسی صحابیؓ کی ادنیٰ سی تنقیص کرنے والے کو زندیق۔ بے دین۔ کہتے تھے[1]۔

---

[1] حافظ ابن حجرؒ عسقلانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الاصابہ" ج ۱ ص ۱۲ میں بیان کیا ہے:۔ قال (ابوزرعۃ الرازی) "اذا رأیت الرجل ینتقص احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاعلم انہ زندیق وذلک ان الرسول حق والقرآن حق وما جاء بہ حق وانما ادی الینا کلہ الصحابۃ وھؤلاء (ای المنتقصون) یریدون ان یجرحوا شھودنا لیبطلوا الکتاب والسنۃ"

اس وقت جس ذہن کے پیدا ہو جانے کی بات کی جا رہی ہے اس کا صحیح اندازہ علماء میں خاص طور پر ان لوگوں کو زیادہ ہے جو اپنی کسی خصوصیت، یا اتفاق، یا اور کسی وجہ سے اس حیثیت میں ہیں کہ لوگ ان سے مسائل دریافت کرتے اور اپنی ذہنی الجھنیں پیش کر کے انھیں دور کرنے میں ان سے مدد لیتے ہیں۔

اسے خوش قسمتی کہیئے یا کوئی اور نام دیجیے کہ راقم سطور بھی ان لوگوں میں ہے جسے نوع بنوع سوالات کے ساتھ اس قسم کے مسائل سے بھی سابقہ پڑتا اور ان کے جوابات دینے ہوتے ہیں۔

چنانچہ پچھلے سال دینی مزاج اور سلیم ذہن رکھنے والے ایک صاحب کے کئی سوالنامے آئے جن میں بعض دوسرے سوالات کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا۔

"... کی ایک کتاب ...... میری نظر سے گذری اور میں نے اپنے لیے اس کتاب کو غیر معمولی نافع پایا، اس میں ...... مقام صحابیت کے بارے میں لکھا ہے کہ — یہ وہبی ہے اور معجزات نبوت کا اعجاز ہے ...... ہمارے نزدیک ایک بھی صحابی کا مرتد ہونا ثابت نہیں اور اگر کوئی شخص اس طرح کہے یا سمجھے تو گویا نہ صرف مرتبہ صحابیت کی ناقدری ہے بلکہ تنقیص رسالت بھی نکلتی ہے کہ جن کی قلب ماہیت اللہ کے رسول کی ایک نگاہ سے کامل ہو جائے ان کو مرتد سمجھنا گویا اسی اعجاز نبوت کو در پردہ تسلیم نہ کرنے کے مرادف ہے۔"

یہ نقل کرنے کے بعد یہی صاحب آگے لکھتے ہیں:۔

"مگر بعض ایسے معترضین ...... جو بہر حال تنقیدی مزاج رکھتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ جب یہ تاثیر نگاہ نبوت کے معجزات میں سے ہے ...... تو ...... اس کا بکھر جانا (یعنی ایسے شخص کا مرتد ہو جانا۔ برہان) تنقیص کا سبب ہے۔"

مکتوب نگار نے اس کے علاوہ صحابہ کی اتباع کی بابت بھی اسی نہج کے سوالات اٹھائے تھے جن کے تفصیلی جوابات (حسب توفیق خداوندی) دیدیے گئے۔ خیال ہوا کہ ان صاحب کو جواباً جو کچھ لکھا گیا، اس کا ضروری حصہ مناسب تغیر و تبدیلی کے بعد دوسرے مخلصین اور صحیح الفکر افراد کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے ان کے واسطے بھی کسی درجہ میں مفید اور کار آمد

ثابت ہو۔ اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے قارئین "الفرقان" کے سامنے یہ سطریں پیش کی جا رہی ہیں (برہان)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہونے والے افراد کے طرز عمل کو بنیاد بنا کر یہ سمجھنا کہ ایسے لوگوں کا دین حق سے پھر جانا بھی "تنقیص رسالت کا سبب ہے" یا جو علما کسی صحابی کے بھی مرتد ہونے کی نفی کرتے اور صحابی کے ارتداد کو تنقیص رسالت کا سبب قرار دیتے ہیں ان پر فتنۂ ارتداد کی بنا پر تعریض کرنا یہ پتہ دیتا ہے کہ ایسے لوگوں نے ان "علماء" کی بات کا یہ مطلب سمجھ لیا ہے کہ ایسے تمام لوگ کہ جن پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نظر پڑ گئی وہ سب کے سب بلا استثناء "کامل" بن گئے، اور ان کے دل کی کایا پلٹ ہو گئی۔ حالانکہ ان حضرات علماء کا یہ مطلب ہرگز نہیں کیونکہ ایسا کہنا یا سمجھنا واقعات کو جھٹلانے بلکہ قرآن و حدیث کی تکذیب کرنے کے مترادف ہو گا۔ بھلا اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ابوجہل، ابولہب اور اسی قماش کے دوسرے معاندین پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف یہ کہ بارہا نظریں پڑیں بلکہ ان سے بلد بار گفتگو ہوئی اس کے باوجود وہ کفر پر جمے رہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے۔ اس لیے بلاشبہ ان حضرات علماء کے کلام کا مطلب یہ ہے (جس کی صراحت بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے) کہ جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حقیقی ایمان کی دولت نصیب ہو گئی انہی پر آپؐ کی نظر کیمیا اثر نے یہ کام کیا کہ انھیں کامل بنا دیا اور ان کا رتبہ اتنا بلند کر دیا کہ ان کا مقابلہ بڑے سے بڑا ولی (غیر صحابی) بھی نہیں کر سکتا۔ اور وہ لوگ جو بظاہر ایمان لے آئے تھے پھر اس کے بعد مرتد ہو گئے۔ در اصل ان کے دل میں حقیقی ایمان داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ حقیقی ایمان جس کے دل میں گھر کر لے اور پھر جو اس کا لذت شناس ہو کر اس کی حلاوت محسوس کرنے لگے وہ کبھی مرتد نہیں ہو سکتا اس کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینا اور سخت سے سخت تکلیف برداشت کرنا آسان ہو سکتا ہے مگر اس دولت سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔

اس پر صحابہ کرامؓ کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ اسی بات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یوں ارشاد فرمایا ہے:۔

ثلث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ...... أن یکرہ أن یعود فی الکفر

کما یکرہ أن یقذف فی النار

کہ تین باتیں جس شخص میں ہوں گی وہی ایمان کی حلاوت پائے گا........ (تین میں سے

ایک یہ ہے کہ) کفر کی طرف واپس جانا اتنا ہی ناگوار (اور دشوار) ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی حقیقی مومن مرتد اور کافر نہیں ہو سکتا، لہٰذا جو بھی مرتد ہوتا ہے وہ دراصل حقیقی مومن نہیں تھا۔

جہاں تک عہد نبوی کے ان مسلمانوں کا تعلق ہے جو (بظاہر) ایمان لے آئے تھے لیکن پھر مرتد ہو گئے ان کا معاملہ بھی یہی ہے ان کے قلوب میں حقیقت ایمان رچی بسی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی حلاوت سے آشنا ہوئے تھے، ایسے لوگوں کی ایک تعداد عہد نبوی میں موجود تھی۔ ان کے بارے میں قرآن مجید کی متعدد آیات اور مستقل ایک سورۃ نازل ہوئی جو ایسے لوگوں کے موجود ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ سورۂ حجرات کی ایک آیت میں کچھ لوگوں کے متعلق یوں فرمایا گیا

قالت الأعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا أسلمنا ولما يدخل الإيمان فی قلوبکم

یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہو گئے، اے نبی! آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تمہیں حقیقی ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی ہے (اس لیے تم اپنے آپ کو ایمان والے نہ کہو) ہاں تم خود کو (ظاہری) مسلمان کہہ سکتے ہو، کیونکہ تمہارے دلوں میں ابھی تک ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔

اس سے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کا مرتد ہو جانا نبوت و رسالت کی تنقیص کا سبب نہیں کیونکہ یہ لوگ ایمان والے بنے ہی نہیں تھے تو جس طرح ابوجہل و ابولہب جیسے دشمنان اسلام کا وجود اور ان کا ایمان نہ لانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نقص اور آپ کی شان میں کوتاہی کا موجب نہیں، اور ابو طالب کا ایمان قبول نہ کرنا دعوت کی کمزوری کا سبب نہیں ہے۔ اسی طرح ایسے ہی مسلمان نما کافروں کا بناوٹی روپ چھوڑ کر اپنی سابقہ اصلی حالت پر لوٹ جانا۔ یا یہ کہیے کہ اصلی حالت ظاہر کر دینا تنقیص کا سبب نہیں بن سکتا، تو پھر اس سے آپ کی نگاہ کی کیمیا اثری پر کیونکر کوئی حرف آ سکتا ہے۔ ابوجہل و ابولہب اور دوسرے دشمنان اسلام پر نہ صرف یہ کہ آپ کی نظر پڑی بلکہ بارہا ان سے گفتگو بھی ہوئی لیکن کچھ ان پر اثر نہ ہوا اس لیے کہ ان کے دل قبول حق کی

استعداد سے عاری ہو کر اپنی تمام صلاحیتیں کھو چکے تھے، اس حقیقت کو قرآن حکیم نے متعدد آیتوں میں بیان کر دیا ہے۔ مثلاً فرمایا "ختم اللہ علیٰ قلوبھم"

اس قسم کے شبہات کچھ لوگوں نے عہد نبوی میں بھی پیدا کیے تھے جن سے بعض مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر بھی اثر پڑتا تھا۔ اس اثر کو زائل کرنے اور آپ کی تسکین کے لیے متعدد آیات نازل ہوئیں، مثلاً انک لاتھدی من أحببت ولکن اللہ یھدی من یشاء، لست علیھم بمصیطر، ان علیک الا البلاغ ایمان حقیقی کی دولت مل جانے کے بعد اس سے دست بردار ہونا ممکن نہ ہونے پر شہادت کی حیثیت رکھنے والا ہرقل کا یہ واقعہ بھی ہے کہ جس کا ذکر حدیث کی تمام کتابوں میں ملتا ہے کہ اس نے حضرت ابوسفیانؓ (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چند سوالات کیے (جن کے بعد اس رومی شہنشاہ نے آنحضرت کے رسول ہونے کا اعتراف بھی کیا)۔ ان سوالات میں ایک یہ بھی تھا ھل یرتد احد منھم سخطۃ لدینہ بعد أن یدخل فیہ قلت لا۔ آخر میں ہرقل نے اس سوال کی مصلحت بتاتے ہوئے کہا: وکذلک الایمان حین تخالط بشاشتہ (مطلب یہ ہے کہ، ہرقل نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ نبی پر ایمان لانے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اس دین سے بیزار ہو کر اپنے سابق دین کی طرف لوٹا؟ (مرتد ہوا) جس کا جواب ابوسفیان کی طرف سے قطعاً نفی میں ملا، تو اس نے کہا! جب ایمان قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے (کہ پھر کوئی اس سے پھرتا نہیں) یہ واقعہ بخاریؒ میں بھی موجود ہے۔

جب ایمان کی حلاوت و لذت کا یہ کرشمہ ہے اور ایمان حقیقی کی یہ تاثیر ہے تو اس معیار پر اعلیٰ درجہ میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جنھوں نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمۂ صافی سے فیض اٹھایا یعنی صحابہ کرام (رضوان اللہ علیھم) اس حقیقت پر اتنے دلائل ہیں کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے اور جن کا انکار نصف النہار میں سورج سے انکار کے مرادف ہوگا۔

انھی دلائل کی بنیاد پر امت کے تمام قابل ذکر علماء نے صحابہ کی فضیلت و عدالت پر سب اہل حق کا اتفاق نقل کیا ہے۔ پانچویں صدی کے مشہور محدث و محقق عالم خطیب بغدادی نے

لے بخاری جلد ۱

اپنی معروف کتاب "الکفایہ"[1] میں صحابہؓ کی افضلیت اور ان کے عادل و متدین ہونے کا مستقل ایک باب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہی ہے "باب ماجاء فی تعدیل اللہ و رسولہ للصحابۃ (یعنی صحابہؓ کی اللہ اور رسول کی طرف سے تعدیل و توثیق کیے جانے کا باب)" اور اس باب کے تحت لکھا ہے کہ "صحابہ کے بارے میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ وہ "عادل" تھے یا نہیں کیونکہ ان کی "عدالت" تو ثابت و معلوم ہے اس لیے کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے پاکباز اور برگزیدہ ہونے کی خبر دی ہے۔ (لأن عدالة الصحابة ثابتة معلومة بتعديل الله لهم واخباره عن طهارتهم واختياره لهم) اس کے بعد وہ آیتیں ذکر کیں جن سے صحابہ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، اور پھر ان کی شان میں وارد متعدد احادیث نقل کیں[2]۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے "الاصابۃ" میں لکھا ہے، "اتفق اهل السنة على ان الجميع عدول ولم يخالف فى ذلك الا شذاذ من المبتدعة"[3] کچھ اہل بدعت کو چھوڑ کر تمام اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں، اسی کتاب میں یہ بھی ہے "انهم افضل من جميع الخالفين بعدهم والمعدلين الذين يجيئون من بعدهم هذا مذهب كافة العلماء ومن يعتمد قوله یعنی صحابہ کرام اپنے بعد کے تمام لوگوں میں سے افضل ہیں جن میں وہ لوگ بھی ہیں جو تعدیل کرتے ہیں، یہی تمام قابل اعتماد علماء کا مذہب ہے"۔

اس مقام پر یہ جان لینا بھی نہایت ضروری ہے کہ "صحابی" کسے کہتے ہیں اور علماء نے "صحابی" کی کیا تعریف بیان فرمائی ہے؟ یہاں سب سے زیادہ وسیع النظر عالم (کہ جن کی عظمت پر علماء اہل حق کا اتفاق ہے) کی احوال صحابہ پر مستند ترین کتاب سے "صحابی" کی تعریف نقل کی جاتی ہے۔

اصح ما وقفت عليه من ذلك أن الصحابي من لقي النبي صلى الله عليه وسلم مومناً به ومات على الاسلام فيدخل فيمن لقيه، من طالت مجالسته له أو قصرت، ومن روى عنه

---

[1] الکفایہ ص۴۶ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد [2] مشہور محدث ابن عبدالبر نے بھی "الاستیعاب ص۱۲ ج۱" میں ایسی بہت سی حدیثیں ذکر کیں ہیں، ان میں ایک یہ ہے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ اختار اصحابی علی الثقلین سوی النبیین والمرسلین" اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سفیان ثوری "وسلام على عباده الذين اصطفى" کا مصداق صحابہ کرامؓ کو بتاتے تھے۔ [3] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ للحافظ ابن حجر العسقلانی ص۱۰/۱۱ ج۱

او لم یروہ من غزا معہ او لم یغزو، ومن رآہ رؤیۃ ولو لم یجالسہ ومن لم یرہ لعارض کالأعمیٰ" ترجمہ:- میری معلومات کے اعتبار سے سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ صحابی وہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت ایمان ملا ہو، اور اسلام پر ہی اس کی وفات ہوئی ہو، وہ شخص بھی اس شرف میں شریک ہے جو طویل مدت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نشین رہا اور وہ بھی جو بہت تھوڑی مدت رہا ہو وہ بھی جس نے آپ سے سنکر کچھ روایت کیا اور وہ بھی جس نے کچھ نقل نہیں کیا، وہ بھی جس نے آپ کے ساتھ جہاد کیا اور وہ بھی جس نے نہیں کیا، وہ بھی جس نے صرف آپ کی جھلک تو دیکھی لیکن ہم نشینی کی نوبت نہیں آئی اور وہ بھی جس نے ملاقات تو کی مگر کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کو دیکھ نہیں سکا جیسے نابینا "مات علی الاسلام کی شرط کا فائدہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں وخرج بقولنا "مات علی الاسلام" من لقیہ مومناً بہ ثم ارتد ومات علی ردتہ والعیاذ باللہ یعنی اس شرط (اسلام ہی پر وفات ہونے کی شرط) کی وجہ سے وہ شخص صحابی کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بظاہر اسلام کی حالت میں ملا تھا مگر بعد میں وہ مرتد ہو گیا، اور اسی حال میں مر بھی (العیاذ باللہ) حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ:- ھذا التعریف مبنی علی الاصح المختار عند المحققین کالبخاری وشیخہ احمد ومن تبعہما، یعنی یہ تعریف تمام محققین کی اختیار کردہ ہے جن میں امام بخاری، امام احمد جیسے جلیل القدر محدثین کے علاوہ ان کے متبعین بھی شامل ہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کا مرتد ہونا ناممکن اور محال ہے اور غلط فہمی کے تمام پردے چاک ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ارتداد کا شکار ہوئے وہ حقیقتاً صاحب ایمان نہیں ہوئے تھے اور جو بھی قبائل وفات نبوی فداہ روحی کے بعد مرتد ہو گئے تھے ان کا ایک فرد بھی صحابی نہ تھا۔

صحابہ کا قابل اتباع ہونا

جس گروہ انسانیت کو یہ مرتبہ و مقام حاصل ہو کہ وہ منبع اصلی و سرچشمہ حقیقی سے فیضیاب

۱؎ الاصابہ ج ۱ ۔ حافظ نے یہاں چند ایسے لوگوں کے نام بھی گنا دیے ہیں جو اس بدبختی کا شکار رہے مثلاً عبیداللہ بن جحش ۔ عبداللہ بن اخطل

مستفید ہو چکا ہے وہ بےشک قابل اتباع و تقلید ہے، اور اس کا ہر ہر فرد "پچھلوں کے لیے نمونہ (IDEAL) کی حیثیت رکھتا ہے اور چراغ راہ کا کام کر سکتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

أصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم[1] لیکن بعض حضرات اس پر یہ کہتے ہیں کہ "اصحابی کالنجوم" سے تمام کے تمام مراد ہیں تو پھر ایک صاحب وہ بھی تو ہیں جو صحابہ کے ساتھ اللہ کے رسول کے ہمراہ کسی غزوہ میں شریک ہوئے اور جوانمردی سے لڑتے بھی رہے..... مگر..... اللہ کے رسول نے فرمایا..... وہ جہنمی ہے..... بعد میں خودکشی کے مرتکب ہوئے۔ تو کیا اس ارتکاب جرم اور خودکشی کی بھی اقتدا کرنی چاہیے۔[2]

جواب سننے سے قبل ایک اصولی بات ذکر کر دینا ضروری و برمحل معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس قسم کے موقعوں پر بولے جانے والے عام الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی استثنا رہی نہیں ہے بلکہ لفظ "کل" سے ایسے مقامات پر وہ مفہوم مراد ہوتا ہے جو روزمرہ کی گفتگو میں عموماً لیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ملکۂ سبا (بلقیس) کے بارے میں کہا گیا ہے "واوتیت من کل شیٔ" اس آیت کا یہ مطلب سمجھنا کہ بلقیس کو ہوائی جہاز ٹینک اور ایٹم بم وغیرہ (یا اس زمانہ کی ہر ہر چیز) دیے گئے تھے۔ بہت کم فہمی و کم علمی کی بات ہوگی، حالانکہ "کل شیٔ" کا منطقی مفہوم یہی ہے کہ ہر ہر چیز دی گئی ظاہر ہے کہ "کل شیٔ" کے مفہوم میں یہ چیزیں بھی داخل نہیں

---

[1] یہ حدیث مشکوٰۃ صفحہ ۵۵۴ ج ۲ میں "رزین" کے حوالہ سے مذکور ہے مگر ائمۂ حدیث فنی طور پر اسے بہت کمزور کہتے ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے ایک مشہور عرب عالم ناصر الدین البانی نے مشکوٰۃ کے حاشیہ پر اس حدیث کے بارے میں یہ تک لکھ دیا ہے:
حدیث باطل واسنادہ واہٍ جداً کما بینتہ فی الاحادیث الضعیفۃ اور اپنی اسی کتاب میں ص۷۸ سے ص۸۵ تک بڑا تفصیلی کلام کیا ہے۔

اس حدیث کی سند جیسی بھی ہو لیکن علمائے اصولیین کی ایک تعداد کے یہاں یہ بات تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ صحابہ کے اقوال و افعال فی الجملہ حجت ہیں، اگرچہ تفصیلات میں خاصا اختلاف ہے، اصول فقہ کی مشہور کتاب "حسامی" میں ابوسعید بردعی کا یہ قول نقل کیا ہے، تقلید الصحابی واجب یترک بہ القیاس لاحتمال السماع والتوقیف ولفضل اصابتھم فی نفس الرائ بمشاھدۃ احوال التنزیل، اس کی شرح نامی ص۱۰۱ ج۱ میں امام رازی وغیرہ کا بھی یہی قول بتایا گیا ہے۔ [2] سوالنامہ میں یہ بھی تعیین افراد کا اعتراض ذکر کیا گیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ "کل شئ" کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جتنا کہ ظاہری طور پر نظر آرہا ہے۔

ایک اور مثال سے یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ" سب جانتے ہیں اور اسی کے مطابق پوری امت کا متفقہ عقیدہ بھی ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل ہمارے لیے نمونہ اور قابل تقلید ہے مگر ذرا غور کیجیے کہ کیا نابینا کو آتا دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو جانا اور منہ پھیر لینا بھی ہم سے مطلوب ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں (حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا، جس پر قرآن مجید کی آیت "عبس وتولیٰ أن جاءہ الأعمیٰ" بلکہ پوری سورۃ دلالت کرتی ہے)

اس کا جواب صاف واضح ہے، کہ جب کسی عمل کے بارے میں یقینی دلیل سے معلوم ہو جائے کہ یہ عمل "عام قاعدہ" میں داخل نہیں ہے، تو ہم اس عمل کی حد تک اتباع کے مکلف نہ ہوں گے، یا یوں کہہ لیجیے کہ صرف یہ عمل "اسوہ" میں داخل نہ سمجھا جائے گا اور اس استثناء کے باوجود عام قاعدہ اپنی جگہ درست رہے گا کہ آپ کا ہر عمل قابل اتباع ہے۔ محض استثنائی مثالوں کو بنیاد بنا کر کوئی بھی شخص کسی عمل سے سرتابی کی جرأت کرنے کا مجاز نہ ہوگا، جیسا کہ قرآن مجید کی ایک آیت یا چند آیتوں کے حکم کا منسوخ ہو جانا اس کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اب قرآن مجید حجت نہیں رہا اور اس کی اتباع ضروری نہیں رہی۔ بلکہ نسخ کے باوجود اس کا اصل مقام یہی ہے کہ وہ "ہادی" اور زندگی کا "دستور العمل" ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ کسی صحابی کا کوئی ایسا عمل جس کا مطلوب نہ ہونا کسی قوی دلیل سے ثابت ہو جائے تو یہ کہا جائے گا کہ بس اس عمل کی حد تک وہ ناقابل اقتدا ہیں مگر اصول یہی رہے گا کہ "صحابی قابلِ اقتدا ہیں" یہ اصولی بات ذکر کر دینے کے بعد وہ قصہ بیان کیا جاتا ہے جس کو بنیاد بنا کر بعض لوگوں نے صحابہ کے مقتدا ہونے کی حیثیت کو چیلنج کیا ہے۔ اوپر کی سطروں میں بیان کردہ سوال سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ پورا واقعہ صحیح مسلم کتاب الایمان میں باب غلظ تحریم قتل الانسان نفسہ[1] کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے صاف اور صریح اشارے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص مومن ہی نہیں تھا بلکہ کافر تھا۔

---

[1] مسلم شریف ص۷۲ ج۱ مطبوعہ رشیدیہ دہلی

شهدنا مع رسول الله صلى الله عليه
وسلم حنينا فقال لرجل ممن يدعى
بالاسلام هذا من اهل النار فلما
حضرنا القتال قاتل الرجل قتالاً شديداً
فأصابته جراحة فقيل يا رسول الله
الرجل الذي قلت له انفا إنه من
اهل النار فانه قاتل اليوم قتالاً شديداً
وقد مات فقال النبي صلى الله عليه وسلم
الى النار فكاد بعض المسلمين أن يرتاب
فبينما هم على ذلك إذ قيل فإنه
لم يمت ولكن به جراحاً شديداً
فلما كان من الليل لم يصبر على الجراح
فقتل نفسه فاخبر النبي صلى الله عليه
وسلم بذلك فقال الله اكبر اشهد أني
عبد الله ورسوله ثم امر بلالا
فنادى في الناس أنه لا يدخل الجنة
إلا نفس مسلمة وإن الله يؤيد
هذا الدين بالرجل الفاجر

خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص جو مسلمان کہا جا رہا
تھا اور بہت دلیری سے جنگ لڑ رہا تھا اس کے
بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
یہ جہنمی ہے۔ اس پر لوگوں کو اس کے عمل جہاد
کے پیش نظر تعجب ہوا، اور قریب تھا کہ کچھ
مسلمان شبہ میں پڑ جائیں کہ اچانک سننے میں
آیا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا تھا اور زخموں کی
تاب نہ لا کر خود کشی کر بیٹھا اس پر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اکبر اشہد
انی عبد اللہ ورسولہ اور پھر حضرت بلال
سے اعلان کروایا کوئی بھی بغیر سچے اسلام
کے جنت میں داخل نہ ہو سکے گا (اور کبھی ایسا
بھی ہوتا ہے کہ اللہ کسی کافر سے بھی
اپنے دین کو تقویت پہونچوا دیتا ہے۔

حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں تھا، یہ حقیقت
"ممن یدعی بالاسلام" اور "انہ من اهل النار" جیسے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہی ہے،
اور جب اس شخص کی خودکشی کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ نے اللہ اکبر اشہد انی
عبد اللہ ورسولہ، فرمایا، ظاہر ہے کہ یہ انداز صاف بتا رہا ہے کہ آپ نے جس مخفی حقیقت کی اطلاع
دی تھی جس پر لوگوں کو تعجب بھی ہوا تھا اس پر ایک کھلی دلیل مل گئی جس سے لوگوں کا استعجاب

واستبعاد جاتا رہا، اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ حضرت بلال کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں "جنت میں صرف سچا و پکا مسلمان ہی داخل ہو سکتا ہے"۔ یہ جملہ بھی صاف بتا رہا ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا نیک کام بھی جنت میں داخلہ کا سبب نہیں بن سکتا لہٰذا اس شخص کا جی جان سے لڑنا اور کشتوں کے پشتے لگانا بھی اس کو جنت میں لے جانے کا سبب نہ بنے گا کیونکہ وہ صاحب ایمان نہ تھا اس کے جذبۂ جاں سپاری سے جو غلط فہمی لوگوں کو (اس کے ایماندار اور جنتی ہونے کے بارے میں) ہوگئی تھی اس کو یہ فرما کر دور کر دیا "ان اللہ یوید ھذا الدین بالرجل الفاجر" یہ قرائن نہیں بلکہ صراحتیں ہیں جو اس کے کفر کو ظاہر کر رہی ہیں، چنانچہ شراح نے بھی یہی سمجھا ہے، (اس کے علاوہ کسی اور پہلو کی گنجائش ہی کہاں ہے) مثلاً مشہور شارح حدیث علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں:- فیہ تنبیہ علی أن ذلک الرجل ما کان من المسلمین عن أصلہ، اس کے بعد ایک امکانی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھتے ہیں لا أنہ بسبب فعلہ خرج منہم یعنی یہ شخص شروع ہی سے مسلمان نہ تھا یہ مطلب نہیں ہے کہ خودکشی کی وجہ سے خارج از اسلام ہوگیا (کیونکہ خودکشی گناہ کبیرہ تو ضرور ہے لیکن اس کے ارتکاب سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا) اور لفظ "فاجر" سے بھی دھوکہ کا امکان باقی تھا (کیونکہ فاجر عام طور پر "گنہگار" کے معنی میں آتا ہے) اسے یہ کہکر دور کر دیا، الفاجر اعم من ان یکون کافراً او فاسقاً، (یعنی یہاں "فاجر" سے مراد کافر ہے صرف گنہگار نہیں ہے)[1]

اس تفصیل کے سامنے آجانے کے بعد اس بارے میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ وہ شخص کافر تھا، اور جب کافر تھا تو صحابی ہو ہی نہیں سکتا اس لیے اس احتمال آفرینی اور مطلب برآری کی جو کوشش ہو سکتی تھی اس کی مطلق گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

پھر بھی اگر کچھ لوگ اس سے مطمئن نہ ہوں اور اس کے لیے اس قبیل کی دوسری مثالیں پیش کریں مثلاً کہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص ثعلبہؓ تھا اس کا یہ واقعہ ملتا ہے کہ آپ کی دعا سے اس کی معاشی تنگی، وسعت میں تبدیل ہوگئی تھی اور پھر اللہ کے رسول نے

---

[1] فتح الملہم ص ۲۶۳ ج ۱ للعلامۃ شبیر احمد عثمانی

[2] سوالنامہ میں "ثعلبہ" کا حوالہ دے کر بھی کچھ لوگوں کا اعتراض نقل کیا گیا ہے۔

اس کی زکوٰۃ تک قبول نہ فرمائی — تو کیا ان کی بھی اقتدا کی جائے؟

اس واقعہ کا اصولی جواب تو وہی ہے جو شروع میں بیان ہوا، لیکن اس کے ساتھ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ واقعہ حدیث کی کسی صحیح اور معتبر کتاب میں نہیں آتا، قدرتی بات ہے کہ اس بناء پر واقعہ کی صحت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی (مشہور ترین محدث اور دریائے علم کے معروف شناور) نے تو اس کی عدم صحت کا ہی رجحان ظاہر کیا ہے وہ فرماتے ہیں ولا اظنه يصح[1] اور بالفرض یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو جس موقع پر عام طور پر اسے نقل کیا جاتا ہے (یعنی قرآن مجید کی آیت[2] ومنهم من عاهد الله لئن اتانا من فضله لنصدقن ولنكونن من الصالحين فلما اتاهم من فضله بخلوا به وتولوا وهم معرضون کا شان نزول قرار دیتے ہوئے[3]) اس سے خود یہ چل رہا ہے کہ یہ شخص منافق تھا، مومن نہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے نقل کیا ہے اسی آیت کے شان نزول کے طور پر ذکر کیا ہے، اور یہ آیت اور اس کے آگے پیچھے کی متعدد آیات منافقین ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس کے بعد والی آیت۔

فاعقبهم نفاقا فی قلوبهم تو کھلے طور پر ایسے لوگوں کا منافق ہونا بتا رہی ہے۔ اسی بنیاد پر حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ میرا غالب گمان ہے کہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے اور صحیح ماننے کی صورت میں یہ وہ ثعلبہ نہیں ہو سکتے جو مشہور صحابی ہیں اور بدر کی جنگ میں شریک تھے، کیونکہ ان شرکاء بدر کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا ہے لايدخل النار احد شهد بدرا والحديبية، "جو شخص بھی جنگ بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا وہ ہرگز جہنم میں داخل نہ ہوگا۔" صحابی رسول کے بجائے وہ ثعلبہ نامی کوئی دوسرا شخص ہوگا اور اس کے بعد اس کے قرائن لکھے ہیں (پوری تفصیل کے لیے الاصابہ ص۲۰۳ ج۱ دیکھیے) اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ واقعہ ہی صحیح نہیں اور اگر صحیح ہے تو یہ شخص سچا مومن نہیں بلکہ منافق تھا اور اس صورت میں وہ صحابی نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی صحابی کا زکوٰۃ سے انکار ثابت نہیں۔

ان دونوں پہلوؤں سے قطع نظر ایک احتمال یہ بھی ہے (جس کی گنجائش واقعہ کے بعض اجزاء سے نکلتی ہے) کہ یہ شخص مسلمان ہی ہو لیکن کسی عناد و سرکشی کے طور پر نہیں، بلکہ تساہل اور زکوٰۃ کی

---

[1] الاصابہ ص۲۰۳ ج۱ [2] سورہ توبہ [3] تفسیر ابن کثیر ص۳۷۴ ج۲، و درمنثور ص۲۶۱ ج۳

فرضیت (بالخصوص اموال ناطقہ کی زکوٰۃ) سے لاعلم ہونے کی بنا پر اس ابتلا کا شکار ہو گیا، چنانچہ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا یا احساس کرایا گیا، تو زکوٰۃ لیکر حاضر خدمت ہوا، اور جب قبول نہ کی گئی تو سخت نادم و متاسف ہوا، فرط ندامت اور اظہار حسرت کے طور پر روتا اور سر پر خاک ڈالتا تھا، جیسا کہ اکثر واقعہ نگار لکھتے ہیں، مثلاً علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی مشہور تفسیر "در منثور" میں جن الفاظ میں اسے ذکر کیا ہے ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت یا کم از کم حیوانات کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم، اس شخص کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد نازل ہوا (وفقدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسأل عنہ فاخبروہ أنہ اشتری غنماً وأن المدینۃ ضاقت بہ ...... ثم إن اللہ تعالیٰ أمر رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم أن یأخذ الصدقات وأنزل خذ من اموالھم صدقۃ" (ج) اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی اور ان کی زکوٰۃ نہ قبول کرنے کی وجہ سے ان کی جو حالت ہوئی اس کے بارے میں لکھتے ہیں (فجعل یبکی ویحثی التراب علی رأسہ) ان کے اس رویہ کی وجہ سے حسن ظن کی گنجائش نکلتی ہے اور کہا جا سکتا ہے ان کی زکوٰۃ کا قبول نہ کیا جانا تنبیہ کے لیے تھا، عام طور پر ہوتا ہے کہ اپنے لوگوں کو تنبیہ زیادہ کی جاتی ہے اور ان کی فروگذاشتیں بھی نظرانداز نہیں کی جاتیں، جس طرح غزوہ تبوک سے تخلف کرنے والے منافقین کو تو کوئی خاص سرزنش نہیں کی گئی، بلکہ جانتے ہوئے بھی ان کے بے وقعت حیلے بہانوں ہی کو قبول کر لیا گیا، مگر تین مخلصین کی سخت آزمائش ہوئی اور پچاس روز تک مسلسل ان کا بائیکاٹ رہا (حدیث کی تقریباً تمام معتبر کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے) اس طرح یہاں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سبق بھی لیا جا سکتا ہے کہ ان کو کس قدر ندامت ہوئی اور کس درجہ افسوس ہوا اور اس میں ان صاحب کی اقتدا کی جا سکتی ہے، اور یہ بھی سیکھا جا سکتا ہے کہ قریبی تعلق والوں کی معمولی کوتاہیاں نظرانداز نہ کی جائیں بلکہ ان پر انھیں تنبیہ کی جائے اور سزا دی جائے۔ —— اگرچہ موخر الذکر احتمال کو علماء نے عام طور پر ذکر نہیں کیا ہے بلکہ عام شراح نے یہی کہا ہے کہ یہ وہ ثعلبہ نہیں ہیں جو بدر وغیرہ میں شریک ہوئے اور مخلص مومن تھے، سر پر خاک ڈالنے کی بھی علامہ آلوسی نے یہ توجیہ کی ہے، "وحثوۃ للتراب لیس للتوبۃ من نفاقہ بل للعارض عدم قبول زکوٰۃ مع المسلمین" یعنی اس کا سر پر خاک ڈالنا نفاق سے توبہ کرتے (اور حقیقی ندامت کے اظہار) کے لیے نہیں تھا بلکہ چونکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کی زکوٰۃ نہیں قبول کی گئی تھی اس لیے اسے عار محسوس ہوئی اور اسی وجہ سے اس نے اپنے سر پر خاک ڈالی۔ — والغیب عند اللہ وبیدہ ازمۃ التوفیق فنسأل اللہ تعالیٰ التثبیت

باقی ؟

مولانا محمد تقی امینی

خطاب عید الفطر

یہ خطاب عید الفطر کے دن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا

[یہ خطاب جیسا کہ ظاہر ہے ۴-۵ مہینے کے بعد الفرقان کے اس شمارہ میں شائع ہو رہا ہے۔ لیکن امید ہے کہ ناظرین کرام مضمون کی افادیت میں اس زمانی تاخیر کا کوئی اثر محسوس نہ کریں گے۔]

حضرات! آج عید کا دن ہے جو دنیا کے تہواروں اور میلوں سے مختلف ہے۔ ہماری عید میں مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں سے ہٹ کر اس حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا کی طاقتوں سے بڑی ایک دوسری طاقت اور اس زندگی سے زیادہ حقیقی ایک دوسری زندگی ہے جس میں ذرہ ذرہ کا حساب دینا اور ہر حس و حرکت کا جواب دینا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے عید کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے:-

"عید یہ نہیں ہے کہ عمدہ کپڑے پہنے جائیں عمدہ کھانے کھائے جائیں پسندیدہ چیزیں استعمال کی جائیں اور لذات و شہوات سے لطف اندوز ہوا جائے بلکہ عید یہ ہے کہ طاعات میں قبولیت کی علامت ظاہر ہو۔ گناہوں کے لیے کفارہ ہو۔ برائیاں نیکیوں سے بدل دی جائیں بلندی درجات کی بشارت ہو۔ نور ایمانی سے شرح صدر ہو۔ اور قوۃ یقین سے سکون قلب حاصل ہو وغیرہ"[1]

---

[1] عبد القادر جیلانی۔ کتاب الغنیۃ لطالبی طرق الحق فی معرفۃ آداب الشریعۃ جزء ثانی فصل فی ذکر الفطر ص۱۵

عید کے لیے اس دن کا انتخاب کیا گیا جس دن انسان تربیتی کورس مکمل کر کے عید منانے کے قابل ہوا یعنی ایک ماہ تک مسلسل نماز قرآن اور بالخصوص روزے کے ذریعہ انسان اپنی خواہشات پر قابو حاصل کرتا رہا اور زندگی میں ان صفات اور خصوصیات کو ابھارتا رہا جن سے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی اور روح اپنے سرچشمہ سے اتصال پیدا کرتی ہے امام غزالیؒ نے روزہ کا یہ مقصد بیان کیا ہے:-

"روزہ سے مقصود اللہ کے اخلاق میں بالخصوص صمدیت یعنی بے نیازی کی صفت سے متصف ہونا اور بقدر امکان خواہشات پر قابو پاکر فرشتوں سے مشابہت پیدا کرنا کیونکہ فرشتے خواہشات سے منزہ اور پاک ہوتے ہیں"[۱]

عید کی تقریب دراصل اس احسان کا شکرانہ ہے جو بطور خاص اللہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے۔ تقریباً دو ہزار سال تک دنیا کی امامت و پیشوائی بنی اسرائیل کے پاس رہی اور جب وہ اس قابل نہ رہے تو شب قدر میں یہ امامت و پیشوائی امت مسلمہ کی طرف منتقل ہوگئی جس کی صورت یہ ہوئی کہ اس شب میں نبوت کا تاج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر رکھا گیا اور پھر آپ کے واسطہ سے اس تاج کی وراثت امامت اور پیشوائی کی شکل میں امت مسلمہ کے حصہ میں آئی۔ اس منصب کی بدولت یہ امت دوسری تمام قوموں سے ممتاز اور افضل قرار پائی اور بطور شکرانہ ایسی عید یا جشن مسرت منانے کا حکم دیا گیا جو منصب امامت کی نمائندگی کرنے والا اور اس کے شایان شان ہو۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور امت مسلمہ کی امامت نے دنیا کو جو کچھ دیا اس کی داستان نہایت طویل ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ نبوت نے دنیا کو جو سب سے زیادہ قیمتی شے عطا فرمائی وہ "انسان" ہے جس میں نبوت کی تعلیم و تربیت سے متضاد اوصاف و کمالات کی نمود ہوئی۔ اقبال نے کہا ہے ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات	ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل	اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

[۱] غزالی۔ احیاء العلوم جلد ۱ ص ۲۳۴

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو   رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب   عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی اربابِ ذوق فارس میدانِ شوق   بادہ ہے اس کا رحیق۔ تیغ ہے اس کی اصیل

یہ انسان صرف بندگی کے لیے کارآمد نہیں ثابت ہوا بلکہ زندگی کے ہر میدان میں کارآمد ثابت ہوا۔ اور جو کام بھی اس کے سپرد ہوا اس میں اپنی اہلیت و فرض شناسی کا زیادہ سے زیادہ ثبوت دیا۔

نبوت نے انسان کو انسان بنانے کے لیے جو معلومات فراہم کیں اور جو معیارات قائم کیے وہ اس دور میں بالخصوص توجہ کے لائق ہیں مثلاً

(۱) نبوت نے زندگی کے راز اور انسان کی سائینس سے واقف کرایا۔ زندگی کا راز اندرونی حصہ کے تاروں میں پوشیدہ ہے اور انسان کی سائنس ایک ذی شعور طاقت سے ان تاروں کا صحیح ربط قائم کرنے میں مخفی ہے۔ ان دونوں تک رسائی اس جدید انسان کے بس سے باہر ہے جس کو عقل و ہوس نے اختراع کیا، صنعت نے پیدا کیا اور پھر ریسرچ و تحقیق کے ذریعہ اس کو سرتاسر مادی بنا دیا۔

(۲) نبوت نے نورانی شعاعوں کے ذریعہ زندگی کے ان مخفی تاروں کا عکس لیا جن کو چھیڑے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا اور بہت سے نغمے خاموش رہتے ہیں پھر زندگی سے گریزاں بنتی اور تمدن خود تمدن کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔

(۳) نبوت نے انسان کے نورانی اصل ہونے کا ثبوت فراہم کیا اور پھر اس کی مناسبت سے اخلاق و کردار کا معیار مقرر کیا حلال و حرام کے درمیان تمیز کی جائز و ناجائز اور اچھائی و برائی کی تقسیم کی۔

(۴) نبوت نے زندگی کے "اقدار" متعین کر کے ان کا سرچشمہ اللہ کی صفات کو قرار دیا جن میں تبدیلی اور زمان و مکان کی پابندی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ ان کا وجود یکساں قائم رہتا ہے۔

(۵) نبوت نے عقل کو جذبات و خیالات پر غالب رکھنے کا بندوبست کیا اور روح کو سکون و اطمینان دینے کے لیے اس کے سرچشمہ سے ربط و تعلق پیدا کرا دیا۔

اسی طرح امت مسلمہ کی امامت نے دنیا کو جو کچھ دیا وہ بھی بہت طویل ہے یہاں چند کردار پیش کیے جاتے ہیں جن میں عبرت و بصیرت ہے۔

(۱) حضرت ابو بکرؓ کی بیوی نے ایک دن شیرینی کی فرمائش کی جواب دیا کہ میرے پاس گھر کے بقدر ضرورت روزمرہ خرچ سے زائد رقم نہیں ہے کہ اس سے شیرینی منگا سکوں، بیوی نے کہا کہ اجازت ہو تو اسی میں سے کچھ رقم جمع کر کے خدمت میں پیش کردوں فرمایا اگر ایسا کر سکتی ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔ چند روز بعد کچھ رقم جمع کر کے حضرت ابو بکرؓ کو دی تو فرمایا کہ یہ رقم ضرورت سے زائد معلوم ہوتی ہے اس لیے یہ بیت المال کا حق ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے نہ صرف یہ رقم سرکاری خزانہ میں جمع کردی بلکہ اس مقدار کو مستقلاً تنخواہ سے یہ کہہ کر کم کر دیا کہ ابو بکر کے اہل و عیال شیرینی کھائے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں[۱]۔

(۲) حضرت عمرؓ کی بیوی نے (غالباً قحط کے زمانے میں) ایک مرتبہ گھی خریدا تو پوچھا کیسے خریدا ہے جواب دیا آپ کی تنخواہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے میں نے اپنی ذاتی رقم سے خریدا ہے فرمایا میں اس کو اس وقت تک نہ چکھوں گا جب تک دوسرے لوگ اس کو استعمال نہ کرنے لگیں[۲]۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ اپنے بچہ کے ہاتھ میں تربوز دیکھا تو کہا کہ تمھیں شرم نہیں آتی ہے تم امیر المومنین کے بیٹے ہو کر پھل کھا رہے ہو اور محمدؐ کی امت لاغر و نحیف ہو رہی ہے۔ بچہ روتا ہوا بھاگا لوگوں نے کہا کہ اس نے پیسہ سے نہیں خریدا بلکہ کھجور کی گٹھلیاں دے کر خریدا ہے[۳]۔

(۳) حضرت علیؓ عید کے دن خشک روٹی کھا رہے تھے پوچھنے پر جواب دیا کہ ہماری عید اس دن ہوتی ہے جس دن کوئی گناہ نہ ہو[۴]۔

(۴) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو ذمہ داری محسوس کر کے رونے لگے یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھی تر ہوگئی ان کی بیوی فاطمہ نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا میں نے پوری امت کی ذمہ داری لی ہے اس میں ہر قسم کے لوگ ہیں بھوکے فقیر، بے سہارا، بعض بے سروساماں مجاہد، بے بس مظلوم، غریب قیدی۔ بہت بوڑھے کثیر العیال جن کے پاس مال کم ہے۔ اسی طرح

---

[۱] ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۲۹۱ [۲] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثالث والثلثون صفحہ ۔۔

[۳] ایضاً صفحہ ۶۹ [۴] کتاب الغنیۃ حوالہ بالا

مختلف علاقوں کے رہنے والے دوسرے ضرورت مند ہیں۔ قیامت کے دن ان سب کے بارے میں مجھ سے باز پرس ہوگی اور ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے والے اللہ کے رسول ہوں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں جرح میں ٹوٹ جاؤں اس لیے اپنی جان پر ترس کھا کر رو رہا ہوں۔[1]

(۵) امت مسلمہ نے علماء و صوفیاء کی شکل میں ایک کردار پیش کیا جنھوں نے باد سموم کی لپیٹ کا مقابلہ کر کے نبوت کی تعلیمات اور اس کے معیارات کو برقرار رکھا۔ اگر صوفیاء نہ ہوتے تو اسلام اتنا زیادہ وسیع نہ ہوتا۔ علماء نہ ہوتے تو اسلام کی صحیح تعلیم اجاگر نہ ہوتی پھر امامت و پیشوائی کی بات بے معنی ہوکر رہ جاتی۔ ابھی تو نہیں قیامت کے دن جب حفاظت دین کے متعلق باز پرس ہوگی اور اس سلسلہ میں ایثار و قربانی اور کارگزاری سننے سنانے کا وقت ہوگا تو یہی بوریہ نشین سامنے آکر کہیں گے۔

بار الہا جب اپنوں نے غیروں سے آشنائی کی تھی اور روح و جسم دونوں مرہون ہو گئے تھے۔ جب غیروں نے مکین و مکان پر منظم حملہ کیا تھا اور دل و دماغ دونوں مجروح ہو چکے تھے۔ جب باد سموم کے تیز و تند جھونکے نبوت کی شمع کافوری کو گل کر رہے تھے اور شمع بجھ بجھ کر جل رہی تھی تو ایسے نازک وقت میں اگر ہم سے کچھ نہ ہو سکا تو غیروں کی دشمنی مول لے کر "ملبہ" کی رکھوالی کی۔ اپنوں کے طعن سنکر شمع کافوری کی حفاظت کی۔ دوسروں کی پیش کش کو ٹھکرا کر اجڑے آشیانہ کی یاد تازہ رکھی حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہر طاقت سلب ہوگئی ہر حرکت بند ہوگئی صرف آنکھ کی چمک دیکھ کر اپنی تسلی کی اور سامنے سے کسی کو سراغ و ٹیا اٹھانے نہ دیا۔

علماء و صوفیاء کے علم و ہنر کا امتحان کم ہوا لیکن کردار کا امتحان ہر وقت ہوتا رہا اور ناکامی سے نہیں بلکہ کامیابی کی بنا پر ان کے نشیمن جلتے رہے اس کے باوجود حفاظت دین کی خدمت میں فرق نہ آنے دیا۔ امت مسلمہ کی تاریخ میں جب تک نبوت کی تعلیم اور تاریخی کردار محفوظ رہیں گے وہ دنیا کی امامت و پیشوائی سے دست بردار نہ ہو سکے گی اور یہ بھی توقع ہے کہ جشن عید منانے میں اپنی آن و شان کو برقرار رکھے گی۔ دنیا میں حسن کی کمی نہیں "آن" کی کمی ہے صرف ادا کافی نہیں شان کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ دونوں امت مسلمہ کی زندگی میں برقرار رہیں گے اس کی جاذبیت و دلکشی میں فرق نہ آئے گا اور جب یہ دونوں ختم ہو جائیں گے تو گھاس پھوس سے زیادہ

---

[1] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۳ و کتاب الخراج ص ۱۰

اس کی وقعت نہ رہے گی۔

آج کی دنیا نیلام کی ایک منڈی بنی ہوئی ہے امیر و غریب افسر و ماتحت سب کے دام لگ رہے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے دام ابھی نہیں لگے ہیں اس دنیا میں بالخصوص نبوت کی تعلیم اور ہمارا تاریخی کردار "مینارۂ نور" کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کی عید کا ہمارا پیغام بھی روشنی کا مینارہ ہے جس میں دوسروں سے زیادہ خود کے لیے عبرت و بصیرت کا سامان ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مکتوب لندن

باسمہ سبحانہ

مخدومی والد ماجد۔ اللہ آپ کی صحت کاملہ کا مژدہ سنوائے!

گھر سے آنے والے ہر خط کے ساتھ یہی امید وابستہ ہوتی ہے اور کچھ نہ کچھ طمانیت کی بات نکلتی بھی ہے۔ مگر ہماری مرادوں کی منزل تھوڑی دیر اور چاہتی ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے دل کو امید کا بہت بڑا سہارا دے رکھا ہے اور اس دیر میں اس کی کسی حکمت کا یقین بھی۔

تقریباً سوا مہینہ ہوا جب گلاسگو جانے سے پہلے آپ کی خدمت میں خط لکھا تھا۔ اس کے بارے میں عبید سلمہٗ کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ وہ تازہ الفرقان میں چھپ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اور لکھنا چاہیے کیونکہ اس خط میں گلاسگو جانے کے ارادے اور واپسی پر وہاں کے اجتماع کے سلسلے میں کچھ لکھنے کے خیال کا اظہار تھا۔ پس جو لوگ اس خط کو الفرقان میں پڑھیں گے قدرتی طور پر اگلے خط کے منتظر ہو جائیں گے۔

یہ وعدہ میں اب سے پہلے پورا کرتا ایسی چیزیں بروقت ہی لکھنے کی بھی ہوتی ہیں۔ مگر طبیعت ایسی نہ رہی کہ کچھ لکھنے کو جی چاہے۔ بہرحال کچھ تو ایک دو دن سے طبیعت بھی غنیمت ہے اور پھر یہ تقاضا پیدا ہو گیا ہے تو لکھ ہی دینا چاہیے ورنہ پھر کہیں زیادہ دیر تک مؤخر کرنا پڑے۔

غالباً ۲۰ دسمبر کو میں نے سابقہ خط لکھا تھا۔ ۲۴ دسمبر تا ۲۶ دسمبر برطانیہ کے شمالی علاقے اسکاٹ لینڈ کے مشہور شہر گلاسگو میں تبلیغی اجتماع تھا۔ یہ تاریخیں کرسمس کی چھٹیوں کی وجہ سے رکھی گئیں تھیں۔ جو یہاں سال میں سب طبقوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے بڑی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ گلاسگو لندن سے بجانب شمال مغرب چار سو میل کے فاصلے پر ہے۔ سڑکوں کی خوبی کا یہاں

کوئی ٹھکانا نہیں۔ حافظ ابراہیم صاحب صدیقی نے اس سفر میں اپنی معیت کی دعوت دے رکھی تھی۔ یعنی اُن کی کار سے سفر ہو۔ ماشاء اللہ اچھی کار اُن کے پاس ہے۔ ۲۴ کی صبح ۹ بجے وہ میرے یہاں تیار ہو کر تشریف لے آئے۔ ارادہ اور جلدی کا تھا تاکہ دن دن میں وہاں پہنچ لیں۔ جمعہ کی نماز کی وجہ سے راستے میں اچھا خاصہ ٹھہراؤ بھی ہونا تھا۔ مگر یہ حضرات جلدی نہ آسکے اس لیے کہ صبح ہی صبح فرانس سے عربوں کی دو کاریں پہنچیں۔ کچھ اُن کے ناشتے پانی میں وقت لگا اور پھر یہ ہوا کہ انھیں گلاسگو کے لیے کوئی رہبر بھی چاہیے، تو کیوں نہ یہ لوگ حافظ صاحب ہی کو امیر کارواں بنالیں۔ چنانچہ ایک کے بجائے یہ تین گاڑیاں میرے یہاں پہنچیں اور ماشاء اللہ ایک چھوٹی سی برات لیکے ہم گلاسگو کو چلے۔

شہر لندن کی ٹریفک، ایک گھنٹہ شہر سے باہر ہونے میں لگ گیا۔ چار بجے دن غروب ہوتا تھا۔ چار سو میل کا سفر چھ گھنٹے بھی باقی نہ رہے اور جمعہ کے لیے وقفہ الگ۔ پروگرام تھا کہ مانچسٹر میں جمعہ پڑھ لیں گے۔ لیکن نہ مسجدیں دور سے پہچانی جاتی ہیں نہ صدائے اللہ اکبر سنائی دیتی ہے۔ نہ ایسا کوئی آدمی آسانی سے ملتا ہے جسے بے شبہ مسلمان جان کر مسجد کا پتہ لے لو۔ اور پچاسوں میل کا شہر چکر ہی کاٹتے کاٹتے ایک مسجد ملی تو جمعہ پڑھ کر لوگ نکل رہے تھے۔ وہاں سے ایک صاحب کو دوسری مسجد کے لیے لیا تو وہاں تک پہنچنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ سلام پھر رہا تھا۔ پورا ڈیڑھ گھنٹہ بھی گیا۔ نماز پھر بھی ظہر ہی کی ملی۔ اکیلے ہوتے تو شاید یہ صورت نہ پیش آتی۔ پیچھے جو دو گاڑیاں اجنبی مسافروں کی اپنے ساتھ تھیں انھیں لیکر چلنے نے بھی کافی وقت لیا۔ الغرض جمعہ گیا اور مسافروں والی نماز ظہر ملی۔ مسجد بڑی شاندار تھی دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ نماز سے فراغت کے بعد امام صاحب کے کمرے میں دوپہر کا کھانا ہوا۔ ماشاء اللہ کیا دسترخوان تھا، سب سے پہلے تو جگہ تنگ اور آدمی زیادہ یعنی ساڑھے چار تو ہم تھے۔ حافظ صاحب اُن کے دو صاحبزادے۔ ایک دوست اور ایک میں راقم سطور۔ اور وہ عرب بھائی گنتی تو نہیں کی دس گیارہ سے کم نہ ہوں گے۔ اور کمرہ ذرا سا۔ پھر بھی ایسی اخوت اور محبت کی فضا تھی کہ اس تنگی نے کھانے کا لطف کچھ بڑھا ہی دیا۔ کھانا بھی اپنی طرز کا یکتا ہی تھا۔ ہمارے تو میزبان بھی حافظ صاحب ہی تھے۔ انھوں نے روٹیاں، سیخ کے کباب، سبزی اور مٹھائی کے پیکٹ نکالے تو ادھر عرب بھائیوں نے پنیر کے ڈبے، زیتون کے پیکٹ۔ دودھ کی بوتلیں اور ڈبل روٹی۔

ماشاء اللہ کیا لطف اس وقت کے کھانے میں آیا گو ڈرتے ڈرتے ذرا ہی ذرا سا کھایا تھا۔ طبیعت ایسی ہی چل رہی تھی۔

اس کھانے کی مجلس میں ان عرب بھائیوں سے ملنے کا موقع ملا تو بڑا انس ایک دوسرے سے ہوا۔ اِلّا ماشاء اللہ سب مراکشی تھے۔ فرانس میں کام کرتے ہیں۔ سب جوان یا نوجوان تھے۔ معمر کوئی نہ تھا۔

عصر کی نماز سوا تین بجے پڑھ کر مانچسٹر سے نکلے اور مغرب راستے میں ادا کرتے ہوئے آٹھ بجے گلاسگو کے اجتماع گاہ میں عین عشاء کی جماعت کے وقت پہنچ گئے۔ خواہش تھی کہ پہنچتے ہی اپنے حافظ مقبول صاحب (جامعہ رشیدیہ ساہیوال) والوں سے ملاقات ہو جائے۔ اُن کا بلاوا پچھلے سال سے گلاسگو کے لیے چل رہا تھا۔ تو واقعی ایسا ہی ہوا کہ چند منٹ بھی نہ گئے کہ حافظ صاحب جو یہاں (مفتی صاحب) کہلاتے ہیں مل گئے اور مجھے بڑا اطمینان ہوا۔

یہ اجتماع گاہ یہاں کی ایک بہت بڑی مسجد تھی جو حال ہی میں ایک صاحب خیر نے خرید کر وقف کی ہے۔ اتنی لمبی چوڑی اور کئی منزلہ ہے کہ ہزاروں آدمی سما جائیں۔ اس کے نگراں اور امام اس وقت مفتی صاحب ہی ہیں۔ (اصل امام اور نگراں اُن کے چھوٹے بھائی حافظ شفیق احمد صاحب وطن گئے ہوئے تھے) مفتی صاحب نے میرا سامان اپنے کمرے ہی میں رکھوایا۔ اور اس لحاظ سے میں اور میرے ساتھی بھی بالکل بے فکر ہو گئے جنھیں میری طبیعت کی وجہ سے میرے قیام وغیرہ کا کچھ مجھ سے بھی زیادہ خیال تھا۔

گلاسگو میں داخلہ کے وقت کی ایک بات نہ بھولے گی۔ یہ ۲۴ر اور ۲۵ر دسمبر کی درمیانی رات تھی یہ رات ہی اصل کرسمس کی رات ہوتی ہے۔ تو جیسے ہمارے یہاں عید کی رات میں بازاروں میں بھیڑ بھڑکا رہتا ہے۔ دوکانیں رات گئے تک کھلتی ہیں گلاسگو کی اس رات میں ہم نے اپنے یہاں کا بالکل وہی مشرقی انداز دیکھا۔ کتنے کے کتنے دوکانوں میں گھسے پڑے تھے۔ وہ تو کہیے یہاں پیدل لوگوں کو سختی سے فٹ پاتھ پر چلنے کی عادت ہے ورنہ سڑک پر راستہ طے کرنا مشکل ہو جاتا۔

اسی موقع پر ساتھیوں نے بتایا کہ اسکاٹ لینڈ کے لوگ (اسکاچ)، انگلینڈ والے انگلش، لوگوں

سے مختلف ہوتے ہیں۔ طبیعت میں سادگی، کشادگی اور ملنساری ہے۔ یہی اسکاٹ لینڈ ہے جہاں کی ام الخبائث "اسکاچ وہسکی" بہت مشہور ہے۔ اور بعض پاکیزہ مشروب بھی بہت اچھے مانے جاتے ہیں جو پینے میں آئے۔

احباب ہمیں اجتماع کی طرف واپس آجانا چاہیے۔ یہاں گذشتہ سال بھی اجتماع ہوا تھا امسال یہ خیال تھا کہ محنت نہیں ہوئی ہے اجتماع ہلکا رہے گا۔ چنانچہ انتظامات بھی کچھ ہلکے ہی پیمانے کے تھے۔ مگر وہاں تو جو آمد شروع ہوتی ہے تو تمام اندازے دھرے رہ گئے۔ قریب تین ہزار پر جاکر نوبت پہنچی۔ مسجد بہت وسیع وعریض اور ہزاروں کو سما لینے والی تھی۔ پھر بھی ایک ہزار آدمی کے بقدر ایک ہال کا انتظام اگلے دن کرنا پڑا۔ بلجیم، فرانس اور ہالینڈ وغیرہ سے کوئی ستر پچھتر عرب آئے تھے۔ طلباء کی تعداد کوئی تین سو تھی۔ جن میں غالب اکثریت ملیشین طلباء کی تھی۔ اور ان میں سے کوئی ستر پچھتر نکلے بھی۔ مجموعی طور پر کوئی بیس جماعتیں نکلیں۔

ایک ایک منٹ لوگوں کا کام میں لگایا گیا۔ یہاں اردو کا خطاب ہو رہا ہے۔ وہاں عربی میں بیان ہے اور وہاں انگریزی حلقہ ہے۔ نہایت صبر و سکون اور دلچسپی سے لوگ سارے پروگراموں میں حصہ لیتے رہے۔ اسلام کی عالمگیریت اور ہدایت کا کیا کھلا ہوا نشان ہے کہ اس خدا فراموش ملک میں کرسمس کی جیسی قیمتی چھٹیوں اور اس کی شدید سردی میں ایک دعوت تجدید ایمان پر ہزارہا ہزار لوگ "یاتون من کل فج عمیق" کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ اپنی چھٹیوں کو پوری طرح فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے لیے کوئی تین سو کے قریب ستر کا تقریباً بیس جماعتوں میں نکلے بھی۔ بس ایک کمی ہے کہ یہاں اس دعوت کو اس کی پوری گہرائی اور وسعت کے ساتھ پیش کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود جتنا کام ہو رہا ہے اور جتنے وسیع عوامی دائرے میں ایمان کیا ہے اور اسلام کیا ہے؟ کا پتہ لوگوں کو چل رہا ہے اس کی بنا پر اس کی قدر نہ کرنا بڑی محرومی کی بات ہوگی۔

میرا سفر اول و آخر اجتماع میں شرکت کی غرض سے نہیں تھا۔ بلکہ کئی تقاضے شامل تھے۔ (۱) مفتی مقبول صاحب سے وعدہ کا ایفاء۔ (۲) تبدیل آب و ہوا۔ (۳) برطانیہ کے ایک تبلیغی اجتماع کا مشاہدہ۔ مفتی صاحب سے وعدہ کا ایفاء ہو گیا مگر نام ہی کا رہا کہ طبیعت بالکل اچھی نہ رہی۔

گلاسگو کے پانی کی بڑی شہرت پچھلے سال سے سن رکھی تھی۔ مگر جیسا کہ اور بھی تجربہ ہوتا رہا ہے میری طبیعت تو وہ پتھر ہے کہ جونک نہیں لگتی۔ تین دن رہا کسی اثر کا شبہ بھی تو نہوا ہاں تیسرا مقصد مشاہدہ کا حاصل ہو گیا اور بڑا اچھا رہا۔ طبیعت کچھ بھی اچھی رہی ہوتی تو میں چاہتا تھا کہ ایک آدھ جماعت میں بھی نکل کر دیکھا جاتا۔

اسکاٹ لینڈ ایک مستقل تاریخی خطہ ہے یہاں کی زبان میں بھی اہل انگلینڈ سے کچھ فرق ہے اور جیسا کہ اوپر آیا۔ مزاج و اخلاق بھی مختلف ہیں۔ وہاں قدامت ہے تعمیرات خاص طور سے بڑی پرشکوہ قدامت کا نمونہ ہیں۔ مفتی صاحب چاہتے تھے کہ میں کم از کم ایک ہفتہ ٹھہروں تو وہ مجھے اس علاقہ کی کچھ سیر کرائیں۔ خاص طور سے اڈنبرا (ADINBURAH) دکھائیں جو کبھی یہاں کا پایۂ تخت رہا ہے۔ گلاسگو سے ہے بھی نزدیک ہی۔ مگر میرا یہ حال تھا کہ ایک ایک دن رہنا مشکل مجبور ہو کر ۲۰؍ کو چلا آیا۔ راستے میں نیوٹن اترا اور ایک دن وہاں سال گزشتہ کے احباب کے ساتھ رہ کر ۳۰؍ کو اپنے مستقر پر آگیا۔ ان لوگوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزرنے سے طبیعت میں تھوڑی تازگی آگئی۔ ایسے خلوص اور اتنی بے تکلف محبت کے لوگ کم ہی کہیں رہتے ہوں گے۔

سفر کے یہ دن عام طور پر برف باری کے دن تھے۔ نیوٹن کے قیام کے دن درجہ حرارت صفر سے بھی سوا ۱۱ درجے نیچے گر گیا تھا۔ لندن میں بھی ۸ درجہ گرا ہوا رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ کمرہ جو ایک ہفتے سے خالی پڑا تھا اور ایسی سردی گزرنے پر بھی ہیٹر اس میں نہ جلا تھا یخ بستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ۲۴ گھنٹے ہیٹر جلنے کے بعد یہ کہیں رہنے کے قابل ہوا۔

طبیعت تین چار دن تو ایسی ہی چلتی رہی یعنی جیسی یہاں سے گئی تھی اور سفر میں رہی تھی۔ مگر پھر کچھ خدا کا فضل ہوا۔ بہتر ہونا شروع ہوئی اور ۲۰؍ تاریخ تک ایسی اچھی ہوتی چلی گئی کہ میرا جو تھوڑا بہت وزن پچھلے دنوں میں رفتہ رفتہ کم ہو گیا تھا وہ بحال ہو گیا۔ لیکن ایک دن اس اطمینان نے کہ اب انشاء اللہ طبیعت ٹھیک ہو گئی غضب کر دیا اور دو ایک لقموں کی کمی کھانے میں جو رکھتا رہا تھا تجربۃً اسے ایک وقت چھوڑ کے دیکھا تو پھر پورا ایک ہفتہ حالات بحال نہوئے خیر اللہ کا شکر ہے اب چار دن سے معدہ کے حالات بالکل درست ہیں۔ یہ اوپر تیخ اس دفعہ یہاں

(مارجن میں ہاتھ سے لکھا ہوا: [illegible])

رسید کتب

الفرقان میں کتب و رسائل پر تبصرہ و ریویو کا کام والد ماجد مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے قلم سے ہوتا تھا۔ ان کی صحت کی خرابی کی بنا پر عرصے سے یہ سلسلہ بند ہے اور الفرقان میں بار بار اس کا اعلان بھی کیا جا چکا ہے ــــ لیکن اس کے باوجود تبصرہ کے لیے نئی مطبوعات کی آمد کا سلسلہ مستقل جاری ہے۔ اس لیے اب یہ مناسب سمجھا گیا کہ الفرقان کے ذریعہ ان کتابوں اور رسائل کی ماہ بماہ مختصر تعارف کے ساتھ اطلاع دیدی جایا کرے جو ادارہ کو تبصرہ کے لیے موصول ہوتی ہیں ــــ امید ہے کہ مصنفین اور ناشرین حضرات اس میں ہمیں معذور تصور فرمائیں گے۔

عبید الرحمٰن سنبھلی

قوالی اور اسلام | از محمد اشفاق حسین پتہ: ادارہ اہل سنت و جماعت ۷-۴۹۷-۱-۱۴ استارام بٹیہ دوبرو گیان باغ۔ حیدرآباد (آندھرا پردیش) صفحات ۲۲۰۔ سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ قیمت چار روپیے۔ اس کتاب میں قرآن و حدیث فقہ اور ارشادات سلف کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام میں مروجہ قوالی کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔

قربانی خلیلؑ اور شہادت حسینؓ | از مولانا حکیم محمد زماں حسینی قاسمی۔ ناشر: ناظم مجلس القرآن والحدیث۔ ۸۰ کولو ٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷۳۔ صفحات ۴۰۔ سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ کتابت و طباعت معیاری۔ قیمت دو روپئے۔ یہ در اصل دو تقریریں ہیں، ایک کا موضوع عید الاضحیٰ کی قربانی ہے اور دوسری تقریر کا موضوع سیدنا حسینؓ کی شہادت کا واقعہ اور اس ضمن میں رسوم و خرافات کی تردید ہے۔

اظہار حقیقت | مرتبہ مولانا سید شریف حسین ترمذی۔ ناشر: مجلس علمیہ۔ حیدرآباد (اے۔ پی) صفحات ۳۲۔ خوب صورت آفسٹ پرنٹنگ۔ قیمت ایک روپیہ۔ اس کتابچہ میں بریلوی دیوبندی اختلاف کی مختصر تاریخ اور اجمالی روئیداد مستند حوالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور بریلوی الزامات کی تردید کرتے ہوئے رسالہ التصدیقات کا خلاصہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

نوٹ:- مذکورہ بالا تینوں کتابیں کتب خانہ الفرقان سے بھی طلب کی جا سکتی ہیں۔

انسانی فریضہ | مرتبہ افتخار فریدی صاحب۔ پتہ فریدی بلڈنگ۔ سنبھلی گیٹ۔ مراد آباد۔ صفحات ۳۴۔ دین و دعوت کی ضرورت و اہمیت سے متعلق اکابر اور مشاہیر علماء کی منتخب تحریروں پر مشتمل یہ پمفلٹ مندرجہ بالا پتہ سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

Regd. No. L.LW/NP-62

Monthly 'AL FURQAN' 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 45 NO. 2 & 3 FEB. & MARCH 1977 Phone : 25547

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

اور

مسئلہ نزولِ مسیح و حیاتِ مسیح

از

مولانا محمد منظور نعمانی

قیمت -/3

ناشر الفرقان بکڈپو، ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ

وفیات نمبر

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

پانچ روپیہ

اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۷۷ء

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

وفیات نمبر

چالیس سالہ فائلوں کے تعزیتی مضامین

مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

چندہ
سالانہ :- ۱۵/- روپے
عام شمارہ کی قیمت :- ۱/۵۰

قیمت
پانچ روپے

غیر ممالک سے
سالانہ :- دو پونڈ
(بذریعہ بحری ڈاک)

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے
براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ مبلغ پندرہ روپے ارسال کریں۔ اگر خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً مطلع فرمادیں ورنہ اگلا شمارہ بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا
براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی اڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس، باغ گونگے نواب لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

۱۹۷۴ء، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء کے تین انتخاب نمبروں کے بعد "وفیات نمبر" کے عنوان سے الفرقان کا یہ چوتھا انتخاب نمبر اللہ کی مدد اور توفیق سے ہدیۂ ناظرین ہے۔

گزشتہ سال الفرقان کے تیسرے انتخاب نمبر میں، جب یہ اعلان کیا گیا کہ یہ اس انتخابی سلسلہ کا آخری خاص نمبر ہے تو ناظرین کرام میں سے بعض مخلصوں نے یہ مشورہ دیا کہ چوں کہ اس سلسلۂ انتخاب میں وہ تعزیتی مضامین شامل نہیں کیے گئے، جو مشاہیر اکابر دین و ملّت یا دوسرے ممتاز حضرات کی وفات پر ادارہ کی طرف سے الفرقان میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، لہٰذا وہ تمام مضامین بھی اسی طرح ایک خاص نمبر کی شکل میں شائع کر دیئے جائیں ــــــ اُس وقت اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا تھا ــــــ بعد میں جب وفیات کے سلسلے کے مضامین کو اس نظر سے دیکھا گیا تو اندازہ ہوا کہ ان کو یکجا کر دینے سے ہمارے دور کے بہت سے اکابر داعیان کا ایک اچھا اور پُر تاثیر تذکرہ تیار ہو جائے گا جس کا مطالعہ ناظرین کے لئے اور خاص کر آئندہ نسلوں کے لئے ان شاء اللہ بہت نفع مند ہوگا۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا اور اب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ناظرین کے لئے نافع بنائے اور قبول فرمائے۔

اس نمبر سے متعلق چند ضروری باتیں

۱۔ اس نمبر میں اب پانچ سال پہلے (۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء) تک کے تعزیتی مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ قریبی پانچ سال میں جو مضامین اس سلسلے کے لکھے گئے ہیں اُن کا اس مجموعہ میں شامل کرنا عدم گنجائش کے علاوہ اس لئے بھی ضروری نہیں سمجھا گیا کہ الفرقان کے موجودہ قریباً سب ہی ناظرین کی نظر سے وہ گزر چکے ہوں گے اور اکثر حضرات کے پاس محفوظ بھی ہوں گے۔

۲۔ اس نمبر میں مضامین اُسی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں جس ترتیب سے وہ الفرقان میں شائع ہوئے تھے۔ صرف ابتدا میں ایک تصرف مناسب سمجھا گیا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے متعلق مضمون جو ترتیب واشاعت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر تھا، اس مجموعہ میں اسے پہلے نمبر پر کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اگست ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات پر مدیر الفرقان نے جو بسوط مضمون لکھا تھا وہ اس وقت ہفتہ وار "ندائے ملت" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اور چونکہ اس دور میں "الفرقان" اور "ندائے ملت" کے ناظرین کا حلقہ بہت کچھ مشترک تھا اسلئے الفرقان میں اسے شائع نہیں کیا گیا تھا اور مولانا مرحوم کے متعلق صرف مختصر نوٹ لکھ کر ندائے ملت کے مضمون کا حوالہ دے دیا گیا تھا۔ اس مضمون کی خاص اہمیت کے پیش نظر ارادہ تھا کہ اس "وفیات نمبر" میں اس کو بھی شامل کر دیا جائے تاکہ وہ الفرقان کے صفحات میں محفوظ ہو جائے اور ہمارے اس دور کے ناظرین کی نظر سے بھی گذر جائے لیکن صفحات میں گنجائش نہ نکل سکنے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اب ارادہ کیا گیا ہے کہ مولانا مرحوم سے متعلق اس مضمون کو اور وفیات کے سلسلے کی بعض اور اہم چیزوں کو انشاء اللہ الفرقان کے اگلے شمارہ میں شائع کر دیا جائے گا، اس طرح آئندہ شمارہ اس "وفیات نمبر" کا "تکملہ" یا "ضمیمہ" ہو جائے گا۔

۴۔ الفرقان کے اس سے پہلے شمارہ میں "وفیات نمبر کی ایک جھلک" کے زیر عنوان جن اکابر و مشاہیر کے اسمائے گرامی لکھے گئے تھے ان میں آخری نام شہید مظلوم شاہ فیصل بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا تھا یعنی اعلان کیا گیا تھا کہ شاہ مرحوم سے متعلق جو تعزیتی مضمون انکے حادثۂ شہادت پر الفرقان میں لکھا گیا تھا، وہ بھی وفیات نمبر میں شامل ہوگا، لیکن بعد میں یاد آیا کہ وہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والے دوسرے انتخاب نمبر ہی میں "نگاہِ اولیں" کے زیر عنوان لکھا گیا تھا اور ناظرین الفرقان کے پاس یقیناً محفوظ ہوگا، اس لئے اس کا اس چوتھے انتخاب نمبر میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

۵۔ حسب معمول سابق یہ وفیات نمبر بھی خریدار حضرات کی موجودہ تعداد سے زیادہ چھپوایا جا رہا ہے، تاکہ دوسرے شائقین بھی منگوا سکیں۔ اس کی قیمت بھی پہلے انتخاب نمبروں کی طرح پانچ روپے رکھی گئی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ پڑھے لکھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ نمبر تحفہ کے طور پر دیں تو یہ آپ کا بہت اچھا اور دین کے لحاظ سے بہت نافع ہدیہ اور تحفہ ہوگا۔ انشاء اللہ الفرقان کی طرف سے بھی بہت سے حضرات کو یہ نمبر ہدیہ اور تحفہ کے طور پر بھیجا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس سے دینی نفع پہونچائے

ناظم۔ الفرقان لکھنؤ

عـہ اس کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے متعلق مضمون مرتب کے سہو سے ترتیب میں مؤخر ہو گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

الحمد للہ الذی بعزتہٖ وجلالہٖ تتم الصٰلحٰت

الفرقان کے انتخابی سلسلہ کا یہ چوتھا خاص شمارہ "وفیات نمبر" ناظرین کی خدمت میں پیش ہے، اس میں قریباً وہ سب مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جو کسی کی وفات پر اب سے پانچ سال پہلے تک (یعنی ۱۳۹۲ھ م ۱۹۷۲ء تک) الفرقان میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کو کتابت کے لئے دینے سے پہلے راقم سطور نے اس وقت بھی پڑھا۔ اس کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگرچہ ان میں زیادہ تر اس عاجز ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں، تاہم اس وقت ان کے پڑھنے سے، مجھے بڑا دینی نفع پہونچا، دل متاثر ہوا، آنکھیں بار بار روئیں، اپنی موت یاد آئی، بلکہ بعض اوقات گویا سامنے آکھڑی ہوئی، اور اس کے لئے تیاری کی فکر پیدا ہوئی ــــــ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے ناظرین کرام کے دلوں میں بھی یہ فکر پیدا فرمائے اور ہم سب کو قبر اور آخرت کے لئے تیاری کی توفیق عطا فرمائے کہ سب کو دیر سویر وہیں جانا ہے ــــــ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ۔

آج ان سطروں کا لکھنے والا بھی یقیناً ایک دن مرنے والا ہے، وہ دن اور وہ گھڑی بس اللہ ہی کو معلوم ہے۔ جب بھی وہ وقت آئے گا تو اپنے بارہ میں نہ کچھ لکھا جا سکے گا، نہ کہا جا سکے گا، شاید دوسرے ہی لوگ کچھ کہیں یا لکھیں گے جو میرے حال سے پورے واقف بھی نہ ہوں گے۔ اس لئے

میں نے مناسب سمجھا کہ اس وفیات نمبر کے نگاہ اولیں کے ان صفحات میں خود ہی اپنے بارہ میں کچھ لکھ دوں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۔

قمری حساب سے میری عمر کا ۷۸ واں سال ہے اور شمسی حساب سے ۷۶ واں چل رہا ہے، اس لئے بظاہر بہت زیادہ وقت باقی نہیں ہے ۔۔۔ تاہم جو کچھ باقی ہے اللہ تعالیٰ اس میں توبہ و انابت اور تلافیٔ مافات کی توفیق عطا فرمائے ۔

ابتک جو طویل عمر اور مہلت ملی (بغیر ادنیٰ تواضع اور انکسار کے عرض کرتا ہوں) اس کو بہت ضائع اور برباد کیا ۔۔۔ ربِ کریم کی طرف سے ہر طرح کے انعامات سے بے حساب نوازا گیا ۔۔۔ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جہاں دُنیا بھی تھی اور دین بھی تھا ، پھر والد ماجد کو توفیق دی کہ انھوں نے للّٰہیت اور آخرت طلبی ہی کے جذبہ سے مجھے دینی تعلیم میں لگانے کا فیصلہ فرمایا ، پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی نے دینی تعلیم کی تکمیل خاص کر حدیث شریف کی تحصیل کے لئے اب سے نصف صدی پہلے کے "دارالعلوم دیوبند" میں پہونچایا ، جو اس وقت دینی تعلیم و تدریس بالخصوص علم حدیث و سنّت اور اس کے مطابق زندگی کی جامعیت کا بے مثال نمونہ اور مرکز تھا ، اور امام العصر حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ محدث کشمیری قدس سرہٗ جیسے علم کتاب و سنّت اور شریعت و طریقت کے جامع اساتذہ مسندِ تدریس کی زینت تھے ۔۔۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ علم بھی نصیب فرمایا ۔ پھر اسی کے ساتھ یہ عظیم ترین نعمت بھی عطا فرمائی گئی کہ اس نصف صدی کی پوری مدت میں جن اللہ والوں کو پایا ، ان سب کی عقیدت و محبت اور ان کی طرف سے بے استحقاق غیر معمولی شفقت و عنایت نصیب ہوئی ، ان کی خدمت میں حاضری کی توفیق بھی ملی ۔ استفادہ ہی کی نیت سے کبھی کبھی کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا ۔۔۔ کچھ ذکر و شغل کی بھی توفیق ملی ۔۔۔ لیکن اپنی شومیٔ قسمت اور بے استعدادی کی وجہ سے ان کی اصل دولت نسبتِ احسانی اور تزکیۂ اخلاق کی نعمت سے محرومی کی حسرت کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکا ۔

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل ۔۔۔ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

بظاہر خدمتِ دین کے مختلف شعبوں سے تعلق بھی نصیب رہا ، قرآنِ مجید اور حدیث شریف کے درس و تعلیم کے بہت اچھے مواقع عطا فرمائے گئے ، دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف ، مضامین و مقالات

اور تقریر و بیان کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کی بھی توفیق ملی، اور ان راہوں سے خوب شہرت بھی حاصل ہوئی۔
—— لیکن اپنے اندر کا حال یہ ہے کہ ان کاموں کی عنداللہ مقبولیت کی جو اولین شرط ہے، یعنی صدقِ رضائے الٰہی کی نیت اور اخلاص و احتساب، اُس کے بارے میں کبھی اطمینان حاصل نہ ہو سکا —— اور معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے ان کاموں میں اگر اخلاص نہ ہو تو یہ سب مقربہ مار دیے جانے کے لائق ہیں، بلکہ یہی دینی کام (جو بظاہر نیابتِ نبوت کے سلسلے کے مقدس کام ہیں) اگر دُنیا طلبی یا عندالناس مقبولیت و شہرت کے لئے کئے جائیں (تو جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مروی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث سے معلوم ہوتا ہے تو پھر یہی کام) دوسرے سب گناہوں سے پہلے جہنم میں ڈلوانے والے بدترین گناہ ہیں —— اعاذنا اللّٰہ تعالیٰ من ذالک۔

اس طویل زندگی میں بے گنتی واعظانہ اور مصلحانہ تقریریں کیں، ہزاروں کو گناہوں سے توبہ کرائی، اللہ و رسول کی فرمانبرداری، اتباعِ شریعت و سنّت اور گناہوں سے بچنے کی خوب تلقین و تاکید کی، پورے ۴۵ سال کی مدت میں الفرقان ہی کے صفحات میں سیکڑوں دینی و اصلاحی مضامین و مقالات لکھے —— لیکن پوری سچائی کے ساتھ اپنی اس کوتاہی اور بے نصیبی کا اقرار ہے کہ ایک مومنِ صادق اور داعیٔ حق کے قول و عمل اور حال میں جو مطابقت اور یکسانی ہونی چاہیے اُس میں ہمیشہ بے حد و بے حساب کمی محسوس ہوئی —— اگر خدانخواستہ "لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ" والا مؤاخذہ ہوا تو کوئی عذر اور جواب نہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اس حال کی اصلاح فرمائے اور اب تک کی تقصیرات کو اپنے رحم و کرم سے معاف فرمائے —— اَللّٰھُمَّ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ۔

اپنی رائے اور اپنے فہم و فکر پر زیادہ اعتماد اور اس کے ساتھ فیصلہ اور اقدام میں جلد بازی بھی میری بری عادتوں میں سے رہی ہے اور اس نے زندگی میں بڑی بڑی غلطیاں کرائی ہیں، لیکن احساس ہو جانے پر اللہ تعالیٰ نے رجوع اور اصلاح کی بھی توفیق دی فلہ الحمد ولہ الشکر —— اگر میں نے کبھی کوئی ایسی بات کہی یا لکھی ہے یا کوئی ایسا اقدام کیا ہے جو علماء راسخین و ربانیین کی عام رائے کے خلاف ہے تو اس کو غلط اور مرجوع عنہ سمجھا جائے۔

الحمد للہ نماز، روزہ جیسے فرائض کی کم از کم ظاہری ادائیگی نصیب ہے، اسی طرح وہ گندے حیوانی معاصی

جن کو شریعت کی خاص اصطلاح میں "کبائر و فواحش" کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے ان سے بھی بڑی حد تک محفوظ رکھا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ظاہر و باطن کے طرح طرح کے گناہوں میں اپنے کو سر سے پاؤں تک ملوث دیکھتا ہوں، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق بھی ملتی ہے اس لئے ارحم الراحمین کی رحمت سے معافی اور مغفرت کی امید رکھتا ہوں ـــــ انشاء اللہ الرحیم الکریم اُس زمرہ میں شامل کردیا جاؤں گا جن کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔[1] "وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ" ـــــ (آل عمران۔ ع۔۱۳)

دینی اور آخرتی نقطۂ نظر سے میری نہایت مہلک اور خطرناک بیماری یہ ہے کہ اخلاقی رذائل، حُبِّ جاہ، رِیا، کبر، غصہ اور اُس کے نتیجہ میں بندگانِ خدا کی دل آزاری، اور غرباء و مساکین سے کم آمیزی اور اُن کی محبت ملاطفت سے محرومی جیسے رذائل کی جڑیں دل کی گہرائی میں جمی ہوئی ہیں، حالانکہ یہ شیطانی معاصی ہیں جو زنا، شراب جیسے حیوانی معاصی سے بھی زیادہ خطرناک ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت ہے کہ وہ ان خبیث امراض کی جڑوں کو دل سے نکال کے مرنے سے پہلے قلب و روح کو پاک فرمادے۔

اللهم اهدنی لاحسن الاعمال والاخلاق انه لا يهدی لاحسنها الا انت واصرف عنی سيئها لا يصرف عنی سيئها الا انت۔

وصیّت

جیسا کہ عرض کیا گیا قمری حساب سے میری عمر کا ۷۴ واں سال چل رہا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ

---

[1] آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ایسے قصوروار بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ معاف فرماکر نیکوں کے ساتھ جنت میں داخل فرمادے گا جن کا حال یہ رہا ہوگا کہ جب انھوں نے کوئی شرمناک حرکت یا گناہ کیا تو ان کو اللہ یاد آیا اور انھوں نے معافی مانگی اور گناہگاری پر قائم اور مصر نہ رہے تو ایسے قصوروار گناہگار بھی بخش دیے جائیں گے۔ ۱۲۔

زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ حدیث شریف میں وصیت کرنے کا سخت تاکیدی حکم ہے ____ اس عاجز نے اپنے خانگی اور مالی معاملات سے متعلق ایک یادداشت "وصیت نامہ" ہی کے طور پر، گزشتہ رمضان مبارک میں شدید بیماری کی حالت میں جبکہ میں اسپتال داخل تھا، لکھائی تھی لیکن وہ ناتمام اور نامکمل تھی، اب اس پر نظر ثانی اور ممکن حد تک اس کی تکمیل کر کے گھر والوں کے لئے محفوظ کر دینے کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اس کے علاوہ کچھ باتیں عام دینی نصیحت اور خیر خواہی کی عرض کرنا بھی اپنا فرض سمجھ کر **عمومی وصیت** کے طور پر یہاں لکھتا ہوں:۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" کی تعمیل کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے نفس اور اپنی ذات کو، اس کے بعد اپنی اولاد، اپنے عزیزوں، دوستوں اور درجہ بدرجہ سب اہل تعلق کو اور اس کے بعد ان سب اہل ایمان کو جن تک میری بات پہونچ سکے، میری وصیت ہے کہ:۔

قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے مطابق خالص توحید پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور اس یقین اور دھیان کے ساتھ شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے۔ ہمارا ظاہر و باطن ہر لمحہ اس کے سامنے ہے اور مرنے کے بعد اس کے سامنے پیش ہونا اور پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔

اہتمام کے ساتھ شریعت کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ادا کریں، خصوصاً نماز با جماعت کی پابندی کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں (اگر نماز نہیں تو گویا ایمان نہیں) ____ جن چیزوں کو اللہ و رسول نے ناجائز و حرام قرار دیا اور منع فرمایا ہے ان سب سے، خاصکر کبائر اور فواحش سے اپنے کو بچانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہیں، اگر اغوار شیطانی یا اپنے شریر نفس کے تقاضے سے گناہ ہو جائے تو سچے دل سے توبہ و استغفار کریں، اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت فرما دے گا۔ اس کا ارشاد ہے:۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء ع ۱۶)	جو کوئی بندہ برا کام کرے یا اللہ کی نافرمانی کر کے اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان پائیگا۔

اگر خدانخواستہ توبہ و استغفار کے بعد پھر گناہ ہو جائے اور بدبختی سے بار بار ہو جائے تب بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر ہزار بار گناہ کر کے بھی بندہ سچے دل سے توبہ کرے گا اور اللہ سے معافی مانگے گا تو وہ رحیم و کریم معاف فرمائے گا ؂

گر ہزار بار توبہ شکستی باز آ　　　　این درگہ ما درگہ نومیدی نیست

عمر کا بڑا حصہ غفلت اور گناہوں میں گزارنے کے بعد بھی اگر توبہ و استغفار اور اصلاح حال کی توفیق ملے تو کچھ نہیں گیا ـــــ اولیاء اللہ میں ہزاروں وہ ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ غفلت بلکہ فسق و فجور میں گزرا پھر جب اُن کے اندر ایمانی احساس جاگا اور انھوں نے اپنے کو شیطان کے پنجے سے نکال کر خدا کے راستہ پر ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو مقام ولایت تک پہونچا دیا ـــــ ایسے لوگوں کیلئے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے لگیں، اللہ کے ایسے بندوں سے قریب ہوں جو اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہوں ـــــ انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اچھا یا بُرا اثر ڈالنے والی چیز صحبت ہے ؂

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

جن لوگوں نے بظاہر خدا سے بے تعلقی اور آخرت کی طرف سے بے فکری والی زندگی ہی کو اپنا لیا ہے اور اسی میں وہ مست و مگن ہیں، بخدا وہ بدترین قسم کی خودکشی کر رہے ہیں۔ اگر وہ میرے قریبی عزیز بھی ہیں، تو میں اُن سے بری ہوں ـــــ اُن کو بہت ڈرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ توبہ و اصلاح کی توفیق سے بلکہ ایمان سے بھی ان کو محروم نہ کر دے ـــــ اُس کو کسی کی پروا نہیں وہ غنی عن العٰلمین ہے، اسکی بندگی اور فرمانبرداری خود ہماری ضرورت ہے ـــــ ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق اور محسن چچا تھے لیکن جب انھوں نے اپنے لئے ایمان کو پسند نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی (رسول اللہ ؐ کی خواہش کے باوجود) اُن کے لئے ایمان پسند نہیں فرمایا اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ ۔

حقوق العباد

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اُس کا تعلق حقوق اللہ سے تھا۔ حقوق العباد کا معاملہ اس حیثیت سے زیادہ اہم اور قابل فکر ہے کہ اس میں اگر تقصیر اور کوتاہی ہو جائے، یعنی کسی بندہ کی ہم سے حق تلفی یا اس پر ظلم و زیادتی ہو جائے تو اس سے نجات کا اور سبک دوشی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے (جو رحیم و کریم ہے) اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا ہے، بلکہ

اُسکی صورت صرف یہی ہے کہ یا تو اُس مظلوم بندہ کو اسی دُنیا میں اس ظلم و زیادتی کا بدلہ اور معاوضہ دے کر سبکدوشی حاصل کی جائے یا معاف کرالیا جائے ـــــ اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی یہاں نہ ہوسکی تو آخرت میں خدانخواستہ سخت عذاب بھگتنا ہوگا ـــــ صحیح بخاری شریف میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد مروی ہے جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے کہ:ـــــ

"جس کسی نے کسی دوسرے بندہ پر ظلم و زیادتی کی ہو، اُس کی آبروریزی کی ہو یا اس کا کوئی حق مار لیا اور دبالیا ہو تو اُس کو چاہئے کہ اِس زندگی ہی میں اس سے معاملہ صاف کرلے، قیامت کے اُس دن کے آنے سے پہلے جب اس کے پاس ادا کرنے کے لئے روپیہ پیسہ کچھ نہ ہوگا ـــــ اگر اُس کے پاس اعمال صالحہ ہوں گے تو اسکے ظلم اور حق ماری کے بقدر اس مظلوم کو دلوا دیئے جائیں گے اور اگر وہ اعمال صالحہ سے بھی خالی ہاتھ ہوگا تو مظلوم بندہ کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے (اور وہ جہنم میں سکی سزا بھگتے گا)

الغرض حقوق العباد کا معاملہ بہت زیادہ قابل فکر ہے، لیکن زندگی اور معاشرت بگڑ جانے کی وجہ سے فی زماننا بہت سے دیندار اور عبادت گذار بھی حقوق العباد کے معاملہ میں بہت کوتاہیاں کرتے ہیں ـــــ یہ عاجز سب سے پہلے اپنے نفس، اپنی اولاد، اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل تعلق کو اور سب اہلِ ایمان کو اس بارہ میں خصوصیت سے وصیت اور تاکید کرتا ہے۔ اگر کسی بندہ کا کوئی مالی یا غیر مالی حق ہمارے ذمہ ہے تو اس کو ادا کرنے یا معافی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا اپنے پر عظیم ظلم اور اپنے ساتھ شدید دشمنی ہے۔

اس عاجز سیہ کار کا زندگی میں جن حضرات سے تعلق اور واسطہ رہا ہے، اُن میں سے بہت سوں کی میری کسی بات یا کسی عمل سے دل آزاری ہوئی ہوگی، بہت سوں کی غیبت کی ہوگی، دل نے بہت سوں کے بارہ میں بدگمانی کی ہوگی یا اسی طرح کی کوئی اور کوتاہی اُن کے بارہ میں مجھ سے ہوئی ہوگی ـــــ تو جن حضرات تک میری یہ گذارش پہونچ جائے، اپنی اس تحریر کے ذریعہ میں اُن سب سے اللہ کیلئے معاف کردینے کی استدعا کرتا ہوں، وہ اللہ کے واسطے مجھے معاف فرمادیں، مجھ پر ان کا یہ بہت ہی بڑا احسان ہوگا اور وہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے ـــــ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ـــــ اور اگر اس طرح کے حقوق کسی مسلمان بھائی پر بالفرض میرے ہوں تو میں نے اللہ سے اجر کی امید رکھتے ہوئے ان کو بالکل سبکدوش کردیا۔

جہانتک مجھے یاد ہے کسی عزیز یا دوست کا مجھ پر قرض یا کوئی اس طرح کا مالی حق باقی نہیں ہے۔ اگر بالفرض کسی صاحب کا ہو تو وہ مجھے بتلادیں اور یاد دلادیں، اگر اطمینان ہوگیا تو انشاءاللہ ضرور ادا کردیا جائے گا۔

اور میں ان کا ممنون ہوں گا۔ اور جن حضرات کے ذمہ میرا کوئی مالی حق باقی ہے، اگر ان کے لیے ادائیگی مشکل ہو تو مجھ سے گفتگو یا خط و کتابت کرلیں انشاء اللہ ان کے لئے سہولت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے سلسلہ کے حقوق

تقریباً ۶۴ سال سے الفرقان جاری ہے اور اس کے ساتھ کسی نہ کسی پیمانہ پر کتابوں کی فروخت کا سلسلہ بھی رہا ہے۔ اور بہت مدت سے میں ان دونوں سلسلوں کے معاملات سے خود تعلق نہیں رکھتا، لین دین کے سارے معاملات دوسرے ہی کارکن کرتے رہے ہیں، لیکن بلاشبہ مالکانہ حیثیت سے ذمہ داری میری رہی ہے۔ تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں یقیناً ہزاروں بندگان خدا الفرقان یا کتابوں کے خریدار رہے ہوں گے۔ اگرچہ میں کارکنوں کو ہمیشہ تاکید کرتا رہا ہوں کہ کسی کا کوئی حق ہمارے ذمہ باقی نہ رہ جائے لیکن غالب گمان یہی ہے کہ کم از کم نادانستہ یا غفلت و لاپروائی سے بہت سے بندگان خدا کے ساتھ معاملہ میں کوتاہی یا انکی کوئی حق تلفی ہوئی ہوگی، اور ان کا کوئی حق رسالہ یا کتب خانہ کے سلسلے میں باقی رہ گیا ہوگا۔ اسلئے میں ایسے سب حضرات سے جن کا کوئی حق دفتر الفرقان یا کتب خانہ الفرقان کے ذمہ باقی رہ گیا ہو، گزارش کرتا ہوں کہ وہ مجھے مطلع فرما کر اپنا حق وصول کرلیں۔ یہ ان کا مجھ پر احسان ہوگا۔ اور اگر شرافت و مروت کی وجہ سے ایسا کرنے میں انکو تکلف ہو تو ارادہ کے ساتھ لوجہ اللہ معاف قرار دیں اور آخرت کے مواخذہ سے مجھے سبکدوش کردیں۔

میری ایک وصیت یا گزارش یہ ہے کہ میرے انتقال کے بعد میرے نجی خطوط شائع نہ کیے جائیں۔ اگر کسی خط کی اشاعت میں کوئی خاص افادیت سمجھی جائے تو میرے بڑے لڑکے مولوی عتیق الرحمان کو خط دکھا کر ان کی اجازت سے شائع کیا جائے۔

دعائے مغفرت کی التجا

عزیزوں، دوستوں اور سب مسلمان بھائیوں سے، جن تک میری بات پہونچ سکے، آخری گزارش اور التجا یہ ہے کہ دعائے مغفرت کا مجھے انتہائی درجہ میں حاجت مند سمجھ کر جب بھی توفیق ہو میرے لئے مغفرت و رحمت کی دعا کریں۔ انشاء اللہ اس کے صلہ میں آپ کے لیے اللہ کے مقرب فرشتے مغفرت و رحمت کی دعا کریں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ کوئی دعا کرتا ہے تو فرشتے "آمین" کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ کہتے ہیں کہ "ولک مثل ذالک" یعنی تجھے بھی اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائے جو تو اپنے مومن

بھائی کے لئے مانگ رہا ہے۔ ـــــــــــ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین وسلام علی المرسلین

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ م۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۷ء

اپنا حال

الحمد للہ قریباً ۹ مہینے کے بعد اس خاص شمارہ کیلئے "نگاہ اولیں" اپنے قلم سے لکھا ہے اس سے پہلے املاً دوسروں سے لکھاتا رہا ہوں ـــــــ میری علالت کا سلسلہ گزشتہ رمضان المبارک کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ قریباً دو مہینے بلڈپوریا اور بخار کے تسلسل کی وجہ سے علالت کی نوعیت معالجین کے نزدیک تشویشناک رہی پھر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں باقی نہیں رہیں۔ لیکن ٹانگ میں جو شدید تکلیف اس علالت کے آغاز ہی سے پیدا ہو گئی تھی اس میں اگرچہ تخفیف ہوتی رہی لیکن وہ برابر باقی رہی۔ قریباً چھ مہینے تک معالجین کی رائے یہ رہی کہ ہڈی میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی صرف ورم آگیا ہے اس کی وجہ سے یہ تکلیف ہے۔ اسی بنیاد پر وہ علاج کرتے رہے اور تکلیف میں کسی قدر کمی بھی ہوتی رہی، یہاں تک کہ میں بیٹھ کر رکوع سجدے کے ساتھ نماز ادا کرنے لگا۔ اور فرلانگ دو فرلانگ کے قریب چلنے بھی لگا۔ لیکن اس چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ معالجین کہتے رہے کہ آہستہ آہستہ یہ تکلیف بھی جاتی رہے گی اور چلنا پھرنا معمول کے مطابق ہو جائے گا۔ لیکن ادھر قریباً دو تین مہینے سے اس میں کوئی مزید تخفیف اور کمی نہیں ہوئی۔ تو صورت حال کو سمجھنے کے لئے آخر مارچ میں پھر ایکسرے کرایا گیا، اس کو دیکھ کر معالج ڈاکٹر نے بتلایا کہ معاملہ کے سمجھنے میں شروع میں غلطی ہوئی۔ کولھے کی جو ہڈی تین سال پہلے ایکسیڈنٹ میں ٹوٹی تھی وہی پھر کسی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی (اور بلڈپوریا بھی اسی وجہ سے ہوا تھا) اور اس وقت ہڈی کا جو علاج ہونا چاہئے تھا تشخیص صحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ علاج نہیں ہوا ـــ اب جو بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اس کا پورا علاج اور پوری اصلاح آپریشن سے ہی ہو سکتی ہے ـــــ اب میرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ حالت ہی کے ساتھ باقی زندگی حتی الوسع احتیاط سے گھر کے اندر ہی گزارنے کا فیصلہ کر لیا جائے ـــــ جیسا کہ عرض کیا گیا اپنی ضرورتوں کے لئے کسی قدر تکلیف اور تکلف کے ساتھ چل لیتا ہوں، نماز بیٹھ کر ادا کر لیتا ہوں ـــــ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہڈی کا آپریشن کرایا جائے اور مصنوعی ہڈی کا جوڑ لگوایا جائے۔ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ڈاکٹروں سے مشورہ جاری ہے۔ جس میں میرے لئے دنیا اور آخرت کی خیر ہو اللہ تعالیٰ اسکی طرف رہنمائی فرمائے اور اسکو آسان اور مقدر فرمائے۔ اپنے مخلصین سے بھی اسی دعا کی استدعا ہے ـــــــ نعمانی

محمد منظور نعمانی

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ

(رجب وشعبان ۱۳۶۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان (ابتک جن کے نام نامی کے ساتھ مدظلہ اور دامت برکاتہم کہنے اور لکھنے ہی کی زبان اور قلم کو عادت رہی ہے اور آج پہلی بار اُن کی رُوح پاک کے لیے رحمت و رضوان کی دعا زبان قلم سے نکل رہی ہے) آپ کے وصال کی اطلاع ہمارے ناظرین کرام کو اب سے بہت پہلے مل چکی ہوگی۔ (حضرت حکیم الامت ۱۵ ارجب ۱۳۶۲ھ کو واصل بحق ہوئے)

کسی بابرکت بزرگ کا اس دنیا سے اُٹھ جانا تاریخ کا کوئی نادر واقعہ نہیں ہے اللہ کے جن ہزارہا برگزیدہ بندوں کے نام عظمت و احترام کے ساتھ ہماری زبانوں پر آتے ہیں اور علیہ الصلوٰۃ والسلام یا رضی اللہ عنہ یا قدس سرہٗ یا رحمۃ اللہ علیہ جیسے کلمات سے جن کی عظمت و برگزیدگی کا اعتراف اور ان کے لیے دعائے خیر ہم کرتے ہیں وہ سب وہی ہیں جو اس دنیا میں تھے اور اللہ کے مقررہ قانون کے مطابق اپنی مدت حیات ختم کر کے اور اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دے کر اس عالم سے سدھار چکے ہیں۔

تاہم دین کی غربت اور فتنوں کی کثرت کے اس زمانہ میں اللہ کے کسی صالح اور مصلح بندے اور دین کے کسی ممتاز خادم کا اُٹھ جانا یقیناً غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ عام حالت یہی ہے کہ اب جو جاتا ہے پھر اس کی جگہ پر ہوتی نہیں دیکھی جاتی اور معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بخاری یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر والتمر لا یبالیھم اللہ[1] کی پیشین گوئی اسی طرح تدریجاً عمل میں آرہی ہے۔

---

[1] "صالحین" یکے بعد دیگر نمبروار اُٹھتے چلے جائیں گے اور جو یا کھجور کے کوڑے کرکٹ کی طرح نکمے اور خراب آدمی ہی باقی رہ جائیں گے۔ اللہ کے یہاں جن کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں علم و ارشاد کے اعلیٰ درجوں کی جو جامعیت اللہ پاک نے حضرت حکیم الامت کو عنایت فرمائی تھی وہ خواص کے حصہ میں بھی بہت کم آتی ہے۔ لیکن یہاں اس وقت آپ کے خصائص و کمالات کا بیان مقصود نہیں ہے ورنہ اگر اس کا ارادہ کیا جائے تو حضرت مرحوم کے جو قابل ذکر احوال اس عاجز کو براہ راست اور بلا واسطہ معلوم ہیں انہی سے ایک پوری کتاب بلکہ انشاء اللہ کئی جلدوں والی کتاب تیار ہو سکتی ہے ـــــ اس وقت تو صرف اپنے نفس اور اپنے اُن بزرگوں اور دوستوں کے لیے جو اس صدمہ سے محزون و مغموم ہیں چند تعزیتی کلمات ہی لکھنے کے واسطے قلم اٹھایا ہے۔

بزرگو! اور دوستو! آپ کا صدمہ یقیناً بجا اور حزن و غم بیشک برمحل، یقیناً ایسے "مربی" کا سایہ سر سے اُٹھ جانے پر یہ حزن والم بالکل فطری چیز ہے ـــــ لیکن ہاں صدمہ و غم کی ان گھڑیوں میں بھی بھول نہ جائیے اللہ کے اس خاص فضل و کرم کو بلکہ صبر کے ساتھ ہی شکر بھی ادا کیجیے رب کریم کے اس احسان کا کہ اُس نے حضرت حکیم الامت (علیہ الرضوان والرحمۃ) کو کافی عمر عطا فرمائی اور علاوہ دیگر دینی خدمات کے تصنیف و تالیف کی طرف آپ کو خاص طور سے متوجہ فرمایا اور پھر آپ کی اُن تالیفات کی طبع و اشاعت کا بھی ایسا انتظام فرمایا کہ گو آج حضرت اپنے جسم مبارک کے ساتھ ہم میں نہیں ہیں لیکن الحمد للہ کہ آپ کے علمی و ارشادی فیوض کا اتنا مکمل ذخیرہ ہمارے استفادہ اور رہنمائی کے لیے موجود ہے کہ یہ کہنا انشاء اللہ مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت مرحوم اپنے فیوض و برکات کے لحاظ سے اب بھی ہم سے جدا نہیں ہوئے ہیں۔ گویا اس حیثیت سے اللہ پاک نے آپ کو "بقاء و دوام" عطا فرما دیا ہے ، اور کیوں نہ ہو

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

یقیناً ہمارے حق میں بھی یہ اللہ پاک کا بہت بڑا احسان اور انعام ہے اور اس کا حقیقی شکر یہی ہے کہ ہم اس سے (یعنی حضرت مرحوم کی دینی و ارشادی تالیفات سے) کما حقہ استفادہ کریں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچائیں۔ اس میں ایک پہلو تو ہمارے فائدہ کا ہے جو ظاہر ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ اس راہ سے جتنا بھی استفادہ کریں گے اور جس قدر بھی اس سلسلۂ خیر کو آگے بڑھائیں گے اس کا جس قدر ثواب آپ کو ملے گا حدیث صحیح "من دعی الی حسنۃ الخ" کے اصول کے مطابق اتنا ہی حضرت حکیم الامت کے حساب میں ثبت کیا جائے گا۔ تو گویا آپ کی تالیفات سے استفادہ اور آپ کی تعلیمات پر عمل کرنا آپ کے مدارج بڑھنے اور آپ کا مقام اور زیادہ بلند ہونے کا بھی ایک بہترین اور بے خطر ذریعہ ہے ـــــ!

اور یہاں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ سے خصوصی محبت وتعلق رکھنے والے بزرگوں اور دوستوں کی نظر سے حادثہ کا یہ پہلو کبھی اوجھل نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیے کہ حضرت مرحوم جس عالم میں تشریف لے گئے ہیں انشاء اللہ وہ عالم حضرت کے لیے اس دار المحن سے ہزاروں درجہ بہتر اور خوش گوار ہوگا — آخر اس رحلت کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے جس نے "شوقِ وطن" لکھ کر ہزاروں کو موت کا مشتاق اور آخرت کے دیس کا شائق بنا دیا تھا وہ خود بھی اب اس "سرائے فانی" سے اپنے اسی جاودانی دیس کو چلا گیا، اور جس کی رضا جوئی کے لیے اور جس کی یاد میں راتوں کی نیند اور دنوں کا چین و آرام قربان کیا جاتا تھا، اب اُسی کے حضور میں اور اس کے مقامِ رضوان میں پہونچنا نصیب ہوگیا، ان کا وہ مولا اُن سے راضی اور وہ اس سے راضی، اور اور ہم سب کا بھی وہی والی اور وہی ہادی — حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولی ونعم النصیر — اُسی سے دعا ہے کہ حضرت مرحوم کو ہم سب کی طرف سے بہتر جزا دے اور اُن کی جدائی کے صدمہ کو ہمارے لیے باعثِ اجر بنادے۔ ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ ودرکاً من کل فائت ..... باللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المصاب من حرم الثواب۔

ان تعزیتی سطور کو ختم کرتے ہوئے ایک بات اپنے ناظرین کرام سے اور بھی عرض کرنی ہے :-

بارہا مجھ پر یہ گزرا ہے کہ اکابرِ اُمت میں سے کسی کی کوئی خاص پر تاثیر تصنیف یا ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا یا کسی ذریعہ سے اُن کے خاص احوال سننے میں آئے تو دل میں حسرت کے ساتھ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہوتی — بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی، امیر المومنین حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے متعلق بارہا یہ حسرت دل میں آئی ہے — تو کیا عجب کہ اسی طرح آئندہ بہت سے لوگ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو بھی حسرت سے یاد کریں، اور اللہ کے جو خاص بندے ابھی باقی ہیں ان کے نہ رہنے کے بعد اُن کی بھی حسرت کے ساتھ بس یاد ہی رہ جائے۔

برادرانِ دینی جانے والے جاچکے اور جو ابھی باقی ہیں وہ بھی ایک دن اسی طرح چلے جائیں گے اور یہ قریباً کلیہ سا ہوگیا ہے کہ جو جاتا ہے اس کی جگہ عموماً خالی ہی رہتی ہے — اس لیے جو خاص بندگانِ خدا اس وقت موجود ہیں، جن کی صحبت اللہ کی خشیۃ اور ایمانی حلاوت پیدا کرنے میں خاص اثر رکھتی ہے

اور جن کی نشانی حدیث نبوی میں یہ بتلائی گئی ہے کہ

یذکرکم اللہ رؤیتہ ویزید فی علمکم	ان کو دیکھنا تمہارے اندر اللہ کی یاد کو تازہ کرے
الآخرۃ عملہ ویفقہکم منطقہ	اور ان کے اعمال کا مطالعہ تم کو آخرت کی یاد دلائے
	اور ان کی گفتار سے تم کو نفع حاصل ہو۔

بہرحال ایسے برگزیدگان خدا اس وقت موجود ہیں (اور اگرچہ ان کی تعداد اب بہت کم ہے تاہم اللہ کی زمین ابھی ایسے وجودوں سے خالی نہیں ہوئی ہے) تو چاہیے کہ ان ہستیوں کو غنیمت بلکہ اللہ کی نعمت سمجھا جائے اور ان کی صحبت سے حسب توفیق فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ کیا خبر کل کو ان میں سے کبھی کون کون نہ رہے! ـــــ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ جا کر کسی "شیخ" سے "بیعت" ہی کر لیجیے! بلکہ میں جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ صحبت، اور استرشادی رابطہ ہے نہ کہ رسمی بیعت! اولئک قوم لا یشقی جلیسہم

آج تو پی لو خدا جانے کہ کل کیا حشر ہو
میکدہ اٹھ جائے یا ساقی بہاں پھر نہ ہو

بقیہ صفحہ ۱۴

موجود تھیں مولانا کو لٹا یا گیا۔ لا الٰہ الا اللہ کا ورد مولانا کی زبان پر تھا۔ مولانا انعام الحسن صاحب اسی کار میں ساتھ تھے۔ باقی دوست آگے پیچھے دوسری کاروں میں۔ کچھ لوگ پہلے انتظامات کے لیے اسپتال پہنچ چکے تھے۔ راستے میں بس ایک بار دریافت فرمایا کتنی دور راہ رہے۔ کہا بس پہنچ رہے ہیں۔ لیکن ابھی مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ اور رہا تھا کہ اس بے چین روح کو رحمت حق نے بڑھ کر اپنی آغوش میں لے لیا اور ادھر کار بھی ایک جھپاکے میں اسپتال کے اندر تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم دروازہ پر موجود جھٹ پٹ کار کا دروازہ کھلا۔ بتایا گیا ہو نی ہو چکی مگر ڈاکٹروں نے اپنا آخری فرض ایک انجکشن دے کر ادا کیا کیونکہ جسم میں گرمی باقی تھی۔

یہ ہے اس داعی آخرت کے سفر آخرت کی مختصر روداد ـ ۳۰ رذی قعدہ مطابق .... اپریل یوم شنبہ کو ۹ بجے صبح اپنے والد ماجد کے پہلو میں اسی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی جو آپ کا تبلیغی مستقر تھا ـــــ رہے نام اللہ کا

محمد منظور نعمانی

اچھی زندگی اور اچھی موت

عزیز بھائی الحاج محمود حسین کی یاد میں

(ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

"الفرقان" کے گزشتہ پرچہ کی کاپیوں کی تصحیح وغیرہ سے جس روز مجھے فراغت ہوئی غالباً اُسی روز میرے سب سے چھوٹے بھائی مولوی حکیم محمد احسن (سلمہم اللہ تعالیٰ) کا خط سنبھل سے آیا، جس میں علاوہ دوسرے امور کے یہ بھی مرقوم تھا کہ

"بھائی صاحب کو شنبہ کے روز سے بخار ہوگیا تھا، پرسوں سے وہ نمونیا کی جانب مائل ہوگیا ہے، مرض سخت معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے"

یہ مجھ سے چھوٹے اور اُن سے بڑے بھائی (حاجی محمود حسین مرحوم) کی علالت کی پہلی اطلاع تھی جو کارڈ کے ذریعہ ۵ ذی قعدہ بروز شنبہ بریلی میں مجھے ملی، چونکہ کارڈ تین دن پہلے کا لکھا ہوا تھا اس لیے میں نے فوراً تار دلوایا کہ ــــ "بھائی محمود کی حالت سے فوراً اطلاع دو" ــــ اگلے روز (اتوار کے دن) جواب تار ہی سے آیا کہ "ویسی ہی حالت ہے فوراً آجانا چاہیے"

میں دوشنبہ کی صبح کو یہاں سے روانہ ہوکر شام کے ۴ بجے سنبھل پہونچ گیا، دیکھا تو مرض کی تکلیف سخت تھی میں نے سلام کے بعد پوچھا ــــ "بھائی! کیا حال ہے؟" سانس کو قابو میں کرتے ہوئے جواب دیا "وعلیکم السلام، الحمد للہ، حال اچھا ہے، خدا کا شکر ہے آپ خاص وقت پہ آگئے" ــــ میں اس آخری لفظ سے بہت کھٹکا، اگرچہ مرض کی شدت اور نزاکت ظاہر تھی لیکن پھر بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ آخری ہی علالت ہے اور وہ "خاص وقت" بھی اتنا قریب آچکا ہے۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے ۲۴ ہی گھنٹے بعد ۲۰ ذیقعدہ کو قریب ۵ بجے شام روح نے جسم سے مفارقت اختیار کرلی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ مجھ سے دو برس چھوٹے میرے حقیقی بھائی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ خصوصیتیں ایسی دی تھیں جن کا اس جگہ ذکر کرنا شاید بہت سوں کے لیے فائدہ مند اور باعث موعظت ہو جائے۔

قریباً دو تین سال سے انابت الی اللہ اور رغبت فی الآخرۃ کی خاص دولت نصیب ہوگئی تھی، نفل نماز، نفل روزوں اور تلاوت قرآن کی قابل رشک کثرت کے علاوہ غرباء و فقراء، اور مساکین و یتامیٰ کی خدمت و اعانت ان کا خاص شغل تھا اور یہ خدمت بھی عموماً اخفا کے ساتھ ہوتی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی غریب کی تکلیف یا کسی خاص ضرورت کا علم ہو جاتا تو اس کی ضرورت کی چیز بازار سے لا کر یا اگر گھر پر موجود ہوتی تو گھر سے لے جا کر خود ہی ان کے یہاں پہونچا آتے اور اس قسم کے کام عموماً رات کی تاریکی میں کرتے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ عین کھانے کے وقت کوئی حاجتمند آجاتا یا معلوم ہوتا کہ مسجد میں کوئی مسافر آگیا ہے اور اس کو کھانے کی ضرورت ہے تو اپنا کھانا اس کو دے دیتے اور اگر گھر میں کھانا فاضل نہ ہوتا تو خود وہ وقت یوں ہی گزار دیتے، اور گھر والوں پر دوبارہ پکانے کا بار بھی نہ ڈالتے، محلہ کی مسجد میں ٹھہرنے والے مسافروں کے لیے صبح کو چائے تیار کر کے خود لے جاتے اور پلاتے ـــــ چونکہ سینہ کے ہمیشہ سے کمزور تھے اور سانس یا کھانسی کی تکلیف اکثر ہو جایا کرتی تھی اس لیے موسم سرما میں صبح کو دواءً ایک انڈا تیار کرا کے اکثر کھاتے لیکن ایک یتیم کو (جو اپنے گھر ہی رکھ لیا تھا) اس میں بھی ضرور شریک کر لیتے۔ حالانکہ خود اپنے بچے اللہ کے دیے چار تھے لیکن صبح کے اس ایک انڈے میں صرف اس یتیم ہی کا حصہ ہوتا۔

پچھلے ہی موسم سرما میں روئی بھری ہوئی نیم آستین صدری پہنے ہوئے تھے ایک غریب سائل آگیا اور اس نے سردی کی شکایت کی اسی وقت اپنے جسم سے صدری اتار کے اس کو دیدی وہ پہن کر چلا گیا، اگلے دن وہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ میرے جسم میں یہ ڈھیلی ہے اس سے جاڑا نہیں جاتا اسی وقت اس کو ساتھ لیکر بازار گئے اور اس کے جسم کے ناپ کی نئی صدری تیار کرا کے یا خرید کے اس کو دی اور وہ پرانی صدری جو کل اس سائل کو دی تھی بے تکلف آپ پہن لی۔

ان امور خیر میں اُن کی اس فراخ دستی ہی کو دیکھ کر ان کے قریب ترین عزیزوں تک کا یہ اندازہ تھا کہ اُن کے پاس بہت زیادہ نہ سہی لیکن کچھ معتد بہ سرمایہ ضرور ہے لیکن انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ سب کچھ بس یہی تھا جو ان راہوں میں خرچ ہو رہا تھا ـــــ باقی اللہ کا نام!

گذشتہ ہی سال حج کیا اور وہ بھی بڑے نرالے طریقہ سے ـــــ پہلے سے اپنا عزم بلکہ شاید خیال بھی نہ تھا،

البتہ میرے ماموں صاحب حج کی تیاری کر رہے تھے جب ان کی روانگی کا خاص دن آگیا بلکہ جب اسباب بندھ بندھا کر تیار ہوگیا اور روانگی میں کوئی ایک گھنٹہ ہی باقی رہ گیا تو چھوٹے بھائی مولوی محمد احسن دسلمہم اللہ تعالیٰ سے کہنے لگے ——— "بھئی! میرا بھی جی جانے کو چاہتا ہے پھر خدا جانے موقع ملے نہ ملے کہو کیا رائے ہے؟" ——— انھوں نے کہا ——— "اس معاملے میں خلاف مشورہ کون دے سکتا ہے، الحمد للہ بڑا نیک ارادہ ہے، لیکن یہ آپ خود سوچ سمجھ لیں کہ آپ کا موقع بھی ہے یا نہیں؟" ——— بولے: "اس وقت اتنا روپیہ موجود ہے کہ میں جا سکتا ہوں اور ان شاء اللہ تین چار مہینے تک گھر کا کام بھی چل سکتا ہے، پھر نہ معلوم کبھی اتنا روپیہ پاس ہوا نہ ہوا۔ اس لیے یہی جی میں آرہا ہے کہ چلا ہی جاؤں، ماموں صاحب کا ساتھ بھی ہے۔" چھوٹے بھائی سے اتنی گفتگو کرنے کے بعد پھر کہا "اچھا تم ابا جی سے اور ذکر کر دیکھو اور ان سے اجازت لے لو، اگر انھوں نے اجازت دیدی تو بس یہی فیصلہ ہے" ——— وہ اسی وقت والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ——— "بھائی صاحب حج کا ارادہ کر رہے ہیں آپ سے اجازت چاہتے ہیں" ——— والد ماجد نے اس ارادہ پر اپنی دلی مسرت کا اظہار فرمایا اور بخوشی اجازت دیدی۔

اب صرف دس پندرہ منٹ میں سفر حج کی تیاری ہوتی ہے، گھر میں آئے اہلیہ سے ذکر کیا، ابتداءً تو انھوں نے ہنسی مذاق سمجھا، لیکن جب بتلایا کہ فی الحقیقت یہی ارادہ کر لیا ہے تو انھوں نے کہا اچھا خدا حافظ، کنجی لیکر روپیہ صندوق سے نکالا صرف ایک پتلی فرد اور ایک تہبند، ایک ٹین کا لوٹا گھر میں سے لیا، ایک جوڑا کپڑا جسم پر تھا، بھائی حکیم محمد احسن سلمہ سے کہا ——— "ایک قمیص اور ایک پائجامہ اپنا اور لا دو اور ایک صدری جس میں کئی جیبیں ہوں" ——— وہ فوراً تینوں کپڑے نکال کر لائے اُن کا پائجامہ اپنے پائجامے ہی کے اوپر اور قمیص قمیص پر پہن لی اور اوپر سے صدری بھی ڈال لی، اور اللہ کا نام لے کر اللہ کے گھر کو روانہ ہوگئے۔

میں بریلی میں تھا اس لیے مجھے بھی تیسرے دن مولوی حکیم محمد احسن سلمہ کے خط سے اطلاع ہوئی، پھر چار پانچ روز کے بعد کراچی سے خود اُن کا معذرتی خط آیا کہ میں نے اچانک ہی ارادہ کر لیا اس لیے ملاقات نہ کر سکا مجھے اور میرے علاوہ اور اعزہ و متعلقین کو بھی اُس وقت حیرت تھی کہ اتنے بڑے کام کا ارادہ اور تہیا آناً فاناً کیسے اور کیوں کر لیا گیا لیکن اب اس کی حکمت سمجھ میں آئی کہ مرحوم کی زندگی کا وہ آخری حج تھا اور اس کے بعد اُن کو حج کا وقت ہی آنا مقدر نہ تھا سبحان اللہ و بحمدہ ——— جب وہ کسی کو اپنے گھر بلانا چاہتے ہیں

تو ایسے بے سان و گمان بلا لیتے ہیں اور جانے والے یوں چلے جاتے ہیں کہ گویا کسی نے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

آخری وقت کی بعض باتیں بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مرض نمونیا اور ڈبل نمونیا تھا یعنی دونوں پھیپھڑے ماؤف تھے، جس وقت بخار بڑھا ہوا ہوتا تو کبھی کبھی ہوش و حواس قائم نہ رہتے، لیکن اس حالت میں بھی خیال نماز وغیرہ ہی کا رہتا بار بار پوچھتے کہ نماز کے وقت میں کتنی دیر ہے؟ کبھی اسی حالت میں مسجد جانے کا ارادہ کرتے اور کہتے کہ "مسجد میں جماعت تیار ہے آپ لوگ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے"

تمام ایام مرض میں ہوش اور حاضر حواسی کے اکثر اوقات میں اگرچہ سانس کی شدت مہلت نہ لینے دیتی لیکن کوشش اور شفقت سے کبھی "کلمۂ شہادت" اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ۔ کبھی استغفار "استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ" ـــــ یا ـــــ "رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین" کبھی آیت کریمہ "لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین" کبھی دعا استشفاء "اللھم اشفنی بشفائک وداونی بدوائک واعصمنی من الاحوال والامراض والاوجاع" اور سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ "یا حی یا قیوم برحمتک استغیث" ـــــ الغرض اکثر یہی کلمات طیبات ورد زبان رہتے، اور سانس کی شدت کا عالم یہ تھا کہ قریباً ہر ہر کلمہ پر سانس ٹوٹتا ـــــ میں نے یہ دیکھ کر کہ اس طرح ان کو تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے کہا کہ اس وقت تم صرف دل ہی دل میں یہ کلمات اور دعائیں پڑھتے رہو، زبان سے ادا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تو تھوڑی دیر کے لیے زبان روک لی لیکن اس کے بعد پھر اسی طرح پڑھنا شروع کر دیا۔

بے ہوشی کے وقت میں بھی اگر کوئی بات ادھر اُدھر کی زبان سے نکلتی اور حاضرین میں سے کوئی "اللہ" کا نام پاک لے دیتا تو فوراً زبان پر وہی جاری ہو جاتا، جب تک زبان ساتھ دیتی رہی یہی حال رہا، اور اس کے بعد جب صرف سانس ہی رہ گیا تو اس میں بھی کبھی کبھی "یا اللہ" سنائی دیا، نزع کے وقت گھر والوں، مردوں، عورتوں اور ہوشمند بچوں میں سے غالباً کوئی ایسا نہ تھا جس کی زبان پر مناسب وقت کلمات طیبات نہ ہوں، سب سے زیادہ عبرت انگیز اور سبق آموز حالت ان کی اہلیہ کی تھی، جو میری حقیقی تایا زاد بہن بھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے بڑی صالح فطرت ان کو ملی ہے، بالکل آخری وقت بڑی استقامت کے ساتھ انھوں نے تین مرتبہ کلمۂ

طیبہ کی خود تلقین کی، اور جب روح نے جسم سے مفارقت اختیار کر لی تو خاموشی کے ساتھ اُٹھیں، فوراً وضو کر کے ہم سب سے پہلے نمازِ عصر ادا کی جس کا وقت ہو چکا تھا، اور دعاء مغفرت میں مشغول ہو گئیں —— والدہ ماجدہ کی بے قراری دیکھ کر میں ان سے عرض کرنے لگا کہ یہی وقت صبر و استقامت کا ہے" لیکن یہ کہتے ہوئے خود میری آواز میں بے اختیار گریہ کا اثر نمایاں ہو گیا، تو اسی وقت بیوہ ہونے والی اور اپنے تاریک مستقبل کو سامنے کھڑا دیکھنے والی میری اس تایا زاد بہن نے مجھ سے کہا "بھائی جی! خدا کے واسطے آپ اپنے کو سنبھالے رکھیں، اگر آپ قابو میں نہ رہے تو پھر ہم سب کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا" فی الحقیقت اُن کی اس ایک بات نے اسوقت مجھے سنبھال لیا —— میں نے اتنے نازک وقت میں اس صبر و استقامت کا کوئی نمونہ اس سے پہلے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی کو اس صبر و ثبات کا بہتر اجر، اور دُنیا و آخرت میں راحت و چین دے۔

مرحوم بھائی کی روح نے جس وقت ہم سب کو الوداع کہا شام کے سوا پانچ بجے تھے، نمازِ عصر سے فراغت کے بعد فوراً ہی تجہیز و تکفین کا انتظام شروع ہو گیا، بعد مغرب غسل دیا گیا اور نمازِ عشا کے بعد متصلاً نمازِ جنازہ پڑھ کے قبرستان لے جایا گیا، یہاں قبر کی تیاری میں تھوڑی سی دیر تھی، بھائی مولوی حکیم محمد حسن نے مجھ سے کہا اگر ہو سکے تو کچھ بیان کر دیجئے ابھی قبر میں کچھ دیر ہے، اُن کے اس کہنے پر مجھے یاد آیا کہ یہ سنت نبوی بھی ہے۔ صحیح بخاری شریف "کتاب الجنائز" میں ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان ہی یہ ہے" باب الموعظة المحدث عند القبر" جس کے ذیل میں امام بخاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مختصر "وعظ" نقل فرمایا ہے جو آنحضرتؐ نے دفن میت ہی کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا —— بہر حال طبیعت اگرچہ بہت خستہ اور شکستہ تھی لیکن جب یہ خیال آ گیا تو ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور آیت کریمہ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ "تلاوت کر کے تقریباً آدھے گھنٹے "موت" اور "بعد الموت" کے متعلق کچھ عرض کیا (جو انشاء اللہ الفرقان کے کسی قریبی شمارہ میں شائع ہو جائے گا) آخر میں توبہ و انابت اور استغفار و طلب رحمت کی ضرورت اور اس کے فضائل و فوائد کا کچھ بیان کر کے، اپنے لئے مرحوم بھائی کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے استغفار ہی پر اس سلسلہ کو ختم کیا گیا —— اور قریباً دس بجے شب کے مرحوم کو آغوشِ لحد کے سپرد کر دیا گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

بالآخر ہم سب کو بھی اسی راہ سے گزرنا اور اُسی جگہ پہنچنا ہے، اور بقا ہے صرف اللہ ذو الجلال والاکرام کو۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ○

محمد منظور نعمانی

پہلی رفیقہ حیات کی مفارقت پر

(شمارہ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ سے)

گزشتہ ذیقعدہ ہی میں چھوٹے بھائی حاجی محمود حسین مرحوم کی رحلت واقع ہوئی تھی اور اب ساتویں رمضان کو میری اہلیہ اُسی عالم کی طرف منتقل کر دی گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہ

یہ تقریباً ۵۱ سال سے میری زندگی کی شریک تھیں اور اللہ پاک کا احسان ہے کہ "دنیا" سے زیادہ وہ دین میں میری رفیقہ تھیں۔ اُن کی صابرانہ سیرت کے ساتھ سلیقہ داری و دانشمندی نے مل کر خانگی افکار سے مجھے آزاد کر دیا تھا —— تقریباً دائمی خرابی صحت کے باوجود میری اور بچوں کی خدمت اور گھر کے سارے کام کاج کے ساتھ ان کی کثرتِ عبادت، فرطِ خشیت اور بالخصوص رات کی اور صبح کی نماز میں دعاؤں یا سجدوں میں کبھی کبھی اللہ کے حضور میں ان کا رونا میرے لیے تازیانۂ عبرت بن جاتا تھا۔

ہاتھ اتنا وسیع تھا کہ دروازوں پہ عام طور سے پھرنے والے سائلوں کو دینے کے خلاف میری سخت رائے معلوم ہونے کے باوجود ان کا جی یہی چاہتا کہ کسی کو خالی نہ واپس کیا جائے۔ دل اتنا درد آشنا تھا کہ کسی مصیبت زدہ کو تکلیف یا خستگی کی حالت میں دیکھ لیتیں تو دن بھر بلکہ کبھی کبھی کئی کئی دن اس سے متاثر اور دردمند رہتیں اور بار بار اس کا ذکر کرتیں۔

عام مہمانوں کے متعلق (اپنے خاص حالات کی وجہ سے) میرا اصول یہ ہے کہ وقت پر جو کچھ حاضر ہو وہی ان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور کوئی خاص اہتمام نہ کیا جائے، لیکن ان کی خواہش ہمیشہ یہ ہوتی کہ کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور ہو اور وہ اکثر و بیشتر ایسا ہی کرتیں اگرچہ اکثر اوقات سب کچھ

اپنے ہی ہاتھ سے کرنا پڑتا ـــــ لیکن اپنی ذات کے بارے میں حال یہ تھا کہ مجھے یاد نہیں کبھی انھوں نے زیور یا کسی قیمتی کپڑے ہی کی فرمائش سے مجھ پر بار ڈالا ہو۔ طبیعت بن اللہ نے سادگی پسند بنائی تھی مگر اس کے ساتھ ہی مزاج میں متین شگفتگی تھی اور نظافت بلکہ گھر تک کی صفائی ستھرائی کا اہتمام تھا کہ ہر روز صبح کو تلاوت کلام پاک وغیرہ معمولات سے فارغ ہونے کے بعد قریباً ایک گھنٹہ روزانہ وہ گھر کی صفائی اور جھاڑ بوہار میں ضرور صرف کرتی تھیں۔ طرح طرح کی بیماریوں سے زار نزار ہونے کے باوجود جفاکشی اور مستعدی کا عالم یہ تھا کہ بوقت ضرورت بے تکلف خود چکی چلا لیتیں جو ان کی خرابی صحت کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے ناگوار بھی ہوتا۔ ان کی انہی عادات وخصوصیات نے میری خانگی زندگی کو بے حد ہلکا اور خوشگوار بنا رکھا تھا۔

اُن کے انتقال سے متعلق بعض باتیں بھی قابل ذکر ہیں شاید اللہ کے کسی بندے یا بندی کو اُن سے کوئی سبق حاصل ہو جائے صرف اسی لیے ان کو حوالہ قلم کرتا ہوں۔

(۱) اسی سال شروع اپریل سے آخر جون تک پورے تین مہینے وہ بیمار رہیں اور ابتدائی پندرہ بیس دن کے بعد ہی مرض نے "تپ لازم" کی صورت اختیار کر لی تھی جس سے مجھے اور ان کے بھائیوں کو بھی خطرہ ہو گیا۔ مرحومہ نے اس بیماری میں مجھ سے کہا کہ "غالباً اس بیماری سے میں بچ نہ سکوں گی" ـــــ میں نے کہا کیوں؟ ـــــ کہا "میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس سے میں یہی سمجھی ہوں کہ میرا وقت قریب ہے"۔ میں نے ان کے دل پر سے اس اثر کے دفع کرنے کے لیے کہا کہ "خواب واب کچھ نہیں، تمہارا ذہن اور وسوسہ ہے" ـــــ اس وقت تو میں نے یہی کہہ دیا لیکن چونکہ بعض اعزا کی موت کے متعلق ان کے خوابوں کی صحت کا پہلے سے بھی تجربہ تھا اس لیے خود میں بھی "وہم" میں پڑ گیا ـــــ مگر میں دیکھتا تھا کہ اب جب کہ ان کو یہ خیال ہے کہ یہی مرض شاید میرا آخری مرض ہو تو پھر ایسی حالت میں رجوع الی اللہ واعراض عن الدنیا کی جو کیفیت ہو جانی چاہیے اور جس طرح ہمہ تن موت کی تیاری میں لگ جانا چاہیے وہ حالت ان کی نہیں ہے، بلکہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بچوں وغیرہ کے خیال سے موت سے کچھ گھبراتی ہیں۔ میں نے ان کی اس کیفیت کو بار بار محسوس کیا اور دور دور کے اشاروں کنایوں سے ان کو متنبہ کرنا بھی چاہا مگر ان کو تنبہ نہیں ہوا، اور میں نے بیماری کی اس حالت

یں صاف صاف کہنا مناسب نہ سمجھا، لیکن مجھے اس کی بے حد فکر رہی اور میں نے ارادہ کرلیا کہ کسی مناسب وقت پر ان شاء اللہ میں ان کو اس کی طرف ضرور توجہ دلاؤں گا۔ اللہ کی شان! کہ اُس بیماری سے ان کو شفا ہوگئی، اور پھر میں بھی اپنی اس بات کو بھول گیا، اب رمضان مبارک سے چند روز پہلے میں خود بیمار ہوا تو ایک دن مجھے وہ بات یاد آئی اور میں نے ان سے کہا کہ تمھاری بیماری کے زمانہ میں میں نے یہ کمی تمھاری حالت میں محسوس کی تھی۔ آدمی جب بیمار پڑے اور ایسا بیمار کہ موت بظاہر قریب معلوم ہو تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ اللہ پاک کی طرف ہی متوجہ ہوجائے اور تمھارے لیے تو ویسے بھی موت سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے عورتوں کو سب سے زیادہ خیال اپنے بچوں کی "بربادی" کا ہوتا ہے سو تمھارے دونوں بچے تمھاری تربیت کی عمر سے نکل چکے ہیں۔ کتنی ہی اللہ کی بندیاں ہوتی ہیں جو اپنے شیر خوار بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں آخر اللہ پاک ان کی بھی پرورش کا سامان کرتا ہی ہے"——
میری یہ بات سن کر ان پر بڑا اثر ہوا اور اپنی اُس حالت پر انھیں بڑا قلق ہوا اور مجھ سے کہا کہ آپ کو یہ بات اسی وقت مجھ سے صاف صاف کہہ دینی چاہیے تھی، اگر میں اسی حالت میں مرجاتی تو کیا ہوتا؟——

یہ ساری گفتگو محض اتفاقی طور پر ہوئی نہ کہنے والے کو وہم وگمان تھا اور نہ سننے والی کو کہ ابھی ہفتہ عشرہ ہی میں "وہ وقت" آجانے والا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ دوسری رمضان کو جو اچانک وہ سخت بیمار ہوئیں تو وہ پہلی حالت اب نہ تھی۔ بلکہ ایک عیادت کرنے والی خاتون سے میری اس گفتگو کا حوالہ دے کر انھوں نے اپنا قلبی اطمینان ظاہر کیا۔ اور ان کے سامنے میری وہ ساری تقریر دہرائی۔ (اللھم لک الحمد)

---

(۲) جمعرات کا پہلا روزہ رکھ کر جمعہ کی شب میں وہ غالباً مجھ سے پہلے اٹھیں بڑے اطمینان سے تہجد اور دوسرے معمولات سے فارغ ہوکر سحری تیار کی (شب جمعہ میں زیادہ سویرے اٹھنے اور زیادہ پڑھنے پڑھانے کی وہ ہمیشہ کی حریص تھیں) اور کھا پی کر ہم سب تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ جماعت کا وقت آنے پر میں مسجد چلا گیا۔ قریب آٹھ بجے کے جب وہاں سے واپس آیا تو دیکھا کہ حسب عادت قرآن پاک کی تلاوت کر رہی ہیں، لیکن چہرہ کی حالت اور بار بار پہلو بدلنے سے مجھے شبہ ہوا کہ شاید کوئی

تکلیف ہے، میں نے دریافت کیا کہ خیریت تو ہے؟ جواب دیا کہ "کچھ جی خراب سا ہو رہا ہے اور پیٹ میں درد بھی ہے۔" میں نے کہا کہ پھر تلاوت شام کو کر لینا! — کہا سورۂ کہف شروع کر چکی ہوں اب تو اس کو ختم ہی کروں گی (کہف ان کو حفظ بھی تھی اور جمعہ کو اس کے پڑھنے کا التزامی معمول تھا) بہرکیف اسی حالت میں انھوں نے کہف ختم کی اور فوراً ہی قے اور درد میں شدت شروع ہو گئی۔

(۳) پانچ دن وہ مریض رہیں ابتدائی دو دن اور آخر کے ایک دن تکلیف اتنی شدید رہی کہ نماز بھی لیٹے لیٹے اشاروں سے پڑھیں تکلیف کی شدت اور طبیعت کے ضعف کو دیکھ کر میں نے ایک روز کہا کہ جس وقت تکلیف زیادہ ہوا کرے تو نماز کو زیادہ مختصر کر دیا کرو مثلاً رکوع۔ سجدہ کی ایک ہی تسبیح پر اکتفا کر لیا کرو، چنانچہ اس کے بعد سے انھوں نے اسی پر عمل کیا، لیکن آخری دن عصر کی نماز جب انھوں نے پڑھی تو اگرچہ آج تکلیف اور ضعف کی ہر دن سے زیادتی تھی لیکن وہ دیر لگا کر پڑھی اور بعد نماز بہت دیر تک دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتی رہیں جس میں بار بار اپنے گناہوں سے استغفار کرتی تھیں۔ میرے علم میں یہی ان کی آخری نماز تھی، مغرب اور عشا کے وقت میں ان کو نماز کا ہوش نہیں رہا اور اسی رات کو ۱۰ بجے ان کا وقت موعود آ گیا۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شئ عندہ اجل مسمی فلنصبر ولنحتسب ــــــــ

دفتر "الفرقان" کے قریب جو مسجد واقع ہے جس میں نماز پڑھتا ہوں اور جو اس عاجز ہی کی تحریک سے گذشتہ سال ہی از سر نو تعمیر ہوئی ہے، خاص اس کی فصیل کے نیچے مرحومہ دفن کی گئیں۔

ــــــ بظاہر تو امید رحمت کی بہت سی وجوہ جمع ہیں، رمضان مبارک کا مہینہ، مرض تخمہ جس کی موت کو حدیث میں شہادت قرار دیا گیا ہے۔ پھر مسافرت کی حالت اور زیر مسجد تدفین، جہاں ہر وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔

اے اللہ ان نیک فالوں کو حقیقت بنا دے اور اپنی اس عاجز بندی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، حسنات قبول فرما، اور سیئات سے درگزر، مغفرت و رحمت تیری شان ہے اور تیرے گنہگار بندوں کو تجھ سے اسی کی امید ہے۔ انک انت الغفور الرحیم ط

اپنے ناظرین کرام اور جملہ اخوان دینی سے بھی انہی دعاؤں کی استدعا ہے۔

محمد منظور نعمانی

اللہ کے لیے جینے اور مرنے والا ایک بندہ

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

(رجب ۱۳۶۳ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

واحسرتاہ! گذشتہ سال رجب و شعبان ہی کے مشترک پرچے میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے راقم الحروف کے قلم سے آخر میں یہ چند سطریں نکلی تھیں۔

"برادرانِ دینی! جانے والے جا چکے اور جو ابھی باقی ہیں وہ بھی ایک دن اسی طرح چلے جائیں گے اور یہ قریبًا کلیہ سا ہو گیا ہے کہ جو جاتا ہے اس کی جگہ عمومًا خالی ہی رہتی ہے — اس لیے جو بندگانِ خدا اس وقت موجود ہیں، جن کی صحبت، اللہ کی خشیت اور ایمانی حلاوت پیدا کرنے میں خاص اثر رکھتی ہے اور جن کی نشانی حدیث نبوی میں یہ بتلائی گئی ہے کہ:۔

یذکرکم اللہ رؤیتہ ویذکرکم	ان کا دیکھنا تمہارے اندر اللہ کی یاد کو تازہ کرے
الآخرۃ عملہ ویفعکم منطقہ	اور ان کے اعمال کا مطالعہ تمہیں آخرت کی یاد دلائے
	اور ان کی گفتار سے تم کو نفع حاصل ہو۔

بہر حال ایسے جو بندگانِ خدا اس وقت موجود ہیں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے تاہم اللہ کی زمین ابھی ایسے وجود والے خالی نہیں ہوئی ہے) تو چاہیے کہ ان ہستیوں کو غنیمت بلکہ اللہ کی نعمت سمجھا جائے اور ان کی محبت سے حسبِ توفیق فائدہ اٹھایا جائے کیا خبر کل کو ان میں سے بھی کون نہ ہو۔

آج تو پی لو خدا جانے کہ کل کیا حشر ہو   میکدہ اٹھ جائے یا پھر مہرباں ساقی نہ ہو"

ان سطروں میں میں نے نام تو اگرچہ اپنے کسی بزرگ کا بھی نہ لکھا تھا لیکن جن دو تین خاص ہستیوں کی طرف میرا اشارہ تھا ان میں افادی وارشادی خصوصیات اور نافعیتِ صحبت کے لحاظ سے میرے نزدیک

اہم ترین ہستی حضرت مولانا الیاس (علیہم الرحمۃ والرضوان) کی تھی اور اس مضمون ہی کی طرف میں نے ایک چھپا ہوا اشارہ بھی اس طرح کر دیا تھا کہ اسی شمارہ میں حضرت حکیم الامت کے اس تذکرہ کے بعد متصلاً ہی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب علیہ الرحمۃ کے بیس اصلاحی ملفوظات کی ایک قسط شائع کی تھی ——— بہت سے سمجھنے والوں نے میرے اس اشارہ کو سمجھ بھی لیا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ میں نے یہ لکھا تھا بغیر کسی خاص خطرہ کے شعور و احساس کے محض اتفاقی طور پر قلم سے نکل گیا تھا، مجھ انجان کو کیا خبر تھی کہ حضرت مولانا کے انفاس طیبہ سے ہماری محرومی بھی اسی سال میں مقدر ہو چکی ہے اور آنے والے رجب ہی میں وہ بھی ہم میں سے اٹھا لیے جائیں گے۔ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۝

حضرت مولانا کے وصال سے بظاہر تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ کروڑوں مسلمانوں میں سے ایک مسلمان، یا ہزاروں عالموں اور بزرگوں میں سے ایک بزرگ عالم اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور یہ سب کچھ اس دنیا میں روز ہی ہوتا رہتا ہے ——— مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اکیلا وجود لاکھوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور وہ پتھروں کی کان میں لعل اور ہیرا ہوتے ہیں، بیشک حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی رجال عظام میں سے تھے اور ایسوں کی موت و حیات روحانی دنیا میں بہت بڑا تغیر اور انقلاب عظیم ہے ——— آہ! جنھوں نے نہیں جانا ان کو کس طرح بتایا جائے اور کیسے باور کرایا جائے کہ کتنی بڑی چیز کھو گئی ؎

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

افسوس! بہت ہی کم لوگوں نے حضرت مولانا کو جانا اور ان کی دینی دعوت کی اہمیت کو سمجھا، حتی کہ علماء کے جس مخصوص طبقے کو زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا چاہیے تھا اس کی اکثریت نے بے توجہی اور بے اعتنائی کی .... پھر بہتوں نے توجہ بھی کی تو صرف اتنا سمجھ کر کہ مولانا ایک مخلص بزرگ ہیں اور مسلمانوں میں کلمہ اور نماز کی تبلیغ کرنا اور کرانا چاہتے ہیں بہرحال نیک کام ہے اس لیے ساتھ دینا چاہیے ——— لیکن مولانا جو کچھ تھے اور جس کام کے لیے ان کی دعوت و پکار تھی جیسا کہ عرض کیا گیا اس کو بہت ہی کم لوگوں نے سمجھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے قریباً ڈیڑھ دو مہینے پہلے اس کمی کا احساس بہت زیادہ

ہونے لگا تو اور جی چاہتا تھا کہ کاش خاص صلاحیتوں والے اہلِ علم مولانا کے یہاں زیادہ آئیں مگر دلوں پر اللہ کے سوا اختیار کسے ہے ؟

ایک دن کا واقعہ ہے یہ عاجز راقم سطور اور اخی فی اللہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (اکثر اللہ امثالہم) کسی کام سے بستی نظام الدین سے دہلی شہر آئے یہاں حضرات اہلِ علم کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی، ایک مناسب تمہید کے بعد ہم دونوں نے ان حضرات کو حضرت مولاناؒ اور ان کے کام و پیغام کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ مولانا کی برکات سے استفادہ اور ان کے کام کو سمجھنے اور دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ وقت اور روپیہ صرف کر کے دور دراز سے مستقل سفر کر کے آتے ہیں، اپنے کاموں کا حرج کر کے آتے ہیں اور بعضوں پڑے رہتے ہیں۔ خود ہم کو بھی مستقل ہی سفر کر کے آنا پڑتا ہے۔ آپ کو اللہ پاک نے بہت ہی اچھا موقع دیا ہے، آپ حضرات دہلی ہی میں رہتے ہیں کبھی کبھی وقت نکال کر "بستی نظام الدین" تشریف لے جایا کیجیے، یہ بھی عرض کر دیا کہ حضرت کی موجودہ علالت تشویشناک ہے بہت ممکن ہے کہ پھر ہم اس ہستی سے محروم ہو جائیں۔

پوری دلسوزی کے ساتھ یہ عرض کرنے کے بعد بھی جب یہی محسوس ہوا کہ ان حضرات نے اس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی، — تو ہم کو تاسف اور قلق ہوا اور میں تعجب و حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ یہ حضرات اتنی بڑی چیز سے کتنے بے پروا اور اپنے عمومی مشاغل پر کیسے قانع اور ان میں کتنے منہمک ہیں، تو رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا — تعجب کی کوئی بات نہیں ہے اسی دلی میں جب حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، اور شاہ اسمٰعیل شہید تھے تب بھی خود دلی میں رہنے والوں کو اس کی فرصت بہت کم ملتی تھی کہ وہ ان کی برکات سے استفادہ کریں۔ اور اُن کے پیغام کو سُنیں !

اسی طرح کے تجربات و احساسات نے یہ خیال پیدا کیا تھا کہ حضرت مولانا کی ایک مختصر سی ہی سوانح حیات اور ان کی دعوت و تحریک کے متعلق ملفوظات مرتب کر کے جس قدر جلد ممکن ہو شائع کر دی جائے، سوانح کی ترتیب رفیقِ محترم نے اپنے ذمہ لی تھی اور اس کا کچھ کام انھوں نے شروع بھی کر دیا تھا، اور ملفوظات کا کام میں نے شروع کیا تھا۔ اگرچہ ارادہ اور آرزو یہی تھی کہ یہ مجموعہ حضرت کی حیات ہی میں شائع ہو جائے تاکہ اس کے ذریعہ واقف ہو کر اور لوگ ادھر متوجہ ہوں، لیکن مقدر یہی تھا کہ اس کی

تکمیل حضرت کے وصال کے بعد ہو، دونوں کام ابھی بالکل ابتدائی درجہ ہی میں تھے کہ حضرتؒ کا وقت موعود آگیا ــــ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید

اب تجویز یہ ہے کہ الفرقان کی ایک غیر معمولی اشاعت اس تذکارِ حسن کے لیے مخصوص کردی جائے۔ اُمید یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ سالِ رواں کے اندر ہی "الفرقان" کا وہ خاص نمبر ہدیۂ ناظرین کرام ہو سکے گا۔ آپ حضرات بھی دعاؤں سے ضرور مدد فرمائیں۔

حضرت کی اس آخری علالت ہی کی دو چار باتیں اس صحبت میں بھی ذکر کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

(۱) اپریل کے آخری ہفتے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری زید مجدہ اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے، اس سے دو دن پہلے حضرت پر نہایت سخت دورہ پڑ چکا تھا جس کی وجہ سے ضعف بے حد ہو گیا تھا کہ دو چار منٹ بھی بات کرنے کی سکت نہ تھی، شاہ صاحب کی خبر سن کر اس ناچیز کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھے ان سے باتیں ضروری کرنی ہیں، لیکن صورت یہ ہو گی کہ تم اپنے کان میرے منہ کے قریب کر دینا اور میں جو کہوں وہ اُن سے کہتے جانا ــــ چنانچہ جب شاہ صاحب اندر بلائے گئے تو بات شروع تو میرے ہی واسطے سے فرمائی۔ لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد اتنی قوت آگئی کہ خود مخاطب ہو گئے اور قریباً آدھ گھنٹہ مسلسل تقریر فرماتے رہے۔ اس تقریر کے دوران میں ارشاد فرمایا۔

"شاہ صاحب! میں نے شروع میں مدرسہ پڑھایا (یعنی مدرسہ میں درس دیا) تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحبِ استعداد طلبہ کثرت سے آنے لگے ــــ میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ جو لوگ عالم، مولوی بننے کے لیے ہی مدرسہ میں آتے ہیں مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم، مولوی ہی بن جائیں گے اور پھر ان کے مشاغل وہی ہوں گے جو آجکل عام طور سے اختیار کیے جاتے ہیں کوئی طب پڑھ کر مطب کرے گا، کوئی یونیورسٹی کا امتحان دے کر اسکول کالج میں نوکری کرے گا، کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا، اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو گا۔ یہ سوچ کر مدرسہ میں پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا جبکہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دے دی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی، اللہ اللہ کرنا آنے والوں پر اتنی جلدی

کیفیات اور احوال کا ورود شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ — زیادہ سے زیادہ یہی کہ کچھ اصحاب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں پھر لوگوں میں اگر ان کی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لیے آئے، کوئی اولاد کے لیے تعویذ کی درخواست کرے کوئی تجارت اور کاروبار میں ترقی کی دعا کرائے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے ذریعہ بھی آگے کو چند طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے — یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ طے کیا کہ اللہ نے ظاہر و باطن کی جو قوتیں بخشی ہیں ان کا صحیح مصرف صرف یہ ہے کہ ان کو اسی کام میں لگا یا جائے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں، اور وہ کام ہے۔ "اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لیے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا" بس ہماری یہ تحریک یہی ہے اور یہی ہم سب سے کہتے ہیں یہ کام اگر ہونے لگے تو اب سے ہزاروں گنے زیادہ مدرسے اور ہزاروں گنی زیادہ خانقاہیں قائم ہو جائیں بلکہ ہر مسلمان مجسم مدرسہ اور خانقاہ ہو جائے اور حضور کی لائی ہوئی نعمت اس عمومی انداز میں بٹنے لگے جو اس کے شایانِ شان ہے۔"

اس صحبت میں حضرتؒ نے اس کے علاوہ جو کچھ اور فرمایا تھا وہ انشاء اللہ تعالیٰ ملفوظات کے سلسلے میں ہدیۂ ناظرین ہو گا یہاں تو اس سلسلۂ کلام کا صرف اتنا ہی ٹکڑا درج کرنا تھا۔

(۲) اسی اپریل کے مہینے میں جس روز آپ پر وہ شدید دورہ پڑا جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے۔ اُس دن آپ پر قریب دو گھنٹے کے غشی کی سی کیفیت طاری رہی، آنکھیں تک بند تھیں، دیر کے بعد یکایک آنکھیں کھولیں اور زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے۔

الحق یعلو، الحق یعلو، الحق یعلو، ولا یعلیٰ

پھر ایک وجد کی سی کیفیت میں ایک گونہ ترنم کے ساتھ (جو عام عادت نہ تھی) تین دفعہ یہ آیت تلاوت فرمائی۔ کان حقًا علینا نصر المومنین ۔ (ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمہ حق ہے) جس وقت بلند آواز سے آپ نے یہ آیت تلاوت فرمانی شروع کی میں صحن مسجد میں تھا آواز سن کر حضرت کے حجرے کے دروازہ پر جا کھڑا ہوا، جو خاص خادم اندر تھے اُن سے میرا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ وہ کہاں ہے؟ میں سنتے ہی اندر حاضر ہو گیا، ارشاد فرمایا

"مولوی صاحب! اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ کام ہو گا اور اللہ کی مدد اس کو اتمام تک پہنچائے گی۔ مگر یہ شرط ہے کہ اس کے اس وعدۂ نصرت پر کامل یقین اور بھروسہ کے ساتھ اس سے نصرت کو مانگتے رہو اور اپنی امکانی کوششوں میں کمی نہ کرو۔"

یہ فرمانے کے بعد پھر آنکھیں بند ہو گئیں، تھوڑی دیر کی گہری خاموشی کے بعد صرف اتنا فرمایا۔

"کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے۔"

(۳) عجیب تماشا تھا اس علالت میں حضرتؒ کی قوت و صحت جوں جوں گرتی تھی، احیاء دین کی تڑپ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ روز بروز اسی قدر بڑھتا جاتا تھا ضعف و نقاہت کے لحاظ سے حضرتؒ کی مہینوں وہی حالت رہی جس حالت میں اچھوں اچھوں کو بھی سوائے خاموش پڑے رہنے کے اور کچھ گوارا نہیں ہوتا ہے لیکن اس سارے عرصہ میں دیکھنے والوں نے اکثر ان کو تین ہی حالتوں میں دیکھا۔

یا اسؒ کام (احیاء دین) کی سوچ و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں، اسؒ کے لیے دل کی انتہائی شکستگی کے ساتھ دعائیں فرما رہے ہیں۔ کارکنوں کے لیے اخلاص، ثبات و استقامت، اتباع طریقۂ محمدی اور اصول مرضیہ کی پابندی اور پھر رضا و قبول اپنے اللہ سے مانگ رہے ہیں اور ایسے سوز کے ساتھ مانگ رہے ہیں کہ بعض اوقات پاس والوں کو رونا آجاتا ہے، یا اسؒ سلسلہ میں احکام و ہدایت دے رہے ہیں، بس ہر وقت کا گویا یہی شغل تھا۔ ہر آنکھوں والا۔ دیکھ سکتا تھا کہ اللہ کے لیے جینے اور مرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

حتیٰ کہ علاج کے سلسلہ میں بھی جو طبیب یا ڈاکٹر آتے اُن سے پہلے اپنی بات کہتے اس کے بعد ان کو دیکھ بھال کا موقع دیتے —— ایک دن حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دلی کے ایک مشہور مسلمان ڈاکٹر کو لائے۔ مولاناؒ نے اپنی بات ان سے کیسے عجیب انداز میں کہی فرمایا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس ایک فن ہے جس سے مخلوق استفادہ کرتی ہے لیکن وہ فن وہ ہے جس کو ماند کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام چند ظاہری معجزے (اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دینا، مردوں کو زندہ کر دینا) دے کر بھیجے گئے تھے، اور یہ تو آپ جان سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو روحانی علوم دیے گئے تھے وہ ان ظاہری معجزوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل تھے، تو مجھے آپ سے یہ کہنا

ہے کہ ہمارے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو روحانی علوم اور احکام بھیجے گئے ہیں وہ وہ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روحانی علوم اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو بھی غیر چلن دار کر دیا تو ذرا سوچئے کہ حضور کی لائی ہوئی ان روحانی چیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا کتنی بڑی چیز کی نا قدری ہے۔

(۴) اس موضوع (احیاء دین) کے سوا کوئی بات کہنا تو درکنار سننا تک گوارا نہ تھا، اگر کوئی شخص کوئی دوسری بات سامنے شروع کر دیتا تو اکثر اوقات برداشت نہیں فرما سکتے اور فوراً روک دیتے۔ خدام میں سے کوئی خیریت مزاج پوچھتا تو فرماتے۔

"کبھی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس میں کیا خیریت اور بے خیریت بے خیریت تو جب ہے کہ جس کام کے لیے پیدا کئے گئے ہیں وہ کام ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو بے چین ہو ـــــ (فرماتے) ـــــ صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حال میں چھوڑا تھا اس میں ادنیٰ تغیر آنے کو بھی وہ خلاف خیریت سمجھتے تھے"

آہ! ابھی رجب تک کان یہ باتیں سنتے تھے، آنکھیں ان کیفیات و واردات کا نظارہ کرتی تھیں اور دل حسب توفیق اثر لیتا تھا۔ آج ان چیزوں کو حسرت کے ساتھ بس یاد ہی باقی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کو کبھی فنا نہیں ـــــ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام ہ

جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا غم اور صدمہ ہے وہیں طبیعت کو اس سے بڑا اطمینان ہے اور یقیناً اللہ کی اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کوشاں کے اللہ کے جس کام کو زندہ کیا تھا اور نصرتِ دین و دعوت الی اللہ کے جس فریضہ کی تجدید کی تھی، حضرت کے وصال کے بعد بھی بفضلہ تعالیٰ اس میں کوئی اضمحلال نہیں آیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ اپنی اس آخری علالت ہی میں کئی بار اپنے فکر مند نیاز مندوں کو مطمئن کرنے کے لیے آپ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد کام میں اور زیادہ ترقی ہوگی اور وہ آئیں گے جو ابھی تک نہیں آتے ہیں، تو آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ بحمد اللہ کام برابر آگے ہی بڑھ رہا ہے اور اس وقت جبکہ یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں حالانکہ رمضان مبارک کا مہینہ ہے مگر اتنی جماعتیں اور اتنے قافلے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے گھروں کی راحتوں کو چھوڑے ہوئے روزوں کی حالت میں اس دعوتِ دین کے سلسلہ میں مصروف گشت ہیں کہ اس سے پہلے اس کام کی پوری تاریخ میں کبھی اتنا بلکہ شاید اس کا آدھا بھی نہیں ہوا تھا فللہ الحمد ولہ المنۃ

محمد منظور نعمانی

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ

(رمضان مبارک ۱۳۶۶ھ اگست ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

والد ماجد[1] نے اسی رمضان مبارک کی پانچویں شب میں عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کے اور تراویح بھی ہر رکعت ادا کر کے ایسے انداز سے آخرت کا سفر فرمایا جو بظاہر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا کوئی خاص ظہور تھا۔ والغیب عند اللہ تعالیٰ۔

واقعہ رحلت کی تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کی زندگی کی بعض قابل ذکر اور سبق آموز خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ امید ہے کہ اللہ کے بندوں کو اس تذکرہ سے ان شاء اللہ نفع ہوگا۔

نماز اور جماعت کا اہتمام

نماز با جماعت کا جیسا اہتمام میں نے اپنے والد ماجد میں دیکھا، ایسا بہت ہی خاص بندگان خدا میں دیکھا ہے۔ اور یہ صرف اپنے ہی حق میں نہ تھا، بلکہ اُن کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ گھر کا ایک ایک آدمی، بلکہ ہر صاحب شعور بچہ بھی جماعت کے وقت مسجد میں پہونچ چکا ہو۔ نماز کا وقت شروع ہوتے ہی سب پر تقاضا فرمانا شروع کر دیتے تھے۔ پھر جب مسجد کو جاتے تو راستہ کے لوگوں کو یاد دلاتے جاتے۔ ادھر چند مہینے سے آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا اور بینائی قریباً معدوم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے خود وقت کا اندازہ نہ فرما سکتے تھے تو ظہر اور عصر میں بہت پہلے سے دریافت فرمانا شروع کر دیتے تھے کہ مثلاً دروازہ کے سامنے سایہ

---

[1] والد ماجد کا اسم گرامی احمد حسین تھا لیکن عام طور سے "صوفی احمد حسین" کے نام سے معروف و مشہور تھے۔ ۱۲

کہاں تک پہونچ گیا؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دس دس دفعہ دریافت فرماتے اور گھر کے بعض نابمجھ بچے اس باربار کی دریافت سے تنگ اور عاجز آجاتے ——— ادھر سال دو سال سے جب کہ جسمانی قوت میں اور بصارت میں زیادہ ضعف ہو گیا تھا، ہر نماز کے لیے خصوصاً تہجد کے لیے زیادہ سویرے تیاری فرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "بارا ٹٹو سویرا سوار ہی"[1]

نوافل کا اہتمام

نوافل میں اشراق، اوابین، اور تہجد پابندی سے پڑھتے تھے۔ کبھی اُن کا تہجد قضا ہونا میرے علم میں نہیں۔ اب اُن کی رحلت کے بعد میں نے والدہ ماجدہ سے دریافت کیا کہ کبھی ان کا تہجد قضا ہونا آپ کو یاد ہے؟ فرمایا ہاں کبھی بہت عرصہ پہلے ایسا ہو جاتا تھا، لیکن پھر اُس دن روزہ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کا یہی علاج ہے۔

ذکر و تسبیح

ذکر کے سلسلہ کے اپنے معمولات کبھی انھوں نے تفصیل سے نہیں بتلائے لیکن دن اور رات کے جتنے وقت وہ تسبیح سے شغل رکھتے تھے، میرا اندازہ ہے کہ اس کے حساب سے ان کے مختلف اذکار و تسبیحات کی مجموعی مقدار دس بارہ ہزار سے یقیناً زیادہ تھی۔ جن میں سے تہجد کے بعد دوازدہ تسبیح، اور عصر و مغرب کے درمیان دو ہزار اسم ذات کے معمول کا مجھے علم ہے، ان کے علاوہ آیت کریمہ اور تسبیح و تحمید اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور درود شریف وغیرہ کی تعداد کا مجھے علم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ یہ سب چیزیں اُن کے معمولات میں تھیں، اور ان میں سے بعض کی مقدار شاید کئی کئی ہزار تھی۔

ایک زمانہ میں اُن کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد کھڑے ہو کے اور اپنے کو روضۂ مقدسہ نبویؐ پر تصور کر کے ۴ ہزار بار درود شریف پڑھتے تھے ——— ذکر فرماتے تھے کہ انھیں ایام میں ایک دن پڑھتے پڑھتے ایک خفیف غنودگی سی طاری ہوئی اور ایک ایسی حالت ہو گئی جو نہ نیند تھی اور نہ پوری بیداری، اُسی عالم میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور حضورؐ نے مجھے دو رکابیاں (پلیٹیں) عطا فرمائیں، ایک مٹی کی اور ایک چاندی کی ——— فرماتے تھے،

---

[1] ایک حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (من خاف ادلج ومن ادلج بلغ المنزل) جسے منزل کی فکر اور کھٹکا ہوگا وہ اندھیرے منھ سویرا چل دے گا، اور جو سویرا چل دے گا وہ منزل پر پہونچ جائے گا۔

میں نے اُس سے یہ سمجھا ہے کہ مٹی کی رکابی دُنیا ہے اور چاندی کی رکابی دین ہے، اور مجھے یہ دونوں عطا ہوں گی پھر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا تو الحمد للہ خوب مل گئی، اللہ تعالیٰ نے گذارہ کا پورا سامان دے رکھا ہے، لیکن دین ابھی نصیب نہیں ہوا، شاید میری اولاد میں کوئی "شام کی اڑان"[1] کا پیدا ہو جائے، اور یہ بشارت اُس کے ذریعہ پوری ہو جائے۔

معمولات میں استقامت اور مداومت

نوافل اور اذکار کے معمولات میں استقامت اور مداومت کی شان یہ تھی کہ تکلیف دہ بیماری کی حالت میں بھی ان کو ترک کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ بیماری میں ان کا یہ "نشہ" شاید اور زیادہ تیز ہو جاتا تھا اور چاہتے تھے کہ اس حالت میں اللہ کی یاد اور زیادہ ہو۔ اُن کی عمر بھر کی حسرت تھی کہ زندگی کے آخری دن تک ان کے اذکار اسی طرح جاری رہیں اور موت ذکر ہی کی حالت میں آئے۔ سو بظاہر تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرمادی، زندگی کی آخری ساعتوں تک اللہ کی یاد اور دعا و استغفار کا سلسلہ جاری رہا۔

میرے دوست مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامیؔ (جو آجکل ہمارے صوبہ یوپی کی وزارت تعلیم کے پارلیمنٹری سکریٹری ہیں) کو سفر حج میں والد ماجد کے احوال و اشغال دیکھنے کا کچھ موقع ملا تھا تو حج سے واپسی پر انھوں نے راقم سطور کو لکھا تھا کہ میں نے اُن کے جو حالات اور مشاغل دیکھے ایسے تو مشاہیر اور مشائخ میں بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں، عجیب جواں ہمت بزرگ ہیں فی الحقیقت ذکر و عبادت اور شب بیداری کے بارہ میں والد ماجد کی ہمت اور عزیمت جوانوں کے لیے بڑی ہی سبق آموز تھی۔

صلۂ رحمی

ان کی زندگی کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت صلۂ رحمی بھی تھی۔ قرابتداروں میں اگر کوئی ضرورت مند ہوتا تو برابر مالی خدمت کرتے، بیمار ہوتا تو خبر گیری کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خاندان کا کوئی بوڑھا بیمار ہے اور اُس کے گھر والے اُس کی

---

[1] یہ کبوتر بازوں کی خاص اصطلاح ہے، جو کبوتر اتنی لمبی اور اونچی پرواز کا ہو کہ صبح کو اڑان شروع کرے اور دن بھر برابر اُڑتا ہی رہے اور شام کو اُترے، اس کو کہتے ہیں کہ یہ "شام کی اڑان" کا ہے۔ والد ماجد یہ لفظ بہت بولتے تھے وہ نوجوانی میں کبوتر باز اور کبوتر بازوں کی سوسائٹی میں رہے تھے۔

اچھی خبر گیری نہیں کر رہے ہیں یا اپنے حالات کی وجہ سے مجبور ہیں تو والد ماجد اُن کو اپنے گھر لے آتے۔

سخاوت اور اہل حاجت کی خدمت

فقراء و مساکین اور عام سائلین کو دینے میں اُن کا ہاتھ جتنا کھلا ہوا تھا اور اللہ نے اُنھیں اس کا جو حوصلہ دیا تھا (اللہ کے مخصوص ترین بندوں کو مستثنیٰ کر کے)، کم از کم میں نے اس کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی سائل آیا اور ہماری نظر میں وہ مستحق نہیں ہے اور ہم نے اپنی یہ رائے ظاہر بھی کر دی لیکن وہ اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے، کسی سائل کو خالی واپس نہ کرنا ان کا اصول تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسے لوگوں کو بھی جن کو ہم مستحق نہیں سمجھتے تھے اتنا دے دیتے تھے کہ ہم پر گراں گزرتا تھا۔ بہر حال اس معاملہ میں اُن کی ہمت کی بلندی اور ہاتھ کی فراخی حیرت انگیز تھی۔ انتقال سے کچھ ہی روز پہلے کا واقعہ ہے کہ اپنے ہی شہر کے ایک دوسرے محلہ کے ایک صاحب آئے اور انھوں نے اپنی حاجت ظاہر کی، والد ماجد نے کسی بچہ سے فرمایا کہ گھر میں ایک روپیہ یا دو روپے کا نوٹ ہو تو لے آؤ۔ بچہ والدہ ماجدہ کے پاس آیا اتفاق سے اُس وقت ایک یا دو روپیہ والا کوئی نوٹ موجود نہ تھا، بچہ نے آ کر یہی عرض کر دیا، فرمایا اچھا پانچ روپیہ کا ہو تو لے آؤ۔ اتفاقاً اُس وقت پانچ روپیہ کا بھی کوئی نوٹ موجود نہ تھا، والدہ ماجدہ نے اُس بچہ سے کہدیا کہ پانچ کا بھی نہیں ہے دس کا ہے، بچہ نے آ کر یہی عرض کر دیا فرمایا اچھا دس کا ہی لے آؤ، چنانچہ بچہ دس کا نوٹ والدہ ماجدہ سے لے گیا، والد ماجد نے وہی نوٹ اُن صاحب حاجت سائل کو دے دیا، اور گھر میں آ کے فرمایا کہ میں تو ایک یا دو روپے ہی دینا چاہتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے اُس کی قسمت کے دس ہی تھے۔

ہر سال گھر کے خرچ کے اندازہ کے علاوہ صرف فقراء اور مساکین کے لیے غلہ کی ایک مقدار ضرور رہتی تھی جتنی کہ اگر اپنی کاشت کی پیداوار میں اتنی گنجائش نہ ہوتی تو خرید کر رکھا جاتا۔ چنانچہ اس سال بھی ایسا ہی ہوا کہ اپنی کاشت کی پیداوار کم تھی اس لیے کئی سو روپے کا غلہ باہر سے خریدا، اس کے بعد پھر کئی سو روپے کا اور خریدا تو والدہ ماجدہ نے عرض کیا کہ اس قدر غلہ خریدنے کی کیا ضرورت ہے جو پہلے لیا جا چکا وہی بہت کافی ہے! فرمایا، تم کیا جانو! جب زیادہ

پڑا ہوگا تو حاجتمندوں کو دینے میں ہاتھ نہیں رکے گا۔ چنانچہ خاص قسم کے اُن سائلوں کے علاوہ جو روپے پیسے ہی کے سائل ہوتے ہیں اکثر اہل حاجت کو وہ غلہ ہی دلواتے تھے اور جس کو بھوکا سمجھتے تو حتی الامکان اس کو پکا پکایا کھانا کھلاتے تھے۔ جس زمانہ میں کھانا پکانے والی کوئی ملازمہ ہوتی تو پھر تو روزانہ کئی کئی کھانوں کا بھی اوسط رہتا، لیکن جن ایام میں والدہ ماجدہ ہی پکانے والی ہوتیں تو ان دنوں میں بھی یہ سلسلہ کچھ نہ کچھ جاری رہتا، اگرچہ والدہ ماجدہ کی تکلیف کے خیال سے ہم لوگوں پر گراں گذرتا۔ ہمیشہ کی عادت تھی کہ گھر میں بار بار تاکید فرماتے کہ سالن میں پانی زیادہ ڈالو، اور کبھی کبھی خود چولھے پر پہونچکر اپنے ہاتھ سے ڈال جاتے، تاکہ وقت پر کوئی آجائے تو کمی نہ پڑے۔

واقعہ یہ ہے کہ حاجتمندوں اور مسافروں کو کھلانے کا اللہ تعالیٰ نے والد ماجد کو جو حوصلہ دیا تھا اور اس میں ان کو جو لذت آتی تھی وہ اس دور میں اگلے زمانوں کے قصوں کا ایک نمونہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اُن کی اسی ایک نیکی کو قبول فرمائے تو ان شاء اللہ نجات کے لیے کافی ہے۔

معاشی حالت اور اپنی معیشت

مذکورہ بالا حالات و واقعات سے کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ والد ماجد کوئی امیر کبیر اور بڑے دولتمند قسم کے آدمی تھے، واقعہ یہ ہے کہ اُن کی یہ بلند ہمتی اور فراخ دستی محض اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ایک صفت تھی ورنہ وہ آجکل کے معیار کے لحاظ سے اوسط درجہ کے گذارہ کے مالک تھے، بلکہ کبھی کبھی مقروض بھی رہتے تھے اور بعض سالوں میں اُن پر زکوٰۃ کا ایک پیسہ بھی واجب نہ ہوتا تھا مگر داد و دہش کا کم و بیش یہی حال رہتا تھا۔

لیکن اپنی ذات پر ہمیشہ بہت کم خرچ کرتے تھے۔ بہت سادہ کھاتے اور نہایت سادہ پہنتے تھے، بلکہ اس بارہ میں تو ان کا طرز عمل کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا جس پر ناواقفوں کو بخل کا شبہ ہوسکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ بعض اوقات پانی میں صرف نمک ڈال کر اسی سے کھانا کھالیتے تھے، اور لباس کا حال تو عموماً ایسا رہتا تھا کہ ناواقفوں اور اجنبیوں کے سامنے بعض اوقات ہم لوگوں کو ندامت اور شرم سے دوچار ہونا پڑتا تھا —— اب سے تیرہ۱۳ برس پہلے ۱۳۵۲ھ میں جب سفر حج کا ارادہ فرمایا تو ایک صحبت میں راقم سطور نے حج کی یہ خصوصیت بیان کی کہ یہ عاشقانہ عبادت ہے اور

اس کے ارکان و افعال کسی عاشق مجنوں کی سی حرکتیں ہیں، اسی واسطے اللہ تعالیٰ کو اس میں دیوانوں کی سی صورت اور ہئیت زیادہ پسند ہے، حتیٰ کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ حاجی زیادہ محبوب ہے جو پراگندہ حال اور میلا کچیلا ہو (الشعث التفل) بہرحال اس عاجز نے کسی صحبت میں یہ مضمون بیان کیا تھا، اس کے بعد خاص روانگی کے دن بلکہ روانگی کے وقت مجھے یہ خیال آیا کہ موسم سرد ہے اور والد ماجد کے ساتھ گرم شیروانی نہیں ہے، میں نے ایک شیروانی چند روز پہلے سلوائی تھی اس وقت پہنے ہوئے تھا، اس کے متعلق میں نے والد ماجد سے عرض کیا کہ آپ اس کو اپنے ساتھ رکھ لیجیے: فرمایا تم تو مجھے یہ حدیث سنا چکے ہو کہ "پراگندہ حال اور میلا کچیلا حاجی اللہ کو زیادہ محبوب ہے" پھر مجھے یہ نئی شیروانی کیوں دیتے ہو، چنانچہ نہیں لی ——— جب حج کا ذکر آگیا ہے تو ایک واقعہ اسی سلسلہ کا اور بھی ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

والد ماجد اس سفر میں اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق اپنی سفری ضرورتوں سے فاضل کافی رقم لے گئے تھے، لیکن وہ سب حرمین کے فقراء و مساکین پر اور دوسرے مصارف خیر میں صرف کی اور حجاج عام طور سے جو قیمتی چیزیں خرید کر لایا کرتے ہیں شاید اپنے ہاتھ سے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں خریدی، واپسی پر گھر کی ایک بچی نے عرض کیا کہ آپ ہمارے لیے جانماز یں تو لائے ہوں گے، فرمایا بیٹی! میرے نزدیک وہ نماز اچھی ہوتی ہے جو چٹائی پر پڑھی جائے۔ بہرحال یہ تھا اُن کا عام مذاق اور اپنی معیشت کا طرز۔

علم دین سے شغف

خود عالم نہ تھے بلکہ معمولی اُردو فارسی جانتے تھے لیکن دینی جذبہ کی وجہ سے چاہتے تھے کہ اولاد میں اور اولاد کی اولاد میں ایک بھی غیر عالم نہ رہے۔ اُن کے اسی شوق اور جذبہ کا نتیجہ ہے کہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں اس وقت پانچ فارغ التحصیل عالم ہیں اور دو دار العلوم دیو بند میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ اُن کی نسل میں جاری رہے گا۔

تصوف کی عظمت اور صوفیاء سے عقیدت

دین کے شعبوں میں سے تصوف کی عظمت والد ماجد کے قلب میں سب سے زیادہ تھی اور اس لیے دین کی نمائندگی کرنے والے مختلف طبقوں میں سب سے زیادہ عقیدت و وابستگی بھی ان کو صوفیاء

ہی سے تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو دین کی یہ دولت بعض صوفی بزرگوں ہی کی صحبت و محبت سے ملی تھی اگرچہ دین کا اصل جوہر اور مادہ تو ان میں موروثی اور خاندانی تھا لیکن اس کی آبیاری اور ترقی میں بعض صوفی بزرگوں کی صحبت ہی کو خاص دخل تھا۔

بعض غلطیوں کی اصلاح

اس موقع پر ناظرین کی سبق آموزی کے لیے اس حقیقت کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد اپنی جوانی ہی میں جن صوفیوں سے زیادہ متاثر اور مستفیض ہوئے اُن کے جو حالات خود والد ماجد سے سُنے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات اگرچہ اپنی نیت میں مخلص اور خدا طلبی میں صادق تھے اور بڑے ذاکر شاغل اور صاحب ریاضت بزرگ تھے لیکن دین کا علم ان بزرگوں کا بہت ناقص تھا اور غالباً کسی عالم ربانی اور محقق صوفی کی صحبت بھی اُن حضرات کو نہیں ملی تھی اس لیے اُن کے طریقے میں بدعات اور علمی و عملی اغلاط کی بہت کچھ آمیزش تھی اور اس کے اثرات والد ماجد میں بھی بہت کچھ تھے اور اب سے بیس پچیس برس پہلے تک اس سلسلے کی بعض غلطیاں گویا اُن کے عقائد کا جزو تھیں اور ان کی اصلاح بڑی مشکل نظر آتی تھی کیونکہ تصوف اور طریقت کے سلسلہ میں وہ عام علماء شریعت کی باتوں کو ـــــ "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند" ـــــ کے قبیل سے سمجھتے تھے اور اُن کو "ناآشنائے راز" جانتے تھے ـــــ خصوصاً جن علماء ربانی نے ہندوستان میں دین کو بدعات سے پاک کرنے کی کوشش کی اور سنت کا علم بلند کیا (مثلاً حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور اس آخری دور میں حضرت مولانا تھانویؒ) ان سب حضرات کو وہ تصوف و طریقت اور حقیقت و معرفت سے ناآشنا ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بریلی اور بدایوں کی خاص اصطلاح کے مطابق "وہابی" بھی یقین کرتے تھے۔

میرے زمانہ طالب علمی تک والد ماجد کے خیالات ایسے ہی رہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے اسباب پیدا فرما دیے جن سے ان خیالات کی اصلاح ہوتی رہی اور عمر کے آخری حصہ میں تو الحمد للہ پوری پوری اصلاح ہو گئی۔

والد ماجد کی سابقہ زندگی میں ایک اصلاح طلب پہلو یہ بھی تھا کہ عبادات اور ذکر و شغل کے شعبہ میں ان کا مقام جتنا بلند تھا، اخلاق و معاشرت و معاملات کے شعبوں میں اتنا بلند نہیں تھا۔

اور اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ خود دین کے عالم نہیں تھے اور جن صوفی بزرگوں سے وہ متاثر اور مستفیض ہوئے تھے وہ بھی دین کا جامع اور مکمل تصور نہیں رکھتے تھے اور صرف ذکر و تسبیح اور عبادت و ریاضت ہی کو کمال اور ذریعۂ تقرب سمجھتے تھے، لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق سے ان سب چیزوں کی بھی اصلاح ہو گئی اور ایسی انابت نصیب ہوئی جس پر اُن لوگوں کو بھی رشک کرنے کا حق ہے جو کبھی ان غلطیوں اور کمزوریوں میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔

فالحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

معاشی مشاغل یا دنیاداری

والد ماجدؒ کے مذکورۂ بالا حالات سے شاید بعض ناظرین کو یہ شبہ ہوا ہو کہ وہ کوئی گوشہ گیر اور خانقاہ نشین قسم کے صوفی ہوں گے اور دنیوی کاروبار سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں گے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی زندگی ایک بڑے مصروف اور جفاکش کاروباری آدمی کی سی زندگی تھی۔ تجارت، زمینداری، کاشتکاری، اُن کے معاشی مشاغل تھے اور وہ بڑی دلچسپی اور بڑی مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ اس کاروباری سلسلہ کے سارے کام انجام دیتے تھے ——— اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر کوئی اجنبی آدمی ان معاشی مشاغل میں اُن کی مصروفیت اور محنت کو دیکھتا تو ہرگز یہ نہ سمجھ سکتا کہ اس شخص کو اللہ کے ذکر و عبادت سے بھی کوئی خاص اُنس ہو سکتا ہے ——— بلا مبالغہ وہ ذکر و عبادت کی کثرت اور تعلق مع اللہ کے لحاظ سے پورے راہب اور صوفی تھے، اور اپنے کاروباری مشاغل کی مصروفیت اور محنت کے لحاظ سے پورے دنیادار۔ وما احسن الدین والدنیا لو اجتمعا۔

آخری چند مہینوں کا حال

والد ماجد کا سن اسّی سے متجاوز ہو چکا تھا۔ چھ سات مہینہ سے بصارت میں بہت کمی آگئی تھی، قریب کے آدمی کو بھی صورت سے پہچاننا مشکل تھا اور اتنے ہی دنوں سے ایک نئی شکایت یہ شروع ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی (خصوصاً گرمی کی شدت کے وقت) دل بہت گھبرانے لگتا تھا اور ایک طرح کی وحشت سی ہونے لگتی تھی اور اس وقت جی چاہتا تھا کہ کوئی اچھی باتیں کرنے والا ہو تا کہ طبیعت دوسری طرف متوجہ رہے۔

ذکر و تسبیح سے اُن کے ذوق کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور یہ ذوق اُن کو ساری عمر سے تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دینی اصلاحی کتابوں سے اُنھیں کبھی دلچسپی نہیں رہی بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرح کی عدم مناسبت تھی مگر جب سے اُن کو دل کے گھبرانے کی یہ شکایت ہوئی تھی اُس وقت سے ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ چاہتے تھے ہر وقت کوئی اُن کو دینی کتابیں پڑھ پڑھ کے سُناتا رہے، یا اللہ کا یا اللہ کے نیک بندوں کا یا آخرت کا تذکرہ ہوتا رہے چنانچہ احادیث نبویہ کے اردو ترجمہ کی چند کتابیں ان کے پاس رکھی رہتی تھیں اور وہ ان کو دوسروں سے پڑھوا پڑھوا کے ہر وقت سُنتے رہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان آخری چند مہینوں میں احادیث نبویہ سے ایسا ذوق اور اتنی مناسبت و دلچسپی بخش دی تھی کہ جب تک کتاب پڑھی جاتی ان کے دل کو سکون اور چین رہتا اور جیسے ہی وہ سلسلہ منقطع ہوتا دل کی بے چینی اور گھبراہٹ ایکدم اُبھر آتی۔ پھر خشیت اور رقت ان دنوں میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ ترغیب و ترہیب کے سلسلہ کی اکثر حدیثوں پر زار زار روتے اور بار بار استغفار کرتے خصوصاً جن بعض غلطیوں میں اپنی سابقہ زندگی میں کبھی وہ مبتلا رہے تھے جب کوئی حدیث اُن کے متعلق آجاتی تو بعض اوقات بہت متاثر ہوتے کبھی کبھی ہچکیوں سے رونے لگتے اور بڑے الحاح کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے اور کبھی بڑی حسرت سے فرماتے، بے علم کے آدمی کچھ نہیں، ہم عمر بھر بے خبر رہے ——— حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والد ماجد کی اصلاح کی تکمیل براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و ملفوظات کے ذریعہ فرمائی۔ یہ محض اس رب کریم کا فضل ہی تھا کہ زندگی کے ان آخری دنوں میں احادیث پاک سے ان کو اتنی مناسبت بخش دی گئی کہ گویا وہی ان کے درد دل کی دوا تھی اور اسی سے اُن کے دل کو سکون اور چین حاصل ہوتا تھا۔

والد ماجد کا ایک خواب جب سے والد ماجد کو اختلاج قلب کی مذکورہ بالا شکایت شروع ہوئی تھی اسی زمانہ میں انھوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان کو آفتاب غروب ہوتا نظر آیا تھا اور اس کی تعبیر انھوں نے یہی کی تھی کہ اب ان کی عمر کا آفتاب عنقریب غروب ہونے والا ہے چنانچہ ہم سب سے انھوں نے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا اور اس کے بعد سے آخرت کی طرف اُن کی توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور اکثر اوقات حسن خاتمہ کی دُعا فرماتے رہتے تھے ایک دفعہ خود راقم سطور نے سُنا رو رو کر اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے تھے ———

اے اللہ میرے اعمال جنت کے قابل نہیں ہیں مجھے محض اپنی رحمت سے جنت کے خادموں اور دربانوں میں کر دینا۔

آخری دن اور آخری وقت

اوپر کی سطروں میں دل کی جس گھبراہٹ کا ذکر ہوا ہے....... اس کے علاوہ اور اس کے اثر سے پیدا شدہ ضعف کے سوا کوئی اور خاص تکلیف یا بیماری والد ماجد کو بالکل نہیں تھی، آخری دن تک اپنی معمولی ضرورتیں چل پھر کے خود پوری کرتے رہے اور شب و روز کے نوافل اور اذکار و اوراد کے سارے معمولات بھی انجام پاتے رہے یہاں تک کہ بالکل آخری دن (۲۴ رمضان دوشنبہ کے دن) مغرب کی نماز پڑھی، حسب معمول اوابین کی رکعتیں بھی پڑھیں۔ اس کے بعد جب عشاء کا وقت قریب آیا تو سینہ میں خفیف سا درد محسوس ہوا جلدی سے زنانخانے میں تشریف لے گئے وضو کے لیے لوٹے میں پانی لیا اور فرمایا خدا خیر کرے سینہ میں کچھ درد سا ہو رہا ہے، معلوم کیا ہے، جلدی سے نماز پڑھ لینی چاہیے! چنانچہ لوٹا ہاتھ میں لیے باہر تشریف لائے وضو کیا اور اپنے معمول کے مطابق ۴ رکعت سنت قبل عشاء پڑھی پھر اپنے پوتے محمد عمر سلمہ کو امام بنا کے عشاء کی نماز بالکل اول وقت جماعت سے پڑھی، اس کے بعد ۲ رکعت سنت بعد عشاء پڑھی اور پھر اپنے معمول کے مطابق دو نفل پڑھے اور محمد عمر سلمہ کو تاکید کی کہ نفل پڑھنے کی عادت رکھو، فرائض میں جو کمی اور کوتاہی رہ جاتی ہے نفلوں سے اس کی تلافی کی امید ہے ___ اس کے بعد تراویح بھی شروع کر دی لیکن درد برابر زیادتی ہوتی رہی یہاں تک کہ ۸ رکعت تراویح پڑھنے کے بعد درد سے [illegible] بیٹھ گئے اور گھر والوں کو اب معلوم ہوا کہ درد معمولی نہیں ہے، میرے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحٰق [illegible] شروع کیں لیکن تقریباً ایک گھنٹہ تک درد میں بالکل تخفیف نہیں ہوئی بلکہ تکلیف برابر بڑھتی ہی رہی۔ اس پورے وقت میں والد ماجد اللہ کے ذکر و فکر اور توبہ و استغفار اور حسن خاتمہ کی دعاؤں میں مشغول رہے کبھی تسبیح پڑھنے لگتے، کبھی ہاتھ اٹھا کے دعا و استغفار کرتے اور رو رو کر اللہ سے عرض کرتے۔ اے اللہ میرے بس میں کچھ نہیں ہے تو ہی میری مدد فرما، میرا خاتمہ ایمان پر فرما، مجھے سعادت فرما دے، مجھے بخش دے۔ تقریباً ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ یہی کیفیت رہی کہ درد میں شدت ہوتی گئی اور والد ماجد اسی کرب کی حالت میں ذکر و دعاء، توبہ و استغفار میں مشغول رہے، اس کے بعد یکایک درد میں افاقہ ہونے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں بالکل

سکون ہوگیا۔ چھوٹے بھائی اور والدہ ماجدہ (جو ان کی تیمارداری کی مشغولیت کی وجہ سے نماز اور تراویح نہیں پڑھ سکے تھے) اُن سے باصرار فرمایا کہ اب تم جاؤ اور اپنی اپنی نماز پڑھو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی اور اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ چنانچہ ان کے فرمانے سے حکیم محمد احسن سلمہ بھی نماز پڑھنے چلے گئے اور والدہ ماجدہ بھی زنان خانے میں آکر نماز پڑھنے لگیں۔ والدہ ماجدہ نے عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر تراویح شروع کی ابھی ۱۲ رکعتیں پڑھی تھیں کہ گھر میں جو چراغ روشن تھا وہ اچانک گُل ہوگیا اور اندھیرے سے کچھ وحشت سی ہوئی، بجائے اس کے کہ چراغ کو پھر سے روشن کرنے کی کوشش کرتیں یہ خیال کرکے کہ باہر والد ماجد کے پاس لالٹین روشن ہے، باقی نماز پڑھنے کے ارادہ سے باہر آگئیں۔ والد ماجد ابھی تک بیدار تھے۔ دریافت فرمایا کیا نماز پڑھ آئیں۔ کہا کہ ابھی کچھ باقی ہے یہیں پڑھوں گی، فرمایا اچھا پڑھو۔ والدہ ماجدہ نے اُن کی نماز کی اُس چوکی پر جو ہمیشہ ان کے پلنگ کے برابر میں رہتی تھی نماز پڑھنی شروع کی ابھی پہلی ہی رکعت تھی کہ والدہ ماجدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ والد ماجد کو نیند آگئی اور نیند کی حالت میں ان کے سانس کی جو ایک خاص طرح کی کیفیت اور آواز ہوا کرتی تھی والدہ نے وہی کیفیت اور وہی آواز محسوس کی، پھر دوسری رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد جب والدہ ماجدہ نے "التحیات" پڑھنی شروع کی تو ان کو ایک ہلکی سی ہچکی کی آواز آئی اور والد ماجد کو سونے کی حالت میں کبھی کبھی ایسی ہچکی بھی آجایا کرتی تھی جس سے اُن کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی اور اس وقت ان کو پانی پینے کی ضرورت ہوتی تھی —— چنانچہ والدہ ماجدہ نے سلام پھیر کے جلدی سے ان کو پانی دینا چاہا لیکن معلوم ہوا کہ غالباً اس ہچکی کے ساتھ ہی ان کی روح دوسرے عالم میں پہونچ چکی اور اب اس دنیا کے پانی کی ان کو ضرورت ہی نہیں رہی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے لیکن جس طرح اور جس سکون و اطمینان کے ساتھ ان کی موت واقع ہوئی اس سے اندازہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ خاص فضل و کرم فرمایا۔

والد ماجد کی بڑی حسرت اور آرزو تھی اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے بڑی دعائیں کیا کرتے تھے کہ ان کے ذکر و عبادت کے سارے معمولات زندگی کے آخری دن تک جاری رہیں

الحمدللہ بظاہر تو ایسا ہی ہوا اور پھر مہینہ بھی رمضان مبارک کا ملا۔ ان سب ظاہری علامتوں سے اور اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے امید یہی ہے کہ ان کے ساتھ خاص لطف و کرم کا معاملہ ہوا ہے لیکن ہمیں یہ کسی حال میں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ "اللہ غنیٌ عن العالمین" ہے اور اس کے فیصلے ہم نادانوں کے قیاسوں اور اندازوں کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے تمام ناظرین کرام سے التجا ہے کہ وہ والد ماجد کے لیے مغفرت و رحمت اور ترقیٔ درجات کی دعا فرمائیں یہ ان کا میرے ساتھ بہت بڑا احسان ہوگا اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کو اجر عظیم دے گا۔ انّ اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ یہ نامۂ سیاہ اکثر وطن سے باہر رہنے کی وجہ سے اُن کی خدمت کے فریضہ سے ہمیشہ قاصر رہا اور نام کی مولویت کی وجہ سے وہ خود بھی اس کا موقع کبھی نہیں دیتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد سب سے بڑا قلق اسی تقصیر کا ہے اور اب اس کی تلافی کی اس کے سوا اور کوئی صورت سامنے نہیں کہ ان کے لیے خود بھی دعائیں کروں اور اللہ کے دوسرے بندوں سے بھی دعائیں کراؤں اس لیے تمام ناظرین سے بالخصوص اپنے احباب مخلصین سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ میرا ذاتی کام اور میری ضرورت سمجھ کر پورے الحاح کے ساتھ والد ماجد کے لیے مغفرت و رحمت کی اور ہم پسماندگان کے لیے اس مصیبت کے اجر کی دعا فرمائیں۔ واجرهم علی اللہ

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ علیہ الرحمہ

(ربیعین ۱۳۷۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

قارئین الفرقان اب سے بہت پہلے اخبارات میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (علیہ الرحمۃ والغفران) کی خبر وفات پڑھ چکے ہوں گے اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہی ہے، اور یہ ہر شخص کی جانی بوجھی بات ہے ــــــ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے اُن کی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے، اور دور و نزدیک والے اس سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات و حوادث سے متاثر ہوا کرتے ہیں ــــــ

علم دین میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بلند مقامی اور خصوصاً فقہ و فتویٰ میں اُن کی مرجعیت اور سیاسیات میں اُن کی خاص بصیرت اور ذہن و فکر کا سلجھاؤ یہ تو وہ چیزیں ہیں جن سے کسی درجے میں وہ لوگ بھی واقف ہوں گے جنکی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائط ہوں گے، لیکن ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے غیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی حضرات واقف ہوں گے جنھیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور برتنے کا زیادہ موقع ملا ہو گا ــــــ یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی عظمت کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود اُن کے دوسرے قسم کے کمالات سے ہمیشہ زیادہ متاثر رہا ــــــ ان میں سے اُن کے جس کمال کا نقش میرے دل پر سب سے زیادہ گہرا ہے وہ اُن کی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے، اس بارے میں اس عاجز کا جو تاثر اور احساس ہے واقعہ یہ ہے کہ اُس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے ان کو جتنی بلندیاں عطا فرمائی تھیں وہ اتنے

ہی متواضع اور بے نفس تھے، اُن سے ملنے والے اُن کے کسی نیازمند نے بھی کبھی محسوس نہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں بعض اوقات اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ انھیں شرم آتی، اس عاجز نے اس مقام کی کسی شخصیت میں کبھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا ——— دوسری جس خصوصیت سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ سفر و حضر کی سیکڑوں صحبتوں میں میں نے کبھی ان کی زبان سے، نہ نجی گفتگو میں، اور نہ مجلسی بحثوں اور گفتگوؤں میں، کسی بڑے سے بڑے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی کخت لفظ کبھی نہیں سُنا ——— اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ سُننا یاد نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے یہ عاجز بہت متاثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ: "كَانَ يَخْدِمُ نَفْسَهُ" (کہ آپ خود ہی اپنے خادم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر لیا کرتے تھے) ——— حضرت مفتی صاحبؒ اس اُسوۂ نبویؐ کے خاص نمونہ تھے، اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے اور بچوں کے بہت سے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جن کے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی توہین سمجھے گا ——— واقعہ یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی ان سیرتی خصوصیات سے اتنا متاثر ہے کہ اگر اُن کے ہاتھ پر کھلی کرامتیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متاثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اُن اکابرین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و عقیدت اور ان کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کی وفات اس دورِ فتن میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

اللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ وَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ؀

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سلطان عبدالعزیز ابن سعود رحمہ اللہ تعالیٰ

(ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

پرسوں ۱۰ر نومبر کو ہم نے بڑے رنج و افسوس کے ساتھ یہ خبر سُنی کہ والیِ نجد و حجاز سُلطان عبدالعزیز ابن سعود انتقال فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!

اس خبر سے مختلف لوگوں کو مختلف پہلوؤں سے رنج ہوا ہوگا، ہمیں خاص طور سے جس پہلو سے افسوس ہے وہ یہ کہ ایک حامیِ توحید وسنت اور ماحیِ شرک و بدعت دنیا سے اُٹھ گیا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین وادخلہ فی جنّت النعیم! ——— واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے سلطان کی خدمات کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی، سلطان کی حکومت سے پہلے، حجاز کی وہ سرزمین پاک جس سے توحید وسنّت کا آفتاب طلوع ہوا تھا، جس نے ساری دُنیا پر ہدایت کی شعاعیں بکھیر کر شرک و بدعت کا اندھیرا کافور کردیا تھا، ایک بار پھر مشرکانہ اعمال اور بدعات کی آماجگاہ بن کر گنبدِ خضرا میں آرام فرمانے والی روحِ پاک کو خون کے آنسو رلا رہی تھی، سلطان کو اللہ نے جب اقتدار بخشا تو اُس نے "الذین اِن مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر" کا نقشہ کھینچ دیا، اور ان منکرات کبیرہ کے مقابلہ میں ارشادِ نبوی "فلیغیرہ بیدہٖ" کی تعمیل کرکے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کردیں، اس کے علاوہ سُلطان کا یہ کبھی کارنامہ یاد رہے گا، کہ اس بیسویں صدی میں روئے زمین پر حدود اللہ کے قیام کی کوئی جھلک... اگر دکھائی دیتی ہے، تو صرف اسی کے حدودِ سلطنت میں۔

حال ہی میں حجاز کے کسی رسالہ میں شائع ہوا تھا کہ اقوام متحدہ نے مختلف ممالک سے اُن کا دستور مملکت اپنے ریکارڈ میں رکھنے کے لیے مانگا، تو سلطان مرحوم نے قرآن کریم کا ایک نسخہ بھجوا دیا، کہ:- "ھذا دستورنا!" اگر یہ واقعہ ہے تو "اعتزاز بالدین" کی کتنی بڑی مثال ہے؟ اور ان باتوں پر جب ہم اس لحاظ سے غور کرتے ہیں، کہ اُس نے ایک شخصی سلطنت میں سیاہ و سپید کا تنہا مالک ہوتے ہوئے یہ سب کچھ از خود کیا، رعایا کے مطالبہ سے مجبور ہو کر نہیں!——— جبکہ اسلام کے نام پر بنائے گئے "ملکوں" میں عوام کے بنائے ہوئے حکمراں، اپنے ملک کا دستور قرآن و سنت کے مطابق بنانے سے شرماتے ہیں، کتراتے ہیں، اور اپنے عوام کو طرح طرح کے گھسّے دے کر" اس الزام" سے بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں ——— تو قدرتی طور پر سُلطان کی قدر بہت بڑھ جاتی ہے۔

بہت سے لوگوں کو سُلطان کے بعض اقدامات پر اعتراضات بھی ہوں گے اور ہیں مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے:-

"اذکروا محاسن موتاکم و کفوا عن مساوئھم"

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا سیّد سلیمان ندویؒ

(الفرقان بابت ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوا)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خبرِ وفات ہمارے ناظرین اب سے کئی ہفتے پہلے اخبارات میں پڑھ چکے ہوں گے ــــــ اگرچہ حقیقت یہی ہے کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والے اور جینے والے کسی آدمی کی موت بھی کوئی غیر متوقع سانحہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں جو آیا ہے وہ جانے ہی کے لیے آیا ہے اور یہاں کی ہر زندگی موت ہی پر ختم ہونے والی ہے، اس لیے کسی زندہ شخص کا مر جانا نظری طور پر ایسا ہی ایک واقعہ ہے جیسا کہ ہر دن کے بعد رات کا اور رات کے بعد دن کا آنا ــــــ لیکن اللہ کے جن بندوں کی زندگی زیادہ قیمتی اور زیادہ نفع رساں ہوتی ہے ان کا اس دنیا سے جانا ایک غیر معمولی قسم کا سانحہ ہی ہوجاتا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔

سید صاحب اس دور میں نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے بلکہ پوری اسلامی دنیا کے ممتاز ترین اور مشہور ترین رجالِ علم و دین میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے علم و دین کا وہ کام لیا جس کی توفیق خاص بندوں ہی کو ملتی ہے ــــــ دوسرے علمی و دینی کاموں کے علاوہ صرف "سیرۃ النبیؐ" ہی کا کام اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ توفیق الٰہی کا خاص کرشمہ ہے۔

اپنے کسی بندہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص الخاص فضل ہوتا ہے کہ اس کو کسی اچھے اور بڑے کام کی صلاحیت بھی بخشی جائے اور اسی کام کی لگن اس کے دل میں لگا کر اس میں اس کو مشغول بھی کر دیا جائے اور ضروری اسباب بھی اس کے لیے فراہم کر دیے جائیں، سید صاحب کی زندگی اور ان کے کام کو دیکھنے والے ہر شخص کو صاف نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص عنایت و توفیق اُن کی رفیق تھی۔

دوسرا بہت بڑا فضل سید صاحب پر اللہ تعالیٰ کا یہ ہوا کہ اس علمی امتیاز و تبحر اور عالمی شہرت و وقعت کی ان تمام بلندیوں کے حاصل ہونے کے باوجود جو ہندوستان کے کسی عالم دین کو حاصل ہو سکتی تھیں ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے قلب و روح کے تزکیہ و تجلیہ کی طلب پیدا فرمائی اور پھر اس راستہ کے طے کرنے کے لیے کسی صاحب ارشاد شیخ کی رہنمائی کی ضرورت بھی انھوں نے محسوس کی اور اس کے لیے جب ان کی نظر انتخاب حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ پر پڑی تو "ندویت" و "دیوبندیت" کا فاصلہ مولانا شبلی مرحوم اور حضرت مولانا تھانوی کے طرز کا غیر معمولی فرق اور بہت سے مسائل میں خود اپنی رائے اور تحقیق کا اختلاف جیسے جو بہت سے حجابات سدِ راہ ہو سکتے تھے ان میں سے کوئی بھی سید صاحب کا راستہ نہ روک سکا ـــ اور اللہ کے بندے نے جس طرف جانے میں خیر دیکھا اس طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔

اس عاجز کے نزدیک تو سید صاحب کا یہ اقدام ہی ایک ایسا مجاہدہ تھا کہ "خود شکنی" کی کٹھن گھاٹی تو اسی سے طے ہو گئی ہو گی، اور عارفوں کا کہنا ہے کہ اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور کر لینے کے بعد راستہ بہت ہی مختصر رہ جاتا۔

بہرحال سید صاحب پر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی خاص الخاص فضل ہوا اور ان کو ظاہر و باطن کی وہ جامعیت عطا فرما دی گئی جو انبیاء علیہم السلام کی خاص میراث ہے۔

وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ

سید صاحب کا اس دنیا سے جانا ہم پسماندگان کے لیے بلاشبہ ایک رنجدہ سانحہ ہے لیکن خود اُن کے لیے انشاء اللہ ایسی ترقی ایسی بلندی اور ایسی نعمت ہے کہ اگر اس دنیا میں اس کا مشاہدہ ہو جائے تو اس کے اشتیاق میں اس زندگی کا ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو جائے اور یہاں کا جینا عذاب معلوم ہونے لگے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے ساتھ رحمت و مغفرت اور قبولیت کا خاص معاملہ فرمائے اور اُن کی دینی خدمات کا اپنی شانِ عالی کے مطابق صلہ عطا فرمائے اور ان کے علمی فیوض سے فائدہ اٹھانے کی بعد والوں کو توفیق دے۔

محمد منظور نعمانی

اپنے شفیق ترین استاذ کی یاد میں

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(رجب ۱۳۷۴ھ مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

انا للہ وانا الیہ راجعون ———— وانا بکم یومئذٍ للاحقون

یہ ناچیز ۲۰ر فروری سے کل ۱۱ر مارچ تک احباب کے ایک تبلیغی قافلہ کے ساتھ سفر میں رہا اور ۲۰ دن کے بعد آج ۱۲ر مارچ کو لکھنؤ واپس پہونچا ہے۔ آج سے تین دن پہلے ۹ر مارچ کو ہمارا قافلہ کٹھیار (ضلع پورنیہ بہار) میں تھا۔ وہاں کے مدرسہ "دارالعلوم لطیفیہ" میں ہمارا قیام تھا، قریباً ۹ بجے دن کا وقت ہوگا کہ مدرسہ مذکور کے مدرس مولانا عبدالرزاق صاحب ایک تار ہاتھ میں لیے نہایت غمزدہ صورت میں دوڑے ہوئے آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا کہ "دیوبند سے آیا ہوا یہ تار ہے بہت بڑا حادثہ ہوگیا" میں نے پوچھا کیا خبر ہے؟ انھوں نے جواب دیا اطلاع یہ ہے کہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا انتقال ہوگیا"!

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی گھڑی کسی کی بھی موت کوئی موجب حیرت واقعہ نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حضرت مولانا کی علالت کی کوئی اطلاع اس سے پہلے نہیں تھی، اس لیے تھوڑی دیر تو بس تحیر ہی کی کیفیت رہی لیکن بالآخر یقین کرنا پڑا، اٹھ کر وضو کیا، کچھ نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے نہایت شفیق استاذ کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کی۔ ————

کٹھیار سے روانہ ہونے کے بعد کل گورکھپور میں اخبارات میں بھی یہ خبر پڑھ لی۔ اپنے ناظرین کرام سے گزارش ہے کہ وہ بھی حضرت مرحوم کے لیے مغفرت و رحمت اور ترقی درجات کی دعا

فرمائیں، راقم الحروف پر بھی ان کا یہ احسان ہوگا۔

سب جانتے ہیں کہ اس دنیا کی حقیقت ایک سرائے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مسافروں کی آمدورفت کا تانتا بندھا ہوا ہے، روزانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں آتے ہیں اور جاتے ہیں، اس لیے کسی کا یہاں سے کوچ کرجانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کے بعض بندے کچھ ایسی انفادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کا اس دنیا سے جانا کسی قوم یا جماعت کے لیے واقعۃً بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے، اس لیے اُن سے تعلق رکھنے والوں کو اُن کی موت سے غیر معمولی رنج اور صدمہ ہوتا ہے ـــــ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کے ان ہی بندوں میں سے تھے۔

اس وقت کسی مفصل تذکرہ کی تو گنجائش نہیں صرف چار صفحے کی محدود وسعت کو پیش نظر رکھ کر حضرت ممدوح کی زندگی کے بعض پہلوؤں کے متعلق چند سطریں الفرقان کے ناظرین کرام کے لیے لکھنا چاہتا ہوں، اس سے انشاء اللہ کچھ اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا۔

حضرت مولانا سے میری ابتدائی واقفیت

حضرت مولانا نے اپنے ابتدائی دور میں فقہ اور ادب کی بعض درسی کتابوں پر جو حواشی لکھے تھے اور درس کے انداز میں جو غیر معمولی خصوصیت پیدا کرلی تھی اُس کی وجہ سے علمی اور درسی حلقوں میں اپنے ابتدائی زمانہ ہی میں حضرت مولانا کو خاص شہرت اور عظمت حاصل ہوگئی تھی۔ اب سے ۴۴-۴۳-۵ سال پہلے جبکہ راقم الحروف عربی کی ابتدائی متوسط کتابیں پڑھتا تھا، خوب یاد ہے کہ اُس وقت کے میرے بعض اساتذہ حضرت مولانا کی علمی اور درسی خصوصیات کے بہت تذکرے کیا کرتے تھے۔ میں نے پہلے پہل حضرت مولانا کا نام اپنے ان استادوں ہی سے سنا تھا۔

دارالعلوم میں میری حاضری اور حضرت مولانا کا تدریسی امتیاز

شوال ۱۳۴۳ھ میں یہ ناچیز دارالعلوم دیوبند گیا اور دو سال وہاں رہا، پہلے سال میں "ہدایہ اخیرین" "سبعہ معلقہ" اور دوسرے سال میں "تفسیر بیضاوی" سورہ بقرہ (جو اُس وقت دورۂ حدیث کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی) اور "شمائل ترمذی" مولانا ہی سے سبقاً سبقاً پڑھیں، اُس وقت کا اپنا خیال اور اندازہ یہ تھا اور آج تک بھی اس میں کوئی

فرق نہیں آیا ہے کہ مولانا مرحوم اِن کتابوں کو اِس طرح پڑھاتے تھے کہ اگر اُن کے مؤلفین و مصنفین علامہ مرغینانی اور امام ترمذی اور قاضی بیضاوی اور امراؤ القیس وغیرہ اصحاب معلقات، مولانا کا درس سنتے تو انھیں یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوتی کہ اُن کی کتابوں کا کیسا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ خاص کر "ہدایہ اخیرین" کا درس تو اتنا ممتاز ہوتا تھا کہ علمی اور درسی ذوق رکھنے والے اہل علم جنھوں نے بار بار ہدایہ اخیرین پڑھائی ہوتی، مولانا کا درس سن کر ان کا بھی جی چاہنے لگتا کہ ایک دفعہ ہدایہ اخیرین مولانا سے پھر پڑھیں، اور بعض حضرات نے ایسا کیا بھی۔

بے پناہ محنت اور بے انتہا مصروفیت

حضرت مولانا کا خاص وصف جس میں اب تک ان کا کوئی ثانی نہیں دیکھا گیا وہ ان کی بے پناہ محنت اور بے انتہا مصروفیت تھی، میرا خیال ہے کہ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں دوپہر اور رات کے سونے کے چند گھنٹوں کو نکال کر (جو میرے اندازہ میں ۵-۴ گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے) اگر کوئی شخص اس کی کوشش کرتا کہ اُن کو کسی وقت فارغ اور غیر مشغول دیکھ سکے تو مہینوں نہ دیکھ پاتا۔ اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ آدمی اپنے وقت کی قدر کرے تو کتنا کام کر سکتا ہے۔ بلا مبالغہ وہ روزانہ اتنا کام کرتے تھے کہ اوسط درجے کے کام کرنے والے ۴-۵ آدمی مل کر بھی اتنا کام عام طور سے نہیں کرتے۔

شیخ الادب والفقہ اور صدر مفتی و ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند

درسی علوم میں فقہ اور عربی ادب میں حضرت مولانا کو چونکہ خاص الخاص مہارت تھی اس لیے دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والی علمی برادری میں عام طور سے ان کو "شیخ الادب والفقہ" کہا اور لکھا جاتا تھا ——— ایک عرصہ تک وہ دارالعلوم کے صدر مفتی بھی رہے لیکن بعد میں تدریس اور نظامت تعلیم کی ضروریات نے دارالعلوم کے اہل حل و عقد کو مجبور کیا کہ دارالعلوم کی صدارت افتا کے لیے کسی اور کا انتخاب کیا جائے اور تدریس اور نظامتِ تعلیم کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

تحریر و تصنیف

ہمارے قدیم طرز کے علماء میں علمی رسوخ کے باوجود تحریر پر قدرت اور تصنیف کا اچھا ذوق رکھنے والوں کی کمی رہی ہے لیکن مولانا مرحوم صاحب علم و

درس ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھے اور سلیس و شگفتہ اُردو لکھنے والوں میں تھے۔ دارالعلوم دیوبند کا قدیم ماہنامہ "القاسم" جس دور میں دارالعلوم کی علمی شان کے مطابق ایک معیاری دینی و علمی ماہنامہ تھا اس زمانہ میں کافی عرصہ تک اس کی ادارتی ذمہ داریاں عملاً مولانا ہی سے متعلق تھیں ——— القاسم کی پرانی جلدوں میں آپ کے بعض مضامین اب بھی ایسے محفوظ ہیں جو آپ کے طرز نگارش کا اچھا نمونہ ہیں۔

انتہائی شفقت کے ساتھ انتہائی رعب

طلبہ کے حق میں حضرت مولانا اس قدر شفیق تھے کہ اس کی مثال نہ دیکھی نہ سُنی۔ خاص کر جو طالب علم پڑھنے میں محنتی اور نیک سیرت ہوتے، مولانا اُن سے بالکل اپنی اولاد کی طرح محبت فرماتے، اُن کو اوقات مدرسہ کے علاوہ بعض اوقات کئی کئی سبق پڑھاتے، دن میں کوئی وقت خالی نہ ہوتا تو رات کے اوقات میں پڑھاتے۔ حد یہ ہے کہ اگر وہ حافظِ قرآن ہوتے تو قرآن مجید سننے کے لیے بھی وقت نکالتے، اگر کوئی وقت نہ نکل سکتا تو تہجد میں ان کو امام بنا کر ان کا قرآن سنتے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے دیکھا نہیں ان کو طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا کی محبت و شفقت کا اس زمانہ میں کسی طرح اندازہ نہیں کرایا جا سکتا، لیکن آپ کی یہ محبت اور شفقت، ماں والی محبت و شفقت نہ ہوتی جو بسا اوقات بچہ کو بے تکلف اور بے باک بھی بنا دیتی ہے، بلکہ ایک باوقار اور پُر رعب باپ کی سی محبت و شفقت ہوتی جو طالب علم کو مولانا کا گرفتار اور گرویدہ تو بنا دیتی لیکن اس میں بے تکلفی کبھی نہ آسکتی ——— آپ کی سیرت کا یہ پہلو حضرت فاروق اعظم رضؓ سے بہت مشابہ تھا۔ اسی لیے طلبہ جس قدر اُن کے سامنے باادب اور محتاط رہتے اور جتنا اُن سے ڈرتے اس ناچیز نے خود اپنی طالب علمی کے زمانے میں دیکھا کہ اُن کے بھی اکابر مثلاً استاذنا حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کبھی نہیں ڈرتے تھے، مولانا کا یہ فاروقی طرز عمل طلبہ کے لیے جس قدر مفید اور ان کی سیرت کا جیسا محافظ تھا اس کا اندازہ صرف انھیں کو ہوگا جو اس دور میں کچھ عرصہ دارالعلوم میں طالب علم بن کر رہے ہیں۔

بے مثال تواضع

اس وقار اور اس فاروقی رعب و جلال کے ساتھ تواضع اور کسر نفسی اس قدر تھی کہ جن کو خود واسطہ نہیں پڑا ان کو اب کسی طرح سے کوئی اس کا اندازہ

نہیں کرا سکتا۔ ہر شخص کو پہلے سلام کرنے کے وہ اتنے حریص اور اس معاملہ میں اس قدر مشتاق اور
اور چابکدست تھے کہ اُن کے قریباً سبھی نیازمندوں نے جن کی تعداد ہزاروں ہوگی مدتوں
اس کی کوشش کی ہوگی کہ پہلے سلام کرنے کی سعادت کبھی انھیں حاصل ہو، لیکن راقم سطور کے ساتھ
وہ سب شہادت دے سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ہمیشہ ناکام اور شکست خوردہ رہے۔ حضرت مولانا
کا عام قاعدہ تھا کہ نگاہ نیچی کیے تیز چلتے اور جیسے ہی کوئی شخص سلام کی زد پہ آجاتا (یعنی
اتنے قریب ہوجاتا کہ وہ سلام سن سکتا) تو اچانک اس کی طرف نگاہ اُٹھاتے اور نگاہ کے
ساتھ ہی زبان اپنا کام کرتی اور اس بیچارے کو وعلیکم السلام ہی عرض کرنے کا موقع ملتا۔
دارالعلوم میں پڑھنے والے طالب علموں کے سوا جو شخص ملنے آتا عموماً اُس کے لیے کھڑے ہوجاتے۔
یہاں تک کہ آپ کے جو شاگرد طالب علمی کے زمانہ میں آپ کے خاص خادم اور نیازمند رہے
ہوتے وہ بھی جب بعد میں کبھی حاضر ہوتے تو حضرت مولانا ہمیشہ کھڑے ہوجاتے اور اکثر
ایسا ہوتا کہ پہلے انھیں بیٹھنے پر مجبور کرتے اور بعد میں خود بیٹھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ تواضع اور
دوسروں کے اکرام کی یہ صفت اس درجہ تھی کہ جو شخص آپ کو نہ جانتا اُسے بسا اوقات تصنع اور
بناوٹ کا شبہ ہوسکتا تھا۔

افسوس صد افسوس کہ ان اوصاف و کمالات کی حامل و جامع ہستی ہم سے جدا ہوگئی!

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله
وانزل على روحه وجسده وتربته شآبيب رحمتك ورضوانك واجعله
من عبادك المقربين۔ آمین یا ارحم الراحمین!

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

(رمضان و شوال ۱۳۷۵ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے سانحۂ وفات کا علم اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ناظرین الفرقان کو اب سے چند روز پہلے ہو چکا ہوگا ـــــــ اگرچہ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر مسافر کی آخری منزل موت ہی ہے، اور اس لیے ہر زندہ کے متعلق ہم سب کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ یہ ضرور ایک نہ ایک دن مرنے والا اور مُردوں سے جا ملنے والا ہے۔ اور خاص کر مولانا مرحوم کا حال تو کئی سال سے یہ تھا کہ خطوط میں برابر تحریر فرماتے رہتے تھے کہ "موت و حیات" کی درمیانی منزل میں ہوں، نیز پچھلے دو تین سالوں میں کئی بار ایسے دورے پڑے کہ تیمارداروں کو مایوسی ہو گئی۔ ان حالات میں آپ کے سانحۂ وفات کی اطلاع آپ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بالکل غیر متوقع نہ تھی اور اس لیے عقل عام کا تقاضا بظاہر یہی تھا کہ دل زیادہ محزون اور متاثر نہ ہوتا۔ لیکن دل کی واردات عقل کے تابع نہیں، خبر سُن کر جو کچھ دل پر گزری وہ بیان میں آنے کی چیز نہیں۔

مولانا مرحوم سے گوناگوں ذاتی تعلقات بھی تھے لیکن آج جو چیز سب سے زیادہ یاد آرہی ہے اور جس سے محروم ہو جانے کا خاص صدمہ ہے وہ مولانا مرحوم کی ممتاز علمی حیثیت اور ان کے علم کی خصوصی افادیت ہے۔

سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ہمارے اس دور میں پچھلے تمام دوروں سے زیادہ ضرورت ایسے اہل علم کی ہے جن کی نظر وسیع اور ذہن روشن ہو۔ اور اسی کے ساتھ دل خدا آشنا اور خدا ترس ہو۔ اور جو سلف کے پورے اتباع کے ساتھ عصر جدید کی خصوصیات اور اس کے تقاضوں

کو بھی سمجھنے والے اور اس سے پیدا ہونے والے مشکل مسئلوں کو حل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ہوں۔ اور یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو بڑی فیاضی سے عطا فرمائی تھیں ــــ مولانا مرحوم کی ان علمی خصوصیات کی قدر و عظمت کا احساس الحمد للہ پہلے بھی تھا، لیکن اب اس نعمت کے چھن جانے کے بعد یہ احساس بیسیوں گنا بڑھ گیا ہے۔ اس لیے جتنا بھی غم اور صدمہ ہو بجا اور برحق ہے ــــ تاہم یہ چیز فی الجملہ تسلی دینے والی ہے کہ اپنی بہت سی تصانیف اور لاتعداد مجلاتی مقالات کی شکل میں جو ورثہ آپ نے چھوڑا ہے اس میں بھی آپ کے علم و مطالعہ اور نتائج فہم و فکر کا کافی حصہ آگیا ہے اور بہت کچھ فائدہ اس سے اٹھایا جاسکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے اور سید عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خواص اہل محبت کے ساتھ آپ کو جو والہانہ اور نیم مجذوبانہ گرویدگی اس زندگی میں عطا فرمائی گئی تھی ــــ "المرء مع من احب" ــــ کے کریمانہ منشور کے مطابق اگلی زندگی میں اُن سب کی رفاقت و معیت آپ کو نصیب ہو۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہٗ ولا تفتنا بعدہٗ۔ آمین

عتیق الرحمٰن سنبھلی

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی وفات

(جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

آہ کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ۱۲ جمادی الاولیٰ (مطابق ۵ دسمبر) کو اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے اور اپنے پیچھے ہزاروں شاگردوں، لاکھوں ارادتمندوں اور کروڑوں اہلِ عقیدت و اربابِ محبت کی ایک دنیا چھوڑ گئے جو اپنی ویرانی پر اشکبار اور دلفگار ہے اور مدتوں رہے گی۔ قدس اللہ سرہٗ و نور ضریحہ۔

آہ! کہ آج بزمِ عرفان سونی ہے، محرابِ انسانیت بے نور ہے۔ مسندِ علم کی رونق جا چکی ہے، اور محفلِ طریقت جانِ محفل کو رو رہی ہے۔

جو جانتے ہیں انھیں تو بتانا کیا، پر جو نہیں جانتے، آہ! انھیں کیسے بتایا جائے کہ اس ایک ذات سے محروم ہو کر ہم کس دولت سے محروم ہو گئے ہیں! —— آہ! وہ سلفِ صالحین کی چلتی پھرتی یادگار، وہ مجسم زہد و ایثار، وہ پیکرِ تقدس، وہ کوہِ استقامت، وہ جلوہ نمائے خلقِ احمدؐ، اب ہم کہاں دیکھ پائیں گے؟ —— جسے دیکھ کر ایمان کے بجھے ہوئے ذرات میں تازگی پیدا ہوتی تھی جس کا قرب پا کر دلوں میں ذوقِ عمل اور تعلق باللہ کی امنگ بیدار ہوتی تھی۔ جس نے اس دورِ انحطاط میں ہر طرح کے مواقع کے باوجود زہد و ایثار ہی کو اپنی اصل دولت سمجھا، جس نے گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر نہیں کارزارِ حیات کے ان میدانوں میں رہ کر بھی اپنے دامنِ تقدس کو بے داغ رکھا جہاں دامنِ تقدس سنبھالے نہیں سنبھلتا اور انسان معذرت خواہ ہوتا ہے کہ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جس نے چودھویں صدی میں عزیمت و استقامت کی ان مثالوں کو دہرایا جو اربابِ عزیمت کی تاریخ میں امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے نقش کی ہیں، اور جس نے اپنے روز و شب اپنے عادات و اطوار اور اپنے اخلاق کو اسوۂ حسنہ سے اس قدر قریب کر رکھا تھا کہ بخدا پڑھا اور سنا ضرور ہے مگر آنکھوں سے اس کی مثال

نہیں دیکھی!

یہ شاعری اور عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں، کہ لکھنے والے کی افتادِ طبع اس قسم کی عقیدت مندی سے کوسوں دور ہے۔ یہ جو کچھ قلم سے نکل رہا ہے حقیقت کا بجا تُلا اظہار اور واقعات و مشاہدات کے حقیقی تاثرات ہیں، اور جس شخص نے بھی کھلے دل کے ساتھ مولانا کی کتابِ حیات کو دیکھنے کا کچھ موقع پایا وہ خواہ شاگرد نہ ہو، مرید نہ ہو بلکہ بالکل غیر اور کسی مستقل مکتبِ فکر کا فرد رہا ہو اس کے تاثرات بھی یہی سامنے آئے ہیں۔

۱۹۴۲ء کی بات ہے اسی قسم کے ایک صاحب نے اُس وقت کی ایک چڑھتی ہوئی شخصیت اور دین کے ایک پُرزور داعی سے ملنے کے بعد ان کے ایک پرجوش رفیق سے جو الفاظ کہے تھے جو انھیں کے واسطے سے مجھ تک پہونچے وہ آج کانوں میں گونج رہے ہیں، انھوں نے کہا تھا کہ "باتیں سب ٹھیک! مگر اس کو کیا کریں کہ اتنی ساری دیر میں یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ کسی دینی شخصیت کے پاس بیٹھے ہیں اس کے برعکس مثلاً مولانا حسین احمد کے پاس بیٹھتے ہیں تو خدا یاد آتا ہے۔"

حقیقت یہی ہے کہ یہ مبارک ہستی جو اپنے تعلق باللہ اور اپنی باطنی کیفیات کو عمر بھر ایک راز کی طرح چھپاتی رہی اس کا چہرہ اس راز کو ہر اس شخص پر فاش کرتا تھا جس کی نظر کی راہ میں کوئی قلبی غبار نہ حائل ہو رہا ہو، اور یہ نظارۂ حالِ دل ہر اس شخص کے دل پر اثر انداز ہوتا تھا جس کے دل پر غفلت کی مہر نہ لگی ہوئی ہو۔

آہ! یہ دولت نایاب اب کہاں؟ —— اب کہاں وہ صحبتیں؟ کہاں وہ مجلسیں؟ جہاں اس آسانی سے دل بیدار ہو جاتا تھا۔ اور مدتوں کی غفلت چند لمحوں کے لیے تو کافور ہو ہی جاتی تھی!

آہ! کیا خلوص و للّٰہیت کا یہ نمونہ پھر دیکھنے کو ملے گا، جس نے مختلف میدانوں کے صاحبِ کمال کو اپنے کسی کمال کی قیمت وصول کرنے کی اجازت نہیں دی اور وہ اس شان سے دنیا سے گیا کہ اپنا سب کچھ لٹا گیا مگر کسی کے خراجِ تحسین کا بھی روادار نہ ہوا!

اسے خلوص و للّٰہیت اور استقامت کی بے پناہی کے سوا کیا کہیے کہ تیس برس تک سیاست کی وادیٔ پُرخار میں رہ کر بھی اس کی قبائے تقدس اسی طرح سلامت رہی جس طرح مدرسہ و خانقاہ کے گوشۂ عافیت میں محصور رہ کر رہ سکتی تھی۔ نہیں! بلکہ وہ انھیں روز و شب میں تقویٰ و طہارت، خوف و خشیت اور عشق و محبت کی بھی مزید منزلوں پر منزلیں طے کرتا رہا —— یہاں تک کہ جب اس میدان

ہے پنہا تو وہ سراپا سوز و گداز تھا!

اور استقامت کے اس مظاہرہ پر کیوں نہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی یاد آنے لگے گی کہ ۱۹۲۱ء میں انگریزی فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی ملازمت کی حرمت کا فتویٰ دینے پر جب وہ گرفتار کر کے کراچی کی عدالت میں لایا گیا تو جلال و جبروت کے دم بخود کر دینے والے مظاہروں کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس نے بہانگ دہل پکارا کہ

"ہاں میں کہتا ہوں کہ انگریزی فوج اور پولیس میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا حرام ہے"

اور وہ اخلاق و کردار اور عادات و اطوار میں "خلق احمدی کی جلوہ نمائی" یہ تو اس کی زندگی کا وہ حسین باب ہے کہ جس کی نظر سے اس باب کے کچھ اوراق گزر گئے وہ محبت اور والہانہ محبت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور حق یہ ہے کہ "اخلاق محمدی" کی تاثیر پر الحمدللہ ایمان تھا اور شرح صدر کے ساتھ تھا۔ مگر مولاناؒ کو قریب سے دیکھ کر گویا (بلا تشبیہ) اس تاثیر کا مشاہدہ ہو گیا۔

مگر آہ! کیا پتہ تھا کہ یہ سب ایمان پرور اور مسرت بخش مناظر ایک دن دل کے داغ بن جائیں گے اور پھر ان داغوں کو بھی عزیز رکھنا پڑے گا۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد!

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رح

میری واقفیت اور تاثرات

(شمارہ بابت جمادی الآخر ۱۳۷۷ھ میں شائع ہوا)

غالباً ۱۳۳۳ھ کی بات ہے میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسے (مدرسۃ الشرع) میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا میری عمر اس وقت ۱۴ سال کی ہو گی، حضرت شیخ الہند رح کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا اس لیے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہند رح مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں، اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مدرسہ کے کہن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسہ تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہند رح کی رہائی کی خوشخبری پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی نظم میں حضرت شیخ الہند رح کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب کا نام سنا۔

پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہند رح مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے۔ غالباً یہ تشریف آوری رمضان مبارک ۱۳۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے میرے والد ماجد نے آئندہ تعلیم کے لیے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم اُن دنوں مدرسۂ عبدالرب دہلی میں مدرس تھے) مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاد حضرت شیخ الہند رح کی زیارت کے لیے دیوبند

جائیں گے اور پھر وہاں سے دہلی۔ مجھے بھی اس کی خوشی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت نصیب ہو گی۔ اُس زمانہ میں میرے وطن سنبھل اور مراد آباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی تھی اس لیے سنبھل سے مراد آباد تک سفر گھوڑے تانگہ سے ہوا، مراد آباد پہونچکر دیوبند کے لیے ٹکٹ خرید لیے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد مراد آباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ آج ہی دیوبند سے فتح پور ہسوہ روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اس وقت دیوبند پہونچکر حضرت کی زیارت نہ ہو سکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے وہ ٹکٹ واپس کر دیے گئے اور دہلی کے ٹکٹ لے کر براہ راست دہلی روانہ ہو گئے ـــــ صبح کو جب ہم دہلی پہونچکر مدرسہ عبد الرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش وفروش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ اسی وقت تشریف لا رہے ہیں شام تک یہیں مدرسہ میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے فتح پور کے لیے روانگی ہو جائے گی اُستاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی، تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقاء سمیت تشریف لائے۔ ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عزیز گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سُن چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نہیں ہیں۔

چند مہینے کے بعد (صفر یا ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں) حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہو گیا۔ مالٹا سے حضرت کی آمد پر خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہو گئی، ملک بھر میں خلافت کے نام پر جلسے اور کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قریب قریب وہ سب بڑے علماء تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور اسارت مالٹا کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا۔ حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقع پر ہوئی، خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدھر کو نکلتے تھے مشتاقان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ کی اپنی تقریر میں لوگوں کے ھر اور ان تکلیفوں مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی

بھی بیان فرمائی تھی جن سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اہل مدینہ کو گزرنا پڑا۔ یہ واقعات ہر مسلمان کے لیے بہت دردناک تھے۔ مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزا یاد ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لیے گئے اور وہ تاریخی مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے، اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں دوسری دفعہ مولانا کی زیارت مرادآباد کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب نجد کے سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف حسین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا، خبریں آرہی تھیں کہ شریف حسین بعض یوروپین طاقتوں سے مدد حاصل کر کے نجدیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پر ہوگی۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ایک رزولیشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پر ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا اور مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ و اقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس رزولیشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنی نے ایک بڑی بسیط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی حرمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ و جدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے بڑھ کر سنائے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے دفتر کے دفتر حفظ ہیں اور اس وسعت میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلہ نہ ہوگا۔

میرے لیے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا۔

اگلے سال میں پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند چلا گیا، وہاں دو سال قیام رہا، حضرت مولانا مدنی کا مستقل قیام اس زمانہ میں غالباً سلہٹ رہتا تھا۔ لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا، چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانہ میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی، اس زمانہ کی آپ کی تقریریں معلومات سے معمور ہوتی تھیں خاص طور سے ہم طلباء ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض تقریریں قلمبند بھی کی تھیں۔

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم چھوڑنے

کا فیصلہ فرمالیا، اس وقت دارالعلوم کی صدارت، تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا، چونکہ دارالعلوم میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہو چکا تھا اس لیے مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گذشتہ ۳۰-۳۲ سال کی مدت میں دیوبند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی —— حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بناء پر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے میں انھیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا امتیاز خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے، اس لیے حضرت مولانا جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا —— لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو تو اس کو بندگی کا کمال نصیب ہوا اسی لیے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے اور اسی لیے سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسران اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ اِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِی الصَّلٰوةُ (تمھارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم .... اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے۔)

اصل بات یہ ہے کہ نماز صرف ایک دینی عمل ہی نہیں ہے بلکہ دینی نظام میں اس کا مقام وہ ہے جو انسان کے جسمانی نظام میں اس کے قلب اور روح کا مقام ہے۔ قلب کے بارے میں مشہور حدیث ہے کہ اسی کے صلاح و فساد پر پورے وجود انسانی کے صلاح و فساد کا مدار ہے۔ (اذا صلح صلح الجسد کلہ واذا فسد فسد الجسد کلہ) اسی طرح نماز کے بارے میں بعض حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کو جانچا جائے گا اگر بندہ کی نماز اچھی نکلی تو وہ کامیاب و بامراد ہوگا اور وہ ناقص و خراب نکلی تو وہ نامراد اور خسارہ میں رہے گا اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جس بندے کی نماز ٹھیک نکلے گی اس کے سارے عمل ٹھیک مانے جائیں گے اور جس کی نماز خراب ہوگی اس کے سارے عمل خراب قرار دیے جائیں گے۔

اسی قسم کی روایات کی بنا پر حج نے یہ کہا ہے کہ نماز کا مقام دینی نظام میں قلب و روح کا مقام ہے۔

نماز کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے یہ دعا نقل کی گئی ہے۔ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ (اے میرے رب مجھے ایسا کر دے کہ میں اچھی نماز ادا کرنے والا ہو جاؤں اور میری نسل میں سے بھی۔)

بہرحال اللہ کے کسی بندے کو نماز کی حقیقت اور اس کی روح کا نصیب ہونا اس کا سب سے بڑا کمال اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہے۔

نماز کی روح کیا ہے؟ —— اس کے جاننے کے لیے امام عارف حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ عبارت پڑھ لیجیے:- وروح الصلوٰة هي الحضور مع الله والاستشراف للجبروت وتذکر جلال الله مع تعظیم ممزوج بمحبةٍ وطمانینة (حجة الله البالغة ج۲ ص۱۲) یعنی اللہ کے سامنے حضوری اور سکینت و محبت آمیز تعظیم کے ساتھ اس کے جلال و جبروت کا تصور اور گہرا دھیان بس یہی نماز کی روح ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے نماز کی جو روح بتائی ہے وہ بلاشبہ ایک باطنی حال ہے جس کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن جس طرح رنج و غم، فکر و الم، مسرت و شادمانی، لذت و سرور وغیرہ قلبی و باطنی کیفیات کے آثار کسی کے چہرے پر دیکھ کر یا اس کی گفتگو اور آواز میں ان کے اثرات محسوس کر کے ان اندرونی کیفیات کا اندازہ ہر ہوش و گوش والا کر لیتا ہے اسی طرح نماز کی اس روح کے آثار کبھی دوسروں کے لیے بعض اوقات اتنے عیاں ہو جاتے ہیں کہ وہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتے اور کانوں سے سن لیتے ہیں۔ بعض صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بیان کیا ہے کہ نماز کی حالت میں ہم آپ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے کی سی (یا بعض راویوں کے بیان کے مطابق ہانڈی میں جوش آنے کی سی) ایک آواز سنتے تھے تو یہ دراصل اسی اندرونی کیفیت کا ایک اثر تھا جس کو دوسرے بھی محسوس کرتے تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب کبھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں

خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔

ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا، خاص کر سجدے میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دل دکھتا تھا لیکن اس تمام عرصہ میں فرائض ہی نہیں بلکہ اوّابین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طولِ قرائت اور طولِ قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف و مشقت سمجھ رہے ہیں ان کے لیے اسی میں راحت و لذت ہے ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور "یا بلال ارحنی بالصلوٰۃ" والی کیفیت سے خاص حصہ ملا ہو۔

رسول اللہ صلعم کی محبت اور اتباع سنت

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ صلعم سے محبت نہ ہو، اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضور کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت اور آپ کی سنتوں اور عادات و اطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا اظہار اپنے موقع پر عملی زندگی میں قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف، عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے۔ تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی خال خال ہی ملیں گی اس سلسلہ میں بعض عادات اور روزمرہ کی بعض دیسی باتوں کا ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا جن سے اندازہ ہو سکے کہ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر گول ہوتا اور جس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے) سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے حتیٰ کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقہ پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتیٰ کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریقہ سنت کی پابندی فرماتے ——— اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیاز مند اور خدام تعظیماً کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے بلکہ بعض اوقات اس اظہار ناراضگی میں برافروختگی بھی ہوتی ——— اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے کیا آپ معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرت اور عادات میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہو گا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و وجاہت، بلندی و برتری حاصل ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی۔ دار العلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے۔ ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع و عریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت و سیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام ——— ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عاجز اس موقع

پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات، راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو ——— اس سلسلے میں بھی خود اپنے ساتھ گذرے ہوئے بعض واقعات کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۱۳۴۲ھ کی بات ہے میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا۔ ہمارے وطن سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا اس میں جماعت دیوبند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندیؒ) نے شرکت فرمائی تھی، حضرت مولانا مدنی بھی تشریف لائے تھے۔ مدرسہ کے مہتمم اور جلسے کی منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کے کھانے کا انتظام میرے والد ماجدؒ نے اپنے یہاں کیا تھا۔ جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا اس لیے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعہ لانے کا انتظام کیا گیا تھا اور سب حضرات سواری ہی سے آئے لیکن حضرت مولانا مدنی نے یہ کیا کہ سنبھل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیاز مند کو بطور راہ نما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشریف لائے حالانکہ موسم گرم تھا اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا۔

سنبھل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں کے ایک صاحب نے جو بیچارے علمی، دینی دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے اور حضرت مولانا سے ان کا کوئی تعارف بھی نہیں تھا، حضرت مولانا مدنی سے درخواست کی کہ میرے گھر پر چل کر چائے پی لیجیے، مجھے یاد ہے کہ ان کی یہ بات سب کو کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، لیکن مولانا نے بغیر کسی عذر و معذرت کے قبول فرما لیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جا کر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔

ایک عجیب واقعہ اور سنیئے ——— حضرت کے ایک شاگرد نے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت ریل سے سفر فرما رہے تھے اور یہ صاحب خادم کی حیثیت سے حضرت کے ساتھ تھے انھیں استنجا کا تقاضہ ہوا۔ بیت الخلا کا دروازہ کھولا تو اس کو بہت غلیظ اور گندہ دیکھ کر واپس آ گئے اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلاء میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا، چند منٹ کے بعد تشریف لائے اور اپنے ان خادم سے کہا

کہ اب چلے جاؤ انھوں نے جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت ان کی واپسی کی وجہ محسوس کرکے بیت الخلا صاف کرنے ہی کے لیے اندر تشریف لے گئے تھے اور جب لوٹے بھر بھر کے بہت سا پانی بہا دیا اور اس کو صاف کر دیا تو باہر تشریف لائے ——— کچھ حد ہے اس تواضع اور بے نفسی کی ؟

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعف پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر حضرت کے چند نیازمندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کرکے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اب صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں، اور حضرت قبول فرمالیتے ہیں (اور اسی طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضروری ہوتا ہے) یہ سلسلہ اب بند فرمادیا جائے، حضرت نے فرمایا میں کیا کروں لوگ آجاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرمالیں کہ اس سلسلہ کو بند کرنا ہے تو تھوڑے عرصہ تک تو ایسا ہوگا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرمادینے پر مایوس واپس چلے جائیں گے۔ اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرمالیا ہے تو پھر اس غرض سے لوگ آنا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جما رہوں، عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے اس کو صرف ضرورت اور موقعہ ہی پر صرف ہونا چاہیے، حضرت نے خاکساری اور تواضع میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے یہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام لے لینا چاہیے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجہ کی تھی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا کہنا سننا، کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یا ناراضگی کسی کی تحسین یا ملامت، حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کو اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا ——— اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلہ کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاست کے بارہ میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر انھوں نے اپنا لیا تھا، جو لوگ دس بارہ سال پہلے کے واقعات بھولے نہیں ہیں انھیں یاد ہو گا کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت و آبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی حضرت مولانا کو اس زمانہ میں اتنا ہی زیادہ مضبوط غیر متزلزل اور پر جوش پایا گیا۔

اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علماء اور غیر علماء میں اور بھی بہت سے تھے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملہ میں بالکل زالی تھی وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے راستے کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلہ کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے۔ یہ میں نے ایک ایسے مسئلہ کی مثال دی ہے جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب پورے اسلامی ہند نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویہ کو اپنے لیے صحیح سمجھ لیا پھر ان کے خاص معتمد اور نیازمند بھی ان کا رویہ بدلوانے اور رُخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے، الّا یہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیلی ہو جائے —— یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ اسی ناکامی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثار و فیاضی اور مہمان نوازی

ناظرین نے ایثار و فیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے —— بیسوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر میرا محتاط اندازہ ہے کہ برسہا برس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا، ان میں ایک

خاصی تعداد تو ان اہل طلب کی ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونے کے لیے دور قریب کے مختلف مقامات سے روزانہ آتے تھے ان کے علاوہ ایک تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف زیارت و ملاقات کے لیے یا کسی معاملہ میں دُعا کی درخواست کے لیے یا اپنی کسی ضرورت میں حضرت مولانا کی سفارش حاصل کرنے کے لیے یا ایسے ہی کسی اور کام سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے، ان کے علاوہ کچھ حضرات وہ بھی ہوتے تھے، جو ذکر و شغل اور روحانی تربیت کے لیے، کئی کئی مہینے حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ مہمانوں کی ان قسموں کے علاوہ کچھ لوگ حضرت مولانا کی اس فیاضی اور مہماں نوازی سے بے جا فائدہ اُٹھانے والے بھی ہوتے تھے، میں نے واقفین سے سنا ہے کہ قرب و جوار کے دیہات کے بعض لوگ جو بازار، تھانے یا تحصیل کے اپنے کاموں سے دیوبند آتے تھے وہ بھی کھانے کے وقت حضرت کے مہمان بن جاتے تھے اور حضرت ان کی اس نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی مہماں نوازی کرتے تھے بلکہ خادموں تک کو سخت تاکید تھی کہ اگر کسی کے متعلق ایسا اندازہ ہو تب بھی مہمانوں ہی کی طرح اس کا اکرام کیا جائے ——— مجھے حضرت کے ایک خادم نے خود بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے ایسے ایک صاحب سے کچھ کہہ دیا تو حضرت ان پر سخت غصہ ہوئے اور یہاں تک فرمایا کہ میرے یہاں آنے والے کسی بھی مہمان کا جو شخص دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا

بہرحال مختلف انواع و اقسام کے ان مہمانوں کی تعداد کا اوسط جیسا کہ اس ناچیز نے عرض کیا چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ تھا اگر کبھی صرف تیس پینتیس ہوتے تھے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہو جاتے تھے۔

حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا مثلاً پلاؤ، بکت یا تریدتیار کیا جاتا، یا دیوبند کی مشہور فیرنی آتی تو بلا امتیاز سارے مہمان اس دن وہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

یہاں اس چیز کا ذکر کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت کے یہاں کا روزمرہ کا سادہ کھانا بھی (یعنی روٹی اور آلو یا لوکی جیسی کسی ترکاری کے ساتھ بڑے گوشت کا شوربہ والا سالن)، اس قدر لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا تھا کہ میں خود بھی شہادت دے سکتا ہوں اور بہت سے مہمانوں سے بھی میں نے سنا ہے کہ حضرت کے دسترخوان پر بیٹھ کر سوایا یا ڈیوڑھا کھانا کھایا جاتا ہے اور کبھی نقصان نہیں دیتا —— جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنھوں نے حضرت کی عجیب وغریب اور بے مثال مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے ان کو اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ روزمرہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری نکمی مدوں میں حضرت کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا، خود اپنی ذات پر اور اہل وعیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال واعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شح اور حب مال سے حضرت کے قلب وروح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور انشاءاللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ —— (تغابن)

اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شح اور حب مال کی بری خصلت سے بچا یا وہ یقیناً فلاح پانے والے ہیں۔

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سن لیجیے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی ایثار و فیاضی اور دوسروں کی راحت رسانی کا فکر واہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔

غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی بات ہے، سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگٹھن کی تحریک کے مقابلے میں "جمعیۃ العلماء ہند کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اترا ہوا تھا۔ اُس وقت اس کے سامنے تبلیغی وفود کے ذریعہ وقتی دفاعی کوششوں کے علاوہ اُن علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے، مذہبی مکاتب قائم کرنے کا ایک ٹھوس مستقل اور وسیع کام بھی تھا، جس کے لیے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی —— جمعیۃ العلماء ہند اور اکابر دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگون کے صاحب خیر تاجروں نے اس سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ

تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی، اس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا ـــــ یہ وفد رنگون پہونچا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے ـــــ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دار العلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی سنگٹھن کے مقابلہ میں دار العلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقل کام ہو رہا تھا)

بہرحال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے ـــــ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے، ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں ان میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اس لیے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے لیکن اس نے کہا، ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اس نے اجازت دی۔ ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کر دی، حضرت نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا، لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہٰذا آپ حضرات کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں، اور واپس چلا جاؤں لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، آخر میں انھوں نے عرض کی کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا ـــــ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بے چارے

مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی ان کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرما دیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس کے بعد کوئی تقریر نہیں کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا حضرت مولانا نے (انھیں کی خیر خواہی کے لیے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادلِ ناخواستہ ماننا ہی پڑا ـــــ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولانا نے خطبہ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی، کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا، اور یہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا، مجھے ان کے اس وعدے کا افسوس ہے لیکن بہر حال اب مجھے ان کے وعدے کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے ـــــ بیان کرنے والے کا بیان ہے ـــــ کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کر آتے تو میں یہ بتاتا اور یہ بتاتا ـــــ آخر میں فرمایا کہ چونکہ ہمارے محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لیے میں مجبور ہو گیا ہوں اور میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا ـــــ پھر چند کلمات وفد کے مقصد کے متعلق بھی کہکر تقریر ختم فرمائی۔

حضرت مولانا اپنی شرط کے مطابق غالباً دوسرے یا تیسرے ہی دن بحری جہاز سے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ حاجی داؤد ہاشم مرحوم نے (جو وفد کے خاص داعی اور میزبان تھے) اپنے خاص ملازم محمد ذاکر صاحب کو بطور خادم کے کلکتہ تک کے لیے حضرت کے ساتھ کر دیا۔ حضرت کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور ذاکر صاحب کا ٹکٹ سرونٹ کی حیثیت سے تھرڈ کا تھا۔ حضرت مولانا کی سیٹ جس کمرہ میں تھی اس میں کوئی دوسرا مسافر نہ تھا اس لیے حضرت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب بھی زیادہ سے زیادہ وقت وہیں حضرت کے ساتھ رہیں، لیکن جہاز کا "بولے" جب آتا تو ذاکر صاحب کے ہر وقت وہاں رہنے پر معترض ہوتا، اس لیے حضرت مولانا نے یہ کیا کہ

وہ خود زیادہ وقت تھرڈ کلاس میں ذاکر صاحب کے ساتھ گذارنے لگے۔ بہر حال سفر ختم ہوا اور چوتھے دن کلکتہ کا ساحل آگیا۔ رواج کے مطابق "بوائے" فرسٹ کلاس کے مسافروں سے "انعام" یا "بخشش" مانگنے آیا۔ اگرچہ راستے میں اس نے حضرت مولانا کو تکلیف دی تھی لیکن "انعام" مانگنے کے لیے وہ حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ذاکر صاحب بھی اس وقت ساتھ تھے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہم لوگوں کو بہت تکلیف دی ہے اسے ایک پیسہ نہ دیجیے لیکن مولانا نے ہنس کے فرمایا کہ نہیں ان کا حق ان کو ضرور دیا جائے گا ——— (آگے کی بات سننے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب کہ ایک روپیہ آج کے ۷، ۸ روپے کے برابر تھا اس لیے جو لوگ بڑے سے بڑا انعام بھی بوائے کو دیتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہوتا تھا) ——— اس کے بعد سنیے کہ مولانا نے گن کر چار روپے نکالے اور اس کو دینے لگے وہ سمجھا کہ یہ مجھ سے مذاق کرتے ہیں اور اس طرح میری بدسلوکی کا انتقام لینا چاہتے ہیں اس لیے اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا، حضرت مولانا نے فرمایا، لے لو یہ تمھارے ہی لیے ہیں، آخر بہت جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت نے وہ روپے اس کو دے دیے ——— راقم سطور عرض کرتا ہے کہ خود محمد ذاکر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کم بخت نے تو حضرت کو اتنی تکلیف دی کہ خدمت کے لیے مجھے حضرت کے ساتھ بھی نہ رہنے دیا اور حضرت نے اسے اکٹھے چار روپے دے دیے، بڑے سے بڑا انگریز بھی ان لوگوں کو ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا، بھائی ذاکر اصل بات یہ ہے کہ یہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ انعام بس صاحب بہادروں سے ملتا ہے، ہماری صورتوں سے اُسے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی اس لیے اس نے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، اب ہمارا سفر تو ختم ہو گیا، میں نے یہ روپے اسے اس لیے دیے ہیں کہ اُسے معلوم ہو کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زائد دے سکتے ہیں، اب مجھے اُمید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندے کو انشاء اللہ یہ آیندہ نہیں ستائے گا بلکہ ان کو آرام پہونچانے کی کوشش کرے گا۔

اسی ایک واقعہ سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاج ایمانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ———

عنداللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی

بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انھیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے ـــــ اس یاد کے لیے جس ایمانی مناسبت اور جس توفیق کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے ان میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہونے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہوگا، یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی ـــــ خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی اور رائے میں خاصا بعد ہوتا لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کے لیے ان کی جوتیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار جھاڑنا بھی سعادت ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور اُن کے ان ایمانی اوصاف کے صدقہ سے ہم کو محروم نہ رکھے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ

(شمارہ بابت ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں شائع ہوا)

محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ کے برادر معظم جناب ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلیؒ کی وفات کی خبر ناظرین الفرقان کو بھی مل چکی ہوگی۔ خدا غریق رحمت کرے، ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی ذات اور اپنے اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ وہ اُس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے سید احمد شہیدؒ جیسی ناقابل فراموش ہستی ملت کو بخشی، اور اپنے بزرگوں کے امتیازات و کمالات کے جامع بھی۔

اس فرشتہ صفت ہستی کو ۱۹۴۳ء سے لے کر عین اس لمحہ تک جب اس کی پاک روح نے اپنے مالک کی طلبی پر لبیک کہتے ہوئے پرواز کی مسلسل اور بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ الفرقان کا دفتر شروع میں تو ۱۰ سال تک گویا ڈاکٹر صاحب کے مطب اور دولت کدہ سے بالکل متصل ہی رہا۔ اس کے بعد جو کچھ فاصلہ بڑھا بھی تو وہ چند قدم سے زیادہ کا نہ تھا۔ رہائشی مکان بھی ۵-۶ سال تک ڈاکٹر صاحب کے زیر سایہ ہی ملا۔ اٹھنا بیٹھنا لکھنؤ کے قیام کے روز اول ہی سے ڈاکٹر صاحب کے متعلقین کے ساتھ رہا۔ اس طرح اپنی بدقسمتی سے گو حاصل کچھ نہیں کیا، لیکن خوش قسمتی سے دیکھا بہت کچھ اور جو کچھ دیکھا وہ کبھی بھولنے والا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی صورت ہی دیکھ کر آدمی کو اُنس اور عقیدت پیدا ہوتی تھی۔ یہ دراصل ان کے باطن کی نورانیت اور جاذبیت کا عکس تھا جو پوری آب و تاب کے ساتھ اُن کے چہرے پر نمایاں رہتا تھا۔ اہل تقویٰ آج بھی اس دنیا میں بہت سے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ لیکن

ڈاکٹر صاحب کو بہت تھوڑی ہی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد دل گواہی دیتا تھا کہ معاصی سے پرہیز کرنا تو الگ بات ہے، ان کے دل میں معصیت کا تصور بھی شاید نہیں آتا۔ وصال کے چند دن بعد ڈاکٹر صاحب کے رفیق خاص و دمساز حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی (اطال اللہ بقائہ) کی خدمت میں اس درخواست کے لیے حاضری ہوئی کہ آپ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو جتنا جانتے ہیں شاید ہی کوئی دوسرا اس درجہ کی واقفیت رکھتا ہو۔ لہٰذا جی چاہتا ہے کہ اگر صحت مساعد ہو تو مرحوم کے تذکرے میں کچھ ارقام فرمائیں، بہت سے بندگانِ خدا کو اس سے دینی فائدہ پہونچے گا۔ اس صحبت میں ڈاکٹر صاحب کی سیرت کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کا ذکر میں نے چھیڑا ہے مولانا موصوف نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تأثر نقل فرمایا کہ ایک مرتبہ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں میری ہی تحریک پر علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا علاج شروع ہوا۔ یہ پہلی ملاقات تھی جو کافی ممتد ہوئی۔ واپس ہو کر مجھ سے کہا کہ میاں میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ ایک ایسے آدمی کے دیکھنے کا موقع تم نے میرے لیے فراہم کیا جیسا نہ اب تک ان آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ امید ہے کہ دوسرا ہو دیکھنے میں آئے۔ میرا تو دل پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ اس شخص کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی نہیں گزرتا۔

یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو تھوڑی ہی سی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد پورے جزم و وثوق کے ساتھ یہ تأثر طاری ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی درجہ کی بھی معصیت کا مادہ ہی اس انسان کے اندر نہیں رکھا ہے۔ کوئی تارک الدنیا قسم کے انسان نہیں تھے، مطب کرتے تھے زمین اور باغات کے علائق رکھتے تھے۔ ایک وسیع کنبے کے ذمہ دار تھے۔ ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داریاں تھیں، غرض ہر طرح کے بشری علائق تھے۔ مگر قول و عمل میں وہ پاکیزگی، وہ طہارت وہ معصومیت کہ فرشتے بلائیں لیں۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسی طرح کا ایک امتیازی وصف جسے مذکورۂ بالا بنیادی وصف کا شاخسانہ کہنا بجا ہوگا ان کی للّٰہیت اور استحضارِ عبدیت تھا۔ ان کے اس باطنی کمال کے یقین سے دل معمور تو تھا ہی مگر مرحوم کا وہ خط دیکھ کر جو عین جوانی کی عمر میں انھوں نے اپنے والد ماجد

حضرت مولانا حکیم عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا تھا، یہ یقین حق الیقین سے بدل گیا۔ اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے اس للّٰہیت اور استحضار عبدیت کا کہ الہ آباد یونی ورسٹی سے بی ایس سی کر کے نکلے ہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے نقشے کے خطوط تیار کرتے ہوئے والد ماجد کو لکھتے ہیں۔

صرفِ عصیاں ہوا وہ حصۂ عمر

جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

جس کی جوانی میں للّٰہیت اور عبدیت کا یہ رنگ ہو، کیا پوچھنا ہے اس کی پختہ سنی اور بڑھاپے کے رنگ کا۔ بس للّٰہیت و عبدیت کی ایک موہنی تصویر تھی جو نہ جانے کب تک آنکھوں میں پھرتی رہے گی۔

اتباع سنت میں بھی اپنے بزرگوں کا پورا پورا ورثہ پایا تھا...... سنت اور سنت کے قائم کردہ حدود کی پابندی ہر چیز میں عزیز تھی۔ انگریزی تعلیم اور ڈاکٹری کے پیشے میں کامیابی کے باوجود وضع قطع، رہن سہن اور گھر کا چال چلن از اول تا آخر سنت کے حدود کا پابند۔ ہر طرف ایک دلآویز مسنون سادگی بیتکلفات سے دوری، سنت اور حدود سنت ہی نہیں، مذاقِ سنت کی بھی ایسی پاسداری تھی کہ انسانی کمزوری کے نہایت نازک مواقع پر بھی اس میں فرق نہیں آتا تھا۔ پانچ صاحب زادیوں پر اکلوتے صاحب زادے، سب سے چھوٹے اور فطری سعادت کی بنا پر صحیح معنیٰ میں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، لیکن لکھنؤ کے پر تکلف اور گراں بار رواجوں سے جکڑے ہوئے ماحول میں اس شان سے شادی کی تقریب ادا ہوئی کہ جیسے سادا ارمان یہی تھا کہ سنت کے مذاقِ سادگی کی پیروی کا ایک یہ موقع بھی میسر آئے۔ بڑا دل گردہ چاہیے ایسے فطری کمزوریوں کے مواقع پر بھی مذاقِ سنت کو عزیز رکھنے میں ا

لڑکیوں کے رشتے آج کی ایک عام کمزوری ہیں اچھے اچھے دیندار اور نائبان انبیاء لڑکیوں کے دنیاوی عیش و آرام کی خاطر ان کے رشتے میں دینداری کی تلاش کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں راقم نے اپنی محدود نظر سے ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ ہی کو دیکھا کہ دنیاوی تعلیم دنیاوی وجاہت، دینی عزت اور عالی نسبی کا جامع ہوتے ہوئے پانچوں صاحبزادیوں کے رشتوں

میں ایک نگاہِ غلط انداز بھی ان مواقع پر نہیں ڈالی جو ان معزز حیثیات کا جامع ہونے کی بدولت دنیاوی اعتبار سے اچھے رشتوں کے حصول میں انھیں حاصل ہو سکتے تھے۔ تمام صاحب زادیوں کے رشتے میں رسولِ اکرمؐ کے پسندیدہ دینی معیار کو شرطِ اول قرار دیا۔ اور اس کے ساتھ اگر اپنی جیسی حیثیت کا دنیوی معیار بھی جمع نہیں ہو سکا تو ادنیٰ پرواہ نہیں کی۔ ...... کتنی عظیم قربانی ہے آجکل کے ماحول میں، معیارِ سنت کی خاطر اپنے لختِ ہائے جگر کے دنیوی عیش و آرام کے امکانات کو قربان کر دینا! اور کس پائے کا اخلاص ہے اپنے دین اور عشقِ رسالت میں!

ان اوصاف کا لازمی تقاضا تھا کہ اس شخصیت میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے لیے دردمندی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی تڑپ بھی ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا سینہ ان جذبات کا بھی گنجینہ تھا۔ اسلامی دنیا میں کہیں کوئی ناگوار واقعہ ہوتا تو بالکل طبعی انداز کے رنج کی کیفیت طاری ہوتی۔ اور کوئی خوش کن خبر ملتی تو طبیعت سرور و نشاط سے لبریز ہو جاتی اور اس کے اثرات دیکھنے میں آتے۔ مرحوم کے جو بعض خطوط کا سلسلہ اسی شمارہ سے شروع کیا جا رہا ہے اس سے اچھا خاصہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سینے میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کی کیسی تڑپ اور اسلام کے لیے کیسا درد تھا[1]۔

بزرگوں کی اخلاقی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔ کسی میں خوش اخلاقی کا کوئی رنگ ہے کسی میں کوئی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خوش اخلاقی میں ایک عجیب باوقار جمال تھا، کشادہ جبینی اور خندہ روئی کے ساتھ، ملنے والوں کا استقبال فرماتے۔ عین سنت کے مطابق پورے رخ کے ساتھ التفات ہوتا۔ ڈاکٹری کا پیشہ ہونے کی بنا پر وقت بے وقت اُن سے ضرورت پڑتی رہتی، ہمیشہ ایک ہی انداز سے متوجہ ہوتے ہوئے پایا۔ مسجد میں نماز کے بعد کچھ عرض کرنا ہوا تب، مطب سے گھر تک یا مسجد سے گھر تک کے راستے ہی میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت پڑ گئی تب، اور گھر کی آرام گاہ میں اجازت لے کر جا پہونچے تب۔ کشادہ جبینی تھی کہ کسی وقت جدا نہیں ہوتی تھی، خاموش اور باوقار چہرے پر شفقت جیسے بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر حاضری قریب سے قریب تر کرتی اور دل میں محبت کا تعلق ابھارتی۔ بلاشائبہ تکلف اس خادم کو تو وہ بالکل اپنے خاندان کے

---

[1] ڈاکٹر صاحب مرحوم کے چند اہم مکتوبات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مرتب کیے ہوئے الفرقان کے متعدد شماروں میں شائع کیے گئے تھے

ایک بزرگ محسوس ہوتے۔ اُن کی خاموش مجلس میں جی لگتا اور بغیر کسی ضرورت ہی کے جاکر کچھ دیر بیٹھنے کو دل چاہتا۔

مرحوم اپنی ذات اور اپنے ظاہری و باطنی کمالات سے خود بھی ایک نہ بھولنے والی شخصیت ہیں۔ مگر ایک زندہ (اور ان شاء اللہ زندۂ جاوید) یادگار بھی ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں، اور وہ ہیں ہمارے محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (مد اللہ ظلہم) مولانا کے والد مرحوم اُن کو صرف نو سال کا چھوڑ کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئے تھے، اس دن سے ڈاکٹر صاحب کے روز وفات تک وہ اپنی والدۂ محترمہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی کے سایۂ عاطفت میں رہے اور انھیں کے دامن شفقت میں تعلیم و تربیت کے سارے مراحل طے کیے۔ مولانا محترم کی آج کی پوری شخصیت انھیں کی تربیت و شفقت کا فیض ہے اور فیض بھی کیسا جاری فیض! اللہ تعالیٰ اس فیض کو مدتوں جاری رکھے اور ڈاکٹر صاحب کے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔

کیسا قابلِ رشک اور قابل تقلید ہے وہ بندہ جو عمر بھر اپنے دونوں ہاتھوں سے بھی آخرت کمائے، اور اپنے بعد بھی اس کی ایک عظیم ذریعہ چھوڑ جائے۔ خدا اس کی بال بال مغفرت فرمائے، انبیاء و صالحین کا قرب عطا فرمائے اور پسماندگان کے دلوں پر اپنے فضلِ خاص سے سکینت برسائے۔

این دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد منظور نعمانی

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

(ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

کئی مہینے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق اخبارات میں ایسی خبریں آ رہی تھیں جو ان کی صحت کی طرف سے بہت ہی مایوس کرنے والی تھیں اور انھیں پڑھ کر دل میں یہی خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید احکم الحاکمین کی مشیت اور اس کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس مرض ہی میں دنیا سے اٹھا لئے جائیں ـــــ یہی ہوا اور پچھلے ہفتہ ۲۲ر اگست کے اخبارات میں ان کی وفات کی خبر آگئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ

دل اس خبر سے بہت متاثر ہوا۔ اور حافظہ نے بھولی بسری باتوں کی ایک ضخیم کتاب دل کی آنکھوں کے سامنے کھول دی۔ ان کی خبر وفات سن کر میں اپنے گھر کے بچوں کے سامنے جن میں سے اکثر نے تو ان کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، ہاں میری ہی زبان سے نام بار بار سنا تھا۔ اُن کا تذکرہ کرنے لگا، اسی سلسلۂ گفتگو میں ان کی زندگی کے بعض ایسے اہم اور قابل ذکر واقعات بھی ذکر میں آگئے جو شاید کہیں لکھ کر محفوظ نہ کئے گئے ہوں، جی چاہا کہ ان کو قلمبند کرا کے محفوظ کر دیا جائے۔

آج وہ ہماری اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور ان کو ہمارے کسی خراج عقیدت اور کسی تحسینی تذکرے کا انتظار بھی نہیں ہے ـــــ جو چیز اُس دوسرے عالم میں ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہے، اور جس کا پہنچنا بھی انشاء اللہ یقینی ہے، وہ اچھی ساعتوں میں ان کے لئے رحمت و مغفرت کی پُرخلوص دعائیں اور اعمالِ خیر کے ثواب کا ہدیہ ہے۔ اور یہی ان کی محبت کا اُن کے محبین پر خاص حق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حق کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

اسی کے ساتھ یقین ہے کہ ان کی بعض ایمانی خصوصیات اور ان کی زندگی کے بعض واقعات

یہ تذکرہ انشاء اللہ بندوں کے لئے ضرور نافع ہوگا، اسی اُمید پر یہ سطریں ایک عزیز سے بطور املا لکھا رہا ہوں۔

جہاں تک اب یاد آتا ہے اخبارات میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام سب سے پہلے اس ناچیز نے اس وقت پڑھا جب لاہور کے ایک دریدہ دہن آریہ سماجی نے اللہ کے آخری رسول سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک نہایت گندی اور رسوائے عالم کتاب لکھ کر شائع کی، اُس کتاب کا نام بھی اتنا خبیث اور دل آزار تھا کہ کوئی شریف آدمی خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، دلی تکلیف کے بغیر وہ نام نہیں لے سکتا —— ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا شدھی سنگھٹن کی فتنہ انگیز تحریک نے پہلے ہی سے کافی خراب کر دی تھی، اس کتاب کی اشاعت نے آگ پر تیل کا کام کیا —— اور مسلمانوں میں سخت ہیجان بلکہ طوفان برپا ہوگیا اس سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی، اُس کا اثر یہ ہوا تھا کہ پردہ نشین خواتین نے اپنے بچے اُن کے قدموں میں ڈال دیئے تھے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر قربان کر دو۔ سید عطاء اللہ شاہ اس تقریر پر گرفتار کر لئے گئے، ان پر مقدمہ چلا اور بالآخر ان کو غالباً دو سال کی قید سخت ہوئی —— بہرحال جہاں تک اب یاد ہے میرے دل میں اُن کی غائبانہ محبت کا بیج اسی زمانہ میں، اخبارات میں ان کا تذکرہ دیکھ کر پڑا۔ پھر مختلف تحریکوں اور سرگرمیوں کے سلسلہ میں اخبارات میں اُن کا نام آتا رہا،

یہاں تک کہ ایک وقت اخبارات میں آیا کہ انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں (جس میں پنجاب کے علماء حق کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔) سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت قرار دیئے گئے، اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین اور سب سے بڑی دینی درسگاہ (دارالعلوم دیوبند) کے صدر و شیخ الحدیث، استاذنا و استاذ العلماء حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری (قدس سرہ) نے بھی بہ حیثیت امیر شریعت اُن کے ہاتھ پر بیعت کی —— اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر اپنی نظر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی عظمت و اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی اور دید و ملاقات کا دل میں بڑا اشتیاق پیدا ہوگیا —— ان کے نام کے ساتھ "بخاری" اور "شاہ" کے دو پُرعظمت ضمیمے لگے ہونے کی وجہ سے میرا تصور اس وقت ان کے بارہ

میں یہ تھا کہ اُن کی شکل و صورت بخاری علماء کی سی اور وضع و ہیئت مشائخ طریقت کی سی ہوگی۔ لیکن اتفاق کی بات عرصہ تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ میں ۱۹۳۰ء میں امروہہ (ضلع مراد آباد) میں مدرس تھا، حسن اتفاق کہ اس سال جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امروہہ ہی میں ہونا طے ہو گیا، اس زمانہ میں مجھے جمعیۃ العلماء اور اسکے کاموں سے خاصی دلچسپی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ چند ہی مہینے پہلے آل انڈیا کانگرس نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ۱۹۲۸ء والی اُس نہرو رپورٹ کو منسوخ قرار دے کر جس کی بناء پر ۱۹۲۹ء میں جمعیۃ علماء ہند بھی کانگرس سے الگ ہو گئی تھی آزادی کامل کی تجویز پاس کی تھی، اور پھر اسکے بعد گاندھی جی نے نمک سازی کی شکل میں انگریزی اقتدار کے خلاف سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کر دی تھی۔ بہر حال امروہہ میں جمعیۃ العلماء کا یہ اجلاس اِس زمانہ اور اس ماحول میں ہونے والا تھا۔

اِدھر ایک بات اسی درمیان میں یہ ہو چکی تھی، کہ مولانا محمد علی مرحوم اور جمعیۃ العلماء کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے مقابلہ میں ایک دوسری "جمعیۃ العلماء" بنالی گئی تھی۔ جس کے صدر خود مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ یہ کشمکش ناسنجیدگی میں کس حد تک جا چکی تھی، اس کا اندازہ بس اِسی سے کیا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند دہلی کا اجلاس امروہہ میں جن تاریخوں میں ہونا طے ہوا تھا۔ ٹھیک انہی تاریخوں میں امروہہ ہی میں اس دوسری جمعیۃ کا اجلاس بھی طے کیا گیا۔ اور ہوا! اور خود مولانا محمد علی مرحوم نے اس کی صدارت کی۔

الغرض جمعیۃ العلماء ہند کے امروہہ والے اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کانگرس کی طرف سے نہرو رپورٹ کی تنسیخ اور آزادی کامل کے رزولیوشن اور گاندھی جی کے سول نافرمانی کی جنگ چھیڑ دینے کے بعد جمعیۃ العلماء کے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آ گیا تھا کہ کانگرس اور اسکی جنگ آزادی کے بارے میں اب اس کا رویہ کیا رہے گا؟ کیوں کہ نہرو رپورٹ کی منسوخی کے بعد وہ بنیاد ختم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے جمعیۃ نے ۱۹۲۹ء میں کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اور اسی بنا پر مولانا حفظ الرحمن صاحب (جو اگرچہ اس وقت جمعیۃ کے اکابر میں یا ہائی کمانڈ نہیں تھے لیکن اپنے سیاسی ذہن اور جرأت و فعالیت کی وجہ سے اپنے اقران میں

سب سے زیادہ ممتاز تھے۔) کانگرس کے ساتھ اشتراک کے بارے میں ایک رزولیوشن بھی اجلاس کے لئے بھیج دیا تھا اور اخبارات میں اس کی اشاعت بھی ہو گئی تھی اور خود جمعیۃ کی صفوں میں اس وقت اس بارہ میں خاصا اختلاف رائے تھا ـــــ بہرحال امروہہ کے اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ اس میں وقت کا یہ اہم اور سخت اختلافی مسئلہ سامنے آنے والا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم والی جمعیۃ کے اجلاس نے قدرتی طور پر ایک مقابلہ اور کشمکش کی فضا بنا دی تھی ـــــ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اب سنیئے!!

جمعیۃ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دو دن پہلے ہی قریبی مقامات سے جمعیتی رضاکاروں کے جتھے انتظام کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ میرے وطن سنبھل کا ایک جتھا ایک دن پہلے پہنچنے والا تھا اس میں کے بعض آدمی علی الصبح پہنچ گئے، اور انھوں نے بتایا کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہمارا جتھا ایک جلوس کی شکل میں امروہہ میں داخل ہو، اس جلوس میں کچھ اونٹ ہوں، ان پر نقارے ہوں، اس لئے ہمارے واسطے اونٹوں اور نقاروں کا انتظام کر دیا جائے (دراصل سنبھل کے رضاکار اس طرح کے "حجازی۔ جلوس نکالا کرتے تھے۔) ہم لوگ جو امروہہ میں اس وقت اجلاس کے کاموں کے ذمہ دار تھے، ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا، قریباً ۸-۹ بجے صبح کا وقت تھا، مجلس استقبالیہ کے دفتر میں بیٹھے ہم اسی مسئلہ پر مشورہ کر رہے تھے کہ اونٹوں نقاروں والا یہ حجازی نما جلوس یہاں نکلنا مناسب ہے یا نہیں۔ میری اور اکثر کارکنوں کی رائے اس وقت کے حالات میں جلوس کے حق میں تھی لیکن ہم سب کے مخدوم اور ہر حیثیت سے بزرگ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ امروہہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے نہیں تھی۔ ان کو غالباً اسکے جواز میں بھی شبہ تھا۔ یا وہ اس کو ثقاہت اور سنجیدگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہ مشورہ چل ہی رہا تھا کہ اچانک دو حضرات دفتر میں داخل ہوئے ان میں ایک تو حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے جو میرے لیے جانے پہچانے ہی نہیں بلکہ میرے استاد تھے اور ان کے ساتھ جو دوسرے صاحب تھے ان کو ہم میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا، ان کی وضع یہ تھی کہ ہاتھ میں بہت موٹا سا ایک سونٹا، جسم پر کھدر کا چھوٹا سا قمیص نما نیم آستین کرتا، اور غالباً کھدر ہی کا رنگا ہوا نیلا تہبند، جسم بالکل پہلوانوں کا سا۔ میں سمجھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ

کوئی رضاکار ہیں، اتنے میں خود مفتی صاحب نے بتایا کہ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں، یہ سن کر سب کی، خاص کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ میرے تصور میں تو ان کی صورت اور وضع بخاری کے کسی مقدس شیخ خانقاہ کی سی تھی، مصافحہ اور ملاقات کے بعد بڑی بے تکلفی کے ساتھ شاہ صاحب نے ہم لوگوں سے فرمایا ''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے کہا ہم لوگ ایک چھوٹے سے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ سنبھل کے رضاکاروں کا جتھا آرہا ہے وہ اس طرح کا جلوس نکالنا چاہتا ہے، ہم میں سے کچھ کی رائے ہے کہ نکلنا چاہئے اور بعض حضرات اس کو ٹھیک نہیں سمجھتے۔ شاہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ اس وقت کے مفتی ہم ہیں، ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ ایسا جلوس نکلنا چاہیئے۔ منگواؤ اونٹ اور نقارے ایک اونٹ پر میں خود بھی بیٹھوں گا۔

اس عاجز کی سب سے پہلی ملاقات شاہ صاحب سے یہی تھی۔ اور ان کے انداز و مزاج کا یہ پہلا تجربہ تھا، جہاں تک یاد ہے یہ جمعہ کا دن تھا۔ جلوس کی تیاریاں فوراً شروع ہو گئیں۔ اور اسی شان سے جلوس نکلا، اور پورے بازار کا اس نے گشت کیا، مشورہ سے یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ آج بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں شاہ صاحب کی تقریر ہوگی۔ (واضح رہے کہ اجلاس بھی جامع مسجد ہی میں ہونے والا تھا، اسی میں پنڈال بنا تھا۔) جلوس ہی نے شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان کیا۔ اس زمانہ میں شاہ صاحب کی اخبارات میں بہت دھوم تھی اور ان کی زندگی کے بعض واقعات نے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ کو ان کا نادیدہ عاشق بنا دیا تھا۔ پھر امروہہ میں بلکہ ہمارے اس علاقہ ہی میں شاہ صاحب کی یہ پہلی آمد تھی۔ اور اس دن امروہہ میں کوئی دوسرا جلسہ بھی نہیں تھا۔ (کیوں کہ دونوں جمعیتوں کے باقاعدہ جلسے کل سے شروع ہونے والے تھے۔) اس لیے شاہ صاحب کی تقریر سننے کے لیے آج بہت سے وہ لوگ بھی آگئے، جن کی دلچسپی دوسری جانب تھی اور جمعیۃ علماء ہند کے سخت مخالف تھے۔

نماز جمعہ کے بعد تقریر شروع ہوئی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو اس ناچیز نے شاہ صاحب کی سنی، اس میں انشاء اللہ بالکل مبالغہ نہیں کہ پورا مجمع بالکل مسحور تھا۔ جمعیۃ العلماء کے

مخالفین کی طرف سے اُس وقت دو باتوں کا خاص طور سے پروپیگنڈا کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ یہ لوگ کانگرس سے اور ہندوؤں سے مل جانے والے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ یہ دیو بندی وہابی ہیں، نجدیوں کے حامی ہیں۔ دشمن رسُول ہیں (معاذ اللہ) اس دوسری بات کے اُچھالے جانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ دوسری جمعیۃ کے اجلاس کا داعی اتفاق سے امروہہ کا وہ عنصر تھا۔ جس کے نزدیک دیوبندی وہابیوں کی تکفیر کے سوا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ قابل توجہ نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے علم میں یہ صورتِ حال ہم لوگوں کے ذریعہ آچکی تھی، اس لئے ساری تقریر کا محور یہی دو مسئلے رہے۔ اس تقریر نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ اپنی پوری زندگی میں کسی تقریر کا ایسا اثر مجھے یاد نہیں، رسُول دشمنی والے ناپاک اتہام کے سلسلہ میں کچھ کہتے ہوئے جب شاہ صاحب نے مولانا جامیؒ کے دو شعر ایک موقع پر پڑھے تو دو آدمی تڑپ کر بیہوش ہو گئے۔ جن کو بہت دیر کے بعد ہوش آیا۔ —— یہ تقریر تقریباً ڈھائی گھنٹے تک ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ اسی پہلی تقریر نے سینوں کو انگریز دشمنی کے جذبہ سے بھر دیا اور امروہہ کی فضا کو جمعیۃ کے حق میں اور آزادی کی جنگ میں کانگرس کے ساتھ اشتراک کے حق میں ہموار کر دیا۔

یہ بات ذکر کرنے سے رہ گئی، کہ شاہ صاحب اجلاس سے ایک دن پہلے اچانک کیوں اور کیسے آئے؟ ہوا یہ کہ جب گاندھی جی نے سول نافرمانی شروع کر دی تو شاہ صاحب نے اس کی حمایت وتائید میں حسب عادت پرجوش تقریریں شروع کر دیں، اُن کو پتہ چلا کہ وہ بہت جلد گرفتار کر لئے جانے والے ہیں اور اندازہ یہ تھا کہ امروہہ کے اجلاس کو جاتے ہوئے راستہ ہی میں غالباً اُن کو گرفتار کیا جائے گا اس لئے وہ چکر کاٹ کے اور کچھ راستہ کار کے ذریعہ طے کر کے ایک دن پہلے ہی امروہہ پہنچ گئے کہ کسی طرح اجلاس میں شریک ہو سکیں اور کانگرس کے ساتھ اشتراک کا رزولیوشن پاس کرا سکیں۔ اگلے دن اجلاس باقاعدہ شروع ہوا، صدر استقبالیہ، حکیم سید ابو النظر رضوی (مرحوم) تھے ان کا خطبہ بڑا وقیع اور جاندار تھا لیکن اس میں مدلل طور پر کانگرس کے ساتھ اشتراک کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی، صدر اجلاس مولانا معین الدین صاحب اجمیری (رحمۃ اللہ علیہ) تھے اور

اُن کے خطبہ میں بھی اس مسئلہ میں یہی رہنمائی کی گئی تھی، ان دونوں خطبوں نے کانگرس کے ساتھ اشتراک کے مسئلہ کو ادبھی شکل بنا دیا تھا، لیکن آخر کار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تجویز کے حق میں ہی فیصلہ ہوگیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس فضا میں اس تجویز کے پاس کرالینے میں سب سے زیادہ حصّہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کا تھا۔ عام و خاص مجالس کی اس شخص کی تقریروں نے فضا پلٹ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کا بندہ تقریر نہیں کرتا سحر کرتا ہے۔

ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری کا ہر وقت خطرہ تھا، اِدھر یہ پالیسی طے تھی کہ جہاں تک اور جس طرح ہو سکے اس وقت وہ اپنے کو گرفتاری سے بچائیں اور جمعیۃ کا یہ تازہ پیغام ہندوستان بھر میں پہنچائیں اور مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ امروہہ میں اجلاس کے دوران ہی میں بعض مخصوص ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی گرفتاری کے احکام آگئے ہیں اور وہ اجلاس ختم ہونے کے بعد روانگی کے وقت گرفتار کر لئے جائیں گے۔

چونکہ طے شدہ پالیسی یہ تھی کہ وہ حتی الامکان گرفتاری سے اپنے کو بچائیں اس لئے چال چلی گئی کہ آخری رات کے آخری اجلاس کے لئے اُن کی تقریر کا خاص طور سے اور بار بار اعلان کیا گیا اور اس طرح عوام کو مشتاق بنانے کے ساتھ پولیس کو بھی شاہ صاحب کے بارہ میں مطمئن کر دیا گیا، اور ہوا یہ کہ شاہ صاحب ایک بڑے عجیب و غریب طریقہ پر دن ہی میں امروہہ سے نکل گئے اور امروہہ کا اسٹیشن چھوڑ کر ایک دوسرے قریبی اسٹیشن سے انھوں نے سفر کیا! اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ ان کی روانگی کا انتظام کرنے والے دو چار آدمیوں کے سوا اپنوں میں بھی کسی کو خبر نہیں ہوئی، رات کو مولانا احمد سعید صاحب (علیہ الرحمۃ) کی تقریر شروع ہوئی اس دن مولانا کی تقریر بھی بڑی غیر معمولی قسم کی ہوئی، اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا رہا کہ مجمع بڑی بے چینی کے ساتھ شاہ صاحب کی تقریر کا منتظر اور مشتاق ہے مولانا نے رات کے قریب دو بجا دیے اور ایک دم کلائی کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے فرمایا، او ہو! دو بجنے کے قریب ہیں! لو بھئی السلام علیکم، اب شاہ صاحب کی تقریر پھر کبھی سن لینا! یہ سن کر پولیس والے بھی

ہکّا بکّا رہ گئے۔

شاہ صاحب نے امروہہ سے نکل کر ایک طوفانی دورہ شروع کیا، جب تک گرفتار نہ ہو گئے، انھوں نے قریباً پورے شمالی ہند کا دورہ کر لیا، ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں جو ہزار ہا مسلمان جیل گئے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی بہت بڑی تعداد تنہا شاہ صاحب ہی کی پُرجوش اور آتشیں تقریروں کے حساب میں تھی۔

—— اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی کشش اور تاثیر دی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ غالباً اپنے اسی دورہ میں وہ بدایوں بھی گئے، مولانا عبد القدیر صاحب بدایونی مرحوم کے یہاں ہوئے، معلوم ہے کہ موصوف اپنے بدایونی مسلک میں کیسے پختہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (بریلوی حضرات کی اصطلاح کے مطابق) ٹھیٹ وہابی ہیں، اسکے علاوہ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا بدایونی مرحوم امروہہ کے اجلاس میں "کانگرس کی جنگ آزادی میں شرکت" والے رزولیوشن کے اہم مخالفین میں تھے —— لیکن اس اختلاف مسلک اور سیاسی اختلاف رائے کے باوجود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور اُن کے خلوص سے ان کا قلب اتنا متاثر تھا کہ کھانے کے لیے ہاتھ دھونے کے وقت خود ہلچی اور لوٹا ہاتھ میں لے کر شاہ صاحب کے ہاتھ دھلاتے تھے اور اپنے شدید اصرار سے شاہ صاحب کو اس معاملہ میں مجبور کر دیتے تھے —— اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی رحمتیں فرمائے۔

یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات درمیان میں آ گئی تھی ورنہ ذکر ان کے ۱۹۳۰ء کے دورہ کا ہو رہا تھا، انھوں نے پنجاب سے بنگال تک کا دورہ کیا اور بنگال جا کر گرفتار ہوئے اور سزا پا کر دمیں سکلی پور جیل میں رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ شاہ صاحب اور اسی طرح اُن کے خاص رفقا کو اپنی اس جدوجہد اور قربانی سے اسکی امید بالکل نہیں تھی کہ کانگرس اور اسکے لیڈروں کی طرف سے اس کا اعتراف بھی کیا جائے گا۔ یا وہ اس قربانی کے ذریعہ کانگرس میں کوئی پوزیشن حاصل کر سکیں گے، بلکہ اسکے برعکس انھیں سابق تجربوں کی بناء پر پورا یقین تھا کہ کوئی ایسا مسلمان

کانگریس میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کرسکتا جو اسلام اور مسلمانوں کا بھی پورا وفادار اور اس موضوع پر بھی لڑجانے والا ہو ـــــــ اور بالکل یہی چیز سامنے آئی ۱۹۳۰ء کی اس جنگ آزادی کے بعد جب دوسری گول میز کانفرنس سے پہلے گاندھی اِروِن پیکٹ ہوا، اور سارے سیاسی قیدی رہا کئے گئے، اور اس کے بعد کراچی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا تو پنجاب کانگریس نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ اور ان کے رفیقوں کو کانگریس کے نظام سے دُور رکھا یہاں تک کہ کراچی کے اجلاس میں یہ لوگ صرف مشاہد کی حیثیت سے شریک ہو سکے۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ اور اُن کے رفقاء کے سامنے اس جدوجہد اور قربانی کا محرک صرف یہ تھا کہ کانگریس انگریز کو ہندوستان سے بیدخل کرنے کے لیے ایک لڑائی لڑ رہی ہے۔ ہمیں صرف اس مقصد کی خاطر اس میں حصہ لینا چاہیے ـــــــ

کانگریس کے اس رویہ اور مزاج ہی کا تجربہ کرکے شاہ صاحب اور ان کے رفقاء نے اپنی ایک مستقل سیاسی تنظیم "مجلس احرار اسلام" قائم کرنے کی ضرورت سمجھی تھی لیکن اس کے باوجود ۱۹۴۷ء تک برابر ان کا رویہ و مسلک یہی رہا کہ وہ انگریزی اقتدار کے خلاف کانگریس کے ہر اقدام میں اس کے ساتھ بلکہ عمل اور قربانی میں آگے رہے اور اسی طرح لیگ ــ کانگریس آویزش میں بھی وہ اپنی رائے اور ضمیر کے فیصلہ کے مطابق لیگ کے خلاف صف آرا رہے اور آزادی سے پہلے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے دونوں جنرل الکشنوں میں بھی انھوں نے اپنی پوری طاقت کانگریس کے حق میں استعمال کی۔ اور اگر آزادی کا حصول کانگریس کی جدوجہد کا نتیجہ ہے تو بلاشبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کا اس میں بہت بڑا حصہ ہے لیکن ہندوستان کے لیے یہ بات کتنی شرمناک ہے اور تاریخ اس کو کس طرح معاف کرسکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو سید عطاء اللہ شاہ کو اپنے وطن امرتسر سے نکل کر اس پاکستان میں جانا پڑا جس کی اس نے آخری وقت تک (بلکہ کانگریس کے پاکستان قبول کرلینے کے بعد تک بھی) بھرپور مخالفت کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے لیے بھی یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اپنے رفیق خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم کی طرح پاکستان کی طرف ڈھکیلے جانے کے بعد پھر ہندوستان واپس آجاتے اور شاید ہم مسلمانان ہندوستان کے لیے اُن کا یہاں آجانا کچھ مفید ہی ہوتا لیکن غالباً

اُن کے مجروح جذبات نے اُن کو اس پر آمادہ نہیں ہونے دیا کہ ایسے طوطا چشموں کا وہ کوئی احسان لیں اور ان سے کوئی امید رکھیں ــــــ دوسری طرف پاکستان میں کئی حکومتیں بدلیں، لیکن سیاسی سرگرمیوں سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کے باوجود قریباً ہر حکومت ہی کے وہ معتوب رہے ــــــ کیسی بدقسمتی ہے اس ملک اور قوم کی جس کے پاس سید عطاء اللہ شاہ جیسی ایک طاقت موجود ہو اور وہ اس سے کوئی کام نہ لے اُس کو کوئی کام کرنے کا موقع بھی نہ دے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات نے ایک طویل تاریخ یاد دلا کر ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ایسے مسئلہ کی طرف ذہن کو بڑی شدت سے متوجہ کر دیا جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے کچھ نظر انداز سا ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ اس سے پہلے کم از کم مسلمانوں کے اُس مذہبی طبقہ کے نزدیک جو آزادی کی جنگ میں اور اس کے سلسلہ کی قربانیوں میں آگے آگے رہا، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل میں اس مسئلہ کو خاص اہمیت بلکہ اولیت حاصل تھی، اس سے میری مراد ہے، آزاد ہندوستان میں ہماری دینی و ملی خصوصیات اور ہمارے مخصوص شرعی قوانین (پرسنل لا) کے تحفظ کا مسئلہ ــــــ میرا خیال ہے کہ گزشتہ دور کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس کے خطبات میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا خطبہ نہ ہوگا جس میں اس مسئلہ کا تذکرہ مسلمانوں کے خاص الخاص اور سب سے اہم مسئلہ کی حیثیت سے نہ کیا گیا ہو، اسکے علاوہ مختلف موقعوں پر جمعیۃ نے جو فارمولے تجویز کئے اُن سب میں بھی اس مسئلہ کو مسلمانوں کی دینی و ملی زندگی کا اہم ترین مسئلہ قرار دے کر دفعات مرتب کی گئی تھیں ــــــ اور مولانا سید محمد سجاد (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) نے تو ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں "نظارت امور شرعیہ" کے عنوان سے ایک مکمل دستوری خاکہ بھی تیار کر کے شائع کیا تھا جس کے متعلق مرحوم کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان کی جمہوری حکومت کا جو نقشہ کانگرس کے سامنے ہے یہ خاکہ آسانی سے اس میں فٹ ہو سکے گا ــــــ بہر حال ۱۹۴۷ء سے پہلے تک اس سلسلہ میں یہ سب کچھ ہوتا رہا، ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور وہ وقت آیا جس کے لیے یہ ساری تجویزیں اور سارے فارمولے تھے تو ملک کے حالات اتنے خراب اور فضا اتنی تاریک تھی کہ ان سوالات کے اٹھانے کی واقعۃً کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ ۱۲ برس گزر جانے کے بعد فضا وہ نہیں رہی ہے اور جس طرح جان و مال عزت و آبرو اور دوسرے عام شہری حقوق میں مساوات کے سوالات ملک کے ذمہ داروں کے سامنے آچکے ہیں، اسی طرح

ضروری تھا ہے کہ یہ مسئلہ بھی اُس سنجیدگی کے ساتھ جو اس کا حق ہے سامنے آئے ــــــ اس کے بتانے کی ضرورت نہیں ہو کہ اس معاملہ میں اب جتنی تاخیر ہوگی وہ مسئلہ کے لئے اسی قدر مضر ہوگی۔

ہمارے دوسرے مسائل جن کا تعلق ہماری مادی اور دنیوی ضرورتوں سے ہے، بہت اہم ہونے کے باوجود بھی ہمارے خاص مسائل نہیں ہیں، وہ تو ملک کے دوسرے بھی بہت سے طبقوں کے مسائل ہیں، ہمارے خاص مسائل تو در اصل وہی ہیں جن کا تعلق ہماری اسلامیت سے ہے ــــــ کم از کم اس مذہبی حلقہ کا تو ہر واقف کار خوب ہی جانتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ سے لیکر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تک اس قافلہ کے تمام ہی مجاہدین نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے انہی مسائل کو نصب العین کے طور پر سامنے رکھ کر قربانیاں دی تھیں اور اسی بنیاد پر وہ اپنی جد و جہد اور اپنی قربانیوں کو اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور قربانی سمجھتے ہوئے اللہ تعالےٰ سے اجر کی توقع رکھتے تھے۔

یاد آتا ہے کہ اب سے ۴۱-۴۲ سال پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی یا علی گڑھ کے اپنے خطبہ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد مقامات مقدسہ اور ممالک اسلامیہ پر صلیبی طاقتوں کے تسلط کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس صورت حال سے آج ابو عبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن الولید کی روحیں بے چین ہیں ــــــ ان سطور کا لکھنے والا جو ایک سخت گنہگار قسم کا آدمی ہونے کے علاوہ بے عمل اور نکما بھی ہے ایسی کوئی بات کہنے کا ہرگز اہل نہیں ہے لیکن اس کا اپنا یہ احساس رہا ہے کہ اس مسئلہ میں ہماری کوتاہی اور ہمارا تغافل ہمارے ان بزرگوں کی روحوں کے لئے یقیناً اذیت اور بےچینی کا باعث ہوگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا یہ باتیں یہاں ایک خاص تاثر کے تحت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ذکر کے سلسلہ میں بے اختیار زبان پر آگئیں، ان کا مقصد ہرگز کسی پر تنقید نہیں ہے، یہ عاجز اس قسم کے تمام امور میں سب سے زیادہ قصوروار اور مسئول اپنے ہی کو سمجھتا ہے۔

یہ سلسلہ بالکل غیر ارادی طور پر بہت طویل ہوگیا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو کا اس میں ذکر آیا اور وہ بھی بہت نا تمام، اب اسی پر ختم کیا جاتا ہے اُن کے لکھنے والے دوستوں نے بہت کچھ لکھا ہوگا اور لکھیں گے۔ آخر میں ناظرین سے رسمی طور پر نہیں بلکہ دل کی گہرائی سے یہ درخواست ہو کہ اس عاجز کے تعلق سے بھی شاہ صاحب کے لئے اہتمام سے مغفرت و رحمت کی دعا فرمائیں اور ساری باتیں تو یہیں رہ جائیں گی لیکن آپکا یہ تحفہ ان شاء اللہ موصوف تک پہنچ کر ان کی راحت اور مسرت کا باعث ہوگا ــــــ داعی کمر علی اللہ!

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی مجددیؒ

میری واقفیت اور تأثرات

(ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اکثر ناظرین کو اخبار اور دوسرے ذرائع سے اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہو چکی ہوگی کہ ۱۷ ذیقعدہ دوشنبہ کے دن مغرب سے کچھ پہلے اہلسنت کے جلیل القدر ربانی عالم اور نقشبندی مجددی سلسلہ کے صاحب مقام اور صاحب ارشاد شیخ، حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی نے ہماری اس دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لہ ولا تفتنا بعدہ۔ ذیل میں حضرت مولانا مرحوم کے متعلق اپنی کچھ ذاتی معلومات اور تاثرات حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ کیا ہے، امید ہے کہ خود راقم سطور کے لیے اور سعید و صالح فطرت رکھنے والے ناظرین کے لیے یہ تذکرہ انشاءاللہ نفع مند ہوگا۔

اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم اور ہفتہ وار "النجم" لکھنؤ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حضرت مولانا کا تذکرہ تو میں اپنے بچپن سے سنتا تھا، لیکن زیارت کا اتفاق سب سے پہلے اب سے قریباً ۳۸ - ۳۹ سال قبل (غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء) جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں ہوا تھا، چوں کہ مولانا کی شہرت ایک مقرر و مناظر اور ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی، اس لیے دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ روشن خیال اور فیشن ایبل قسم کے مولانا ہوں گے مثلاً شیروانی وغیرہ پہنتے ہوں گے، شوقیہ چشمہ

لگاتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ، لیکن مراد آباد کی ایک سڑک پر راستہ چلتے ہوئے کسی واقف نے جب مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب جو پیدل چلے جا رہے ہیں یہی النجم کے ایڈیٹر مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ہیں، تو اپنے تصور کے بالکل خلاف مولانا کی ہیئت اور وضع قطع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، بالکل پرانے قسم کے سیدھے سادے علماء کی وضع تھی اسر پر وہی پرانے علماء کا سا عمامہ، جسم پر عبا، ہاتھ میں لاٹھی نما عصا ——— جمعیۃ کے اجلاس عام میں مولانا کی بھی تقریر کا وقت رکھا گیا تھا، آپ نے بجائے اس کے کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے مناسب کوئی سیاسی یا نیم سیاسی یا کم از کم متکلمانہ و فلسفیانہ قسم کی کوئی علمی تقریر فرماتے، بس وعظ فرمایا، جس کا بڑا حصہ نماز سے متعلق تھا، قدرتی طور پر بہت سوں کو تعجب ہوا کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر ایسے وعظ کا کیا موقع تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عرصہ سے مولانا کا یہ التزام ہے کہ وہ ہر تقریر میں نماز کی خاص طور سے تلقین و تاکید فرماتے ہیں اور گویا یہ اُن پر طاری ہے۔

——— پھر اسی سال کچھ عرصہ کے بعد ایک ضرورت سے امروہہ میرا جانا ہوا، میں ان دنوں منطق و فلسفہ اور اصول فقہ و علم کلام کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مولانا آج کل مدرسہ اسلامیہ جلّہ (امروہہ) میں صدر مدرس ہیں، میں مولانا کی زیارت کے ارادہ سے، نیز اس نیت سے کہ موقع ملے گا تو کسی سبق میں بھی شریک ہو کر استفادہ کروں گا۔ مدرسہ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے طب کی مشہور کتاب نفیسی کا آپ کے یہاں درس ہو رہا تھا، میں بیٹھا تو پورے سبق میں سنا رہا لیکن وہ میری دلچسپی کی چیز نہیں تھی، البتہ یہ بات اسی دن معلوم ہوئی کہ مولانا فن طب کے بھی فاضل ہیں۔ بعد میں جب حالات سے زیادہ واقف ہونے کا موقع ملا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شروع میں کچھ عرصہ مطب بھی کیا تھا لیکن بعد میں اس سے بالکل کنارہ کش ہو کر ان خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے جو اللہ کو آپ سے لینے تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اتفاق سے تین سال میں اسی مدرسہ اسلامیہ میں مدرس رہا جس سے مولانا کا تعلق رہا تھا، اس مدرسہ کے اکثر کار پرداز اور ارباب انتظام چونکہ حضرت مولانا سے عقیدت وارادت کا خاص تعلق رکھتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے

مولانا نے اپنے سنجھلے صاحبزادے مولوی عبدالمومن صاحب فاروقی کو تعلیم کے لیے وہاں بھیج دیا تھا، اس لئے سال میں دو چار مرتبہ ضرور، مولانا کی تشریف آوری امروہہ میں ہوتی تھی، اور میری طبیعت کو چونکہ مولانا سے خاص مناسبت تھی اور مذاہب باطلہ اور فرقہ ہائے ضالہ کی تردید سے اس زمانہ میں راقم سطور کو بھی گہری دلچسپی تھی اور مولانا بھی انھیں وجوہ سے ناچیز پر خاص الخاص عنایت و شفقت فرماتے تھے، اس لئے ہر ملاقات میں ربط و تعلق بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا۔ــــــ کچھ عرصہ کے بعد (غالباً ۱۳۵۰ھ میں) حضرت مولانا کے ساتھ رنگون اور برما کے بعض دوسرے مقامات کا ایک طویل سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ سفر اہل رنگون کی دعوت پر وہاں ایک مذہبی فتنہ کے سر اٹھانے کی وجہ سے کرنا پڑا تھا، اس سفر میں قریباً ایک مہینہ شب و روز مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اور ممدوح کو اب تک جو کچھ جانا اور سمجھا تھا، اس سفر میں اس سے بہت زیادہ جانا اور سمجھا، پھر برما کے اس سفر کے غالباً ایک ہی سال بعد مولانا نے دار المبلغین قائم فرمایا اور اس میں کام کرنے کے لئے اس عاجز کو بھی بلایا، اس موقع پر بھی چند مہینے ایک نیاز مند رفیق کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق ہوا ــــــ اس کے بعد بھی بار بار سفر و حضر میں مولانا کے قریب بلکہ ساتھ رہنے کا اس قدر اتفاق ہوا کہ دور طالب علمی کے بعد اپنے مخصوص اساتذہ کے ساتھ بھی اتنا رہنے کا اتفاق غالباً نہ ہوا ہوگا۔

قریباً ۳۵ سال کے اس تعلق میں مولانا کی زندگی کے جن علمی، عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے میں واقف اور متاثر ہوا، کسی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر ان میں سے چند آج کی صحبت میں حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کے بارے میں اپنی معلومات اور تاثرات کو میں دو حصوں میں تقسیم کرسکتا ہوں، ایک وہ جن کا تعلق علم و تحقیق، اور تصنیف و مناظرہ کی لائن کے امتیازات سے ہے، اور دوسرے وہ جن کا تعلق عبادت گزاری اور پرہیزگاری جیسی درویشانہ صفات سے ہے۔

علمی رسوخ ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہلسنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لئے یہ واقعہ ہے

کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ ممدوح صرف مناظر و مصنف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے، نامور اصحاب درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا، اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں[1]۔ سلامتی فہم کے ساتھ ذہانت و ذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ان سب چیزوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا ــــ علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے علم قرآن سے خاص شغف تھا، آپ کا سلسلہ تفسیر آیات آپ کے تدبر فی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

[1] جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں انھیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات و احادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں کی کتب حدیث و اسماء الرجال اور بعد کے اُن کے مصنفین کی کتابوں کی بھی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاہنامہ اور حملۂ حیدری کے صفحے کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ مولانا کی اس آخری بیماری ہی کا واقعہ ہے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ فردوسی نے شاہنامہ میں اپنے آتش پرست نسلی اکابر کا تذکرہ جس فخریہ انداز میں کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں صحابہ کرامؓ کو جس طرح اس نے حقیر و بے حیثیت دکھانے کی کوشش کی ہے اس کے خلاف ایرانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی آواز اُس وقت اٹھی تھی یا نہیں؟ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی آواز اٹھی ہوگی تو مولانا کو اس کا ضرور علم ہوگا، میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، بیماری اور اس کے پیدا کردہ ضعف تھا ہی، اس کے علاوہ برسوں پہلے سے مولانا کے لیے بڑھاپے کا وہ وقت آچکا تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "لکیلا یعلم بعد علم شیئاً"[2] ــــ ضعف کی وجہ سے مولانا کیلئے اس وقت بات کرنا بھی مشکل تھا، اس کے باوجود میں نے یہ بات دریافت کی، فرمایا کہ صحیح العقیدہ ایرانی مسلمانوں کی طرف سے شاہنامہ کے خلاف بڑے زور کے ساتھ آواز اٹھی تھی، "صولت فاروقی" ایک مستقل کتاب لکھی گئی، یہ منظوم ہے اور گویا شاہنامہ کا جواب ہے، چھپ بھی چکی ہے، میں نے اس کا مطبوعہ نسخہ ہی کبھی دیکھا تھا، پہلے تو اس کا خاصا حصہ یاد تھا، اب کچھ یاد نہیں رہا، پھر فرمایا ہاں ایک شعر یاد آگیا اور شاید وہی آپکے مقصد کے لیے کافی ہوگا، وہ شعر یہ ہے فردوسی کے بارہ میں مصنف لکھتا ہے۔ ؎

دلش گبر و جاں گبر و گبری زباں زگبراں بگبری زباں قصہ خواں

بہرحال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ انسان جب زیادہ بڑھا ہو جاتا ہے تو حاصر علم بھی غائب ہو جاتا ہے۔

تحریر و تقریر کا امتیاز تحریر و تقریر بہت سادہ، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری، حشو و زوائد سے پاک اور عبارت آرائی سے خالی مگر نہایت دلنشین ہوتی تھی، میں نے کسی صاحب قلم عالم کو نہیں دیکھا جس کی تحریر و تقریر میں اتنی یکسانی اور مطابقت ہو، اگر کوئی شخص مولانا کی تقریر لفظ بلفظ لکھتا تو اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کے لیے کسی لفظی ترمیم کی بھی غالباً ضرورت نہ ہوتی، تقریر میں اثر اور زور پیدا کرنے کے لیے مولانا اس مبالغہ کے بھی روادار اور عادی نہیں تھے، جس کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح کمزور روایتیں (اگرچہ وہ علمی حلقوں میں بھی کتنی ہی مشہور ہو گئی ہوں) مولانا ان کے ذکر سے احتیاط فرماتے تھے۔ ہماری اسی صدی کے بہت بڑے حقانی عالم حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب محدث امروہیؒ (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا) میں نے ایک مجلس میں اُن سے خود سُنا حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں ان کی اس بات کا بہت ہی معتقد ہوں اور اس کو ان کی کرامت سمجھتا ہوں کہ وعظ میں بھی کوئی بات غیر تحقیقی بیان نہیں فرماتے۔

مناظرہ کا امتیاز قوت استدلال اور متانت و سنجیدگی آپ کے مناظرہ کا خاص امتیاز تھا، آپ کے متعدد مناظرے چھپے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے کبھی آپ کا مناظرہ سنا ہے، وہ ان کتابی مناظروں کے مطالعہ کے وقت بالکل ایسا محسوس کریں گے کہ حضرت مولانا بول رہے ہیں۔ محقق مناظر کبھی غلط مبحث نہیں کرتا بلکہ اپنی پوری قوت اس پر صرف کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ روشنی میں آجائے، مولانا کا یا لکل یہی طرز تھا، اسی لیے وہ فریق مخالف کی غلط مبحث کی کوششوں کو بھی چلنے نہیں دیتے تھے، اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود غلط مبحث میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، بحث کے مرکزی نقطہ کو مولانا ہر تقریر میں ضرور دہرا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام سامعین کو بھی وہ خاص بات حفظ ہو جاتی تھی، فن کے لحاظ سے یہ مناظر کا کمال ہے اور احقاق حق کے مقصد کے لئے بھی یہ ضروری اور ناگزیر ہے۔

خاص موضوع اگرچہ حسب ضرورت مولانا نے مناظرے عیسائیوں سے بھی کئے، آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے بھی، اور ان کے علاوہ دوسرے فرقہائے ضالہ سے بھی، لیکن مولانا کا خاص موضوع شیعی حملوں سے صحابۂ کرام اور مسلک اہل سنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب تشیع کی

ضلالتوں کو واضح کرکے حجت حق قائم کرنا تھا، اور یہ وہ موضوع ہے جو ہندستان کے خاص تاریخی حالات کی وجہ سے اس ملک کے اکابر علماء و مصلحین کی علمی اور دینی کوششوں کا صدیوں سے خاص موضوع رہا ہے۔ ـــــ اب سے قریباً ساڑھے تین سو سال پہلے گیارہویں صدی ہجری میں تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد امام ربانی شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد بارھویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے معاصر بیہقیؒ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد استاذ الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے تلامذہ، اور اُن کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، الغرض اپنے اپنے زمانہ میں ان سب ہی حضرات کی دینی اور اصلاحی کوششوں کا خاص موضوع اور ہدف (اُن خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) یہی مسئلہ رہا ہے ـــــ جس شخص نے اس موضوع سے متعلق ان اکابر کی کتابیں دیکھی ہیں اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے، اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا نے اس موضوع کو اپنے ان پیشرو اکابر سے کئی گنا زیادہ نکھارا، اور ایک سعادتمند پیرو کار کی طرح ان کے کام کی تکمیل کرکے ان کی روحوں کو شاد اور مطمئن کیا ـــــ اس ناچیز کا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا کی تحقیق و تنقیح نے اس دائرے کے کئی بنیادی مسئلوں کو جو علمی اور نظری تھے اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے ایسا بدیہی بنا دیا کہ عامیوں کے لئے بھی ان کا سمجھنا آسان ہو گیا۔

ردشیعہ کے مشغلہ میں مولانا کی نیت اور اس موضوع سے ان کے غیر معمولی شغف کا اصل باعث مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے ناموس کی حفاظت اور ان کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈے کی تردید بجائے خود بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے لیکن میں جو اس کام کو درجۂ اول کی اہمیت دیتا ہوں اور اس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدی سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابۂ کرامؓ ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگر اس سلسلہ کی پہلی کڑی اور دین کے ناقلوں کی پہلی صف ہی

ناقابلِ اعتبار ہو گئی تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا۔ اور ہمارے پاس اُن کے بارہ میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی۔ بہر حال میں صحابۂ کرامؓ کی یہ حمایت اور مدافعت اور ان کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نیت ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ اُمید اپنے اسی عمل سے ہے۔

غیر معمولی اعتدال مناظرہ کے میدان میں رہنے کے بعد راہ اعتدال پر قائم رہنا بڑی مشکل بات ہے، اللہ ہی اگر توفیق دے اور دستگیری فرمائے تو آدمی اعتدال پر قائم رہ سکتا ہے ورنہ اس میدان میں قدم رکھنے والے کا افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جانا ایک عام بات اور کثیر التجربہ ہے۔ ناچیز نے اس پہلو سے حضرت مولانا کو بہت ہی ممتاز اور باتوفیق پایا۔ صرف ایک مقولہ نقل کرتا ہوں جو مولانا سے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقین اولین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ سے ان کو کیا نسبت؟ ان کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہؓ کو جگہ مل جائے تو ان کے لئے سعادت اور باعث فخر ہے"۔

یہاں تک جن خصوصیات کا میں نے ذکر کیا ان کا براہ راست تعلق مولانا کی عالمانہ یا مناظرانہ حیثیت سے ہے، اگرچہ ان کی عارفانہ اور درویشانہ حیثیت کا بھی اُن میں خاصا حصہ ہے، اب دو چار باتیں میں وہ عرض کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور سے اس دوسری حیثیت سے ہے۔

نماز کے ساتھ قلبی تعلق اور نسبت بنوی م نماز اس حیثیت سے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس گئی گزری حالت میں بھی ہر وہ مسلمان اس کا پابند ہے جس کو خوف خدا اور فکر آخرت کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہے۔ بہر حال اس حیثیت سے نماز ایک عوامی چیز ہے لیکن نماز کے ساتھ دل کا لگاؤ، اس کا حقہ اہتمام اور فکرمندی اور لوگوں میں نماز کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی دیکھ کر دل کڑھنا اور بے چین ہونا بلاشبہ یہ کیفیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے بھی پہلے آپ کے جد امجد سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص نسبت اور وراثت ہیں جنھوں نے

اپنے بیوی بچوں کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بسا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (اے میرے پروردگار میں نے اپنی نسل کو تیرے مقدس و محترم گھر کے پاس بن کھیتی والی وادی میں بسا دیا ہے اے میرے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں۔)

اور عرض و معروض اور مناجات کے اسی سلسلہ کے آخر میں دعا کی تھی۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ، (میرے رب مجھے بنا دے نماز کا قائم کرنے والا اور میری نسل کو بھی یہ چیز نصیب فرما، پروردگار میری دعا قبول فرما۔)

اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری وصیت امت کو فرمائی تھی اس میں سب سے پہلے نماز ہی کی تاکید تھی۔ بہرحال نماز کے ساتھ فکرمندی کا یہ تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم اور اس کے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا، اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک مدت تک مولانا کا یہ التزام رہا کہ ہر وعظ میں نماز کی تلقین و تاکید ضرور فرماتے تھے، بلکہ اس دور میں نماز ہی ان کے مواعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ اس عاجز نے خود بھی نماز کے بارے میں مولانا کا وعظ سنا ہے صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ فرما رہے ہیں بے چین دل کی گہرائی سے فرما رہے ہیں۔ حضرت مولانا نے غالباً اسی زمانہ میں نماز کے موضوع پر ایک بڑی موثر مستقل کتاب بھی "کتاب الصلوٰۃ" کے نام سے لکھی تھی، اس میں مولانا نے قرآن مجید کی ایک سو ایک آیات نماز سے متعلق جمع فرمائی ہیں، اس عاجز کو اعتراف ہے کہ مولانا کی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کن کن عنوانات سے نماز کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کتاب میں آیات کے علاوہ نماز سے متعلق تاکیدی اور ترغیبی ترہیبی حدیثیں بھی اور آخر میں آئمہ امت کے ارشادات بھی ذکر فرمائے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کتاب نہایت موثر ہے اور علمی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے، مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب کی یا اس کے کسی حصہ کی کتابت بھی خود ہی فرمائی تھی (حضرت مولانا

نہایت جمیل الخط تھے اور بد خط تحریر سے گرانی ہوتی تھی) ____ لکھنؤ کے متعدد واقف حضرات سے میں نے سُنا ہے کہ یہاں نماز کا رواج بہت کم تھا، بہت سی مسجدیں غیر آباد تھیں، الحمد للہ اب یہ بات نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس میں سب سے بڑا دخل حضرت مولانا مرحوم کے مواعظ کا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق

اس سے ملتی جلتی دوسری قابل ذکر خصوصیت قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا کا خاص شغف اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے چھ صاحبزادے عطا فرمائے (جنمیں سے دو کا سامنے انتقال ہو چکا ہے) مولانا نے ان سب کو قرآن مجید حفظ کرایا[1] ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا وہی کرے گا جس کو اللہ کی کتاب پاک کے ساتھ غیر معمولی شغف ہو، مولانا پہلے خود حافظ قرآن نہیں تھے، لیکن اب سے چند ہی سال قبل بالکل بڑھاپے کے دور میں خود محنت کر کے حفظ کیا اور زندگی کے ان چند اخیر سالوں میں تو بس تلاوت قرآن ہی ان کا دن رات کا شغل اور وظیفہ تھا گزشتہ آٹھ دس سال میں صبح یا شام جس وقت بھی حاضری کا اتفاق ہوا یہی دیکھا کہ قرآن مجید سامنے ہے اور اسکی تلاوت میں مشغول ہیں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اپنے خاص اہل محبت اور نیاز مندوں تک کے زیادہ آنا اور دو چار منٹ سے زیادہ بیٹھنا باعث گرانی ہونے لگا تھا، اس گرانی کا اظہار زبان سے تو میں نے کبھی نہیں سُنا، لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد چہرے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ انھیں شغل تلاوت کا یہ انقطاع شاق ہو رہا ہے اور وہ منتظر ہیں کہ آنے والا رخصت ہو تو وہ اپنے شغل میں مشغول ہوں۔

اہل وعیال سے محبت اور ان کی جدائی پر صبر والی نبوی وراثت

اپنے اہل وعیال سے محبت بھی انسانی فطرت کا تقاضہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے۔ حدیث وسیرت پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال اور مقام تھا کتب حدیث میں مذکور ہے کہ نواسوں اور نواسیوں میں سے کوئی بچہ منبر پر خطبہ دیتے وقت قریب آگیا تو آپ نے اسی حالت میں اسے گود میں اٹھا لیا بلکہ کبھی کبھی تو انھیں گود میں لے کر آپ نے نماز بھی پڑھی ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی ملاطفت اور حسن معاشرت مثالی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وراثت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اولاد اور اولاد کی اولاد کے ساتھ آپ کے دل کا لگاؤ بھی مثالی تھا

---

[1] بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو بھائی اپنی بیماری وغیرہ کی وجہ سے پورا قرآن مجید حفظ نہیں کر سکے تھے، اگرچہ حضرت مولانا نے اس کے لیے پوری کوشش فرمائی۔ ۱۲

لیکن دو جوان صاحبزادوں (مولانا حافظ عبد الغفور صاحب مرحوم اور مولانا حافظ عبد العزیز صاحب مرحوم) اور جوان العمر اکلوتی چہیتی صاحبزادی اور ان سے پہلے ان کی والدہ مرحومہ کے انتقال کے وقت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال اور ارشاد کا کامل نمونہ دیکھا گیا جو عہد نبوت کے اکلوتے صاحبزادے سیدنا ابراہیم (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات کے وقت آپ کا حال اور قال دیکھا اور سنا گیا تھا، حدیث شریف میں ہے کہ ان کے انتقال پر آپ نے فرمایا:

العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل کو رنج اور صدمہ ہے اور زبان وہی بولے گی جس سے میرا مالک راضی ہو۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

ایک عارف کامل کی شہادت | آخر میں اس دور کے ایک مسلّم عارف بلکہ یقین و معرفت کے امام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ارشاد پر تاثرات کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا اپنے وصال سے ٹھیک ایک سال پہلے رجب ۱۳۶۲ھ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور قریباً ایک ہفتہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا تھا، ایک روز دار العلوم کی مسجد کے وضو خانہ میں وضو فرما رہے تھے، دار العلوم کے دو تین اساتذہ بھی ساتھ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی (موجودہ ناظر شعبہ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء) مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے وضو کر رہے تھے، حضرت مولانا کی ان پر شفقت و عنایت کی خاص نظر تھی، ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبد الشکور صاحب کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، ہاں حضرت جانتا ہوں، زیارت بھی کی ہے۔ فرمایا "نہیں تم نہیں جانتے۔" پھر فرمایا "وہ امام وقت ہیں" ـــــ

لکھنؤ کے اسی سفر میں ناچیز راقم سطور بھی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہم رکاب تھا، ایک صحبت میں (اب یاد نہیں کس سلسلہ میں) خود مجھ سے فرمایا کہ ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبد الشکور صاحب کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ (حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کا وصال چند ہی روز پہلے ہو چکا تھا۔) آخر میں ناچیز راقم سطور اپنے ناظرین سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ حضرت مولانا کے لیے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور تمام محبین و متعلقین کے لیے صبر و اجر اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی خاص طور پر دعا فرمائیں، یہ اُن کا اس ناچیز پر ذاتی احسان ہوگا۔

محمد منظور نعمانی

مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

(ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

الفرقان کے ناظرین میں شاید کوئی ایک بھی نہ ہوگا جو اس دور کے امام یقین و معرفت مرشدنا حضرت رائے پوری کے نام نامی سے ناواقف ہو، اور غالباً سبھی کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ اسی ماہ مبارک ربیع الاول کی ۱۴ر تاریخ کو (مطابق ۱۶ر اگست ۶۲ء) دن کے قریباً ساڑھے گیارہ بجے لاہور میں حضرت کا وصال ہو گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ عبادہ المحسنین المخلصین۔

راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اللہ کی توفیق سے قریباً بیس سال سے جو نیاز مندانہ اور مسترشدانہ تعلق و ارتباط حضرت کے آستانہ عالی سے نصیب تھا اس کا حق تھا کہ الفرقان میں ہمیشہ حضرت کے حالات و افادات شائع ہوا کرتے لیکن چونکہ یہ بات معلوم تھی کہ اپنے نیازکیشوں اور عقیدت مندوں کا حضرت کے بارے میں اخبارات و رسائل میں کچھ لکھنا اور ایک صاحب ارشاد شیخ وقت کی حیثیت سے تذکرہ کرنا حضرت کے لیے گرانی ہی نہیں بلکہ اذیت کا بھی باعث ہوتا ہے[1]۔ (اور اپنے

---

[1] اس معاملہ میں خود اپنے اکابر کو مختلف الحال دیکھا ہے، بعض حضرات اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ ان کے اچھے حالات اور ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہو، اور بلاشبہ اس میں خیر کا یہ پہلو ضرور ہے کہ یہی چیز بہت سے بندوں کے لیے واقفیت اور پھر طلب و توجہ کا ذریعہ بن جاتی ہے، لیکن بعض حضرات پر "نفی ذات" اور "میں کچھ بھی نہیں" کے احساس کا غلبہ ہوتا ہے، وہ اپنے کو اس درجہ سراپا قصور سمجھتے ہیں کہ ہر سچی تعریف اور واقعی حالات کا تذکرہ بھی غلط بیانی
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس تعلق سے پہلے ہی ۱۳۵۸ھ میں گویا اب سے ۴۴-۴۵ سال پہلے اس کا ایک تجربہ بھی ہو چکا تھا) اس لیے اس پوری مدت میں جہاں تک یاد ہے حضرتؒ کے متعلق الفرقان میں کبھی کچھ نہیں لکھا جاسکا، اب جبکہ حضرت کا وصال ہو چکا ہے اور مجبوری باقی نہیں رہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یا غلط قسم کا مبالغہ معلوم ہوتا ہے، یا حسن خاتمہ کے بارے میں سوئ خاتمہ کے فکر و اضطراب کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس کے روادار نہیں ہوتے کہ زندگی میں ان کے ایمانی کمالات کا چرچا کیا جائے عصر حاضر ہی کے ہمارے ایک بزرگ جن سے اس عاجز کو عقیدت و محبت نصیب ہے (اور جو خوش قسمتی سے ہماری اس دنیا میں ابھی رونق افروز ہیں) اس عاجز نے ایک دفعہ چاہا کہ ان کے بارے میں اپنے بعض خاص معلومات "الفرقان" میں لکھ دے تاکہ اللہ کے بندے ان کے مقام سے واقف ہو کر حسب توفیق استفادہ کر سکیں لیکن وہ کسی طرح اس کی اجازت دینے پر راضی نہیں ہوئے، اور منجملہ اور وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی لکھی کہ جب تک ایمان پر خاتمہ نصیب نہ ہو جائے کسی چیز کا کوئی اعتبار نہیں اور یہاں تک لکھ دیا کہ اگر میرے متعلق یہ باتیں لکھی گئیں تو صرف یہی نہیں کہ میری مرضی کے خلاف ہوگا بلکہ مجھے اذیت بھی ہوگی۔

بہرحال خاصانِ خدا میں سے بہت سوں کا ایک حال یہ بھی ہوتا ہے اور مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا حال یا ذوق بھی یہی تھا۔ ۱۳۵۸ھ میں (اب سے گویا ۴۴-۴۵ سال قبل) یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک خاص مقصد کے تحت حضرت کی خدمت میں رائے پور حاضر ہوئے تھے اس وقت ہمارا حضرت سے کوئی خاص ربط و تعلق نہیں تھا، صرف دور کی کچھ واقفیت تھی، ہم اس سفر میں چند اور دینی مرکزوں میں بھی گئے تھے۔ واپسی پر مولانا ندوی نے اس سفر کی روداد لکھی جو الفرقان میں شائع ہوئی اس میں رائے پور کی حاضری کا بھی ذکر تھا اور حضرت کے بارے میں موصوف نے اپنے خاص تاثرات بھی لکھے تھے جو صرف ایک عام زائر اور اجنبی مسافر کے تاثرات تھے، الفرقان رائے پور کی خانقاہ میں جاتا تھا، جب حضرت کی نظر سے وہ مضمون گذرا تو آپ نے خط لکھا جس سے معلوم ہوا کہ اپنے بارے میں اس طرح کی تحریریں نہ صرف یہ کہ حضرت کو ناپسند ہیں بلکہ ان سے قلب مبارک پر گرانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تجربہ کے بعد حضرت کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت نہیں کی جاسکتی تھی۔

ہے کہ "اذکروا محاسن موتاکم" (دنیا سے چلے جانے والے اپنے لوگوں کے اچھے حالات اور اچھی باتوں کا تذکرہ اور چرچا کرو) تو اپنے دل حزیں کی تسکین ہی کے لیے چند سطریں حضرت کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ ع

خاطرہ خود را تسلی میدہم

دین میں تزکیۂ باطن اور اخلاص و احسان کی جو اہمیت ہے اور اس شعبہ کے سنبھالنے والے ائمہ ارشاد اور مشائخ ربانیین کا جو مقام اور ان کی جو امتیازی حیثیت ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "تفہیمات الٰہیہ" کی پہلی ہی تفہیم میں اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

"انبیاء علیہم السلام جن چیزوں کی خصوصیت سے دعوت دیتے ہیں وہ بنیادی طور پر تین ہی چیزیں ہیں۔

ایک مبدأ و معاد وغیرہ سے متعلق عقائد کی تصحیح!

اس شعبہ کو علمائے عقائد و اصول نے سنبھال لیا ہے۔

دوسرے عبادات اور معاملات و معاشرت وغیرہ انسانی اعمال کی صحیح صورتوں کی تعلیم، اس شعبہ کی کفالت فقہائے امت نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

تیسرے اخلاص و احسان: (یعنی ہر کام خالصًا لوجہ اللہ اور اس دھیان کے ساتھ کرنا کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے۔)

اور یہ تیسری چیز دین و شریعت کے مقاصد میں سب سے دقیق اور عمیق ہے اور پورے نظام دینی میں اس کی حیثیت وہ ہے جو جسم میں روح کی اور الفاظ کے مقابلہ میں معنی کی! اور اس شعبہ کی ذمہ داری صوفیاء کرام رضوان اللہ علیہم نے لے لی ہے، وہ خود راہ یاب ہیں اور دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، خود سیراب ہیں اور دوسروں کو سیراب کرتے ہیں، وہ بڑے بانصیب اور انتہائی سعادت مند ہیں۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت یہ ہے کہ اس امت کے علمائے ربانی جو ختم نبوت کے بعد انبیاء علیہم السلام کے وارث اور ان کے ترکہ کے امین ہیں وہ اس "نور" کی حفاظت و اشاعت کے لیے جو انبیاء علیہم السلام سے ان کو ملا ہے برابر سعی کرتے رہیں اس لیے اس طبقہ میں

سلسل یہ دستور چلا آرہا ہے کہ یہ حضرات اپنے مستفیدین و مسترشدین میں سے جن کو اس منصب کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل سمجھتے ہیں ان کو "خلیفہ" مقرر کرتے ہیں اور ان کے علاوہ دوم سوم درجہ کے لوگوں کو بھی اس راہ کا "داعی" بنا کر بھیجتے ہیں تا کہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام جس کام کے لیے آئے تھے وہ جاری رہے اور "إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" کا منشور ربانی پورا ہو۔

(تفہیمات الٰہیہ ص ۱۲-۱۳۔ ملخصاً)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام سے ائمہ ارشاد و سلوک کے کام و مقام پر اچھی روشنی پڑ جاتی ہے اور اس سلسلہ میں جو "استخلاف" یعنی خلیفہ بنانے یا اجازت دینے کا ان حضرات کا جو دستور و معمول ہے اس کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔

ہمارے حضرت قدس سرہ کا اصل کام و مقام یہی تھا، اور اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے حکم سے اپنے کو سب طرف سے یکسو کر کے اسی خدمت پر لگا دیا تھا' حضرت نے پہلے درس نظامی کی باقاعدہ تکمیل کی تھی اور اس دور کے رواج کے مطابق فنون عقلیہ منطق و فلسفہ پر خاص محنت کی تھی، ایک عرصہ تک مختلف مقامات پر درس بھی دیا تھا آخر میں جب بریلی میں درس و تدریس ہی کے سلسلہ میں قیام تھا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المنقذ من الضلال[1] کا مطالعہ کیا، فی الحقیقت تو صرف عنایت ربانی تھی لیکن بظاہر اس کتاب کا مطالعہ ہی اس کا سبب بنا کہ دل میں جذبۂ طلب حق کا وہی شعلہ بھڑک اٹھا جس نے امام غزالی کو "نظامیہ بغداد" کی مسند صدارت سے اٹھا کر (جس کا درجہ عزت و عظمت کے لحاظ سے اس وقت وزارت سے کم نہ تھا) برسوں راہ حق میں سرگرداں پھرایا تھا۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آپ درس و تدریس کے شغل کو خیرباد کہہ کر بریلی سے نکل کھڑے ہوئے، لمبے لمبے پاپیادہ سفر کیے، مدتوں ٹھوکریں کھانے کے بعد (جو عشق کے گویا لوازمات میں سے ہے) رحمت حق نے دستگیری فرمائی، اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری (نور اللہ مرقدہ) کی جو خانقاہ آپ کے استفادہ اور پھر افادہ کے لیے ازل سے مقرر ہو چکی تھی وہاں آپ کو پہنچا دیا گیا۔ (خود حضرت کی زبان مبارک سے اس دور حیاتی مدت کے بڑے بڑے سبق آموز ابتلائی واقعات بھی سُنے ہیں لیکن وہ مستقل سوانح حیات میں آنے والی چیزیں ہیں۔)

رائے پور کی خانقاہ میں پہونچکر آپ کو جلد ہی یقین و اطمینان نصیب ہو گیا کہ میں جس چیز کی

[1] یہ کتاب ایک طرح سے امام غزالی کی آپ بیتی ہے اور اس کا پیغام یہ ہے کہ تعلق باللہ، اخلاص و احسان کی یافت کے بغیر کتابی علم ہیچ بلکہ ایک طرح کا فریب ہے۔

تلاش میں ہوں وہ یہاں موجود ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت دوسرے معاصر اکابر و مشائخ حق کے علاوہ خود حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے شیخ قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ بھی دنیا میں رونق افروز تھے اور گنگوہ کا بازارِ عشق و محبت پوری طرح گرم تھا، اور بیعت کی پہلی درخواست کے جواب میں خود شیخ نے آپ کو بھی گنگوہ حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا، لیکن آپ نے اپنے خاص حالات اور اپنی مناسبت کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے اپنے بارے میں یہی فیصلہ کیا کہ "جا اینجاست"۔

فرماتے تھے کہ شروع میں حضرت نے مجھے بیعت نہیں فرمایا بلکہ ذکر کی تلقین فرمادی اور کافی مدت (غالباً دو برس) کے بعد بیعت فرمایا —— یہ زمانہ رائے پور کی اس خانقاہ کے مقیمین کے لیے بڑے عُسر، بڑے مجاہدے اور بڑی سختی کا تھا، فرماتے تھے کہ مسلسل دس سال ایسے گذرے ہیں کہ ہم لوگوں کو جو طالبین کی حیثیت سے خانقاہ میں رہتے تھے، ایک دن میں صرف ایک روٹی مکئی کی ملتی تھی اور وہ بھی درمیان سے بالکل کچی ہوتی تھی، جو صاحب پکانے والے تھے انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ روٹی سکی یا نہیں سکی۔ سالن یا دال ترکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، گاؤں سے کسی دن چھاچھ آجاتی تو کھانے پینے کے لحاظ سے ہم خانقاہ والوں کے لیے گویا وہ عید کا دن ہوتا۔ فرماتے تھے اس علاقہ کے (یو۔پی کے) ہمارے ساتھی تو یہی ایک روٹی آدھی آدھی کر کے دونوں وقت کھاتے تھے لیکن میں پنجاب کا رہنے والا تھا اس لیے ایک ہی وقت میں کھا لیتا تھا اور دوسرے وقت بس اللہ کا نام![1]

---

[1] جس خانقاہ میں ساٹھ ستر سال پہلے یہ عُسر اور فقر تھا وہاں ان آخری سالوں میں سب ہی آنے جانے والوں نے دیکھا کہ ایک ایک وقت میں سو سو دو دو سو مہمان ہیں اور سب کو اچھا خاصا کھانا دونوں وقت کھلایا جا رہا ہے، بلکہ رمضان مبارک میں تو دودھ بھی پابندی کے ساتھ سب کو مل رہا ہے، جو لوگ چائے پینے کے عادی ہیں ان کو ان کے معیار کے مطابق دو دو تین تین دفعہ چائے مل رہی ہے —— اب سے چار پانچ سال پہلے کی ایک دن کی بات ہے ہم دونوں (یعنی یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) بھی حاضر تھے، لگ بھگ سو مہمان ہوں گے، دسترخوان پر خود میں نے گنا چار قسم کی تو صرف کھیر تھی، تین قسم کی مچھلیاں تھیں، گوشت بھی کئی قسم کا تھا، یہ سب قرب و جوار کے دیہات کے حضرت کے محبین و مخلصین حضرت کے مہمانوں ہی کی نیت سے خود اپنے گھروں سے پکوا کے لے آتے تھے اور رائے پور کے خوش نصیب بھائی تو وہ زمانہ ہی اپنے گھروں سے ناشتہ دانوں میں بھر بھر کے کئی کئی قسم کے کھانے لاتے تھے۔ "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کا یہ ظہور ادھر چند برسوں سے مسلسل ہو رہا تھا —— حق ہے "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ"

لیکن یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب حضرت اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے خود اس میں سے کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں مسلسل اس کچی روٹی کے کھانے کی وجہ سے پیٹ اور آنتوں میں جو تکلیف پیدا ہوگئی تھی اس کے اثرات اب تک ہیں ـــــ اس غذا کے ساتھ ذکر اور بالجہر ذکر اس مقدار میں ہوتا تھا جس کا ہم کم ہمتوں کے لیے تصور بھی مشکل ہے ـــــ فرماتے تھے کہ ضعف دماغ کی وجہ سے ذکر کے وقت ناک سے ریزش ٹپکتی رہتی تھی، میں موٹے گاڑھے کا ایک رومال اپنے زانوؤں میں ڈال لیتا جو ریزش سے تر بتر ہوجاتا تھا اور میں روزانہ اس کو دھو کر سکھا لیتا تھا، ذکر ختم کر کے جب حجرہ سے نکلتا تھا تو کچھ دیر تک آنکھوں کے آگے اندھیرا سا رہتا تھا اور میں کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتا تھا ـــــ اس درمیان میں اللہ تعالیٰ کا جو فضل ہوتا رہا، ہم خدام کی ترغیب و تشویق کے لیے کبھی کبھی وہ بھی ذکر فرمایا۔

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں گاہ بگاہ حضرت سے جو کچھ سُنا، اس سے اس نادان اور ناسمجھ نے تو بس یہی سمجھا کہ شریعت کے عام اوامر و نواہی کی پابندی کے علاوہ تقرب الی اللہ کی فضاؤں میں حضرت کی پرواز کے دو ہی خاص بازو تھے۔ ایک ظاہر و باطن سے اللہ کے ذکر کی کثرت دوسرے اپنے شیخ سے غایت تعلق اور محبت!

اپنے شیخ کے وصال[1] کے بعد انھیں کے حکم کے مطابق آپ وہیں پڑ گئے اور ان کی جلائی ہوئی شمع کو پورے ۵۴ سال تک روشن رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس روشنی کا حلقہ آپ کے ذریعہ اتنا وسیع کیا جس کا پہلے شاید تصور بھی نہ ہوگا۔ حضرت کے ہاتھ پر توبہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے کم نہ ہوگی۔ آخری ایام میں تو ایک ایک دن میں کئی کئی سو بیعت و توبہ کے لیے آتے تھے، یہاں تک کہ بسا اوقات سیکڑوں کے مجمع کو ایک ساتھ سامنے بٹھا کر کسی دوسرے بلند آواز خادم کی وساطت سے توبہ اور بیعت کے کلمات حضرت تلقین فرماتے تھے اور بس اس طرح مجموعی بیعت ہوتی تھی۔

آپ کے وابستگانِ دامن اور فیضیافتگان میں بہت بڑی تعداد ان خوش نصیب بندگان خدا کی بھی ہے جنھیں اپنی محنت و مجاہدہ اور اپنی اپنی استعداد و نصیب کے مطابق الحمد للہ بہت کچھ حاصل ہوا۔

اہل اللہ کے طرز و انداز اور ان کے الوان و اذواق مختلف ہوتے ہیں۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

---

[1] شیخ ربانی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کا وصال ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء سہ شنبہ میں ہوا تھا۔ ۱۲

حضرت کا معاملہ یہ تھا کہ ایسی باتیں خاص کر عام مجالس میں بہت ہی کم فرماتے تھے جن سے کوئی آپ کو صاحب مقام بزرگ سمجھ سکے، بلکہ اکثر یا تو بالکل خاموش رہتے یا ایسی باتیں زیادہ فرماتے جن سے بظاہر بزرگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، اب سے چند سال پہلے تک یہ عاجز جب حاضر خدمت ہوتا تو طرح طرح سے اس کی کوشش کرتا کہ حضرت ایسی باتیں بالکل نہ فرمائیں۔ بلکہ بس بزرگوں ہی والی باتیں فرمائیں تاکہ ہر آنے والا متاثر ہو اور معتقد بنے اور طالب بن کر دینی نفع حاصل کر سکے۔ اس غرض کے لیے میں سوالات کر کر کے ایسی ہی باتیں حضرت سے کرانے کی کوشش کرتا لیکن اس میں پوری طرح کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔ مجلس میں جس رنگ ڈھنگ کا کوئی آدمی آجاتا آپ اس سے اسی طرح کی باتیں شروع فرما دیتے۔ بعض وقت تو مجھے اپنی نادانی اور حماقت سے اس صورت حال سے سخت انقباض ہو جاتا کیونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ یہاں جو آئے وہ حضرت کی بزرگی کا فوراً ہی قائل اور معتقد ہو جائے اور فیض حاصل کرے، لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ سب میری نادانی اور حقیقت ناشناسی تھی حضرت باتوں سے معتقد بنانے کے قائل نہ تھے۔ دوسری بات عرصہ کے بعد یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اگر حضرت میری منشاء کے مطابق بس بزرگانہ ہی باتیں فرمایا کرتے تو بہت سے آزاد مزاج ہمارے دوست جو آج ماشاءاللہ ذاکر شاغل ہیں، حضرت سے جوڑ نہ کھا سکتے، اور شاید ان کی زندگیاں آوارگی ہی میں گذرتیں، علاوہ ازیں اس طرز عمل میں غالباً اس کو بھی کچھ دخل تھا کہ حضرت پر نفی اور فنائیت کا غلبہ تھا، واللہ اعلم۔

حضرت کے اس طرز عمل ہی کی وجہ سے عوام تو عوام بعض خواص نے بھی اس ناچیز سے اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے کبھی کبھی سوال کیا کہ آپ لوگوں نے حضرت میں کیا دیکھا؟ ـــــ یہ ناچیز بیس سالہ تعلق کے باوجود کچھ نہ کرنے کی وجہ سے اگرچہ خود محروم اور بالکل ہی محروم رہا، لیکن الحمدللہ اتنا تو بلا کسی مبالغہ کے کہہ سکتا ہے کہ اپنے خیال میں تو کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اللہ کے لیے مٹنے والے بندوں میں ہونی چاہیے اور اپنی عامیانہ آنکھوں نے حضرت میں نہ دیکھی ہو، لیکن اس عاجز نے جن چیزوں کو زیادہ محسوس کیا ان میں سے ایک تو ہے حضرت کا وہ توکل اور تبتل جو کامل یقین اور وصول ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جو شخص حضرت کے قریب صرف

چار دن بھی رہا ہو اور اُسے ان باتوں کا کسی درجہ میں کچھ بھی شعور ہو وہ کھلی آنکھوں اس کو دیکھ سکتا تھا ــــــ دوسری چیز جس سے یہ عاجز اس سے بھی زیادہ متاثر ہے وہ ہے حُبّ جاہ کا ایسا قلع قمع جس سے آگے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ الحمد للہ ہمیں حضرت کے کشف و کرامات کا بھی تجربہ ہوا لیکن بخدا ہزار کھلی کرامتیں اس نعمتِ عظمیٰ کے برابر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کو حب جاہ کے جذبہ سے پاک و صاف کر دے، سلوک و تصوف کے اکابر ائمہ کا گویا ایک مسلمہ ہے "آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ" (طالبین و سالکین ہی نہیں بلکہ صدیقین کے بھی قلوب کا وہ روحانی مرض جو سب سے آخر میں نکلتا ہے حب جاہ کا جذبہ ہے)

جہاں تک اپنا بشری اندازہ ہے ہم نے یہی دیکھا اور محسوس کیا کہ گویا حب جاہ کا بالکل ہی سر کچلا ہوا ہے اور اس میں کہیں کوئی رمق بھی زندگی کی نہیں ہے، یہ عبدیت کی تکمیل ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں۔

آخری مرض کا سلسلہ اور وصال

اب سے قریباً آٹھ سال قبل جب کہ حضرت کا قیام کوہ مسوری پر اپنے نہایت عزیز نیاز مند شاہ محمد مسعود صاحب کی کوٹھی پر تھا، پہلی دفعہ دل کا دورہ پڑا اور سخت خطرہ کی حالت پیدا ہو گئی لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور طبیعت اس وقت سنبھل گئی، مگر اس کے بعد سے کچھ نہ کچھ اثر اس کا ہمیشہ رہا، اس درمیان میں کئی دفعہ خطرناک دورے بھی پڑے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حالت ہر دفعہ سنبھل گئی، قریباً آٹھ سات سال کی یہ پوری مدت اسی مد و جزر میں گذری اسی حالت کی وجہ سے کئی سال سے نماز بھی بیٹھ کر اشارہ ہی سے ہوتی تھی۔ پوری طرح رکوع سجود نہیں فرما سکتے تھے۔ چونکہ حضرت کے خدام اور فیض یافتگان کی بہت بڑی تعداد پاکستان میں ہے اور اصل وطن بھی وہیں ضلع سرگودھا میں ہے اور الحمد للہ قریبی اعزہ حقیقی بھائی بھتیجے وغیرہ بھی موجود ہیں اس وجہ سے اس نازک حالت میں بھی کئی بار پاکستان تشریف لے گئے اور طویل طویل مدت تک وہاں قیام فرمایا۔

اب سے قریباً دو سال پہلے جب آخری مرتبہ حضرت وہاں سے تشریف لائے تو حضرت کے

ضعف کو دیکھ کر عام اندازہ یہ تھا کہ اب غالباً حضرت کبھی پاکستان تشریف نہ لیجا سکیں گے اور وہاں کے مخلصین بھی شاید اس حالت میں اب سفر پر اصرار نہ کریں گے۔ لیکن چونکہ دونوں حکومتوں نے ویزا کے مسئلہ میں سخت مشکلات پیدا کر رکھی ہیں اور وہاں سے کسی کا یہاں آنا اور اسی طرح یہاں سے کسی کا وہاں جانا مشکل ترین مسئلہ بن گیا ہے جس کی وجہ سے حضرت کے اہل محبت اور قریبی اعزہ کو بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے میں سخت مشکلات تھیں اس لیے وہ حضرات صبر نہ کر سکے اور اصرار کا سلسلہ جاری رہا، حضرت بھی ان کے تعلق اور محبت کا حق محسوس فرماتے تھے اس لیے انتہائی ضعف کی حالت میں بھی تشریف لے جانے کا فیصلہ فرما لیا اور گذشتہ مئی میں تشریف لے گئے، اس دفعہ حضرت کی طبیعت زیادہ تر ناساز رہی۔ ۲۶ر جولائی شنبہ کے دن شیخ الحدیث مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کا والا نامہ رفیق محترم مولانا ندوی کے نام آیا جس سے معلوم ہوا کہ ۲۴ر جولائی جمعرات کے دن حضرت شیخ کو لاہور سے تار ملا ہے کہ حضرت کا مزاج زیادہ ناساز ہے، مولانا اسی دن شام کو لاہور کے لیے روانہ ہو گئے، اس عاجز کو ہماری سرکار نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا ہے اس لیے ناچیز کے لیے کوئی صورت وہاں حاضری کی نہ تھی، اور یہ محرومی بھی مقدر تھی۔ رفیق محترم مولانا ندوی جب حضرت کی خدمت میں پہونچے ہیں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی، یہاں تک کہ حضرت نے کچھ بات بھی فرمائی اور مولانا نے اسی دن اس عاجز کو اطمینان کا خط لکھا اس سے ایک دن پہلے مولانا عبدالجلیل صاحب بھی ایسا ہی خط لکھ چکے تھے۔ لیکن چند روز کے بعد مرض کا پھر غلبہ ہو گیا، کئی دن مسلسل غشی کی سی کیفیت رہی بالآخر ۱۴ر ربیع الاوّل بروز پنجشنبہ ۱۱ بجکر ۵ منٹ پر روح مبارک دوسرے عالم کی طرف پرواز کر گئی، اور پنجشنبہ و جمعہ کی درمیانی شب میں اپنے وطن عزیز میں تدفین ہو گئی ——— جاءت به منيته الى قربته۔ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ———

نماز جنازہ ۴ دفعہ ہوئی پہلی لاہور میں، دوسری لائلپور میں، تیسری سرگودھا میں، چوتھی خاص وطن ڈھڈیاں ضلع سرگودھا میں۔ یوں تو خدام و متوسلین کی ایک دنیا ہے، جو تعزیت کی مستحق ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت کے خاص اعزہ بالخصوص مولانا عبدالجلیل و مولانا عبدالرحمٰن و مولانا عبدالوحید صاحب وغیرہ اور حضرت کے وہ خدام اور اپنے وہ اخوان و احباب جو حضرت ہی کے قدموں

سے وابستہ ہو گئے تھے اور حضرت ہی کے آستانہ کو انھوں نے اپنی دنیا بنا لیا تھا تعزیت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں ان حضرات کی خدمت میں عرض کرنا ہے اور اپنے دل سے بھی کہنا ہے ـــــ

ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ ودرکا من کل فائت فباللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المصاب من حرم الثواب ـــــ

انشاء اللہ حضرت کی مستقل سوانح ضرور لکھی جائے گی اور غالباً یہ سعادت رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حصہ میں آئے گی وھو احق بہ واھلہ یہ سطریں تو اس عاجز نے بس اپنی تسکین خاطر کے لیے لکھی ہیں ـــــ ع ـــــ خاطر خود را تسلی میدہم

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

حضرت رائے پوری قدس سرہ کے وصال کے علاوہ اس مہینے کا ایک بڑا اہم ملی حادثہ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ اور روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہے۔ مولانا کی وفات سے صرف جمعیۃ علمائے ہند کی بزم ہی سونی نہیں ہوئی بلکہ مسلمانان ہند کے ایک نڈر، بے باک، سرگرم اور جانباز خادم کی آواز خاموش ہو گئی ـــــ مولانا نے ملک کی آزادی کے بعد کے پندرہ سال میں ملت کی جو خدمت کی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بلا شبہ وہ اس خدمت میں فرد فرید تھے اور آج کوئی ان کا بدل ملت کے پاس نہیں ہے۔

اللہ کی مشیت ہے ایک عجب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ ہر ہر شعبہ کی اہم اہم ہستیاں اٹھتی جا رہی ہیں اور کوئی بھی اپنا کوئی بدل نہیں چھوڑ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان صدمات کے اجر سے محروم نہ کرے اور مرحومین کو اپنی رحمت خاص سے نوازے۔

مولانا کی وفات کا حادثہ اس عاجز کے لیے ایک ذاتی حادثہ کی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ ان کی وفات سے ایک بڑے مخلص اور مہربان دوست سے محروم ہو گیا۔ مولانا کے متعلق اپنے تفصیلی تاثرات میں ہفت روزہ ندائے ملت میں لکھ چکا ہوں[1]، اس لیے یہاں اس مختصر تذکرہ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ ناظرین سے التماس ہے کہ وہ مولانا کی مغفرت اور رفع درجات کے لیے دعا فرمائیں۔

---

[1] ندائے ملت میں شائع شدہ مضمون انشاء اللہ الفرقان کے آئندہ شمارہ (جولائی ۱۹۶۲ء) میں شائع کر دیا جائے گا۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ

"چند نقوش و تاثرات"

(شوال سنہ ۱۳۸۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اسی رمضان المبارک (سنہ ۱۳۸۱ھ) کے وسط میں مشہور عالم ربانی حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ اُن کے متعلق بہت کچھ لکھا جائے گا اور ان کے تلامذہ و معتقدین اور واقفین کی زبان سے بہت سے ایسے حالات اور کمالات معلوم ہوں گے جن کی دُنیا کو خبر نہیں، مولانا کی زندگی باوجود شہرت و مرجعیت اور اس عالم مقبولیت کے جو اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں اور دین کے بے لوث خادموں کو عطا فرمایا کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ نہایت وسیع تھا اپنی بعض خصوصیات اور روحانی کمالات کے اعتبار سے ایک طرح سے اخفا اور گمنامی کی زندگی تھی اور ساری عمر ان کمالات پر پردہ پڑا رہا اور بہت سے قریبی عزیزوں اور روزانہ کے اُٹھنے بیٹھنے والوں کو کبھی ان کی خبر نہیں ہوئی۔ عام طور پر لوگ ان کو ایک واعظ و خطیب اور مفسر قرآن کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن ان کے اصلی کمالات اور ان کی زندگی کے ان گوشوں کے جاننے والے بہت کم ہیں جن کی وجہ سے وہ سلف صالحین اور علماء ربانیین کی آخری یادگاروں میں نظر آتے تھے اور جن سے زہد و ورع، خلوص و للہیت، ایثار و قربانی، استقامت و ثابت قدمی اور حق گوئی و بے باکی کی ان روایات کی تصدیق اور ان میں ایک وسیع اضافہ ہوتا تھا جو علماء و مشائخ کے قدیم تذکروں میں منقول ہیں۔

راقم سطور کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سنہ ۱۹۲۹ء سے نیاز حاصل تھا اس کو مولانا سے علمی

تلمذ اور باطنی تعلیم دونوں کا شرف حاصل تھا، مجھے مولانا کی خدمت میں کئی کئی مہینے بھی قیام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور خط و کتابت اور ان کی شفقتوں کا سلسلہ تو اخیر تک جاری رہا مدرسہ قاسم العلوم کے زمانہ قیام، فضلاء مدارس عربیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں شرکت اور بار بار کی حاضری اور مولانا کے معتمد اور عزیزوں کے ساتھ تعلقات کے ذریعہ مجھے مولانا کی سیرت کے بعض ایسے پہلو اور ان کی بعض ایسی خصوصیات کا علم ہوا جن کا عام طور پر علم نہیں، ان واقعات اور خصوصیات کا تذکرہ قارئین کے لیے بہت سی حیثیتوں سے مفید ہے اور وہ ان کے اندر ایک نئی ایمانی تازگی اور دینی اعتماد پیدا ہونے کا باعث ہو سکتا ہے، یہاں صرف وہی واقعات اور خصوصیات لکھی جائیں گی جن کا مجھے ذاتی طور پر علم ہوا یا مولانا سے قریب تعلق رکھنے والے کسی ثقہ راوی سے سننے میں آئی ہیں۔

زہد و ورع مولانا کا سب سے زیادہ روشن امتیازی وصف جس میں ان کی نظیر اس نسل میں مشکل سے ملے گی، وہ ان کا تورع احتیاط اور زاہدانہ و مجاہدانہ زندگی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ انجمن خدام الدین کے بانی تھے اور آخر وقت تک اس کے امیر اور صدر انجمن رہے، اس انجمن کی ایک مجلس انتظامیہ تھی جس کے ارکان کو ان پر نہ صرف کامل اعتماد بلکہ ان کی ذات کے ساتھ والہانہ تعلق اور اعتقاد تھا۔ یہ انجمن ایک مدرسہ قاسم العلوم اور ایک مدرسۃ البنات چلاتی تھی۔ اس نے کثیر التعداد تبلیغی رسائل شائع کیے جو لاکھوں کی تعداد میں تقسیم و شائع ہوئے، مولانا کا ترجمہ اور حواشی قرآن بھی مقبول ہوئے، رسالہ خدام الدین اس کا ترجمان اور آرگن ہے، غرض اس کا سارا سرمایہ، اس کا مکتبہ اور اس کی دینی سرگرمیاں سب مولانا کی محنت، اخلاص اور مقبولیت کی رہین منت ہیں، لیکن یہ سن کر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ مولانا اس سے ایک پیسہ لینے کے کبھی روادار نہیں ہوئے، ساری عمر انھوں نے اعزازی اور رضاکارانہ طریقہ پر خدمت کی، اور اپنی اور اپنی اولاد کے لیے کوئی منفعت حاصل نہیں کی، مجھے ان کے ایک قدیم معتمد خاص نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سخت علیل ہوئے، معالجین نے آپ کے لیے دوا و غذا کا ایک نظام بتایا جس کی (آپ کی زاہدانہ زندگی میں) گنجائش نہ تھی۔ انجمن کے ارکان نے یہ سمجھ کر کہ انجمن اور اس کا سارا کام مولانا کے دم سے ہے، ان کی زندگی ہی سے

انجمن کی زندگی اور بقا ہے۔ مولانا کے علاج اور صحت پر کچھ انجمن کے حساب سے خرچ کر دیا۔ مولانا کو بیماری سے افاقہ کے بعد جب اس کا علم ہوا تو نہایت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا کہ تم نے مجھے ناجائز کھلایا اور اس کو اپنے پاس سے ادا کیا۔

جب ہم لوگ مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتے تھے تو بعض اوقات ملازمین اور واقفین حال سے معلوم ہوتا کہ مولانا کے یہاں کسی کسی وقت فاقہ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ہم طلبہ کے لیے بڑی فراوانی کے ساتھ کھانے پکتے اور ہم سب آسودہ ہو کر کھاتے لیکن یہ مجال نہ تھی کہ مولانا کے یہاں اس میں سے ایک دانہ بھی پہونچ جاتا اور ان کے گھر کا کوئی بچہ اس کھانے سے مستفید ہوتا۔ جو ان کی معنوی اولاد شکم سیر ہو کر کھاتی۔ حالانکہ مولانا کا دولت خانہ مدرسہ کے بالکل عقب میں تھا اور درمیان میں صرف ایک پتلی سی گلی تھی۔

ہم لوگوں کو خوب اندازہ تھا کہ مولانا کے یہاں عسرت اور نہایت سادگی کے ساتھ گذران ہوتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ اخفاء حال اور تکلیف سے بچانے کے لیے مولانا اپنے عزیز مہمانوں کے کھانے کا انتظام باہر کرتے اور انجمن کے کسی خادم یا مسجد کے کسی منتظم کو کچھ نقد عنایت فرما دیتے، جس سے ان مہمانوں کی میزبانی ہوتی رہتی، مجھے ایک مرتبہ اچانک اس کا اندازہ اور علم ہوا کہ مولانا کے گھر میں عام طور پر کیسی گذران اور کیا معیار زندگی ہے۔ رمضان مبارک میں غریب مسلمانوں کے یہاں بھی کچھ نہ کچھ اہتمام اور تکلف ہوتا ہے، لیکن مولانا کے یہاں میں نے اتنا بھی اہتمام نہیں پایا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ رمضان مبارک میں مولانا کی خدمت میں مقیم تھا۔ مولانا نے ایک روز فرمایا کہ آج کھانا میرے ساتھ کھائیے گا، افطار ہم لوگوں نے پنجاب کے رواج کے مطابق مسجد میں پانی یا چھوہارے سے کر لیا۔ نماز مغرب کے بعد مولانا نوافل میں مشغول ہو گئے فارغ ہوئے تو میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب میں گھر میں اطلاع دینا بھول گیا کہ آج آپ ساتھ کھانا کھائیں گے۔ یہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ فرمایا۔ کھانا آیا تو صرف روٹی اور دال کا پیالہ تھا جو غالباً ماش کی تھی، اسی وقت دہی کا میری خاطر اضافہ کیا گیا۔ مولانا نے کھانا کھاتے ہوئے فرمایا کہ مولوی ابوالحسن صاحب (مولانا اکثر مجھے اسی طرح یاد فرماتے تھے) ہم سے تو یہ دال اچھی ہے کہ یہ جس مقصد کے لیے پیدا کی گئی تھی اس کو اس نے پورا کر دیا۔ مگر ہم نے اپنی زندگی کی

مقصد پورا نہیں کیا۔ اس کے بعد بغیر کسی معذرت کے کھانے میں شریک ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ آج کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

مولانا جیسا کہ عرض کیا گیا، انجمن خدام الدین سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے نہ مسجد یا کسی اور ادارہ سے کچھ قبول فرماتے تھے۔ بعض واقفین حال نے یہ بتایا تھا کہ مولانا کبھی کوئی ٹیوشن کرتے ہیں یا ہفتہ کے کسی ایک دن کوئی مزدوری کر لیتے ہیں جس سے بقیہ دن گذران ہو سکے، باوجود قرب کے ہم لوگوں کو اس کا کبھی صحیح علم نہیں ہو سکا۔ اس بارہ میں توکل اور صبر و قناعت کی وہ اسی روش پر قائم تھے جو اہل اللہ کی ہمیشہ سے روش رہی ہے۔

طمع دنیا اور مشتبہ مال سے احتیاط سے زیادہ مشکل غیبت سے اجتناب واحتراز ہے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو عزلت اور گوشہ گیری کی زندگی نہ گذارتے ہوں، ان کا مختلف طبقوں اور کثیر التعداد لوگوں سے واسطہ پڑتا ہو، یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی جب کسی طبقہ یا فرد سے اعتقادی اور اصولی اختلاف بھی ہو اور اس کے ساتھ صریح ظلم کیا گیا ہو مولانا کو ان نازک موقعوں پر ہمیشہ غیبت اور شکایت سے مجتنب اور محتاط پایا۔ درس میں ہر طرح کا تذکرہ آتا۔ تردید اور تنقید بھی ہوتی لیکن ایک موقع پر بھی مولانا کو اپنے کسی شدید سے شدید مخالف کی کبھی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا گیا، احتیاط اور تورع کا ایک حیرت انگیز واقعہ ان کے رفقائے کار سے سننے میں آیا۔ لاہور میں ایک مرتبہ مولانا اور ان کی انجمن خدام الدین کے خلاف لاہور کے چند علماء اور ان کے خدام نے ایک سخت ہنگامہ اٹھایا۔ انجمن نے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو اس وقت ڈابھیل میں تھے اپنے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا تھا، مخالفین نے ان کو انجمن سے بدظن کرنے کی پوری کوشش کی اور بعض لوگوں نے ذاتی تعلقات سے کام لیکر مولانا کی اور انجمن کی شکایات لکھ بھیجیں اور ان کو غلط معلومات مہیا کیں۔ انجمن کے منتظمین نے یہ مناسب سمجھا کہ مولانا احمد علی صاحب خود ڈابھیل چلے جائیں اور اس طویل سفر میں شاہ صاحب کو حقیقت حال سے مطلع کر دیں۔ تاکہ معاندین ان کی تشریف آوری سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔ مولانا تشریف لے گئے اور ساتھ تشریف لائے۔ انجمن کے ذمہ داروں کو اطمینان تھا کہ شاہ صاحب مولانا کے ذریعہ اصل واقعات سے واقف ہو گئے ہیں اور ان کو سب حال بتا دیا گیا ہے۔ لیکن ان حضرات

کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنے مخالفین کے متعلق اس طویل سفر کی فرصت اور طویل رفاقت و محبت کے باوجود ایک لفظ نہیں کہا۔ اور شاہ صاحب حقیقت حال سے بالکل بے خبر ہیں۔

بے لوث دینی خدمت مولانا کا شروع سے یہ عقیدہ تھا اور اس کا اظہار اکثر اپنے درس میں کرتے تھے کہ دین کے خادم اور مبلغ کی تاثیر اور قبولیت کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اپنے سامعین یا حلقۂ تبلیغ سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہ اٹھائے اور ان کے کسی احسان، خاطر مدارات اور خدمت و ضیافت کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ مولانا اس اصول پر اس سختی سے کاربند تھے کہ نہ اپنے داعیوں سے کرایہ لیتے تھے نہ ان کی ضیافت قبول فرماتے تھے۔ ہم لوگوں کی تربیت کے لیے بعض مرتبہ فرمایا کہ میں کہیں تبلیغ و وعظ کے لیے جاتا ہوں تو ایک گلاس شربت کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ایک عرصہ تک مولانا کا یہ معمول رہا کہ کرایہ اپنے پاس سے صرف کرتے اور اس کے لیے بعض اوقات آپ کو خاصی مدت انتظار کرنا پڑتا یونہ یا اس کے اطراف کے ایک سفر کا واقعہ بیان فرماتے تھے (تقسیم ہند سے پہلے) کہ وہاں ایک مخلص دوست نے مجھے بلایا۔ مجھے جتنے دن قیام کرنا تھا اس کے حساب سے میں گھر سے آٹے کی میٹھی ٹکیاں پکوا کر لے گیا تھا۔ چنانچہ پورے زمانہ قیام میں یہی میری خوراک رہی اور نہ مجھے کسی کا مہمان بننے کی یا بازار میں کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

مولانا تبلیغی سفر میں کبھی کسی کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک سفر میں کسی مخلص دوست نے چند لوگوں کی موجودگی میں مجھے ایک رقم دی۔ مجھے خیال ہوا کہ میں اگر برسرِ مجلس اس کو واپس کر دیتا ہوں تو ان کی سبکی اور دل شکنی ہوگی میں نے اس کو قبول کر لیا اور لاہور آ کر ان کو کوپن پر یہ لکھ کر وہ رقم واپس کر دی کہ میں نے مصلحتاً یہ رقم اس وقت قبول کر لی تھی اب واپس کر رہا ہوں۔

مولانا ہم طلبہ کو کبھی کبھی اپنے بعض ایسے واقعات سناتے جن سے ہمارے اندر اپنے علمی و دینی منصب کا احترام اور اس کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان واقعات کا بڑا اثر پڑتا ہے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ایک مرتبہ سنایا کہ حکومت پنجاب کے بڑے عہدے دار اور رئیس نواب مظفر خاں نے اپنے کسی صاحب زادہ یا صاحبزادی

کے نکاح کے لیے مجھے بلایا میں جب مجلس میں داخل ہوا تو بڑے بڑے عمائد شہر اور عہدہ داران حکومت موجود تھے انھوں نے مجھے اسی بے پروائی اور استخفاف کی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ مولویوں اور نکاح خواں قاضیوں کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ خطبۂ نکاح اور ایجاب و قبول کے بعد نواب صاحب نے ایک معقول رقم جو نوٹوں کی گڈی کی شکل میں تھی مجھے پیش کی۔ میں نے مناسب طریقہ پر اس کے لینے سے معذرت ظاہر کردی اور ضروری سمجھا کہ اہل مجلس پر بھی یہ بات واضح ہو جائے کہ علماء کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس کی اجرت قبول کریں، اس سلسلہ میں میں نے ایک مختصر سی تقریر بھی کی اہل مجلس کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ نواب صاحب پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ بڑے احترام کے ساتھ مجھے پہونچانے آئے۔ اور معذرت کی۔

مولانا جب کبھی کسی دینی دعوت پر تشریف لے جاتے تو کوشش کرتے تھے کہ وہ تمام رسوم و تکلفات سے بچے رہیں، جن کو داعی حضرات اور منتظمین، علماء اور مقررین کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ آپ کو کسی شہر میں مدعو کیا گیا آپ گاڑی سے اترے استقبال کرنے والے اسٹیشن پر موجود تھے۔ آپ نے منھ پر رومال ڈال لیا اور خاموشی سے کسی ایک طرف سے نکل کر قیام گاہ تک پہونچ گئے۔ استقبال کرنے والے جب مایوس ہو کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا احمد علی صاحب تشریف لا چکے ہیں۔

درس و اشاعت قرآن کریم

مولانا نے تقریباً نصف صدی قرآن مجید کی خدمت و اشاعت اور دینی دعوت و اصلاح کا کام کیا اس بارے میں ایسے انہماک شغف و محویت، ثبات و استقامت کا ثبوت دیا جو بغیر اعلیٰ درجہ کی عزیمت یقین و للہیت اور روحانی قوت کے مشکل ہے، جب انگریز حکومت نے ان کو دہلی سے جلا وطن کر کے (جہاں وہ مولانا عبید اللہ صاحب کے جانشین کی حیثیت سے قرآن مجید کے مضامین کی اشاعت اور جہاد و حریت کی تلقین کر رہے تھے) لاہور پہونچایا تو آپ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ آپ شیرانوالہ دروازہ میں اس مسجد میں منتقل ہوئے جو لائن والی مسجد یا سبحان خاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کا مسقف حصہ نہایت مختصر تھا جو اب بھی موجود ہے۔ رفتہ رفتہ آپ کے درس نے شہر میں عام مقبولیت حاصل کرلی

شروع کی۔ اور پھر تو وہ پنجاب کا سب سے بڑا درس قرآن بن گیا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے آپ ہی کی وجہ سے پنجاب میں درس قرآن کا ذوق عام ہوا اور جگہ جگہ اس کی بنیاد پڑی۔ یہاں تک کہ کسی بڑی مسجد اور پڑھے لکھے مسلمان محلہ کے لیے درس قرآن ایسا ضروری کام ہو گیا جس کے بغیر مسجد آباد اور خطیب کامیاب اور مفید نہیں سمجھا جاتا۔ معمولاً آپ کے درس کے دو اوقات تھے۔ ایک فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد۔ یہ عام درس تھا اور ایک مغرب کے بعد یہ انگریزی داں طبقے اور کالجوں کے طلبہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس درس میں صرف جمعہ کے دن ناغہ ہوتا تھا یا جب مولانا سفر میں ہوں اس کے علاوہ چھٹی یا ناغہ کا کوئی دستور نہ تھا۔ بعض اوقات گھر میں میت رکھی ہوئی ہے اور مولانا اپنے درس کا معمول پورا فرما رہے ہیں درس کے بعد حادثہ کی اطلاع دیتے ہیں اور لوگ میت کے جنازہ میں شریک ہوتے ہیں۔

آخر شعبان سے ایک نئے درس کا اضافہ ہوتا تھا "یہ علماء کرام کی کلاس" کہلاتی تھی یہ آخر شعبان سے شروع ہو کر غالباً آخر شوال میں ختم ہوتا تھا۔ یہ درس تین تین چار چار گھنٹے جاری رہتا تھا۔ مولانا کا معمول تھا کہ پہلے امتحان لیتے پھر سبق پڑھاتے۔ اس درس میں صرف مدارس عربیہ کے فارغین اور آخری درجوں کے مستعد طالب علم لیے جاتے تھے۔ ان کی تعداد معمولاً پچاس وسو کے درمیان ہوتی تھی۔ آخر میں آخری امتحان ہوتا تھا اور پھر کسی صاحب نسبت بزرگ کے ہاتھ سے سندیں دی جاتی تھیں۔ یہ سند مطبوعہ ہوتی تھی۔ اس کا مضمون جو عربی میں تھا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ اس پر حضرت شاہ صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور غالباً حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے دستخط تھے۔

کبھی کبھی اثناء سال میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس ہوتا تھا۔ مولانا کو اس کتاب کا بھی بڑا ذوق تھا اور انھوں نے بڑی محنت سے اس کو اپنے استاد و مربی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے پڑھا تھا۔ اور بڑے جوش اور ولولے سے پڑھاتے تھے۔ یہ درس بھی طویل ہوتا تھا اور کئی کئی گھنٹے مسلسل جاری رہتا تھا۔ آخر میں اس کا بھی لاہور کے کوئی ممتاز عالم امتحان لیتے تھے اور نمبر دیتے تھے۔ راقم سطور کو بھی اس درس میں شرکت کرنے اور امتحان دینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حجۃ اللہ کے علاوہ شاہ صاحب کی فوز الکبیر اور موطا امام مالک کا درس بھی بڑے ذوق و شوق سے دیتے تھے۔

قرآن مجید کے درس میں مولانا اپنے استاد مولانا عبید اللہ سندھی کے پورے متبع اور پیرو تھے اور ان کو ان کے طرز پر بڑا اعتماد تھا اس طرز کی خصوصیت الاعتبار والتاویل کے طرز پر (جس کی مثالیں صوفیاء کرام کی کتابوں اور ان کے متصوفانہ نکات اور استنباطات میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں) سیاست اور واقعات حاضرہ کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید پر غور وفکر کرنا اور اس سے سیاسی اشارات اور رہنمائی حاصل کرنا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرز میں صاف وہ اثرات جھلکتے ہیں جو تحریک خلافت کے دور کی انگریز دشمنی اور اسلامی حکومت کے قیام اور آزادی کی والہانہ خواہش کا نتیجہ تھے اور ان سے وہ سیاسی استغراق ظاہر ہوتا تھا جو اس عہد کی خصوصیت ہے۔ ان استنباطات کی علمی وتفسیری قدر وقیمت کے متعلق خواہ کوئی کتنا ہی شبہ کرے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا احمد علی صاحب کی گہری روحانیت، باطنی تاثیر اور ان کا جذبہ اس پر ایسا حاوی تھا کہ وہ درس روحانی واخلاقی طور پر طلبہ کے لیے بڑے بڑے علمی درسوں سے کہیں زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوتا تھا۔ خاص طور پر مولانا جب توحید خالص کا مضمون بیان کرتے (جس کی تقریب مولانا اپنے دعوتی جذبے کی بنا پر اکثر پیدا فرما لیا کرتے اور قرآن مجید کے مضامین ان کی مدد کرتے) اہل اللہ خصوصاً اپنے سلسلہ کے مشائخ کے تعلق باللہ، توکل اور روحانیت کے واقعات بیان کرتے یا الحب للہ والبغض للہ کا مضمون بیان فرماتے اور اس سلسلہ میں اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ، کی تفسیر بیان فرماتے اور حکومت برطانیہ کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کرتے تو قلب پر عجیب اثر ہوتا اور یہی اس درس کی اصل قدر وقیمت تھی۔ اہل اللہ کے واقعات میں ایسا سوز وگداز ہوتا کہ اس سلسلہ کے مضامین بجلی کا اثر رکھتے تھے اور ان سے ذکر الٰہی و خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، راقم سطور کو جو اس سے پہلے ایک خالص ادبی، علمی ماحول میں رہا تھا مردان خدا کی خدمت میں حاضر ہونے ان سے تعلق پیدا کرنے اور اپنے نفس کی اصلاح کا شوق اسی درس سے پیدا ہوا اور یہ اس درس کا احسان عظیم ہے۔ بعد میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ترجمہ و تفسیر قرآن کے اسباق سپرد ہوئے تو اس درس سے مجھے مدد ملی۔

تبلیغی واصلاحی خدمات

مولانا سے اللہ تعالیٰ نے جو سب سے بڑا کام لیا وہ عقائد و رسوم کی اصلاح اور توحید وسنت کی اشاعت ہے وہ

حضرات دیوبند کے مسلک پر پورے طور پر عامل اور اس کے پُرجوش مبلغ اور داعی تھے۔ توحید میں ان کا ذوق اور رجحان حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے حضرت مولانا حسین علی صاحب (واں بھچراں) سے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ بھی بہت محبت فرماتے تھے اور انجمن خدام الدین کے جلسوں میں آیا کرتے تھے۔ راقم سطور کے محدود علم میں پنجاب اور سندھ میں جتنا مولانا کے مواعظ اور ان کے تبلیغی رسائل اور درس قرآن اور پھر بیعت و ارشاد کے تعلق سے دینی نفع پہونچا۔ کم لوگوں سے اتنا نفع پہونچا ہوگا۔ توحید و سنت کی صاف و بے لاگ دعوت کے ساتھ ان میں تصوف کی چاشنی سیاست اور حالات حاضرہ کی بصیرت، اخلاق کی وسعت اور عوام و خواص سے مناسبت بھی جمع تھی جس نے ان کے حلقہ اصلاح کو بہت وسیع اور متنوع بنا دیا تھا۔

افادہ و اصلاح کا ایک بڑا موثر ذریعہ اُن کے جمعہ کے خطبات تھے۔ میرے علم میں لاہور کی کسی مسجد میں اتنا کثیر مجمع اتنے ذوق و شوق کے ساتھ خطبہ سننے نہیں آتا تھا۔ مولانا عربی کے خطبہ جمعہ سے پہلے پورے ایک گھنٹہ تقریر کرتے تھے۔ تقریر زندگی اور واقعات سے قریبی تعلق رکھتی تھی اس میں معاشرہ کی خرابیوں اور لوگوں کے اخلاقی و دینی بیماریوں کی نشان دہی ہوتی تھی اور غلط رجحانات حکومت وقت کی بے دینی اور اس کے انحراف پر اتنی صاف اور کھلی ہوئی تنقید ہوتی تھی جس کی نظیر اس زمانہ میں مشکل ہے۔ بولنے والے کا اخلاص، اس کی بے غرضی، اعتماد علی اللہ، نتائج و عواقب سے بے نیازی اور دین کے لیے دل سوزی اور درد مندی، لوگوں کو مسحور کر لیتی تھی، بہت سی آنکھیں اشکبار نظر آتی تھیں اور بہت سے سر ندامت سے جھکے ہوئے۔ انگریزوں کے عہد اور قیام پاکستان کے زمانہ میں مولانا کی یہ حق گوئی اور بے باکی یکساں طور پر قائم رہی اس میں نہ حکومت کی تمیز تھی نہ جمہور کی۔ اہل شہر کی اخلاقی پستی، تعیش کے رجحان اور اسلامی قانون کی مخالفت کو بڑی بے باکی اور صفائی سے بیان فرماتے تھے، بداخلاقی اور فسق و فجور کے مرکزوں کو شمار کر کے بتاتے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتے۔ اکثر درس میں فرماتے۔ اے اٹھارہ لاکھ لاہوریو! میں تم میں چھیالیس برس سے رہتا ہوں اور قرآن سناتا ہوں لیکن انسان کی صورت کو ترستا ہوں تم سب کچھ ہو

لیکن انسان نہیں ہو۔ مولانا کی تقریریں سُن کر اکثر اقبال کا یہ شعر یاد آتا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اسی حق گوئی کی پاداش میں مولانا انگریزوں کے عہد میں بھی کئی مرتبہ جیل گئے اور پاکستان بننے کے بعد بھی (تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں) جیل تشریف لے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت دار و رسن کے لیے تیار بیٹھے ہیں، آخر دور میں علماء کی تنظیم فرمائی اور پاکستان کے مختلف مقامات پر تقریر کر کے حکومت پاکستان کی دینی مداخلت کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی۔

اپنے اساتذہ اور مشائخ سے تعلق

جن خوش نصیبوں کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے اور درس و مجالس ذکر میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ واقف ہیں کہ مولانا کو اپنے علمی و روحانی مربیوں اور محسنوں سے کتنا گہرا اور والہانہ تعلق تھا۔ یہ ان کی فطری سعادت وفاداری اور شرافت نفس کی دلیل تھی۔ اپنے استاذ اور مربی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے اپنی وفاداری کا حق ادا کردیا اور ان کے طریقہ درس کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہونچا دیا، مولانا عبید اللہ صاحب کے ہندوستان آمد کے موقع پر جب کہ وہ شیخ وقت اور مرجع خلائق بن گئے تھے ایک ادنی طالب علم اور خادم کی طرح اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا۔ اگرچہ ایک موقع پر انھوں نے اپنے استاد سے اختلاف کیا اور جمعیۃ العلماء کے مسلک پر قائم رہے۔ لیکن یہ ایک اصولی اختلاف تھا جس کا اُن کے ذاتی تعلق اور نیاز مندی پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ اور آخر تک ان کے ادب و احترام اور بزرگداشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا سندھ کے مشہور قادری راشدی سلسلہ میں مجاز تھے اور ان کو اس سلسلہ کے دو مشائخ کبار حضرت سید تاج الدین محمود امروٹی اور حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری سے خلافت حاصل تھی، مولانا کا مشکل سے کوئی درس اور کوئی مجلس ذکر ان دونوں حضرات کے

تذکرہ سے خالی جاتی تھی۔ تذکرہ بھی ایسے والہانہ اور عاشقانہ انداز میں جس سے ان کی قلبی کیفیت اور گہری عقیدت صاف جھلکتی تھی وہ اپنے کو بالکل ان کا پروردۂ نعمت اور ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے اور ان کا ہر بن مو ان کے تشکر اور تعریف سے رطب اللسان تھا۔ برسوں گذر جانے اور ہزاروں بار تذکرہ کرنے کے باوجود اس میں وہی تازگی اور چاشنی تھی اور مولانا کبھی اس تذکرہ سے سیر نہ ہوتے تھے گویا مولانا کا عمل اس شعر پر تھا۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ
ھو المسک ما کررتہ یتضوع

ادب و تواضع مولانا جہاں اہل دُنیا اور اہل دول کے سامنے بڑے خود دار اور غیور واقع ہوئے تھے اہل دین اور خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے سامنے جن کو اپنے مشائخ اور اکابر کی صف میں شمار کرتے تھے حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے علماء حق سے نہایت جھک کر اور فروتنی کے ساتھ ملتے تھے اور ان کی نہایت تعظیم کرتے تھے دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ان کو اپنے اساتذہ کی صف میں سمجھتے ہیں اور اپنے کو اُن کے سامنے ایک طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

معاصر علماء و مشائخ میں سے ان کو دو شخصیتوں سے بے حد عقیدت تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا معاملہ کرتے تھے ایک حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک ہمارے حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہ۔ دیکھنے والوں نے بارہا دیکھا ہے کہ مولانا، حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ دو زانو اس طرح مراقب ہو کر بیٹھ گئے ہیں جیسے کوئی مرید رشید اپنے شیخ کے سامنے۔ اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی تو نہایت ادب کے ساتھ مختصر اور بقدر ضرورت جواب دیا پھر خاموش ہو گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ ابتداءً کوئی سوال کیا ہو یا کسی گفتگو میں حصہ لیا ہو۔

مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بڑے معتقد اور ادب شناس تھے جب تک شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ زندہ رہے ان کی خدمت میں مخلصانہ حاضری دیتے رہے اور اپنا بڑا سمجھتے رہے۔ لاہور میں جن علماء سے کچھ استفادہ کیا تھا یا جن کو عالم یا اہل حق میں

سمجھتے تھے ان سے بھی خوردی اور نیاز مندی سے ملتے تھے۔

مشغولیت و مقبولیت مولانا کی زندگی حد درجہ مشغولیت و انہماک اور مجاہدہ و محنت کی زندگی تھی درس کے علاوہ ملاقاتیں، مسائل شرعیہ کا جواب، تلقین ذکر لوگوں کے حالات کا استفسار اور ہمدردی، غرض مشاغل کا ایک سلسلہ تھا جو برابر جاری رہتا بعض وقت ملاقات کے شائقین کو جو دور دور سے آتے تھے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور دیر دیر میں باری آتی، میں نے سنا ہے کہ آخر میں نہایت سربرآوردہ اور صاحب وجاہت اشخاص کو کئی کئی دن کے انتظار کے بعد ملنے کا موقع ملتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مقبول بندوں کے ساتھ معاملہ ہے آخر میں مقبولیت اور رجوع خلائق بہت بڑھ گیا تھا اور مولانا کو زائرین اور معتقدین کے ہجوم اور ان کی کاربراری سے کھانے اور سونے کی فرصت ملنی مشکل ہو جاتی تھی۔ اور نظام اوقات درہم برہم ہو جاتا تھا بعض دن ناشتہ کی نوبت نہ آتی اور بعض وقت کھانا وقت سے بے وقت ہو جاتا۔ جنازہ میں لوگوں کا پروانہ وار ہجوم اور اجتماع عظیم تو وہ منظر تھا جو لاہور کے عظیم شہر نے مدت دراز سے نہیں دیکھا تھا اور شاید مدت دراز تک نہ دیکھے۔ وہ جب لاہور آئے یا لائے گئے تھے تو تنہا تھے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا تھا لیکن جب اس شہر کو داغ مفارقت دیا تو اللہ کے بندوں کا اتنا بڑا مجمع تھا جس کا شمار آسان نہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا
فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝

بقیہ صہ ۱۴۳

ہمدردی کے مستحق ہیں جن کی وہ اعانت اور سرپرستی فرماتے تھے۔

اس ناچیز کے لیے یہ حادثہ گویا ذاتی ہے۔ ناظرین کرام سے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے کہ مولانا مرحوم کے لیے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور ان کے تمام متعلقین اور پسماندگان کے لیے صبر و اجر کی اور ان کے خیر کے سارے کاموں کے لیے جاری اور باقی رہنے کی اہتمام سے دعا فرمائیں۔　　جدہ ۲۷ ر اپریل ۱۹۶۳ء

محمد منظور نعمانی

مولانا محمد ابن موسیٰ میاں سورتی افریقی رح

(ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

الحاج مولانا محمد میاں بن موسیٰ میاں سورتی (مقیم جوہانسبرگ ٹرانسوال جنوبی افریقہ) کا نام نامی مجلس علمی (سملک و کراچی) کے بانی اور سرپرست کی حیثیت سے "مسند حمیدی" کے تعارف کے سلسلہ میں الفرقان کے گذشتہ ہی شمارہ میں ناظرین کرام نے پڑھا ہوگا اس سے پہلے بھی دین اور علم دین کی بعض اہم خدمتوں کے سلسلے میں الفرقان کے صفحات میں ان کا نام بارہا آیا ہے۔

۲۳ر اپریل کو جب کہ راقم سطور حجاز مقدس کے ارادہ سے بمبئی روانہ ہونے کے لیے تیار تھا بالکل اچانک مولانا محمد سعید صاحب (مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت) کا خط ملا جس میں بہت مختصر الفاظ میں یہ انتہائی غمناک اطلاع درج تھی کہ ۱۶ر اپریل منگل کے دن حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاں کا جوہانسبرگ میں انتقال ہوگیا۔ چونکہ اس سے پہلے علالت وغیرہ کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور مولانا محمد سعید صاحب کے خط میں بہت ہی مختصر لفظوں میں انتقال کی اطلاع دی گئی تھی اس لیے دل اگرچہ قدرتی طور پر متاثر ضرور ہوا لیکن خبر کے بارہ میں پوری طرح اطمینان نہیں ہوا۔ ۲۳ر اپریل کو لکھنؤ سے روانہ ہوکر ۲۵ر کو بمبئی پہونچنے کے بعد بعض ایسے حضرات سے دریافت کیا جن کے متعلق اندازہ تھا کہ اگر یہ سانحہ واقع ہوچکا ہے تو ان کو ضرور اطلاع ہوگی مگر اس وقت تک ان کو بھی خبر نہیں تھی لیکن اگلے دن ۲۶ر اپریل کو ایک صاحب سے اور اس کے بعد اخبار منادی سورت سے اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ جو لوگ مولانا مرحوم کو جانتے ہیں ان کے نزدیک اس سال کا یہ بڑا سانحہ ہے۔

اللهم اغفر له وارفع درجته في المهديين واخلفه في عقبه في الغابرين

واغفر لنا ولہ یارب العٰلمین، وافسح فی قبرہ ونور لہ فیہ۔

آج بمبئی سے روانہ ہو کر بعد جدہ پہونچ گیا ہوں اور یہ سطریں لکھ رہا ہوں "کل نفس ذائقۃ الموت" کے اٹل قانون کے مطابق ہر زندہ ہستی کی آخری منزل موت ہی ہے انبیاء علیہم السلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اس حیثیت سے کسی کی بھی موت غیر معمولی اور غیر متوقع حادثہ نہیں ہونی چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں سے خیر اور نفع کے اہم اور وسیع سلسلے جاری کراتا ہے ان کی موت قدرتی طور پر غیر معمولی محسوس کی جاتی ہے۔ مولانا محمد بن موسیٰ میاں بھی ان ہی بندوں میں سے تھے اللہ تعالیٰ نے ان میں خیر و نفع کی بہت سی وہ چیزیں جمع فرمادی تھیں جو شاذ و نادر ہی کہیں جمع ہوتی ہیں۔

اولاً وہ ایک وسیع النظر اور جید عالم تھے، استاذنا استاذ العلماء حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے سعید ترین اور رشید ترین تلامذہ میں تھے، جس زمانہ میں ناچیز راقم سطور دار العلوم دیوبند میں پڑھتا تھا وہ بھی اسی زمانہ میں دار العلوم کے طالب علم تھے۔ دورۂ حدیث انھوں نے ناچیز سے ایک سال پہلے پڑھا، طالب علمی اور نوجوانی کے اس زمانہ میں بھی صلاح و تقویٰ ان کا شعار تھا۔ دار العلوم دیوبند کی اس رفاقت کے بعد پھر کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن دوسرے ذرائع سے حالات معلوم ہوتے رہے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی کچھ قائم رہا، جو ادھر ۱۰-۱۵ سال سے بہت بڑھ گیا تھا۔

علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کی عظیم نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دولت دنیا بھی بھرپور عطا کی تھی اور دین و علم دین کی راہ میں اللہ کی توفیق سے اس کو بھرپور ہی خرچ بھی کرتے تھے۔ ناچیز کا اندازہ ہے کہ ان کے مصارف خیر کی تعداد ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہونچتی ہو گی۔ پھر ان مصارف کی انواع بہت مختلف تھیں۔ مجلس علمی کے تو گویا وہی بانی اور روح رواں تھے، اور انھیں کا سرمایہ اس کا اصل سرمایہ تھا۔ مجلس علمی کے کاموں کا ذکر کبھی کبھی الفرقان میں آتا رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور استاذنا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نہایت نفع مند تصانیف کے علاوہ امام زیلعی کی نصب الرایہ اور مسند حمیدی جو ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہیں اور مصنف عبد الرزاق پر اس کی طرف سے جو کام ہو رہا ہے صرف یہی کام اچھے خاصے خزانے

کو چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے بعد بھی مجلس علمی کے ان کاموں کا سلسلہ جاری اور ان کے صاحب زادوں کو جو بفضلہ تعالیٰ ان کے علم اور دین کے بھی وارث ہیں اس خیر کو جاری رکھنے کی توفیق دے۔

ضلع سورت اور اس کے اطراف میں دینی تعلیم کے مکاتب کا ایک وسیع نظام "انجمن خدام الدین" کے عنوان سے جاری ہے اس کے بانی اور روح رواں بھی مولانا محمد بن موسیٰ میاں ہی تھے، یہ نظام اس قدر باقاعدہ اور مستحکم ہے کہ مختلف صوبوں اور علاقوں میں چلنے والی دینی تعلیم کی تحریکوں کو اس کے طریق کار اور دفتری نظام سے استفادہ کرنا چاہیے اس تعلیمی نظام پر بھی غالباً وہ ہزاروں ماہوار خرچ کرتے تھے اس کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان سیکڑوں دینی مدارس اور دینی اداروں کی مستقل امداد فرماتے تھے جن کے متعلق اطمینان تھا کہ ان کا نظام اور کام قابل اعتماد ہاتھوں میں ہے، اسی طرح مفید دینی تحریکوں کی بھی وسیع پیمانہ پر امداد فرماتے تھے۔

اس سب کے علاوہ جن جن حضرات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ دین یا علم دین کی فلاں خدمت کر رہے ہیں، ان کو بڑے اکرام کے ساتھ مسلسل ہدیے بھیجتے تھے اور اپنے بے تکلف دوستوں سے اس بارہ میں برابر معلومات حاصل کرتے رہتے تھے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ان کے دریافت کرنے پر بعض حضرات کے بارے میں راقم سطور نے ان کو لکھا کہ وہ دین کی فلاں خدمت میں مشغول ہیں اور ان کے یہ حالات ہیں تو انھوں نے اس اطلاع پر دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کیا اور بہت ممنونیت کا اظہار فرمایا۔

اس ناچیز پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل رہا ہے کہ جن اکابر علما یا صلحا کا زمانہ پایا اکثر و بیشتر ان کی زیارت بھی نصیب ہوئی لیکن ایسا بندہ ایک ہی دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری چیزیں جمع فرما دی تھیں اور اس کی ذات سے خیر کے اتنے سلسلے جاری تھے۔

اپنے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری سے ان کو عشق تھا اور اس دور کے اکابر میں سے خاص عقیدت اور مناسبت حکیم الامتہ حضرت تھانویؒ سے تھی۔

ان کا انتقال ہمارے دینی حلقے اور اس دور کے دینی کاموں کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے اور ان کے گھر والوں کے علاوہ وہ سارے دینی ادارے اور دینی کام بھی تعزیت اور

(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

محمد منظور نعمانی

ایک مردِ مومن کی وفات

(حاجی عبداللہ احمد امراؤتی)

(ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

دنیا کے اس کارخانہ میں موت وحیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جو یہاں پیدا ہوا ہے اور جی رہا ہے ایک دن یہاں سے اس کا کوچ کرجانا یقینی ہے، اس لیے کسی کی موت بجائے خود کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں، لیکن اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی علاقہ میں اپنی ذات سے خیر اور بھلائی کا ایک ادارہ ہوتے ہیں، اور ان کے اس دنیا سے جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ علاقہ خیر کے اس ادارہ اور سلسلہ سے محروم ہوگیا۔

امراؤتی (برار) میں ایک میمن تاجر حاجی عبداللہ احمد صاحب اسی قسم کے ایک مردِ مومن تھے۔ دولت کے لحاظ سے کوئی بہت بڑے سیٹھ نہیں تھے لیکن اخلاقی بلندی اور نیکی اور خدمت کے کاموں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے پورے علاقہ میں ان کی ساکھ بہت اونچی تھی، بڑے سمجھدار اور بڑے پختہ دیندار تھے اور ان کی دینداری میں بڑا اعتدال اور توازن تھا، دین کی فکر اور مسلمانوں کا درد گویا زندگی کی روح تھی، عمر اب نوے سے متجاوز ہوچکی تھی لیکن ضعفِ پیری کے باوجود دینی اور ملی کاموں میں جوانوں کی طرح حصہ لیتے تھے برار میں ہونے والے اکثر دینی وملی تعلیمی وتبلیغی کاموں کا سلسلۂ نسب حاجی صاحب ہی سے ملتا ہے —— یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک دینی وملی انجمن اور تعلیمی تبلیغی اور اشاعتی ادارہ تھے —— ۵۰ء کے آخر یا ۵۱ء کے شروع میں امراؤتی میں اسی قسم کا ایک فساد برپا کیا گیا جس قسم کے فسادات ۴۷ء کے بعد سے ہندستان کے بہت سے

شہروں میں ہوتے رہے ہیں اور جن کا نشانہ مسلمان بنتے رہے ہیں۔ کچھی بازار امراوتی کا بڑا بازار ہے۔ اس میں مسلمان میمن تاجروں کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں انھیں میں حاجی صاحب کی بھی ایک دوکان تھی جس کی عمارت بھی انہیں کی ذاتی جائداد تھی، لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا اس میں مال بھی تھا اور وہی ان کا سارا اثاثہ تھا۔ ان دوکانوں کو حسب معمول لوٹا اور جلایا گیا، حاجی صاحب اور ان کے اہل وعیال اس حال میں جان بچا کر کسی طرح نکل سکے کہ جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ گھر والوں نے امراوتی چھوڑ کے پاکستان جا بسنے کے لیے اصرار کیا جہاں تعلقات اور اثرات کی بنا پر ان کو بہت اچھے مستقبل کی امید ہو سکتی تھی لیکن حاجی صاحب یہاں سے جانے پر صرف اس لیے آمادہ نہیں ہوئے کہ میرے جانے سے یہاں کے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوگی اور جن دینی و ملی کاموں سے میرا تعلق ہے خدانخواستہ ان پر اثر پڑے گا ——— فساد کی اس تباہی و بربادی کے بعد حاجی صاحب درحقیقت بالکل خالی ہاتھ رہ گئے تھے، لیکن ایمان کی طاقت نے ان کو سہارا دیا اور انھوں نے بالکل نئے سرے سے کسی طرح کاروباری زندگی پھر شروع کی اور بظاہر اسی طرح اور اسی شان کے ساتھ رہے جس طرح اور جس شان سے وہ امراوتی میں پہلے رہتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہ ۱۲-۱۳ سال بڑے ابتلا میں گزرے گر دینی و ملی فکروں اور کوششوں میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، بلکہ راقم سطور کا اندازہ ہے کہ اضافہ ہی ہوتا رہا ——— بعض دینی سفروں میں ان کے ساتھ رہنا ہوا میں نے ان کو راتوں میں اللہ کے حضور میں بلک بلک کے روتا ہوا دیکھا ——— اپنی زندگی میں جن چند آدمیوں کو دیکھ کر مجھے اُن پر رشک آیا ان میں سے ایک یہ حاجی عبداللہ احمد صاحب بھی تھے ——— بیماری اور اس کی شدت و خطرناکی کی اطلاع تو کوئی دو ہفتہ پہلے ہو گئی تھی، اب ۲۷ر جولائی کو ان کے صاحبزادے عبدالقادر سلمہٗ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ یکم ربیع الاول کی صبح کو حاجی صاحب اللہ تعالیٰ کے جوارِ رحمت کی طرف منتقل ہو گئے اناللہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے اور ان کے پسماندگان اور متعلقین کی وہ خاص مدد فرمائے، ان کے دلوں کو وہ صبر اور سہارا دے جس کے وہ اس وقت خاص طور سے محتاج ہیں ——— ناظرین کرام سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ

(ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

دین کے احیاء کی وہ تحریک جسے "تبلیغی کام" سے موسوم کیا جاتا ہے جو شخص بھی اس کی جس قدر افادیت کا قائل ہے اسی قدر رنج و الم کے ساتھ اس نے یہ خبر سنی ہوگی کہ اس کام کے سربراہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اچانک وفات پائی۔ اور احیاء دین کی اس جد و جہد کی وہ مثالی شخصیت جس کے جذبہ و عمل کے مشاہدے اور جس کے انفاس گرم کی تاثیر سے کتنوں ہی کو ہمہ سوز و ہمہ عمل ہو جانے کی توفیق ملی وہ آج راہ خدا کے ان دیوانوں کے درمیان موجود نہیں ہے۔

بے شک بقاء و دوام اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کی اس دنیا میں کسی کو موت سے رستگاری نہیں۔ لیکن یہ بھی حق ہے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا نے جس راہ پر دیوانہ وار چلتے ہوئے جان دی ہے یہ اسی عشق کی راہ ہے جس میں مر کر بھی آدمی مرتا نہیں۔ اُس کی صرف یاد زندہ نہیں رہتی بلکہ اس یاد کے اثرات سے دلوں کو زندگی ملتی ہے اور یہی حیات دوام ہے جو صرف عشاق کے نصیب میں آتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا بھی کون مسلمان ہوگا جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام نامی سے آشنا نہ ہو۔ آپ کے عظیم المرتبت والد ماجد حضرت

مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۴۰ برس پہلے دین کی عمومی دعوت اور اس کے احیاء کی جو عظیم مگر سادہ جد و جہد اپنی مومنانہ بصیرت اور ایک والہانہ سوز و تڑپ کے اثر سے شروع کی تھی، مولانا کے انتقال پر (یعنی اب سے ۲۰ برس قبل) اس کی گراں بار ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آئیں جبکہ آپ کا سن ۳۰ برس کے اندر تھا۔ مگر آپ کی خداداد صلاحیتوں نے اس بیس برس کے اندر اس دینی تحریک کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ پہلے جس کام کا دائرہ عمل غیر منقسم ہندوستان کے اندر محدود تھا اب اس کی جڑیں روئے زمین کے ہر ہر خطہ میں جا پہونچیں اور خود ہندوستان و پاکستان کے اندر وہ مناظر اس کام کی وسعت و مقبولیت کے آج آئے دن نظر آتے ہیں۔ جو کل صرف آرزوؤں اور تمناؤں کا درجہ رکھتے تھے ——

غرض وہ پودا جو تھوڑی سی ہی نشو و نما حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی زندگی میں پا سکا تھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مجاہدانہ کوششوں اور وہبی صلاحیتوں سے ایک قد آور درخت کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا

افسوس اس ہستی کا چراغ حیات ۲ر اپریل (۲۹ر ذی قعدہ) یوم جمعہ کی سہ پہر کو لاہور کی سرزمین پر آناً فاناً گل ہو گیا۔ ایک ہستی کا چراغ نہیں بجھا دین کا ایک روشن چراغ بجھ گیا۔ روشنی کا ایک بلند مینار گر گیا۔ دین کے لیے سوز و تڑپ کی ایک تصویر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، جسے دیکھ دیکھ کر ہر دن اور ہر رات نہ معلوم کتنے دلوں میں اسی تڑپ کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں —— خدا اپنی رحمت بے پایاں کی بارشیں ان کی روح پر فرمائے اور اس عظیم خلا کو اپنی قدرت خاص سے پُر فرمائے جو ان کی اچانک وفات سے پیدا ہو گیا ہے ——

مولانا کا لاہور میں قیام اسی دینی دعوت کے سلسلے میں تھا جس کے لیے ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف تھا۔ شوال کے پہلے (اور فروری کے دوسرے) ہفتے میں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ پاکستانی احباب کی دعوت پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک لمبے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ لاہور اس سفر کی آخری منزل تھی اور ۲ر اپریل ۲۹ر ذی قعدہ ہی کی تاریخ دہلی واپس ہونے کے لیے مقرر تھی۔

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

—— واپسی ٹھیک اسی تاریخ کو ہوئی مگر کس طرح کہ وہ لاہور ہی میں جمعہ وعصر کے مابین ابدی نیند سو چکے تھے اور اسی نیند کے عالم میں شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز انھیں دہلی کے ہوائی اڈہ پر لے کر اترا اور وہ تبلیغی مرکز و مسجد جہاں دوسرے دن صبح کو ان کے ارشادات سننے اور ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے دور دور سے سمٹ کر مشتاقوں کا مجمع ہونا تھا اُن کے اشکبار سوگواروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور مسجد کیا بھری ہوئی تھی دہلی بھری ہوئی تھی۔

افسوس یہ کیسی بجلی ملت کے شکستہ ایوان پر گری اور کیسی نعمت چشم زدن میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ ابھی مولانا کی عمر پچاس سال کی بھی نہ تھی۔ قویٰ مضبوط اور جسم تنومند تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ دل سے جتنا کام لیتے تھے اور اعصاب پر جتنی شدید محنت کا بوجھ انھوں نے ڈال رکھا تھا اُس میں ظاہری قوت وصحت کے باوجود دل کا جواب دے جانا کوئی بہت حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ دن ورات میں کئی کئی بار طویل طویل خطابات، پھر ان خطابات میں ایک جذبہ وحال۔ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے کام کی فکر و تگ ودو انتھک، آرام سے بے نیازی، صحت و مرض کی تفریق سے لاپروائی، ہر لمحہ محویت کا عالم، یہ ایسی چیزیں نہیں جنھیں قلب و اعصاب بڑی مدت تک برداشت کر سکیں۔ بے شک یہ بڑا ہی عظیم خسارہ ہے کہ دین کے احیاء کی جدوجہد کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار ہستی یوں آن کی آن میں دُنیا سے اُٹھ گئی۔ مگر انھوں نے ایک نمونہ دیا ہے کہ آدمی کمر باندھے تو دین کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ایسے زندۂ جاوید لوگ جب اُٹھتے ہیں تو اپنے پیچھے میدان خالی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کی موت سے زندگی کے چشمے اُبلتے ہیں، وہ ایک روح ایک کی جگہ کتنوں ہی میں سرایت کرتی ہے اور جو جذبہ ایک ذات میں محدود تھا وہ موت کے بعد کتنوں ہی کی میراث بن جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس حادثہ کا صرف صدمہ ہی ملت کے حصے میں نہیں آئے گا بلکہ اس کا یہ صلہ بھی خدا کی رحمت سے بھرپور عطا ہو گا۔

کچھ تفصیلات ان سطروں کی تحریر کے بعد مولانا کے سانحۂ ارتحال کی کچھ تفصیلات علم میں آئی ہیں جن کا اضافہ مناسب ہو گا۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی طبیعت کچھ پہلے سے مضمحل چل رہی تھی۔ چہارشنبہ ۳۱ مارچ کے ایک پروگرام میں مولانا کی تقریر کے اندر نمایاں طور پر کچھ رکاوٹ اور نقاہت محسوس کی گئی اور اس کے بعد مولانا کے تمام پروگرام منسوخ کرنا طے کر دیا گیا۔ جمعرات یکم اپریل کو (غالباً بعد نماز مغرب) ایک عقد نکاح میں مولانا کو تقریر فرمانا تھی۔ یہ ذمہ داری بھی وقت پر مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے سپرد کر دی گئی اور وہ اس غرض کے لیے تشریف لے گئے لیکن بعض حضرات یہ دیکھ کر کہ بڑا ہی منتخب مجمع آیا ہوا ہے مولانا کی خدمت میں واپس آئے اور بالآخر مشورے سے مولانا ہی کو زحمت دیدی گئی مولانا نے تقریر فرمائی جس میں وہی نقاہت و رکاوٹ تھی۔ حد یہ ہے کہ اپنی عادت کے حیرت انگیز حد تک خلاف صرف ایک منٹ کی دعا فرمائی اور اس طرح تقریب کی تکمیل کر کے فوراً واپس ہو پڑے۔ قیام گاہ چونکہ بالکل ہی متصل تھی اس لیے سواری کا سوال نہ تھا۔ مگر قیام گاہ پکڑ نہ سکے راستے ہی میں بیہوشی طاری ہو گئی۔ پسینے سے تر بتر تھے۔ ہاتھوں ہاتھ قیام گاہ پر لائے گئے۔ حکیم ڈاکٹر کی دوڑ ہوئی گھنٹہ بھر کے بعد ہوش آیا۔ عشا کی نماز ساڑھے تین بجے اشاروں سے پڑھی۔ نماز فجر بھی اشاروں سے ادا ہوئی۔ رفیقوں سے معافی مانگی۔ ہر دم کے رفیق اور عزیز قریب مولانا انعام الحسن صاحب کو اپنی کتابوں کی زکوٰۃ نکال دینے کی وصیت کی ڈاکٹروں نے صبح کے معائنہ کے بعد کہا اب خطرے سے باہر ہیں مگر شدید احتیاط کی جائے، دوسرا دورہ ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ دہلی کو واپسی جو اسی جمعہ کے دن طے تھی اس کا تو اب سوال ہی کیا رہا تھا مگر قضا و قدر کے نوشتوں میں واپسی کی یہ تاریخ اٹل ہو چکی تھی۔ ٹھیک جس وقت جمعہ کا خطبہ شروع ہو رہا تھا حالت متغیر ہو گئی۔ قیام گاہ چونکہ بالکل متصل ہی تھی امام نے ہل چل محسوس کر لی۔ ماشاء اللہ فقیہ تھے اور رفیق بھی بے حد اختصار سے خطبہ اور نماز پوری کی۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ سانس اکھڑی ہوئی تھی مگر ہوش و حواس قائم تھے۔ مولانا انعام صاحب سے سانس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی سمجھ تو چکے تھے مگر کہا شاید بلغم پھنس رہا ہے۔ فرمایا نہیں سانس پھنس رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر آ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب آکسیجن کی منزل ہے۔ فوراً اسپتال کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اسپتال کی بات سُنی تو فرمایا وہاں نرس ہوتی ہیں میں نہ جاؤں گا۔ پاکستان کے بااثر اشخاص نیازمندوں میں تھے۔ عرض کیا حضرت ایک نرس بھی پاس نہ آپائے گی۔ آپ اطمینان فرمائیں۔ فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ از راہ عجلت ایک بڑی کار میں جو وہاں بہت سی

(باقی [illegible] پر)

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ

(رجب ۱۳۸۵ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

آج ہی ۳۰ر نومبر کو عصر و مغرب کے درمیان اس عظیم سانحہ کی خبر ملی کہ شیخ وقت اور جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم مدینہ طیبہ) کا وصال ہو گیا — انا للہ وانا الیہ راجعون — اللھم اغفر لہ وارحمہ واکرم نزلہ والحقہ بسلفہ الصالحین من عبادک الذین رضیت عنہم ورضوا عنک۔

اس دنیا میں کسی آدمی کا پیدا ہونا اور اٹھ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان اس دنیا میں آتے ہیں اور اسی طرح ہزاروں موت کے راستے سے چلے جاتے ہیں، لیکن وہ بندے جو اپنے احوال و اوصاف، اور فیوض و برکات کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں اُن میں سے کسی کا اُٹھ جانا بلاشبہ انسانی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے جس سے زمین و آسمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے۔

یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر او التمر لا یبالیھم اللہ بالۃ۔

اللہ کے نیک بندے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے اور ایسے لوگ رہ جائیں گے جو اُن کی نسبت سے ایسے ہوں گے جیسے جَو کی بھوسی یا سوکھی کھجوروں کے چھلکے جن کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

یہ گنہگار راقم السطور اپنے شعور کے گزشتہ قریباً چالیس سالوں میں یہ منظر برابر دیکھتا رہا ہے —

حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہما کی تو صرف زیارت نصیب ہوئی، ان کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس اور مرشدنا حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری (قدس اللہ اسرارہم) کا کچھ قرب تعلق بھی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ ان سب کی وفات پر یہی محسوس ہوا کہ دین اور علم و معرفت کا نور دنیا سے اٹھتا جا رہا ہے اور ظلمت اس کی جگہ لے رہی ہے —— ہمارے ان اکابر و مشائخ کی کچھ یادگاریں باقی تھیں اور باقی ہیں ان میں ایک بڑی صاحب فیض شخصیت حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ نے اسی سال ہم میں سے اٹھالیا اور وہ ہمارے اس سال کا بہت بڑا دینی سانحہ تھا، حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی وفات بھی ہماری دینی دنیا کا بڑا عظیم سانحہ ہے۔

مولانا موصوف شیخ وقت بھی تھے اور اس دور کے جلیل القدر عالم دین بھی، عصر حاضر کی خصوصیات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا اور علوم نبوت کی تشریح اس طرح کرنا جس سے اس دور کے پیدا شدہ مسائل بھی حل ہوں ان کا خاص امتیاز تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ترجمان السنہ" ان کے اس کمال کی آئینہ دار ہے —— افسوس کہ اس کی صرف ۴ جلدیں مولانا لکھ سکے جو شائع بھی ہو گئی ہیں۔ (چوتھی جلد حال ہی میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔)

مولانا مرحوم حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، پہلے دورۂ حدیث مظاہر العلوم میں پڑھ چکے تھے، اس کے بعد صرف حضرت شاہ صاحب سے علمی استفادہ کی غرض سے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیکر دوبارہ دورۂ حدیث یہاں پڑھا، پھر چند سال تک دار العلوم میں مدرس بھی رہے۔ بعد میں جب قضاء و قدر کے ایک فیصلہ نے حضرت شاہ صاحبؒ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کو جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل۔ سورت) بھیج دیا تو مولانا بدر عالم صاحب بھی جامعہ کے ایک استاذ کی حیثیت سے ان حضرات کے ساتھ یہاں آگئے اور یہاں کئی سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحبؒ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے درسی افادات قلم بند کرتے رہے جن کو بعد میں عربی میں مرتب کیا اور فیض الباری کے نام سے وہ چار جلدوں میں مصر میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۱۹۴۸ء میں مولانا ممدوح ہندوستان سے پاکستان چلے گئے اور ۴ سال کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہاں سے حجاز مقدس آگئے اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو کے ساتھ مدینہ طیبہ میں قیام کر لیا۔

کئی سال ہوئے موٹر کے ایک ایکسی ڈنٹ میں ایسے مجروح ہو گئے تھے کہ بچنے کی توقع نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ابھی زندہ رکھنے کا تھا، زندہ رہے لیکن اس کے بعد صرف لیٹے رہ سکتے تھے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھے مگر دینی وعلمی افادہ وافاضہ کا سلسلہ الحمد للہ جاری رہا۔ لیٹے لیٹے دینی اور اصلاحی گفتگو ہر وقت فرماتے رہتے تھے۔

عام مسلمانوں کے افکار وخیالات اور اعمال واخلاق کی اصلاح کے لیے "جواہر الحکم" کے نام سے آسان زبان میں احادیث نبویہ کی شرح کا ایک سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اب سے ۲ مہینے پہلے جب یہ عاجز مدینہ طیبہ حاضر ہوا، تو اس کا دوسرا حصہ عنایت فرمایا تھا، آج خبر وفات ملنے پر اس کو اٹھا کر دیکھا تو بسم اللہ اور حمد وصلوٰۃ کے بعد مولانا نے اس میں لکھا تھا:۔

"اس وقت عالم کے انقلابات کا ہولناک نقشہ اور علماء وصالحین کا بڑی تیزی سے اٹھتے چلے جانے کا عبرتناک سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لیے اس سلسلہ کی چند احادیث اس حصہ میں بے اختیار درج ہو گئی ہیں تاکہ اہل فہم وسعادت اپنی قلیل فرصت کو بے کار ضائع نہ کریں اور جتنی جلد ممکن ہو اعمال خیر میں ہمت سے کام لیں۔"

عجب نہیں کہ مولانا پر اپنی وفات کا قرب منکشف ہوا ہو، اور یہی اُن کے لیے اس سلسلہ کا باعث اور محرک ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے دینی وعلمی فیض کو تا قیامت جاری رکھے اور مسلسل ترقیات اور رفع درجات کا اس کو ذریعہ بنائے اور اپنی رحمت ورضا سے ان کو نوازے اور پسماندگان ومتعلقین کو صبر جمیل اور احتساب کی توفیق دے اور ان کی پوری سرپرستی ونگرانی فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

محمد منظور نعمانی

اللہ کے دو بندے

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ

و

حضرت مولانا شیر محمد سندھی مہاجر مدنیؒ

(ربیع الاول ۱۳۸۵ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

بلاشبہ زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ آدم کی اولاد اپنی دنیوی زندگی میں اس سے فائدہ اُٹھائے۔ اور خود آدمی کی تخلیق کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اور اس ساری کائنات کے خالق و مالک کو پہچانے اور اس کی عبادت و فرمانبرداری کے ذریعہ اس کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرے —— "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"

پھر اس مقصد کی طرف دعوت اور اس راستہ کی رہنمائی کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا گیا، سارے پیغمبر اسی لیے آئے کہ خدا کو پہچنوائیں، اس کی ذات و صفات کے بارہ میں بندوں کو بتائیں اور اس کی عبادت و فرمانبرداری کی دعوت و تعلیم دیں —— جو بندے اپنی تخلیق کے اس خاص مقصد سے غافل ہو کر صرف دنیا کے کیڑے اور نفس کے پجاری بن جائیں ان کی قدر و قیمت ان کے خالق و مالک کی نگاہ میں مکھی مچھر سے کچھ بھی زیادہ نہیں رہتی اور ایسے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ختم ہو جانے سے بھی اس دنیا کی قدر و قیمت اور معنویت میں کوئی کمی نہیں آتی، اور زمین و آسمان جو اس پوری دنیا کے لیے گویا ماں باپ کی طرح ہیں، کوئی رنج و صدمہ محسوس نہیں کرتے، ایسے ہی بعض انسانی گروہوں کی ہلاکت

وبربادی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ" (نہ تو ان پر زمین روئی اور نہ آسمان نے کوئی آنسو گرایا)

اس کے برعکس جو بندے اپنی تخلیق اور زندگی کے اس مقصد کو یاد رکھیں اور اللہ کے قرب و رضا کو اپنا نصب العین بنا کر اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں وہ اپنے خالق و مالک کی نگاہوں میں عزیز و محبوب ہوتے ہیں، انھیں کو عرف خاص میں "اَوْلیاءُ اللّٰہ" اور "خلفاء انبیا" کہا جاتا ہے، دور نبوت ختم ہونے کے بعد انھیں کے ذریعہ سے انبیاء علیہم السلام کے فیوض و برکات اس دنیا کو ملتے ہیں؛ وہ جب دنیا سے اٹھائے جائیں تو زمین و آسمان اور اللہ کے معصوم فرشتے احساس و تاثر اور رنج و غم میں ان کے متعلقین اور محبین کے شریک ہوتے ہیں، ان کی وفات خود ان کے حق میں محبوب حقیقی کا وصال اور ایک طرح کی معراج ہوتی ہے، لیکن ہماری اس دنیا کا ان کے انفاس کی برکات سے خالی ہو جانا دنیا کی روح کے لیے بڑا غمناک حادثہ ہوتا ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں ایسی ہی دو بابرکت ہستیوں سے ہماری دنیا خالی ہو گئی۔ ایک حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری قدس سرہٗ دوسرے حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھی ثم المدنی۔ مہاجر نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ

ہندوستان اور پاکستان کے اہل علم میں سے شاید کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو حضرت مولانا سے واقف نہ ہو۔ مدت دراز تک ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس رہے سلوک کی منزلیں اسی زمانہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی رہنمائی میں طے کیں اور اس طرح کہ اس سلسلہ کی ان کی پوری خط و کتابت اس راہ کے سالکین کے لیے مشعل راہ قرار دے کر "اشرف السوانح" کا جز بنا دی گئی۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے مولانا مرحوم کو صرف خلافت ہی سے سرفراز نہیں فرمایا بلکہ بیعت ہونے والے اکثر علماء و فضلاء کو حضرت قدس سرہ تربیت کے لیے حضرت کاملپوریؒ ہی کے سپرد فرماتے تھے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن کاملپور ہی میں تھے، ملک کی تقسیم

جن حالات میں اور جس طرح ہوئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے اس کا امکان ہی ختم کر دیا کہ حضرت ممدوح پھر سہارنپور تشریف لائیں۔ اور بلاشبہ اس میں بھی خیر کا یہ پہلو مضمر تھا کہ خطۂ پاکستان کو خاص ضرورت تھی کہ ایسی بابرکت ہستیاں وہاں رہیں ——— حضرت مولانا شروع میں کئی سال تک "دار العلوم ٹنڈو اللہ یار" (حیدرآباد سندھ) میں صدر مدرس رہے، اس کے بعد اپنے وطن ہی میں قیام فرمایا اور حکیم الامت حضرت تھانوی نے جو امانت اور خدمت آپ کے سپرد کی تھی اس کو انجام دیتے رہے۔ گزشتہ شعبان کے آخری ہفتہ میں اس وقت وصال فرمایا جب ہندستان و پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ اس لیے اس وقت تو یہاں کسی کو علم ہی نہ ہو سکا۔ رمضان مبارک کے آخری ہفتہ میں جب یہ عاجز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوا تو حضرت نے ذکر فرمایا۔ ان کو غالباً حجاز مقدس کے کسی خط سے چند ہی روز پہلے اس کی اطلاع ہوئی تھی پھر جب معاہدہ تاشقند کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تو ماہنامہ "بینات" کراچی سے اور اس کے بعد گزشتہ مہینہ مئی کے شروع میں حضرت مولانا مرحوم کے صاحبزادہ مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے گرامی نامہ سے کچھ تفصیل معلوم ہوئی۔

اہل اللہ کے الوان مختلف ہوتے ہیں کسی پر کسی رنگ کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر کسی صفت کا۔ اس عاجز کو حضرت مولانا مرحوم کی چند دفعہ صرف زیارت ہی نصیب ہوئی ہے۔ اپنا احساس اور تاثر یہ ہے کہ حضرت ممدوح اپنی صورت و سیرت کے لحاظ سے ان خاصان خدا میں سے تھے جو غلبۂ ملکیت کی وجہ سے ملائکہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ حضرت کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کأنّ الملك نزل من السماء۔ واللہ اعلم باحوال عبادہ[1]

حضرت مولانا شیر محمد مہاجر مدنیؒ

اب سے ۳۳ سال پہلے جب الفرقان بریلی سے جاری ہوا تو کچھ دنوں تک یہ عاجز خود ہی اس کا اڈیٹر تھا اور خود ہی اس کا محرر۔ اس ابتدائی دور میں گھوٹکی ضلع سکھر (سندھ) سے الفرقان جاری کرانے کے لیے سالانہ چندہ کا ایک منی آرڈر آیا۔ مرسل کا نام صرف "شیر محمد" لکھا ہوا تھا۔

[1] گویا آسمان سے فرشتہ اتر آیا ہے۔

اور تحریر کی سادگی سے اس کا شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ کوئی صاحب علم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ خریداروں کے رجسٹر میں میں نے ان کا نام صرف "شیر محمد صاحب" لکھ دیا۔ عرصہ کے بعد الفرقان کے ایک مضمون کے بارہ میں (جو غالباً مسئلہ سماع اموات سے متعلق تھا) ان صاحب کا ایک خط آیا جس میں "امداد الفتاویٰ" کے حوالہ سے اس مسئلہ کے متعلق حضرت تھانویؒ کی ایک خاص تحقیق کا ذکر کیا گیا تھا جس سے میں اس وقت تک واقف نہیں تھا ـــــ اس خط سے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی عالم دین ہیں۔ چنانچہ رجسٹر میں ان کے نام سے پہلے مولانا کا لفظ بڑھا دیا گیا۔ جب مولانا کے پاس "الفرقان" کا وہ پہلا شمارہ پہونچا جس میں ان کا نام "مولانا شیر محمد صاحب" لکھا گیا تھا تو ممدوح نے مجھے لکھا کہ میں عالم نہیں ہوں عامی ہوں اکابر کی کتابیں دیکھنے کا شوق ہے۔ ان سے کچھ باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ اس لیے میرے نام کے ساتھ مولانا نہ لکھا جائے ـــــ ممدوح نے یہ بات ایسے انداز میں لکھی تھی جس سے دل میں ان کی خاص عقیدت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ ان کی زیارت حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی حیات میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں اور دوسری دفعہ ملک کی تقسیم سے کچھ ہی پہلے سکھر (سندھ) میں ہوئی۔ جبکہ اس عاجز نے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ سندھ اور بلوچستان کے بعض مقامات کا دورہ کیا تھا جن میں سکھر بھی شامل تھا ـــــ ممدوح کو کسی طرح میری آمد کا علم ہو گیا تو از راہِ شفقت و عنایت، خود ہی گھوٹکی سے سکھر تشریف لائے۔ ان دونوں ملاقاتوں ... سے عقیدت ... اضافہ ہوا ـــــ قیام پاکستان کے کچھ مدت کے بعد مولانا مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے۔ جس کا مجھے بہت عرصہ کے بعد علم ہوا۔ پھر ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں مناسک حج پر ان کی ضخیم اور محققانہ تصنیف "عمدۃ المناسک" جس کو گجرات کے عالم دین مولانا غلام محمد نوگیت نے شائع کیا تھا۔ مولانا غلام محمد صاحب ہی کے ہاتھ سے ملی۔ اس سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ممدوح کس پایہ کے صاحب نظر عالم اور محقق ہیں۔

پھر اب سے ۱۳ سال پہلے ۱۹۶۳ء میں جب اللہ تعالیٰ نے حج و زیارت کی نعمت نصیب فرمائی تو مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس حاضری میں مناسک کے بعض اہم مسائل کے بارہ میں حضرت سے جو استفادہ کیا گیا اور جو خاص عنایتیں ممدوح نے اس عاجز پر فرمائیں ان کا ذکر اسی زمانہ میں "الفرقان" کے شماروں میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد گزشتہ سال ۱۹۷۵ء کے حج کے موقعہ پر رابطۂ عالم اسلامی کے تعلق سے جب پھر حرمین شریفین کی حاضری کی نعمت رفیق محترم

مولانا علی میاں کی معیت میں نصیب ہوئی تو مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی بھی الحمدللہ ہم دونوں کو بار بار توفیق ملی۔ ہمارا مشترک احساس و تاثر یہ تھا کہ اللہ نے اپنے اس بندہ کو تجرید و تفرید اور رضا و تسلیم کا خاص مقام نصیب فرمایا ہے، جو تھوڑا سا وقت حضرت کی خدمت میں گزرتا وہ ہمارے بہترین اوقات میں سے تھا۔ حضرت ممدوح نے اپنے لیے فقر و مسکنت کی زندگی اختیار فرمائی تھی۔ مشہور حدیث ہے "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح بصعالیک المہاجرین" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خستہ حال اور مساکین مہاجرین کے وسیلے سے فتح کی دعا کرتے تھے) حضرت مولانا شیر محمد صاحب ہمارے اس زمانہ میں "صعالیک المہاجرین" کا ایسا نمونہ تھے کہ اس طرح کا کوئی دوسرا نمونہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، ان کے پاس بیٹھ کر دل دنیا سے سرد ہوتا تھا جو اہل اللہ کی خاص علامت ہے۔

پچھلے مہینہ محرم میں مکرمی محترم عبداللہ نور ولی، مقیم جدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ذی الحجہ میں حضرت مولانا کا وصال ہوگیا (اناللہ وانا الیہ راجعون) ان کی روح اپنے رب سے جا ملی اور ان کا جسم اس بقیع کے سپرد کر دیا گیا۔ جو سب سے پہلے مدفون مہاجر عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ سے لیکر اس وقت تک کے لاکھوں مہاجرین اور مومنین صالحین کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ حضرت مولانا شیر محمد صاحب بھی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلفاء کبار میں سے تھے۔

اس عاجز بندہ پر اللہ تعالیٰ کے بے حساب احسانات و انعامات ہیں، ایک عظیم احسان و انعام یہ بھی ہے کہ اس کے جن اچھے اور مقبول بندوں تک پہنچنا میسر ہوا بلا ادنیٰ استحقاق کے ان کی غیر معمولی عنایتیں اور شفقتیں نصیب ہوئیں اور اپنے گنہگار دل کو ان کی محبت و عظمت کا کچھ حصہ بھی ملا اگرچہ جو استفادہ ان سے کرنا چاہیے تھا اپنے قصور ہمت اور حرماں نصیبی کی وجہ سے وہ نہ کیا جا سکا، لیکن ان کی عظمت و محبت کے جو ذرے نصیب ہیں انشاء اللہ وہ کام آئیں گے۔

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی، صلاحا

ناظرین کرام سے گزارش ہے کہ وہ ان دونوں مرحوم بزرگوں کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا فرمائیں اور حسب توفیق ایصال ثواب کریں۔ موت کے بعد خدمت اور تعلق کا یہی راستہ ہے اور اس میں انشاء اللہ اپنا بھی بڑا نفع ہے۔

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

(شوال ۱۳۸۷ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

وَقَعَتِ الْوَاقِعَة

ان سطروں کی اشاعت تک مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے سانحۂ وفات کی اطلاع اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ناظرین کو ہو چکی ہوگی۔ آج ۲۵ رنومبر ہے صرف ۵ ہی دن پہلے ۲۰ رنومبر کی صبح رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور یہ ناچیز مکہ معظمہ سے واپس آتے ہوئے بمبئی پہنچے تھے، قریباً ۱۱ بجے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، ۲۲ رنومبر کو حضرت اپنے خدام اور رفقاء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کے لئے مظفری جہاز سے حجاز پاک روانہ ہونے والے تھے، رمضان مبارک حرمین شریفین ہی میں گزارنے کا ارادہ تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں رہنے والے حضرت کے خاص محبین و مسترشدین حافظ محمد صدیق صاحب الیمنی (مقیم مکہ مکرمہ) اور مولانا مجداللہ گورکھپوری (مقیم مدینہ طیبہ) حضرت کے قافلہ کے قیام کے لئے جو انتظامات وہاں کر رہے تھے ان کا تذکرہ آیا اور وہاں کے جو خطوط حضرت کے نام ہمارے ساتھ آئے تھے وہ پیش خدمت کئے۔ اتفاق سے اسی دن بلکہ غالباً اسی وقت حضرت کے نام مدرسہ صولتیہ (مکہ مکرمہ) کے مہتمم جناب مولانا محمد سلیم صاحب کا مکتوب پہنچا جو ڈاک سے آیا تھا جس میں انھوں نے مدرسہ ہی میں قیام فرمانے کی حضرت والا سے درخواست کی تھی،

وہ حضرت کے خادم خاص مولانا جامی نے ہمارے سامنے ہی خدمت میں پیش کیا، اور حضرت نے اس کو پڑھا ہم لوگوں نے بھی عرض کیا کہ مولانا محمد سلیم صاحب نے حضرت سے یہ درخواست کرنے کے لئے ہم سے بھی کہا تھا —— جتنی دیر حاضر خدمت رہے حسب عادت انتہائی شفقت و عنایت سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر رخصتی کی اجازت چاہتے ہوئے عرض کیا کہ جی تو چاہتا تھا کہ پرسوں حضرت کو رخصت کرنے کے بعد جائیں لیکن فلاں مجبوری سے جلدی لکھنؤ پہونچنا ضروری ہے، اس لئے کل صبح کے طیارہ سے روانگی کا ارادہ ہے حضرت نے فرمایا کہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ آپ لوگ مجھے رخصت کرکے جائیں گے اور جی بھی چاہتا تھا لیکن جب ضرورت ہے تو کل ہی چلے جائیے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے دعا کی درخواست کی اور حضرت نے بھی ہم سے فرمایا اور آخری مصافحہ کرکے قیام گاہ پر واپس آگئے،

میں حج سے متعلق اپنی دونوں کتابوں "آپ حج کیسے کریں" اور "آسان حج" کے کچھ نسخے حضرت کے قافلہ کے لئے پیش کرنا چاہتا تھا، میں نے مکہ معظمہ ہی سے لکھنؤ "کتب خانہ الفرقان" کو لکھ دیا تھا کہ اتنے نسخے بمبئی روانہ کر دیئے جائیں، لیکن میرے بمبئی پہنچنے تک کتابوں کا پارسل بمبئی نہیں پہنچا تھا اگرچہ بلٹی اسی دن مل گئی تھی، میں نے وہ نسخے بمبئی ہی سے فراہم کئے اور عشاء کے بعد ان کو لے کر پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے بڑی عنایت سے قبول فرمائے اور ساتھ لے جانے والے سامان میں رکھوا دیئے، یہ ۲۰ اور ۲۱ نومبر کے درمیان کی شب تھی اور حضرت کی خدمت میں اس عاجز کی یہ آخری حاضری تھی، حسب معمول رخصتی مصافحہ اور دعا کی درخواست کرکے واپس آگیا اور پروگرام کے مطابق ۲۱ نومبر کی صبح سورج نکلنے سے پہلے بمبئی سے دہلی کے لئے ہم لوگ روانہ ہوگئے۔ اس دن دہلی قیام رہا، اگلے دن ۲۲ نومبر کی صبح دہلی سے لکھنؤ اپنے مستقر پر آگئے،

۲۲ ہی کو مظفری جہاز سے حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوگئے —— آج ۲۵ نومبر کو عصر کی نماز کے بعد افواہی طور پر یہ خبر سنی کہ محلہ ماہ نگر (لکھنؤ) کے فلاں

صاحب کو بمبئی سے کسی نے اطلاع دی ہے کہ مظفری جہاز پر حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وصال ہو گیا ——— دل و دماغ یقین کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ جس کا بڑا سبب اپنا یہ خیال بھی تھا کہ اگر بمبئی میں اس طرح کی کوئی اطلاع آئی ہوتی تو بمبئی کے ہمارے وہ احباب و مخلصین جو حضرت سے عقیدت و محبت کا خاص تعلق رکھتے ہیں ہم لوگوں کو ضرور اطلاع دیتے، ہم لوگوں نے طے کیا کہ بمبئی ٹرنک کال کر کے تحقیق کی جائے، ابھی اس پر عمل نہیں ہو سکا تھا کہ اسی اثنا میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے بذریعہ فون اطلاع ملی کہ سیٹھ عبد الستار صاحب کا تار ابھی بمبئی سے دار العلوم میں آیا ہے جس میں اس سانحہ کی اطلاع دی گئی ہے۔ اب ہم سب کو یقین کر لینا پڑا۔ بیشک جب انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں نہیں رہے تو کون رہے گا، بقا و دوام صرف ایک ذات کے لئے ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

ان سطروں کی ابھی کتابت بھی نہیں ہو سکی تھی کہ بمبئی کے ایک مخلص حاجی یعقوب صاحب کے ۵ نومبر کے لکھے ہوئے خط سے یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ حضرت کے رفقا کا مظفری جہاز سے بذریعہ وائرلیس دیا ہوا تار آج دن کے ۱۱ بجے بمبئی پہنچا جس میں بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۲ بجے کر ۵ منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا۔ اور جہاز کے کپتان کا کہنا ہے کہ جہاز کے عام قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھ کر حضرت کی میت کو سمندر کے سپرد کر دیا جائے اور ہم لوگوں کا اصرار ہے کہ ہم محفوظ کر کے جدہ لے جائیں، آپ لوگ مغل کمپنی سے کپتان کو تار کے ذریعہ ہدایت بھجوائیے کہ وہ جدہ تک لے جانے کی اجازت دے اور انتظام کرے چنانچہ فوراً ہی اس کی کوشش کی گئی، مغل کمپنی نے منظور کر لیا اور جہاز کے کپتان کو بذریعہ وائرلیس اس کی ہدایت دے دی اور بمبئی کے اپنے دوستوں نے حضرت کے رفقا کو بذریعہ وائرلیس مظفری جہاز پر اطلاع بھیجدی کہ مغل کمپنی نے کپتان کو ہدایت دے دی ہے کہ وہ حضرت کی میت کو جدہ تک لے جانے کا انتظام کرے اور ایک تار سعودی

ف یعنی صبح صادق سے کچھ پہلے کیونکہ سمندر کے جس علاقہ میں اس وقت مظفری جہاز جا رہا تھا وہاں صبح صادق ۶½ کے قریب ہوتی ہے۔

عربیہ میں حکومت ہند کے سفیر مسٹر مدحت کامل قدوائی کو بھی دے دیا گیا ہے۔" (حاجی یعقوب صاحب کا یہ خط، ۲۲ نومبر کو لکھنؤ پہنچا)

امید ہے کہ پروگرام کے مطابق ۲۹ نومبر چہارشنبہ کو مظفری جہاز جدہ کے ساحل پر پہونچے گا لیکن حجاز مقدس کے حضرت کے محبین و معتقدین جو بڑی تمناؤں اور مسرتوں کے ساتھ جدہ میں حضرت کے استقبال کی اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حضرت کے قیام کی تیاریاں کر رہے تھے حضرت کے اس جسد عنصری کو جہاز سے اتاریں گے جس سے بے تاب روح سبقت کر کے ملاء اعلیٰ کی طرف پہلے ہی پرواز کر چکی ہے —— اللہ تعالیٰ ان کو اور حضرت کے تمام ہی محبین و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلُّ شَیْئٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی ○

اضافہ شدہ نوٹ:۔

لیکن قضا و قدر کا فیصلہ یہ تھا کہ حضرت کی میت حجاز مقدس کے ساحل پر سمندر ہی میں دفن ہو —— واقعہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کے سفیر مدحت کامل قدوائی اور بعض دوسرے حضرات کی استدعا اور غیر معمولی کوششوں کے نتیجہ میں سعودی حکومت نے تو (وہاں کے دستور کے خلاف) اس کی اجازت دے دی کہ حضرت کی میت کو جدہ کی بندرگاہ پر اتارا جائے اور مکہ معظمہ میں دفن کیا جائے لیکن اس اجازت کی اطلاع جہاز کے کپتان کو نہیں ہو سکی اسلئے جب جہاز جدہ کے ساحل پر پہنچا تو کپتان نے حضرت کے وارثین اور رفقاء سے کہا کہ قانون کی رو سے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میت کو بندرگاہ پہنچنے سے پہلے ہی سمندر کے سپرد کر دیا جائے —— چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا۔ یفعل اللہ ما یشاءُ و یحکم ما یرید

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ وانزل علیہ شآبیب رحمتک ورضوانک (نعمانی)

محمد منظور نعمانی

حضرت العلامہ مولینا محمد ابراہیم بلیاویؒ

(شوال ۱۳۸۷ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرۃ الاستاذ العلامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حادثۂ وفات کی اطلاع ہمارے ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ہو چکی ہوگی —
یوں تو اس سے پہلے ان کے بڑے اور ان سے بہت بڑے بھی جا چکے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور جماعت دیوبند میں ان کی وفات سے، خاص کر علم و تدریس کی کائنات میں جیسا عظیم خلا محسوس کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے ایسا غالباً پہلے کبھی محسوس نہیں کیا گیا۔

علمی اور تدریسی امتیاز کے علاوہ دارالعلوم کی قریباً ایک سو پانچ سالہ تاریخ میں شاید ہی اس کے کسی استاد کو اتنی طویل مدت تک درس دینے کا موقع ملا ہو جتنا اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا۔

آج سے ٹھیک پینتالیس (۴۵) سال پہلے جب یہ ناچیز ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا اس وقت بھی حضرت علامہ مرحوم وہاں کے بڑے اساتذہ میں تھے، اور ہمارے مدارس کی اصطلاح میں "معقولات" یعنی منطق، فلسفہ، اور علم کلام کی مشکل ترین اور انتہائی کتابیں حمد اللہ "قاضی مبارک، شمس بازغہ، اور امور عامہ وغیرہ اکثر ان کے ہاں ہوتی تھیں —
یہ ناچیز چونکہ معقولات کی یہ سب کتابیں پڑھ کر دارالعلوم گیا تھا اس لئے ان کے یہاں ہونے والے ان فنون کے کسی سبق میں میری شرکت نہیں تھی، لیکن معقولات کے ساتھ اپنی مناسبت اور اپنے ذہنی

رابطہ کو محفوظ رکھنے کے لئے چند اور ایسے طلبہ کے ساتھ مل کر جو معقولات کی تکمیل کر چکے تھے کوشش کی کہ منطق یا فلسفہ کی کوئی غیر نصابی اہم کتاب مولانا سے اوقات مدرسہ کے علاوہ "خارج وقت" میں پڑھی جائے، یہ کوشش کامیاب ہوگئی، اور مولانا نے فنون سے خاص دلچسپی ہی کی وجہ سے "شرح اشارات طوسی" خارج میں پڑھانا منظور فرمالیا اور طے ہوا کہ صبح مدرسہ کا وقت شروع ہونے سے پہلے مولانا ہی کی درسگاہ میں یہ سبق ہوا کرے گا ـــــ سبق شروع ہوا اور ایک مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا ـــــ اب اس واقعہ کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ منطق و فلسفہ کی کتابیں میں نے خاص دلچسپی اور محنت سے ایک ایسے استاذ (حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ) سے پڑھی تھیں جو معقولات میں خیرآبادی سلسلہ کے شاگرد تھے اور ان فنون میں خاص دستگاہ رکھتے تھے، اس لئے مجھے اس کی کچھ زیادہ امید نہیں تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے کسی استاذ سے میں معقولات کی لائن میں کوئی قابل قدر استفادہ کرسکوں گا، (کیونکہ دارالعلوم کی خاص شہرت درس حدیث کے لحاظ سے تھی) ـــــ لیکن چند ہی سبق پڑھنے کے بعد اندازہ ہوگیا کہ مولانا ان فنون میں بلاشبہ اپنے وقت کے امام ہیں اور استفادہ کی بڑی گنجائش ہے۔

دارالعلوم دیوبند جانے سے پہلے میں اگرچہ معقولات کی تمام درسی بلکہ بعض غیر درسی کتابیں بھی پڑھ چکا تھا لیکن دینیات سے بالکل کورا تھا، مشکوٰۃ تک نہیں پڑھی تھی، اس لئے اس سال، مجھے مشکوٰۃ المصابیح بھی پڑھنی تھی، اس زمانہ میں دارالعلوم میں اس کا سبق حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ کے ہاں ہوتا تھا ـــــ جس سال یہ ناچیز دارالعلوم دیوبند پہنچا ہے وہ پہلا سال تھا کہ مشکوٰۃ کی جماعت دو حصوں میں تقسیم کردی گئی تھی اور ایک جماعت کا سبق حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے ہاں رکھا گیا تھا۔ اسباق شروع ہوگئے اور دفتر دارالعلوم کی طرف سے وہ نقشہ آویزاں نہیں ہوا جس سے معلوم ہوتا کہ کس طالب علم کا نام کس استاذ والی جماعت میں ہے۔ "معقولات" کی لائن سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے ساتھ جو ایک خاص ذہنی مناسبت تھی اس کی وجہ سے انہی کے درس مشکوٰۃ میں شرکت شروع کردی۔ کتاب الایمان پوری حضرت مولانا ہی سے پڑھی، چند ہفتوں کے بعد دارالعلوم کے دفتری نقشہ میں میرا نام مولانا سراج احمد صاحب کے ہاں پڑھنے والی جماعت میں آگیا اور میں وہاں منتقل ہوگیا۔ لیکن "ایمان" سے متعلق مباحث پر حضرت مولانا سے چند ہفتوں تک

جو کچھ سنا تھا وہ اپنی معقولیت، سلجھاؤ اور دلپذیری کی وجہ سے ایسا ذہن نشین ہوا کہ الحمد للہ آج تک محفوظ ہے۔

میری معلومات کے مطابق یہ پہلا سال تھا جس میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب نے دارالعلوم میں حدیث کا درس دیا، اس کے بعد سے قریب قریب مسلسل حدیث کا کوئی نہ کوئی سبق رہا، مسلم شریف تو بہت عرصہ تک انہی کے ہاں ہوتی رہی۔ پھر حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جب مولانا ہی ان کی جگہ صدر مدرس قرار دیئے گئے تو جامع ترمذی بھی آپ ہی کے ہاں ہونے لگی، جو درسی نقطہ نظر سے صحاح ستہ میں اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے،

حضرت علامہ مرحوم جامع ترمذی کے درس کی ذمہ داری سے کافی پہلے اس پر ایک مبسوط و مفصل حاشیہ لکھنے کا کام شروع کر چکے تھے اور جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے اب سے کئی سال پہلے اس کا کافی حصہ ہو چکا تھا، غالباً حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد صدر مدرسی اور نظامت تعلیم کی دوہری ذمہ داریاں آ پڑنے کی وجہ سے وہ کام تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رہ سکا اگر یہ کام مکمل ہو جاتا تو مولانا مرحوم کا وہ غالباً واحد تصنیفی کام ہوتا اور اس سے باہر کے لوگ بھی ان کے مقام علمی کا اندازہ لگا سکتے — وکم حسرات فی بطون المقابر

حضرت مولانا پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ان کے تلامذہ کی بے پناہ کثرت ہے، گزشتہ پچاس ساٹھ سال کی طویل مدت میں جو ہزارہا طلبۂ دارالعلوم دیوبند سے عالم و فاضل ہو کر نکلے جو ہندوستان و پاکستان میں یا کسی دوسرے ملک میں مختلف قسم کی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں (اور کم از کم برصغیر ہند و پاکستان میں تو دین کی جو روشنی ہے اس میں بلاشبہہ زیادہ حصہ انہی فضلاء دیوبند یا ان کے تلامذہ کا ہے) ان میں کوئی شاذ و نادر ہی ایسا ہوگا جو حضرت مولانا کا براہ راست یا بالواسطہ شاگرد و فیض یافتہ نہ ہو۔ ان میں سے جس نے بھی حضرت مولانا کی خبر وفات سنی ہوگی ضرور ہی رحمت و مغفرت کی دعا بار بار کی ہوگی اور کرتے رہیں گے۔ ان میں کتنے عالم باعمل اور اولیاء اللہ بھی ہوں گے، کتنوں نے مختلف شکلوں میں ایصال ثواب کا اہتمام بھی کیا ہوگا — کیسے خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اپنے پیچھے اس طرح کے سلسلے چھوڑ کے جائیں — وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝

اپنے ناظرین کرام سے راقم سطور کی التجا ہے کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اہتمام سے دعا فرمائیں۔ اس عاجز پر کرم و احسان ہوگا۔

⁂

عتیق الرحمٰن سنبھلی

دو محسنوں کی وفات

(محرم ۱۳۸۹ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

گذشتہ مہینے دو محسنوں سے محرومی ہوئی، یعنی شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب لکھنوی اور مولوی فہیم الدین صاحب (میرٹھی) نے علی الترتیب ۸ر ذی الحجہ اور ۱۱ر ذی الحجہ کو سلک آخرت کی راہ لی۔ مالک الملک سے دعا ہے کہ انھیں رحمت و مغفرت سے نوازے اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب لکھنؤ کے مشہور خاندان اطباء ”جھوائی ٹولہ“ کی بزرگ ترین یادگار تھے۔ کوئی ۵۰ سال مطب فرمایا اور قریب پچاسی برس کی عمر پائی۔ الفرقان کے خریداروں میں ان کا نام نامی ایک مدت سے تھا۔ مگر اب سے چند سال پہلے تک میرے لیے وہ تقریباً ایک اجنبی شخصیت تھے۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں مجھ پر سخت اعصابی ضعف کا حملہ ہوا اور رہ رہ کر اس کا اعادہ ہوتا رہا۔ سنہ ۶۶ء کی گرمیوں میں یہ حالت ہو گئی کہ دوا علاج بیکار محسوس ہونے لگا۔ والد ماجد بار بار معالجہ کی طرف متوجہ فرماتے اور میں ایک یاس کی کیفیت کے ساتھ ٹالتا جاتا۔ حتیٰ کہ بستر سے اٹھنا مشکل ہو گیا۔ حکیم صاحب قبلہ سے رجوع کی نوبت اب تک نہ آئی تھی، والد ماجد نے اصرار سے فرمایا کہ اب کی ان سے رجوع کر کے دیکھا جائے۔ اور پھر ایک دن (غالباً ۱۴ر جون ۱۹۶۶ء کو) حکیم صاحب کے مطب میں حاضری عمل میں آہی گئی۔ والد ماجد نے تعارف کرایا کہ الفرقان کی تمام ذمہ داری ایک عرصے سے اسی نے اٹھا رکھی تھی مگر اب ڈھائی سال سے ضعف اعصاب کی یہ کیفیت چل رہی ہے کہ کسی علاج یا تبدیل آب و ہوا سے کیسا ہی فائدہ ہو جائے لیکن ادھر کچھ کام کیا اور

ادھر عوارض لوٹنا شروع ہوئے۔ حکیم صاحب نے بڑی شفقت سے نسخہ تجویز فرمایا اور علاج شروع ہو گیا۔

علاج کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال نہایت پابندی سے جاری رہا۔ ہر ہفتے یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتے کے بعد حاضری ہوتی تھی۔ مطب کا وقت میری کمزوری کے اعتبار سے خصوصاً موسم گرما میں نہایت ہی سخت تھا، یعنی گیارہ سے ایک تک۔ اور عموماً حکیم صاحب کی تشریف آوری گیارہ کے بعد ہی ہوتی تھی، پھر مطب کا فاصلہ بھی کوئی ڈیڑھ میل۔ غرض یہ آمد و رفت گرمی، دھوپ اور لو کے دنوں میں بہت ہی ہوشربا ہوتی تھی۔ مگر حکیم صاحب کی طرف سے جس عنایت و کرم اور شفقت و التفات کا معاملہ تھا اس کی خنکی نے کبھی اس کلفت کے آگے ہمت کو پست نہ ہونے دیا، کہ حسب ہدایت حاضری میں فرق پڑتا۔ میں حاجتمند تھا اور وہ کرم فرما، دوسرے فیس پیش کرتے تھے اور مجھ سے فیس بھی نہیں لی جاتی تھی لیکن التفات و کرم کا یہ عالم تھا کہ ادھر نظر پڑی اور ان کی یہ خواہش ہوئی کہ سب کو چھوڑ کر پہلے مجھے دیکھ لیں۔ کچھ دیر لگتی تو بیچ میں ایک دو بار معذرت آمیز جملے زبان پر آ جاتے۔ عمر اور عزت کے اعتبار سے میرے بزرگوں کے بزرگ تھے اور ایسی تواضع سے پیش آتے کہ شرم آ جائے۔ حال کہنے کی قریب والی کرسی پر پہنچتا تو عموماً استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ پھر اس قدر شفقت بھرے لہجے میں حال پوچھتے جیسے کسی چھوٹے عزیز سے مخاطب ہیں۔ حال اچھا ہوتا تو زبان پر "الحمد للہ" اور چہرہ پر مسرت نمایاں ہو جاتی وہ مسرت نہیں جو ایک معالج کو اپنی کامیابی سے ہوتی ہے بلکہ وہ مسرت جو ایک شفیق بزرگ کو اپنے کسی عزیز کی راحت سے ہوتی ہے ــــــ کچھ تکلیف بتاتا تو اسی طرح اس کا تأثر چہرہ پر آ جاتا۔ اور پھر نسخہ میں ترمیم فرما کر بڑے دلنواز انداز میں فرماتے کہ انشاء اللہ اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، اب یہ تکلیف نہیں رہے گی۔ اور پھر اسی کریمانہ انداز سے رخصت کرتے جس سے شروع میں پیش آئے تھے۔

حکیم صاحب کے علاج کا یہ سلسلہ پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ تقریباً سال بھر جاری رہا۔ درمیان میں موصوف نے اپنے ایک خاص تدریجی نقشہ پر معالجہ کی تکمیل فرمائی۔ لیکن اس کے بعد والے سال میں بھی بیچ میں وقتاً فوقتاً ضرورت پڑنے پر حاضر خدمت ہوتا رہا۔ اس

دو سال کی آمد و رفت میں کبھی ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا کہ حکیم صاحب کے لطف و التفات میں کوئی فرق محسوس ہوا ہو۔ جب جایئے وہی شفقت، وہی کرم، وہی انبساط اور وہی انشراح کہ محض مریض اور معالج کا رشتہ ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میری حاضری بھی، چاہے کیسے ہی سخت دن ہوں، محض ایک مریض کی مجبورانہ حاضری نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں وہ لذت پیدا ہو گئی تھی جو کسی سراپا شفقت و کرم بزرگ کے پاس آنے جانے میں پیدا ہو جانی چاہیے! اور اسی کی بدولت اس نفع مند علاج میں وہ پابندی مجھ سے ہو سکی جو بغیر اس کے یقیناً میرے لیے آسان نہ تھی ——— میرے مرض کی جڑ اگرچہ حکیم صاحب مرحوم کے علاج سے کبھی نہ کٹ سکی مگر اتنا ضرور ہو گیا کہ اعصابی ضعف سے جو رہ رہ کر قلبی دورہ کی شکل پیدا ہو جاتی تھی اور معاملہ جان پر بنجاتا تھا وہ بحمد اللہ اس علاج کے بعد سے نہیں ہوئی۔

خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اس حسن کرم اور محض لوجہ اللہ شفقت و محبت کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔ اپنی معلومات کی حد تک وہ اپنے رب کے اطاعت شعار اور نہایت عبادت گزار بھی تھے۔ مریضوں کے دیکھنے اور انسانی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ان کے اوقات عموماً اوراد و وظائف اور تلاوت و عبادات سے بھرے ہوئے تھے۔ مرنجان مرنج تھے۔ ثقاہت و متانت اور شرافت ان کی وضع تھی بے ضرورت باتیں کرتے ان کو نہیں دیکھا۔ نسخہ تحریر فرماتے وقت "بسم اللہ الشافی" اس طرح ڈوب کر کہتے جیسے اتنی دیر کے لیے منقطع ہو گئے ہوں۔ عقائد میں نہایت صاف اور جادۂ حق کے شیفتہ تھے۔ دنیا سے جاتے وقت بھی حال تھا جو ایک صاحب حسن عمل مومن کا ہونا چاہیے[1]۔ اپنے ساتھ ان کے اس محبت آمیز برتاؤ کا سراغ اُن کے اندر سے پانے کی کوشش کی تو منجملہ دیگر وجوہ کے ایک خاص وجہ یہ محسوس ہوئی کہ وہ الفرقان کے مطالعہ میں والد ماجد کے سلسلہ معارف الحدیث کو شغف کی حد تک قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور حدیث سے شغف رکھنے والوں کا حسن خاتمہ ایک عام تجربہ ہے۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ واجعل الجنۃ مثواہ واجزہ احسن ما تجزیہ عبادک المحسنین۔

حکیم صاحب کی اولاد میں چار صاحبزادیاں ہیں، دیگر پسماندگان میں چھوٹے بھائی شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب (سابق پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ) بھی ہیں۔ اور وہی

[1] اس بارے میں وصیت کا بھی اہتمام فرمایا کہ کوئی غلط رسم ادا نہ کی جائے جس کا لکھنؤ کے اردادرانہ ماحول میں صحیح العقیدہ لوگوں سے بھی ڈر ہوتا ہو۔

اب مرحوم کے جانشین ہیں، ریٹائر ہونے کے بعد سے لکھنؤ ہی میں قیام فرما ہیں۔ موصوف خود میرے والد ماجد کے بڑے محب اور میرے گھرانے کے بڑے طبی محسن ہیں وہ حکیم صاحب مرحوم کے بھائی ہی نہیں بلکہ بمنزلہ اولاد تھے۔ حکیم صاحب نے گو عمر طبعی میں وفات پائی مگر ایسے شفیق الطبع بزرگوں کی جدائی کسی عمر میں بھی ہو بہت شاق ہوتی ہے اللہ تعالیٰ حکیم عبداللطیف صاحب اور دیگر پسماندگان کو اس صدمہ پر صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

مولوی فہیم الدین صاحب

مولوی صاحب مرحوم باپڑ ضلع میرٹھ کے ایک زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے، حافظ قرآن اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے، ایک عرصہ تک اپنے وطن ہی کے ایک عربی مدرسہ میں درس و تدریس کی خدمات اعزازی طور پر انجام دیں پھر کاروبار میں لگ گئے۔ لکھنؤ کی مشہور اسلحہ فروش لسنرم الٰہی بخش اینڈ کمپنی ان کی ملکیت تھی اور عرصہ دراز سے لکھنؤ ہی میں قیام تھا اتنی بڑی تاجرانہ حیثیت کے باوجود تاجرانہ خو و نام کو نہیں تھی۔ نرمی اور خاموشی، وقار اور سنجیدگی کی تصویر، برسوں قریب سے دیکھا، عادت ہی حلاوت شہر میں مسلمانوں کے دینی اور سماجی کاموں میں بڑے حوصلہ سے حصہ لیتے تھے مگر بے حد بے ریائی اور خاموشی کے ساتھ۔ ان کا حصہ بیشتر مالی امداد کی شکل میں ہوتا تھا غرض وہ گفتار اور لن ترانی سے انھیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو کرتے تو انھیں کبھی نہیں پایا لیکن اخلاق و عادات میں علم دین کا پورا پورا اثر تو ہمیشہ دیکھا۔ نہ عالم ہونے کا احساس کسی بات سے ٹپکتا تھا نہ مالی حیثیت کے احساس کی غمازی کہیں سے ہوتی تھی۔ ایک سادہ اور بھاری شخصیت، کہ ہر آدمی برابر کا سمجھ کے بات کرے۔ شہر کے وہ دینی اور ملی کام کرنے والے جن کے خلوص و دیانت پر مولوی صاحب مرحوم کو اعتماد تھا ضرورت کے ہر موقع پر ان کی مالی اعانت کا بھروسہ رکھتے تھے، خواہ قرض کی شکل میں ہو یا عطیہ کی۔ ان کی دکان گویا تھی، ایسے لوگوں کے لیے ایک ملی بینک تھا جہاں سے ہر وقت ان کی وسعت کے بقدر اس طرح قرض مل سکتا تھا جیسے یہ مولوی صاحب کی ذاتی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی امانت

ہو۔ خود الفرقان بھی ان کی اس شرافت و للّٰہیت کے منت کشوں میں ہے جب کبھی ضرورت ہوئی تو بس سادہ سے دو جملے ٹیلیفون پر کہدئے اور عموماً مولوی صاحب کا آدمی ہی روپے پہونچا گیا۔

عام حاجتمندوں کی امداد و اعانت میں ان کے ہاتھ کی وسعت کا علم اللہ ہی کو ہوگا۔ مگر مجمل طور پر اتنا اندازہ ہے کہ وہ مال کے بارے میں وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ[1] کا ذہن رکھتے تھے۔ کسی حاجتمند کی حاجت براہ راست اپنے سامنے آئے یا کسی قابلِ اعتماد شخص کے ذریعہ اس کا علم ہو وہ اپنے اوپر واجب سمجھتے تھے کہ اس کی مدد کریں، اور وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ[2] کے زمرہ میں داخل ہوں صرف وقتی مدد نہیں بلکہ بیواؤں یتیموں اور معذوروں کے بعض مستقل ماہانہ وظیفے بھی ہمارے علم میں ہیں۔ اگرچہ ان کے اخفاء کا تو یہ عالم تھا کہ شاید وظیفہ پانے والے آجتک نہ جانتے ہوں کہ کہاں سے آرہا ہے۔

حافظ قرآن تھے اور اچھا یاد تھا خصوصاً پڑھتے تو بہت ہی اچھا تھے۔ سادہ اور نہایت صحیح، مخارج کی ادائیگی میں بڑی پختگی۔ دس سال سے میرا قیام بھی ان کے پڑوس میں تھا۔ محلہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو چند آدمیوں کے دم سے آباد ہے وہ پابندی کے ساتھ تراویح میں قرآن سناتے تھے۔ آٹھ بجے دوکان بند کرا کے آتے اور پھر چند منٹ رک کر مکان سے سیدھے مسجد چلے جاتے، کھانا یا ناشتہ بعد میں کرتے ـــــــ ان دنوں بلکہ رمضان کے پورے مہینے میں فجر کی نماز بھی اسی مسجد میں پڑھتے۔ روزانہ کچھ دیر ساتھ کا موقع پورے سال میں اسی مبارک مہینے میں ملتا تھا۔ اور اس کے لیے وقت نماز فجر کے بعد کا تھا کہ مسجد سے نکلے اور میرے ساتھ میرے مکان سے کچھ آگے بڑھ کر امین الدولہ پارک تک چہل قدمی کی۔ طبیعت

---

[1] اور دو حاجتمندوں کو اللہ کے اس مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ (قرآن)

[2] اور اللہ کے فرماں برداز بندوں کے مالوں میں حق ہوتا ہے (یعنی وہ حق سمجھتے ہیں) مانگنے اور نہ مانگنے والے سب حاجتمندوں کا۔ (قرآن)

میں سادگی کا جو ذکر اوپر کیا ہے اس کا یہ عالم تھا کہ مجھے اگر کچھ آگے بڑھ کر کسی دن دودھ لینا ہوتا تو ساتھ چھوڑتے نہیں تھے بلکہ اصرار کرکے وہاں تک ساتھ جاتے تھے۔

۵۵
اللہ غریق رحمت کرے اپنے تجربہ میں تو وہ فرشتہ صفت انسان تھے صرف چونٌ برس کی عمر پائی، صحت اچھی اور جسم بھرا ہوا تھا۔ عید الضحیٰ سے دو دن پہلے فلو ہوا عید کو اچھے رہے دوسرے دن اور اچھے تھے۔ کہ نو بجے صبح دل کا حملہ (ہارٹ اٹیک) ہوا۔ جو اتنا سخت تھا کہ ڈاکٹروں نے شروع ہی سے مایوسی ظاہر کر دی۔ اللہ نے انھیں سب کچھ دیا تھا دوسرے دن صبح تک قیمتی سے قیمتی علاج ہوا۔ دو دو ڈاکٹر رات میں ان کی تیمارداری کو رہے مگر وقت پورا ہو گیا تھا۔ حکم الٰہی کے آگے کسی کی نہ چلی۔ اور صبح ۸ بجے کے قریب روح جسم سے جدا ہو گئی۔ رہے نام اللہ کا! کیسے دیکھتے دیکھتے مولوی صاحب آخرت کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اللہ ان سے جنت میں ملاقات نصیب کرے۔ وہ یقیناً ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

مولوی صاحب کی یادگار تین بچے ہیں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پسماندگان میں عزیز واقارب کے وسیع حلقے کے ساتھ اہلیہ بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے صدمے کو، جو بعض وجوہ سے ان کے لیے بہت ہی سخت ہے، ہلکا کرے۔ انھیں دنیا میں راحت سے رکھے اور جنت النعیم میں پھر ملنا مقدر فرمائے۔ اور اصل ملنا تو وہیں کا ہے جس کے بعد پھر جدائی کا خطرہ ہی نہیں۔ وَاِنَّ الدَّارَ الآخِرَةَ لَھِیَ الحَیَوَانُ لَوکُنتُم تَعلَمُونَ [1]

جی چاہتا تھا کہ گزشتہ الفرقان ہی میں اپنے ان دو محسنوں کی تعزیت کی جائے۔ مگر سال بھر کے قریب ہو گیا ہے کہ لکھنے سے طبیعت کو سخت اِبا ہے لکھنے کی محنت سے اچھی خاصی طبیعت اتنی بار بگڑ چکی ہے کہ اب اس کا تصور بھی طبیعت کو گراں ہوتا ہے کوئی چیز کسی سخت ضرورت یا اندرونی خلش سے لکھنا ہی پڑے تو کئی دن کی کوشش سے طبیعت ہموار ہوتی ہے اور اتنی گنجائش گزشتہ اشاعت کے وقت میں نہیں تھی۔ مجبوراً مؤخر کرنا پڑا اگرچہ دل کو یہ تاخیر بہت ہی شاق تھی۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ دونوں حضرات کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا فرمائیں کہ الفرقان میں تذکرہ کا مقصد یہی ہے۔

---

[1] آخرت کی زندگی ہی۔ اگر تم جانتے ہو تو اصل زندگی ہے۔ (قرآن)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حضرت مولانا عبدالغفور نقشبندی مہاجر مدنی رح

(جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ مطابق اگست ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

[حضرت مولانا عبدالغفور صاحب نقشبندیؒ نے گزشتہ مئی میں مدینہ منورہ ہی میں وصال فرمایا، اتفاق سے رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان دنوں مدینہ طیبہ ہی میں تھے، موصوف سے میں نے درخواست کی تھی کہ حضرتؒ کی وفات پر ایک نوٹ الفرقان کے لیے لکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا نے درج ذیل مختصر مضمون سپرد قلم فرما دیا ـــــ نعمانی]

یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ حجاز مقدس اور حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً اسلام کا مبدء و معاد، ہر مسلمان کا ملجا اور ماویٰ اور ہر دینی و دنیاوی نعمت کا مخزن ہے۔ یجبیٰ الیہ ثمرات کل شیٔ، اس لیے کسی دور میں وہ باکمال شخصیتوں، اہلِ قلوب اور اصحابِ دعوت وارشاد سے خالی نہیں رہے۔

ایسا بھی بہت ہوا ہے کہ اہلِ قلوب اور مشائخ کبار نے زندگی کا بیشتر حصہ دیارِ عجم میں صرف کیا پھر اسی بلد امین یا جوارِ رسولؐ میں آکر پناہ لی اور اپنی زندگی کے آخری دن یہیں بسر کیے۔ دورِ قدیم میں شیخ تاج الدین سنبھلیؒ، شاہ صبغت اللہ بھروچیؒ، سید آدم بنوریؒ اور اس صدی کی ابتدا میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مولانا عبدالحق الہ آبادی شیخ الدلائل کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اقبال مرحوم نے اپنے ان دو مشہور شعروں میں ان سب حضرات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔

درین پیری رہِ یثرب گرفتم　　　غزل خوان از سرورِ عاشقانہ

چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام کشاید پر بہ فکر آشیانہ

ایسی متعدد شخصیتوں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے کسی اشارۂ غیبی یا تقاضائے قلبی سے حرمین شریفین ہی کو اپنی خدمت و دعوت کا مرکز بنایا اور انھوں نے وہاں بیٹھ کر عالم اسلام کے دور دراز گوشوں سے آنے والوں کی روحانی و باطنی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیا۔ اور اس طرح ان کا فیض دور دور پہونچا۔ انھی خوش قسمت اور عالی ہمت افراد میں حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مجددی مدنی بھی تھے جنھوں نے گزشتہ ربیع الاوّل کے اوائل میں اس جہانِ فانی سے کوچ فرمایا اور بقیع کی خاکِ پاک کو اپنا آخری مسکن بنایا۔

مولاناؒ علاقۂ سوات کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم صوبۂ سرحد سے حاصل کر کے دہلی آئے۔ مدرسۂ امینیہ میں تکمیل کی، پھر وہیں سالہا سال تدریس کے فرائض انجام دیے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کے تلمذ پر مولانا کو فخر تھا۔ مولانا کو زمانۂ طالب علمی ہی میں کمالاتِ باطنی اور تزکیہ و تربیت کا ذوق تھا۔ اس سلسلے میں آپ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت فضل علی شاہ صاحبؒ قریشی سے بیعت ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ اپنی فطری استعداد اور مناسبت خداداد سے بہت جلد ایسا امتیاز پیدا کر لیا کہ ان کی اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ پھر بعض اشارات و مبشرات کی بنا پر مدینۂ طیبہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں آستانۂ رسالت پناہی پر پڑ کر خلق اللہ کی خدمت اور نفوس و قلوب کی اصلاح و تربیت میں مصروف ہو گئے۔ اُس عالم گیر انقلاب کی بنا پر جو سارے عالمِ اسلام پر محیط ہے

——— اور حجاز مقدس کے مخصوص حالات کی بنا پر خاص طور پر اصلاح باطن اور تعلق مع اللہ کی دعوت دینے والوں سے یہاں کی فضا روز بروز نامانوس ہوتی جا رہی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ سلاسل و طرق کے ساتھ نسبت رکھنے والوں کو بہت سی مشکلات اور بدگمانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔ مولانا عبدالغفور صاحبؒ نے اس شک و شبہ کی فضا میں اپنا کام شروع کیا اور بہت جلد ان کی ذات اور ان کی قیام گاہ طالبین اصلاح کا مرکز

بن گئی، اور رفتہ رفتہ یہ فیض ہندوستان و پاکستان کے حجاج و زائرین سے تجاوز کر کے مصر و شام و ترکی و ترکستان تک عام ہو گیا۔ لوگ حج کے زمانے میں اور اس کے بعد آپ کے حلقے میں شریک ہوتے تھے اور اجازت سے مشرف ہو کر ان ملکوں میں خلق خدا کی خدمت اور طریقے کی اشاعت میں مصروف ہیں آخری دور میں آپ اکثر پاکستان تشریف لے جاتے۔ آپ کی مقبولیت اور مدینہ طیبہ کی نسبت کی وجہ سے آپ کی ذات کی طرف رجوع عام شروع ہوا اور کثرت سے لوگ آپ کی ذات سے مستفید ہوئے۔

آخری اسفار میں تو یہ حال تھا کہ آپ کی مجلس میں شریک ہونے والوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز نہیں سنی جا سکتی تھی۔ معتقدین اور ارادت مندوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ تھا۔ آپ اصلاح باطن کے ساتھ اصلاحِ ظاہر کی طرف شدت سے متوجہ تھے۔ غیر شرعی وضع کی اصلاح اور نصاریٰ و فرنگیوں کے شعائر کے ازالے پر بہت زور دیتے تھے۔

راقم السطور سے خود فرماتے تھے کہ نکٹائیاں اس کثرت سے اتاری جاتیں کہ ڈھیر کے ڈھیر پھینکنے کی نوبت آتی۔ صدہا نوجوان اور تعلیم یافتہ حضرات نے اس غیر شرعی وضع اور فرنگیوں کی تقلید سے توبہ کی، داڑھیاں رکھیں اور نماز روزے کے پابند ہوئے۔

راقم سطور اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر الفرقان) پر شروع سے مولانا کی عنایت اور نظر شفقت رہی۔ راقم سطور کو ۱۹۴۷ء میں پہلی حاضری کے موقع پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ دن اور آخری دن مولانا کی شفقت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ جب کبھی مدینہ طیبہ کی حاضری کے موقع پر حاضری میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو شکایت فرماتے اشتیاقِ ملاقات کا اظہار کرتے۔ غائبانہ بھی شفقت فرماتے رہتے تھے۔

مولانا نعمانی کی تصنیف معارف الحدیث کے سلسلے سے مولانا کو بڑی مسرت تھی کئی بار اس سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں اس کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کرتا ہوں۔ تبلیغی جماعت کے افراد کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اس کام کو بہت سراہتے۔ تبلیغی جماعت کے اکابر

بھی مولانا سے رابطہ رکھتے تھے اور اہتمام سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

اس مرتبہ اپریل کی آخری تاریخوں میں مدینۂ طیبہ حاضری ہوئی تو حسب عادت مولانا کی خدمت میں حاضری دی، معلوم ہوا کہ وہ بھی چار روز پہلے پاکستان سے سخت علیل ہو کر تشریف لائے ہیں۔ حاضر ہو تو خود ہی فرمایا کہ سخت علیل ہوں کوئی غذا یا دوا اندر نہیں جا رہی ہے۔ صرف گلوکوز کے انجکشن سے طاقت قائم ہے۔ پاکستان کے ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تھا لیکن عمر و نقاہت کے پیش نظر ان کو کامیابی میں تردد تھا۔ اس لیے مدینۂ طیبہ حاضر ہو گیا کہ اگر موت مقدر ہے تو پھر یہیں کہیں نصیب ہو، اس کے بعد حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کی معیت میں حاضری ہوئی حضرت شیخ سے بہت تعلق کا اظہار کرتے رہے اور بہت بلند کلمات فرمائے۔ حضرت شیخ پر بھی بڑا تاثر تھا، چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دن اچانک فجر کی نماز کے لیے مسجد نبوی جاتے ہوئے راستے میں ایک دوست نے اطلاع دی کہ رات نصف شب کے قریب مولانا نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

بعد نماز فجر متصلاً نماز جنازہ ہوئی۔ ارادت مندوں اور اہلِ تعلق کو اطلاع دینے کا نہ وقت تھا اور نہ وہ ذرائع جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن مولانا کی مقبولیت تھی کہ جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کا غیر معمولی مجمع تھا۔ حضرت شیخ اپنی معذوری کے باوجود اخیر تک شریک رہے۔ سیدنا عثمان غنیؓ کی قبر مبارک سے کچھ فاصلے پر تدفین عمل میں آئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ خاص طور پر جو سلسلہ ان کی ذات سے قائم تھا اس کا باقی رہنا موجودہ حالات کے پیش نظر بہت مشکوک نظر آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مرحوم کے درجات زیادہ سے زیادہ بلند ہوں اور جو سلسلۂ رشد و ہدایت ان کی ذات سے قائم تھا وہ باقی رہے۔ ادارہ الفرقان حضرت مرحوم کے تمام متعلقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہے اور وہ مخلصانہ تعزیت پیش کرتا ہے۔

محمد منظور نعمانی

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کا وصال

(ربیع الاول ۱۳۹۰ھ م جون ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً

۱۴ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ (۲۱ مئی ۱۹۷۰ء) پنجشنبہ کی صبح مولانا علی میاں کے نام مولانا محمد عمران خانصاحب کا بھوپال سے دیا ہوا تار پہنچا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ "افسوس! حضرت صاحب کا وصال ہو گیا"۔

یہ بھوپال کے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی (علیہ الرحمۃ) کے وصال کی اطلاع تھی۔ چونکہ کسی علالت کی کوئی اطلاع پہلے سے نہیں تھی اس لیے کئی دن تک انتظار رہا کہ کچھ تفصیل کسی ذریعہ سے معلوم ہو۔ لیکن کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پانچویں دن خود مولانا محمد عمران خانصاحب لکھنؤ تشریف لائے تو موصوف ہی سے تفصیل معلوم ہوئی

اگرچہ حضرت علیہ الرحمۃ کی عمر قمری حساب سے تقریباً ۹۰ سال اور شمسی حساب سے تقریباً ۸۷ سال تھی اور جسمانی طور پر بہت لاغر اور نحیف بھی تھے لیکن ضعف پیری کا کوئی خاص اثر نہیں تھا، روحانی قوت نے جسم کو بھی چاق و چوبند بنا رکھا تھا۔ علاوہ اپنے خاص اشغال و اوراد اور معمولات کے جن میں دن رات کے اوقات کا بڑا حصہ مصروف رہتا تھا مجلس میں گھنٹوں مسلسل تقریر فرماتے تھے۔ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مرتب کیے ہوئے حضرت کے مجلسی ملفوظات جو "الفرقان" میں گزشتہ تین سالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں" ان میں بھی مولانا موصوف نے حضرت کی اس غیر معمولی کیفیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ادھر کئی مہینے سے عام و خاص گفتگوؤں میں مسلسل اس کا اظہار فرماتے تھے کہ مجھے نوٹس مل چکا ہے، جانے کا وقت بہت قریب آ گیا ہے بلکہ فرماتے تھے کہ زندگی کا وقت ختم ہو چکا ہے، میں اب موت میں چل رہا ہوں۔۔۔۔

گزشتہ مہینے میں مولانا علی میاں بعض رفقا کے ساتھ ایک دن کے لیے بھوپال حضرت کی مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ حضرت علیہ الرحمہ کی مجلس میں یہ مولانا کی آخری حاضری تھی، اس مجلس کے ملفوظات مولانا موصوف نے حضرت کے وصال سے صرف ہفتہ عشرہ پہلے الفرقان میں اشاعت کے لیے دیے تھے، چنانچہ وہ اسی شمارہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے آخری ملفوظ میں بھی پوری صراحت کے ساتھ حضرت نے اپنے بارے میں یہی اطلاع دی تھی اور بھی مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس آخری دور میں اس احساس و یقین کا اتنا غلبہ تھا کہ قریب قریب ہر مجلس میں اس کا اظہار فرماتے تھے۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب نے بتایا کہ قریباً دو مہینے پہلے حضرت کی طبیعت چند روز کچھ ناساز رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں پر کچھ ورم ہو گیا تھا۔ جو علاج سے جاتا رہا تھا لیکن اس کے بعد سے جسمانی ضعف بہت بڑھ گیا تھا۔ سہارے کے بغیر اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، مگر نماز بالکل اُسی طرح پڑھتے تھے جس طرح ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ دیکھنے والے کو اس میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ البتہ مسجد تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ گھر ہی پر جماعت ہوتی تھی۔ اس شدید ضعف کے زمانے میں بھی معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بے خوابی کی شکایت ہو گئی تھی اس لیے رات کو نیند بہت دیر سے آتی تھی۔ لیکن ہمیشہ کے معمول کے مطابق تہجد کے لیے اپنے وقت پر اُٹھ جاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جو وقت سونے کا ہے اس وقت تو نیند نہیں آتی۔ اور جو وقت سونے کا نہیں جاگنے کا ہے، اس وقت آتی ہے، تو میں اس کو پاس نہیں آنے دیتا۔

روزانہ کا معمول تھا کہ فجر کے بعد اشراق تک مصلے ہی پر اذکار و اوراد میں مشغول رہتے۔ اشراق پڑھ کے خانقاہ تشریف لے آتے اور کسی کو سامنے بٹھا کے پہلے قرآن مجید کے ۴-۵ پارے سُناتے، سُننے والے صاحب اگر حافظ ہوتے تب بھی حضرت کے حکم کے مطابق قرآن مجید میں دیکھ کے سنتے اس کے بعد گویا مجلس شروع ہو جاتی، سب سے پہلے ایک دو رکوع کے بقدر قرآن مجید تلاوت فرما کر اس کا ترجمہ سُناتے۔ اس کے لیے مولانا فتح محمد صاحب جالندھری مرحوم کا ترجمہ سامنے رہتا، اسی سے پڑھ کر سُناتے۔ اس کے بعد کسی اردو تفسیر سے (اکثر احسن التفاسیر سے جو اردو کی بہت اچھی تفسیروں میں سے ہے) کچھ پڑھ کر سُناتے اور اس ترجمہ اور تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ ذہن پر وارد ہوتا اس کو درمیان میں فرماتے جاتے۔ اس کے بعد حدیث کی کتاب (زیادہ تر مشکوٰۃ شریف) سے کوئی دوسرے صاحب پہلے حدیث کا عربی متن پڑھتے اور حضرت کتاب ہی سے اس کا ترجمہ خود پڑھ کر سناتے۔ اس سب کے بعد امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں سے کوئی مکتوب پڑھ کر سُناتے اور کوئی دوسرے صاحب

مکتوبات کے مطبوعہ اردو ترجمے سے اس کا ترجمہ پڑھ کر سناتے اور حضرت کو جو کچھ فرمانا ہوتا فرماتے ــــ پھر حاضرین مجلس کے احوال اور ان کی سطح کا لحاظ فرماتے ہوئے اُس طرح کے حقائق و معارف بیان فرماتے جس کا نمونہ "یک دو ساعت صحبتے با اہل دل" کے زیر عنوان مولانا علی میاں کے مرتب کردہ ملفوظات میں ناظرین الفرقان پڑھتے رہے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی آخری قسط زیر نظر شمارہ ہی میں شائع ہو رہی ہے۔

یہ سب روزمرہ کا معمول تھا اور بس یہی حضرت کی مجلس تھی۔ اکثر ۱۰-۱۱ بجے یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ اتوار کے دن حاضرین کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی تھی، اس آخری دور میں چار چار سو اور پانچ پانچ سو تک پہونچ جاتی تھی۔ اُس دن ارشادات کا سلسلہ بہت طویل ہو جاتا اور مجلس کبھی کبھی بارہ بجے کے قریب ختم ہوتی۔

آخری اتوار (۱۷ مئی ۲۰۰۰ء) کو مجلس اور زیادہ طویل ہوئی اور اُس دن بار بار اس کا اظہار فرمایا کہ میرا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک خاص والہانہ کیفیت کے ساتھ عارف رومی کے یہ اشعار بھی پڑھے ؎

ایں چہ خوش باشد کہ سوئے شہ روم واصل درگاہ آں بیچوں شوم
وقت آمد کز جہانِ بیکسی پائے کوباں سوئے بام او رسی

اس کے بعد پیر اور منگل کو بھی بالکل اپنے معمول کے مطابق مجلس ہوئی ــــ بدھ کے دن بھی (جو حضرت کے وصال کا دن ہے) روزمرہ کی طرح مجلس ہوئی بلکہ اُس دن صبح کو قرآن مجید روزمرہ کے معمول سے بہت زیادہ قریباً دوگنا سنایا۔ دوسرے معمولات ترجمۂ قرآن، تفسیر و حدیث شریف میں بھی کچھ زیادتی رہی۔ اور حضرت گیارہ بجے کے بعد خانقاہ سے اُٹھ کر اندر تشریف لے گئے۔ بہت خفیف سا کھانا تناول فرمایا۔

گھر میں ایک الماری ہے جس میں حضرت اپنی کچھ خاص پسندیدہ چیزیں محفوظ رکھتے تھے اور وہ ہمیشہ بند رہتی تھی۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کو بلایا اور وہ الماری کھلوائی اُن سے فرمایا جو چیزیں تم ان میں سے لینا چاہو لے لو۔ انھوں نے کچھ چیزیں نکال لیں اور معمول کے مطابق الماری کو بند کرنا چاہا تو فرمایا اب اس کو بند نہ کرو کھلی رہنے دو۔

پھر صاحبزادے سعید میاں اور میاں مصباح الحسن سے کچھ باتیں فرماتے رہے۔ پھر قیلولہ کی نیت سے لیٹ گئے۔ دو ڈھائی بجے کے قریب اُٹھ کر ظہر کی نماز ادا فرمائی اور پھر لیٹ گئے ــــ یہاں تک کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی ــــ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا طبیعت پر گھبراہٹ ہے پھر اُٹھ کر غسل خانہ تشریف لے گئے۔ وہاں چکر آگیا، چھوٹی صاحبزادی کو احساس ہوگیا، وہ اور ان کی والدہ پہونچیں وہاں سے اُٹھا کر لایا گیا اور لٹا دیا گیا۔ اس وقت غشی کی سی کیفیت تھی۔ قریباً دس منٹ میں ہوش آگیا۔ ڈاکٹر قریشی صاحب کو بلایا گیا تھا وہ فوراً پہونچ گئے۔ حضرت نے اُن سے فرمایا کچھ نہیں

بس جگر آ گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ لیکن سُنا نہیں جا سکا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ بڑے صاحبزادے صاحب نے صرف یہ آیت سُنی وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ...... الآیۃ۔

اسی حالت میں پیٹ میں یا سینہ میں تکلیف شروع ہوئی۔ شدتِ کرب کی وجہ سے بار بار ہاتھ اٹھانے کو اور لٹانے کو فرماتے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب نے انجکشن تیار کیا اور عرض کیا کہ اسے لگوا لیجیے، انشاء اللہ ابھی سکون ہو جائے گا۔ فرمایا کہ اچھا لگا دیجیے۔ اور پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ صاحبزادگان اور صاحبزادیاں اور اہلیہ محترمہ قریب تھیں، فرمایا کہ تم سب کلمہ شریف پڑھو، کلمۂ شہادت پڑھو، یٰسین شریف پڑھو، بڑے صاحب زادے محمد سعید صاحب نے یٰسین شریف شروع کر دی۔ دوسرے حضرات کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھنے لگے، فرمایا اب میں رخصت ہو رہا ہوں گھٹنوں تک جان نکل چکی ہے۔ پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہو گئے جو سُنا نہیں جا سکا، تھوڑی دیر کے بعد فرمایا اب ہاتھوں کی جان نکل چکی ہے۔ پھر موجودین کو مخاطب کر کے فرمایا تم سب گواہ رہنا اور پھر بلند آواز سے ایک دفعہ کلمۂ شہادت پڑھا۔ پھر قریبًا ایک منٹ کے بعد بلند آواز سے فرمایا السّلام علیکم۔ اور روح واصل بحق ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

بڑی صاحبزادی صاحبہ ناگپور میں تھیں اُن کو ٹیلیفون سے اطلاع دی گئی، وہ اسی وقت بھوپال کے لیے روانہ ہو گئیں، اُن کے انتظار کی وجہ سے تدفین میں تاخیر کی گئی۔ اور جمعرات کے دن ۲ بجے سہ پہر جنازہ خانقاہ سے اُٹھ سکا۔ جنازہ میں شریک ہونے والوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے جنازہ کی نماز صاحبزادگان کے اصرار سے مولانا محمد عمران خاں صاحب نے پڑھائی اور عصر و مغرب کے درمیان تدفین عمل میں آئی۔

اس حادثہ سے حضرت کے اعزہ و متعلقین اور محبین و مسترشدین کا متاثر اور غمزدہ ہونا بالکل فطری بات ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت تو اپنی مراد کو پہنچ گئے جس کے لیے رُوح عرصہ سے مشتاق اور بے چین تھی ـــــ حضرت کا ایک ملفوظ جو الفرقان میں اب سے بہت پہلے شائع ہوا تھا، اس کا اقتباس آج پھر پڑھ لیا جائے۔

ایک سلسلۂ کلام میں "حیاتِ طیبہ" اور دُنیا و آخرت کی زندگی کی حقیقت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

مجھے تعجب ہوتا ہے جب کوئی بڑھاپے کی شکایت کرتا اور بڑے درد و حسرت سے کہتا ہے کہ اب مرنا ہی باقی ہے، وہ لڑکوں اور جوانوں کو رشک و حسرت سے دیکھتا ہے کہ کبھی میں بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی کسان خوشی خوشی کھیتی کرے جب غلہ کاٹنے کا وقت آئے تو رنجیدہ اور

مایوس ہو، حالانکہ یہ ساری محنت و مشقت اسی دن کے لیے تھی ۔۔۔۔۔۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو اللہ کی ملاقات کا شائق ہو اللہ بھی اُس کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے "مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَائَہٗ ـــــ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بندے کے لیے خدا کی طرف سے سلام و پیام آتا ہے ۔"

اسی سلسلۂ کلام میں پنجرہ میں بند ایک مینا کا یہ حال بیان فرما کر کہ وہ اُڑنے والی میناؤں کی آواز سن کر پنجرہ میں بڑی بیتابی سے پھڑ پھڑایا کرتی تھی ـــــ فرمایا کہ

"یہی حالت رُوح کی ہے جب وہ اوپر کی آوازیں سنتی ہے اور اُس کے کان میں صدا آتی ہے "یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" تو وہ بھی پھڑ پھڑاتی ہے اور اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ پنجرہ کی تیلیاں توڑ کر وہ بھی اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرے اور اپنے ہم جنسوں سے جا ملے ۔"

(صحبتے با اہلِ دل یعنی ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوبؒ ص۶۸-۶۹ (زیر طبع)

ایک دوسرے ملفوظ میں مومن کی موت کی یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے کہ وہ دراصل وطن اصلی عالم آخرت اور اللہ تعالیٰ کے مقام قرب و رضا کی طرف منتقلی کا نام ہے ـــــ ارشاد فرمایا ۔

"میں تو جب کسی بندۂ خدا کے متعلق سنتا ہوں کہ وہ کلمہ پڑھتے ہوئے ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا تو میرا مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ اس کے گھر مٹھائی بھیجوں ۔"

(صحبتے با اہل دل ص۹ (زیر طبع)

ہم ـــــ حضرت کے صاحبزادگان، صاحبزادیوں اور اہلیہ محترمہ اور تمام محبین و مسترشدین کی خدمت میں حضرت کے یہی دو ملفوظ ــ بطور تعزیت پیش کرتے ہیں ـــــ اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے، درجے بلند فرمائے اور اخلاف کو اُن کی اصل دولت کا وارث بنائے ۔

انہ غفور رحیم شکور

محمد منظور نعمانی

حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری رح

(جمادی الاول ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اب سے ٹھیک دس سال پہلے الفرقان کی جون اور جولائی ۱۹۶۰ء کی دو اشاعتوں میں اس ناچیز نے ایک مضمون بعنوان ــــ اللہ کا ایک بندہ ــــ حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری رح کے متعلق لکھا تھا، خوب یاد ہے کہ اُس وقت اُس کا خاص محرک یہ ہوا تھا کہ قریباً ۲۵ سالہ ربط و تعلق کی وجہ سے میں حضرت ممدوح کی نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز زندگی اور غیر معمولی بلکہ محیر العقول حالات سے خاصا واقف اور بہت زیادہ متاثر تھا اور اُن کے وجود کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی اور اسلام کا معجزہ سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ میں محسوس کرتا تھا کہ اُن کو بہت سے وہ لوگ نہیں جانتے جو اگر جان لیں تو بہت فائدہ اٹھائیں اور بہت کچھ حاصل کر لیں۔

حضرت حاجی صاحب کی عمر اُس وقت اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی، خلقی اور جسمانی حیثیت سے بہت لاغر و نحیف اور بظاہر بہت ضعیف سے تھے اس لیے قیاس اور اندازہ یہ تھا کہ دنیا سے ان کی رخصتی کا وقت اب زیادہ دور نہ ہوگا، اسی بنا پر دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان بڑے میاں کے چلے جانے کے بعد ان کے حالات لکھے گئے تو بہت سوں کو بڑی حسرت ہوگی کہ ہمارے زمانہ میں اللہ کا ایک ایسا بندہ موجود تھا اور ہمیں خبر نہ تھی اگر پتہ ہوتا تو ان کی برکات سے متمتع ہوتے ــــ الغرض اسی خیال اور نیت سے اُس وقت میں نے وہ حالات الفرقان میں لکھے تھے۔

بہت سے لوگوں کو اُس مضمون ہی سے حضرت کا پتہ لگا، بعض اصحاب توفیق نے اُسے پڑھ کے حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت و استفادہ کے لیے جودھپور کا سفر کیا، بعضوں نے خط و کتابت

سے رابطہ قائم کیا ـــــــ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اُس کے بعد بھی پورے دس سال تک حضرت ممدوح کو اس دنیا میں رکھا ـــــــ ادھر کافی عرصہ سے خطوط سے اطلاع مل رہی تھی کہ ضعف بہت بڑھا ہوا ہے۔ یہ ناچیز حاضری کا ارادہ بھی کر رہا تھا کہ ۲۰ جولائی کی شام کو حضرت کے صاحبزادگان کی طرف سے لکھا ہوا خط ملا کہ ۲۳ اور ۲۴ جولائی کی درمیانی رات میں تین بجکر پچیس منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ وَاجْعَلِ الْجَنَّۃَ مَثْوٰہُ

اس گنہگار بندہ پر اُس کے رب کریم کے بے حد و حساب احسانات میں سے ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ اس تھوڑی سی زندگی میں اُس نے بہت سے مقبول بندوں تک پہنچایا، اپنے دل کو ان کی محبت و عظمت اور بغیر کسی استحقاق کے ان کی نظرِ عنایت و شفقت نصیب ہوئی ـــــــ لیکن حضرت حاجی عبدالغفور صاحب کو صرف ایک باخدا بزرگ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اُس کی صفتِ ہدایت و رحمت کا ایک معجزہ جانتا۔ ـــــــ وہ ایک نہایت غریب تیلی گھرانے میں پیدا ہوئے، جہاں نہ دنیا تھی نہ دین، انتہائی غربت کی وجہ سے بالکل بچپنے ہی سے محنت مزدوری شروع کی، بیلوں، بھینسوں کا گوبر بینا، گیارہ سال کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے ـــــــ پھر اس محنت مزدوری ہی کے زمانہ میں اور اسی کو وسیلہ بنا کر رحمت خداوندی نے دل میں ایسا دینی رجحان پیدا کیا کہ پیسے بچا بچا کر اچھی دینی اصلاحی کتابیں منگواتے اور چونکہ خود پڑھے لکھے نہیں تھے اس لیے دوسروں کی خوشامد کر کے اُن سے پڑھوا کے سُنتے، پھر اپنے ہی طور پر محنت کر کے اتنی حرف شناسی بھی حاصل کر لی کہ وہ کتابیں خود پڑھنے لگے ـــــــ اسی دور میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینی و دنیوی برکات و ترقیات کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا دُنیا میں تو ۴۔۵ پیسے پانے والے ایک غریب مزدور سے ترقی کر کے بڑے اور بہت بڑے ٹھیکیدار ہو گئے، اس راستہ سے اللہ تعالیٰ نے لاکھوں عطا فرمائے اور لاکھوں ہی اپنے ہاتھوں سے اُن راہوں میں خرچ کیے جن میں خرچ کرنا کارِ ثواب یا اپنی آخرت کے لیے بہتر اور اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کا وسیلہ سمجھا ـــــــ اور اسی کے ساتھ دینی و روحانی ترقی اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہوتی رہی یہاں تک کہ حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے مجاز ہوئے اب سے کوئی ۲۵۔۳۰ سال پہلے قلب میں شدت سے یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو سرمایہ جائداد وغیرہ دی ہے وہ سب آئندہ وارث ہونے والے اصحاب حقوق کو دے کے یا راہ خدا میں صرف کر کے

بالکل اس طرح خالی ہاتھ ہو جاؤں جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا کیا گیا تھا کہ کچھ بھی ملکیت میں نہ تھا اور آئندہ زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کے مطابق مسکین والی گزاروں اور اسی حال میں اس دنیا سے اپنے رب کے پاس جاؤں (اللھم احینی مسکینًا وامتنی مسکینًا واحشرنی فی زمرۃ المساکین) چنانچہ ایسا ہی کیا اور سب کچھ اپنی ملکیت سے نکال کے بالکل فقیر بے نوا ہو گئے اور اپنی بنائی ہوئی مسجد کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں رہائش اختیار فرمائی — دین کی روح اور ایمان کا نقطۂ کمال اخلاص و احسان ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا صحیح علم دراصل علیم " بذات الصدور ہی کو ہوتا ہے لیکن جس حد تک کوئی بشر کسی بندہ کے بارے میں اپنے ادراک و احساس اور اندازہ کی بنا پر کچھ کہہ سکتا ہے یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے قریب رہ کے گویا آنکھوں سے نظر آتا تھا کہ اُن کا اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا پینا، لینا دینا حتیٰ کہ صفت بولنا اور خاموش رہنا بھی اللہ کے لیے اور صرف اللہ کے لیے ہے۔

ابھی اوپر عرض کیا ہے کہ لکھے پڑھے بالکل نہیں تھے، جب اللہ نے دینی ذوق نصیب فرمایا تو اتنی حرف شناسی سیکھ لی تھی کہ اردو کی دینی کتابیں کسی طرح پڑھ لیتے تھے۔ گفتگو میں بعض الفاظ بھی صحیح ادا نہیں ہوتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب کو حکمت اور تفقہ کی وہ دولت عطا ہوئی تھی کہ ہم جیسے کتاب خواں بھی حضرت کی باتوں سے علم حاصل کرتے تھے، کم از کم اس عاجز نے عارف رومی کے اس شعر کا کوئی مصداق اور نمونہ اُن جیسا دوسرا نہیں دیکھا۔

بینی اندر خود علوم انبیا — بے کتاب و بے معید و اوستا

یہ سب چیزیں تفصیل سے اُس مضمون میں لکھی جا چکی ہیں جو الفرقان میں اب سے دس سال پہلے لکھا گیا تھا۔

حضرت مرحوم ایک وسیع علاقہ کے لیے بجائے خود ایک دینی مرکز اور مینارۂ ہدایت تھے، اب وہ اس دنیا سے اٹھا لیے گئے، اللہ تعالیٰ حضرت کے صاحبزادوں کو اور اس علاقہ کے اُن سب حضرات کو جنھوں نے حضرت کی صحبت و تربیت سے تعلق یا شدہ اور فکر آخرت کی دولت پائی، توفیق دے کہ وہ حضرت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خدمت دین اور خیر کے اُن سب کاموں اور سلسلوں کے باقی اور جاری رہنے کا ذریعہ بنیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حضرت مرحوم کو وسیلہ بنایا تھا — یہی ان پر حضرت کا خاص حق ہے اور یہی اُن کے لیے دینی و ایمانی ترقی اور کامیابی کی خاص راہ ہے۔

محمد منظور نعمانی

رفیقۂ حیات کے انتقال پر

(رمضان و شوال ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اِنَّا بِفِرَاقِكِ لَمَحْزُوْنُوْنَ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يُرْضِيْ رَبَّنَا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ؎

میرے خانگی حادثہ پر بزرگوں، مخلص دوستوں اور عزیزوں کے تعزیتی خطوط کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان میں سے بعض نے جو بہت ہی دردمندی سے لکھے گئے ہیں، دل میں داعیہ پیدا کیا کہ مرحومہ اہلیہ کے متعلق چند باتیں حوالۂ قلم کروں۔ جن کے بارے میں اُمید ہے کہ ان شاء اللہ ان سے واقفیت اللہ کے بہت سے بندوں اور بندیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن اور اس کے کرم پر اعتماد و یقین میں اضافہ کا ذریعہ اور خود مرحومہ کے لیے بھی ان شاء اللہ خیر و رحمت کا وسیلہ بنیں گی۔

مرحومہ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے قریباً ۴۸ سال میرے ساتھ رہیں، اس پوری مدت میں برابر یہ تجربہ رہا کہ اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خاص فضل کا ہے۔ اس کا بہت ہی نمایاں اور ایک درجہ میں محیر العقول ظہور اُن کے سفرِ حج اور سفرِ آخرت کے بعض واقعات میں ہوا۔ اس وقت اسی سلسلہ کے چند واقعات سپردِ قلم کرتا ہوں۔

وہ میرے والد ماجد مرحوم کی حقیقی بھانجی کی لڑکی تھیں، دیندار اور عبادت گزار اپنے بچپن سے تھیں، میرے گھر آنے سے بہت پہلے اپنی ابتدائی عمر ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئی تھیں، پھر حضرت کے وصال کے بعد خود میرے ساتھ سہارنپور حاضر ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم سے بیعت کی تجدید کی تھی۔

قدرتی طور پر ان کی بڑی آرزو اور تمنا تھی کہ ان کو حج کی سعادت نصیب ہو لیکن اس کا سامان نہ ان کے پاس تھا نہ میرے پاس۔ اور وہ اس لحاظ سے میرا حال اچھی طرح جانتی تھیں، اس لیے اس سلسلہ میں کبھی انھوں نے مجھ سے ایک حرف بھی نہیں کہا ـــــــ مگر میرے لیے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے کئی بار اس کا سامان فراہم کیا اور پھر ادھر چند برسوں سے "رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کی رکنیت کے طفیل قریباً ہر سال حرمین پاک کی حاضری نصیب ہونے لگی تو میرے جانے کے وقت ان کے دل کا جو حال ہوتا تھا وہ میں محسوس کرتا تھا لیکن وہ مجھ سے اس سلسلہ میں کبھی کچھ نہ کہتیں، بس اللہ تعالیٰ سے عرض کرتیں ـــــ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کی بالکل آخری مہلت میں یعنی ان کے مرض الموت کے شروع ہونے سے صرف چند ہفتے پہلے بے وہم و گمان بالکل "لا یحتسبی" طور پر ان کے اور میرے دونوں کے ہوائی سفر کا ایسے عجیب و غریب طریقہ سے انتظام فرمایا کہ اس کی کوئی توجیہ رب کریم کے خاص الخاص فضل کے سوا نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کے لیے حج والے پاسپورٹ سے سفر کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انٹرنیشنل پاسپورٹ ہی سے سفر کر سکتے تھے۔ اور اہلیہ کے لیے انٹرنیشنل پاسپورٹ حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اندیشہ بلکہ گمان یہی تھا کہ پاسپورٹ جلدی نہ مل سکے گا، اور وقت میں گنجائش بالکل نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کارسازی کہ حیرت انگیز طریقہ پر صرف ۳-۴ دن میں ان کا پاسپورٹ تیار ہوا اور مل گیا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے سفر کرنے والوں کو صرف ۵۰۰ روپے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو ہم جیسوں کے لیے جدہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے سے مکہ مکرمہ پہنچنے تک کے لیے بھی مشکل ہی سے کافی ہو سکتے تھے۔ اس مسئلہ نے اچھا خاصا تردد پیدا کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی اور ہم نے اپنے دل سے کہا کہ اس سفر کا انتظام رب کریم نے محض اپنے لطف و کرم سے فرمایا ہے اس لیے بس اسی کے لطف و کرم پر بھروسہ کر کے چلنا چاہیے چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اور پھر پورے سفر میں اس کا بے حساب لطف و کرم شامل حال رہا۔ اور ہاتھ بالکل خالی ہونے کے باوجود وہ راحتیں اور نعمتیں نصیب رہیں، جو کبھی کسی سفر میں میسر نہ ہوئی

تھیں اور جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بالکل ایسا معاملہ رہا گویا گھر سے قدم نکالتے ہی کسی کریم میزبان نے اپنی مہمانی میں لے لیا ہے۔

حج کے مسافروں کی پہلی منزل بمبئی ہوتی ہے۔ وہاں ہم جیسے لوگوں کے لیے قیام کی اچھی سے اچھی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی مخلص دوست اپنا مہمان بنا لیں اور خود تکلیف اٹھا کے اپنے گھر کے کسی حصہ میں ٹھہرا لیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم نے اس سفر میں اس سے بہت زیادہ آرام دہ انتظام کا فرمایا کہ ہمارے نہایت مخلص دوست حاجی احمد صاحب (زمزمی) نے ہمیشہ کے معمول کے مطابق مہمان تو اپنا بنایا لیکن اپنے گھر میں قیام کی دلی خواہش کے باوجود خاص کر اہلیہ کی راحت کے خیال سے اپنی خوشدامن صاحبہ کے وسیع مکان میں قیام کرایا جو خود اس وقت حج پر گئی ہوئی تھیں اور اپنا وہ مکان پورے ساز و سامان کے ساتھ حاجی صاحب موصوف ہی کے سپرد کر گئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی میں قیام کے ایسے آرام دہ انتظام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ یہ محض فضل ربی تھا۔ پھر بمبئی کے احباب و مخلصین کے گھروں کی خواتین نے ان کی آمد کو گویا ایک تقریب بنا لیا اور ان کے ساتھ انتہائی خلوص و محبت اور اکرام کا معاملہ کیا۔ پھر جدہ پہنچنے پر مخلص مکرم الحاج محمد ولی عبداللہ نور ولی اور ان کے اہل خانہ نے ایسی ہی میزبانی کی۔ بلاشبہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم اور اسی کی طرف سے تھا۔

میں نے مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ میں قیام کرنا طے کیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ ایام حج میں ہندوستان و پاکستان کے سینکڑوں حجاج جن میں خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے، صولتیہ میں قیام کرتے ہیں، اس لیے سوچ لیا تھا کہ بس گزارے کی جگہ پر قناعت کرنا ہوگا اور اس مجاہدہ کے لیے دل پوری طرح بلکہ خوشی کے ساتھ آمادہ و مطمئن تھا۔ لیکن جب ہم لوگ مدرسہ پر جا کر اترے تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے خاص دفتر کے اوپر جو ایک صحن دار اور ہم جیسوں کے لیے نہایت آرام دہ کمرہ حال ہی میں بن کر تیار ہوا ہے۔ ہمارے عنایت فرما حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب نے (جو مدرسہ کے سربراہ ہیں) وہ ہمارے لیے مخصوص کر رکھا ہے، فوراً ہمارا سامان وہیں پہنچوا دیا گیا۔ خود ہم پہونچے تو دیکھا کہ اس کمرہ میں، رہائش ہی کے نہیں بلکہ آسائش کے بھی ضروری سامان ہمارے لیے پہلے سے فراہم کر دیے گئے ہیں۔ پلنگ بچھے ہوئے ہیں، ان پر ہمارے لیے بستر بھی لگے ہوئے ہیں۔ الغرض

وہ سب کچھ تھا جو راحت کے لیے ضروری تھا اور جس کا پہلے سے وہم وگمان نہیں تھا ——— ہم دونوں اپنا سامان کمرہ میں رکھنے کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف جانے لگے، مرحومہ اہلیہ میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب کے پاس سے گزر ہوا تو میں نے اُن کی اس غیر معمولی عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے دلی احساس و تاثر کا اظہار کیا تو مولانا نے حسب عادت بڑی صفائی کے ساتھ فرمایا، مولانا! سچی بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ آپ کے لیے اور آپ کی خاطر بالکل نہیں ہوا، آپ تو آتے ہی رہتے ہیں، بلکہ ان کے لیے کیا گیا ہے جو آپ کے ساتھ آئی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ کبھی پھر آئیں گی یا نہیں۔

ایک نہایت مخلص دوست قاری محمد سلیمان صاحب نے (جو اصلاً سورتی ہیں لیکن مکہ معظمہ میں مقیم ہیں) مولانا شیخ محمد سلیم صاحب سے اجازت لے کر ہم دونوں کو اپنا مستقل مہمان بنا لیا اور سوائے ان دونوں کے جب کہیں خصوصی دعوت ہوتی روزانہ ممدوح کے یہاں سے کھانے کا خوان ہمارے کمرہ میں آتا رہا۔ اسی طرح مدینہ طیبہ کے پورے زمانۂ قیام میں ایک دوسرے نہایت عزیز دوست صوفی محمد اقبال صاحب نے ہم دونوں کی میزبانی کی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اس پورے سفر میں وہ سہولتیں اور راحتیں نصیب فرمائیں جو اس سے پہلے کسی سفر میں نصیب نہیں ہوئی تھیں اور جن کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ اگرچہ مرحومہ کی عمر سفر حج کے وقت پچاس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی لیکن وہ فطری طور پر بہت کمزور تھیں اور کئی برس پہلے سے اُن کے ضعف جسمانی اور ناتوانی کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو سو دو سو قدم بھی پیدل چلنا پڑ جاتا تو اختلاج کی سی کیفیت ہو جاتی اور سانس کا نظام بگڑ جاتا اور بہت دیر تک آرام کرنے کے بعد حالت درست ہو پاتی اور کبھی کبھی دوا استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ یہ بیچاری حج اور عمرہ کے سلسلہ کے طواف بھی بمشکل کر سکیں گی اور صفا و مروہ کے درمیان سعی تو سواری ہی سے کر سکیں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے فضل خاص کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ مکہ معظمہ پہونچتے ہی اُن میں وہ توانائی آگئی جو شاید کبھی جوانی میں رہی ہو۔

جدہ سے بذریعہ کار روانہ ہو کے ہم لوگ مدرسہ صولتیہ پہونچے تھے، سامان اپنے کمرہ میں محفوظ کر کے وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف کو چلے، مدرسہ سے حرم شریف کا فاصلہ

قریباً سو فرلانگ ہے، میں نے مدرسہ سے باہر سڑک پر آکر اُن کی وجہ سے ٹیکسی کرنی چاہی، انھوں نے کہا کہ ہم پیدل ہی چلیں گے، لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ نہیں چل سکیں گی اس لیے میں نے اُن کی بات نہیں مانی اور ٹیکسی سے ہم دونوں حرم شریف گئے، وہاں پہونچ کر پہلے طواف کیا، طواف کے بعد ہم سعی کے لیے صفا پر آئے، وہاں وہ ہاتھ گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں جن پر وہ بیچارے ضعیف اور معذور لوگ کرایہ ادا کر کے سعی کرتے ہیں جو پیدل چل کر نہیں کر سکتے — میں نے اہلیہ سے کہا کہ تم گاڑی سے سعی کر لو، انھوں نے کہا کہ نہیں میں پیدل ہی کروں گی! میں نے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فضل دیکھ کے طواف کے سات چکروں کا اور پھر مطاف سے صفا تک آنے کا اُن پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا، یہی مناسب سمجھا کہ وہ اگر کر سکیں تو میرے ساتھ پیدل ہی سعی کر لیں، چنانچہ انھوں نے پوری سعی میرے ساتھ پیدل کی، اور اُن پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا، حالانکہ سعی کے سات پھیروں کی مسافت پونے دو میل کے قریب ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد وہ میرے ساتھ پیدل ہی مدرسہ صولتیہ واپس ہوئیں۔ پہلے دن کے اس تجربے کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ پھر تو مکہ معظمہ کے پورے زمانۂ قیام میں یہ معمول رہا کہ وہ اکثر پانچوں وقت کی نماز کے لیے میرے ساتھ پیدل حرم شریف گئیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بالکل تندرست خواتین کی طرح بکثرت نفلی طواف بھی کرتیں۔

مدینہ طیبہ میں ہمارا قیام عزیز محترم صوفی محمد اقبال صاحب کے پاس باب التمار میں تھا، وہاں سے مسجد نبوی کا فاصلہ بھی قریب قریب اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ سے حرم شریف کا فاصلہ ہے، وہاں بھی وہ نمازوں کے اکثر اوقات میں میرے ساتھ پیدل ہی مسجد آتیں، ہم دونوں بار بار اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کو یاد کرتے اور اس کا شکر ادا کرتے۔

مجموعی طور پر قریباً چالیس دن حرمین پاک میں قیام رہا۔ انھیں ایک دن بھی اُس ضعف و ناتوانی کا احساس نہیں ہوا جو برسوں سے لازمۂ زندگی بنا ہوا تھا، بمبئی واپسی تک یہی حال رہا، البتہ بمبئی سے لکھنؤ آتے ہوئے ٹرین ہی میں محسوس ہوا کہ اس کیفیت میں کمی آ رہی ہے، پھر گھر پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہ اپنے پچھلے حال پر واپس آگئیں اور معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر معمولی طور پر اپنے خاص الخاص فضل سے اُن کے سفر کا سامان فراہم کر کے ان کی ایک بڑی آرزو اور تمنا پوری کی تھی اسی طرح خارق عادت طور پر اُن کو صرف سفر حج کے لیے یہ طاقت اور توانائی بخش دی گئی تھی۔

پھر چند ہی روز کے بعد اُن کے اُس مرض کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کو ان کی زندگی کے خاتمہ کا ذریعہ بننا تھا —— اور ۲۶ شعبان کو ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سفرِ حج دراصل اُن کے سفرِ آخرت کی تمہید اور اس کی تیاری کا ذریعہ و وسیلہ تھا —— اللہ تعالیٰ کے جس فضل و کرم کا تجربہ ان کی زندگی میں اور خاص کر اُن کے سفرِ حج میں ہوا۔ اُس ربِ کریم سے پوری اُمید ہے کہ سفرِ آخرت کی ساری منزلوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا وہی فضل و کرم مرحومہ کو نصیب رہے گا۔ انہ رؤف رحیم۔

مرحومہ کے انتقال اور مفارقت کا طبعی صدمہ تو فطری بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو حسنِ ظن اور اس کی شانِ کرم پر جو اعتماد نصیب ہے اُس کی بنا پر الحمد للہ دل کو یہ اطمینان ہے کہ اِس وقت اُن کا اس دنیا سے چلا جانا ہی اُن کے لیے بہتر ہوا۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب اُن کی طبیعت ناساز تھی، فرمایا تھا: "لو کان وانا حیٌّ فاستغفر اللہ وأدعو لکِ" (یعنی اے عائشہ! اگر تمہارا انتقال میری زندگی میں ہو گیا تو میں تمہارے واسطے اللہ سے خوب مغفرت طلب کروں گا اور دعائیں کروں گا) ——

اس حدیث پاک کے اشارہ کے مطابق مرحومہ اہلیہ کے لیے استغفار اور دعا کے اہتمام کی توفیق الحمد للہ اس عاجز کو نصیب رہی ہے۔ اور چونکہ اہلِ دین کی ایک وسیع برادری سے تعلق ہے اور اللہ والوں سے محبت ہے اس لیے اپنے حلقۂ تعلق و تعارف میں جہاں جہاں بھی ان کے انتقال کی اطلاع ہوئی، اللہ کے مخلص اور صالح بندوں نے اہتمام سے ان کے لیے استغفار فرمایا اور ایصالِ ثواب کیا۔ جو سیکڑوں خطوط اس سلسلہ میں اب تک مل چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھیں پڑھ کر خود مجھے مرحومہ پر رشک آتا ہے۔ اہلِ دین اور اللہ والوں سے تعلق کی تنہا یہی کتنی بڑی برکت ہے، اللہ تعالیٰ اسی کی قدر و قیمت سمجھنے کی توفیق دے۔ اگر میرے پاس ساری دنیا کے خزانے ہوتے تو میں اُن کو صرف کر کے بھی مرحومہ کے لیے اتنی دعا و استغفار اور اتنا ایصالِ ثواب نہ کرا سکتا۔ یہ محض قلبی و دینی تعلق کی برکت ہے کہ اللہ کے بے شمار بندوں نے حرمین پاک تک میں ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور ایصالِ ثواب کیا۔ مکہ معظمہ سے ایک مخلص عزیز کا خط ملا ہے کہ ان کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انھوں نے مرحومہ کی طرف سے عمرہ بھی کیا، اور حدیث شریف میں ہے کہ رمضان مبارک میں عمرہ حج کے برابر ہے۔ —— یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا مرحومہ پر فضل و کرم ہے اور بلاشبہ بڑی ہی خوش نصیبی

کی علامت ہے۔

اُن کے انتقال کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ ان کی علالت کا سلسلہ قریباً ڈھائی سال سے سفرِ حج کے بعد ہی سے جاری تھا اور پہلے کافی عرصہ تک ان کی حالت بہت تشویشناک اور بظاہر مایوس کن رہی تھی لیکن ادھر قریباً ۵-۶ مہینے سے حالت بظاہر قابلِ اطمینان حد تک بہتر ہو گئی تھی، اُن کے معالج بھی مطمئن تھے ——— دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے لیے ۲۲ شعبان (۴ اکتوبر) کی تاریخ مقرر تھی اور میں نے اُس کی شرکت کے لیے روانگی کا پروگرام بنا لیا تھا کہ دو ہی چار دن پہلے دارالعلوم کے دفتر سے اطلاع آئی کہ فلاں وجہ سے مجلس کی تاریخ دو دن مقدم کر دی گئی ہے اور اب شوریٰ کا جلسہ ۲۰ شعبان سے ہوگا۔ اور دارالعلوم ہی کے فلاں ضروری کام کے لیے مجھے ایک دن پہلے یعنی ۱۹ شعبان کی صبح تک دارالعلوم پہونچ جانا چاہیے ——— مجھے تاریخ کی یہ تبدیلی (جو ضابطہ کے خلاف بھی تھی) سخت ناگوار گزری اور میں نے وہاں پہونچ کر اس پر سخت احتجاج اور اعتراض بھی کیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے انتقال سے پہلے مکان پر پہونچ جاؤں اور ان کی دلی آرزو کے مطابق اُن کا انتقال میرے سامنے ہو۔ اگر مجلسِ شوریٰ کی تاریخ میں یہ تبدیلی نہ ہوئی ہوتی تو میں ۲۶ شعبان کو مرحومہ کے انتقال کے وقت لکھنؤ نہیں پہونچ سکتا تھا ——— مجھے مجلس کی کارروائی کے سلسلے میں پورے پانچ دن دیوبند میں قیام کرنا پڑا، وہاں سے فارغ ہو کر میں سہارنپور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شب و روز وہاں قیام کیا۔ جب وہاں سے لکھنؤ کے لیے روانگی کا ارادہ کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے بالکل خلافِ معمول اور خلافِ عادت[1] فرمایا کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو فلاں مقصد سے دو دن اور ٹھیر جاؤ۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسی مجبوری نہ تھی کہ میں ایک دو دن مزید سہارنپور قیام نہ کر سکتا۔ اور حضرت شیخ مدظلہٗ سے جس طرح کا نیازمندانہ تعلق ہے، اس کا تقاضا تھا کہ میں دو دن اور حضرت ممدوح کی خدمت میں قیام کا فیصلہ کر ہی لیتا، لیکن اس وقت بغیر کچھ زیادہ سوچے سمجھے زبان سے یہی نکلا کہ رمضان مبارک شروع ہونے میں دو ہی چار دن باقی ہیں، اس لیے

[1] حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کا یہ اصول اور معمول ہے کہ وہ اپنے مخلصوں بلکہ بزرگوں سے بھی کبھی مزید قیام کے لیے نہیں کہتے، معلوم نہیں ان کی کیا ضرورت اور مصلحت ہو، خود حضرت ممدوح اپنے اس اصول اور معمول کا ذکر بھی فرمایا کرتے ہیں۔

چاہتا ہوں کہ میں جلدی لکھنؤ پہونچ جاؤں۔ حضرت سے یہ عرض کرنے کے بعد لکھنؤ روانہ ہونے کے لیے رخصتی مصافحہ کرکے باہر نکل آیا۔ اور اب سوچنے لگا کہ مجھے حضرت کے فرمانے کے مطابق دو دن اور ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن حضرت سے رخصتی مصافحہ کرکے چلا آیا تھا اس لیے لکھنؤ واپسی ہی کا ارادہ کرلیا۔ ۲۶ر شعبان کو میرے لکھنؤ پہونچنے کے صرف ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب مرحومہ کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ دار العلوم کی تاریخ کی خلاف ضابطہ تقدیم اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے فرمانے کے باوجود میرا وہاں نہ ٹھہرنا یہ سب منجانب اللہ اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے آخری وقت میں ان کے پاس موجود رہوں، وہ اس کی بڑی آرزو مند تھیں۔

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا۔ مرحومہ کی حالت کئی مہینے سے بہ نسبت سابق کافی بہتر تھی اور میں ان کو اسی حال میں چھوڑ کر دیوبند گیا تھا۔ جب ۲۶ر شعبان کو ۱۲ بجے وہاں سے واپس ہوکر مکان پہونچا تو معلوم ہوا کہ ایک دو دن سے درد کی تکلیف ہے جس کا تعلق گردہ سے سمجھا جا رہا ہے۔ اس وقت بھی دیکھنے میں ان کی حالت تشویشناک نہیں تھی لیکن قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اچانک ان کی حالت میں تغیر ہوا اغلباً قلبی دورہ ہوا اور صرف ۴-۵ منٹ میں روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

للہ ما اعطیٰ ولہ ما اخذ وعلینا الصبر والرضی بالقضا

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درد کی شدید تکلیف کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور استغفار کرنے کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کو سمجھا رہی تھیں کہ دیکھو ذرا اس کا خیال رکھنا کہ تکلیف کی شدت میں میری زبان سے کوئی غلط کلمہ نہ نکل جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے، ہر قسم کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے حسنات کو قبول فرمائے ——— اور جن بندوں نے ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور ان کے پسماندگان کی تعزیت کی اور مخلصانہ ہمدردی کا اظہار فرمایا ان کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے اور دنیا اور آخرت میں فضل و انعام سے نوازے۔ یہ عاجز تو دل سے ان حضرات کا شکرگزار اور دعاگو ہے۔

محمد منظور نعمانی

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی رح

(ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

حکیم صاحب مرحوم کی رُوح پر خدا کی رحمتیں! رمضان مبارک کے دوسرے عشرہ میں ان کی رحلت کا واقعہ پیش آیا تھا جس کو قریباً تین مہینے گزر چکے۔ اس عرصہ میں اُن کے کریمانہ اخلاق اور مخلصانہ عنایتوں کی یاد برابر تقاضہ کرتی رہی کہ مرحوم کے بارہ میں اپنے احساسات و تاثرات کا الفرقان میں بھی کچھ تذکرہ کر کے اپنے ناظرین سے بھی اُن کے لیے دُعاء مغفرت و رحمت کی استدعا کی جائے کہ اس دنیا سے جانے والے کسی محسن یا دوست کے لیے سب سے زیادہ کار آمد نفع مند تحفہ یہی ہو سکتا ہے ——— لیکن الفرقان کے پچھلے دو شماروں (بابت شوال و ذیقعدہ) کی تیاری کے وقت طبیعت کا حال کچھ ایسا رہا کہ دو چار سطریں بھی نہیں لکھی جا سکیں ——— (اس عرصہ میں اور بھی کئی بزرگوں اور دوستوں کی وفات ہوئی جن کے اس عاجز پر خاص احسانات اور حقوق ہیں۔ انشاء اللہ آج ہی کی صحبت میں اُن کے بارہ میں بھی کچھ عرض کیا جا سکے گا ——— واللہ الموفق!)

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کو عام طور سے ایک باکمال اور حاذق طبیب ہی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، شروع میں خود راقم سطور کا تعلق اور رابطہ بھی اُن سے اسی حیثیت سے قائم ہوا، اب سے قریباً ۲۰ برس پہلے کی بات ہے، کسی سلسلہ سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانا ہوا، وہاں نزلہ اور بخار میں مبتلا ہو گیا، میں اُس زمانہ میں یونانی علاج ہی کا عادی تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ہمارے لکھنؤ کے شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب کے چھوٹے بھائی حکیم عبداللطیف صاحب یہاں طبیہ کالج میں پرنسپل ہیں۔ اگرچہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن حکیم عبدالمعید صاحب کے تعلق سے (کہ وہ میرے بڑے ہی

عنایت فرما معالج تھے) انھی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا، میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ میں حکیم صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں، انھوں نے کہا کہ ہم ان کو اطلاع کیے دیتے ہیں وہ ابھی تشریف لے آئیں گے، میں نے کہا کہ میں مریض ہوں مجھے خود طبیب اور معالج کے پاس جانا چاہیے۔ لوگوں نے کہا کہ اُن کو آپ جیسے حضرات کے ساتھ ایسا تعلق ہے کہ آپ کے پہونچنے سے انھیں تکلیف ہوگی اور ہم لوگوں سے سخت شکایت ہوگی — بہرحال ان حضرات نے حکیم صاحب کو اطلاع دے دی اور وہ فوراً ہی تشریف لے آئے، میں نے حکیم صاحب کو پہلی دفعہ اسی دن دیکھا، نبض دیکھ کے اور حال سُن کے جوشاندہ کا نسخہ لکھا اور فرمایا کہ میں خود ہی دوا تیار کرا کے ابھی بھیجتا ہوں، تھوڑی ہی دیر کے بعد دوا آگئی، میں نے پی لی، اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے جلد ہی طبیعت اچھی ہوگئی اور ایک ہی دو دن کے بعد میں لکھنؤ چلا آیا — کچھ مدت کے بعد حکیم صاحب طبیہ کالج سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے دہلی کے ایک طبیہ کالج کی پرنسپلی قبول فرمالی، اسی زمانہ میں دہلی میں غالباً پہلی دفعہ سخت قسم کا قلبی دورہ پڑا، کئی دن موت و زیست کی کشمکش میں گزرے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور صحت یاب ہوگئے — اس کے کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ ہی تشریف لے آئے اور یہیں مطب شروع فرما دیا۔ یہاں بھی میرے لیے حکیم صاحب سے ربط و تعلق بڑھنے کا بہانہ تو اپنی یا اپنے گھر والوں کی بیماری یا علاج معالجہ کا سلسلہ ہی ہوا لیکن چند ہی ملاقاتوں کے بعد معلوم ہوگیا کہ حکیم صاحب صرف ایک حاذق طبیب ہی نہیں ہیں، بلکہ درس نظامی کے ذریعہ جو ایک خاص قسم کی ٹھوس اور پختہ علمی استعداد پیدا ہو جاتی ہے حکیم صاحب اُس کے بھی سرمایہ دار ہیں، اور بالخصوص دینی علوم سے اچھا خاص انتقال ہے، جب بھی علاج معالجہ ہی کے سلسلے سے مطب میں پہونچ جاتا یا وہ غریب خانہ پر تشریف لاتے تو اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے، کبھی کبھی قرآنِ مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کے بارے میں تحریری مراسلت بھی فرماتے۔

راقم سطور کی تالیف "معارف الحدیث" کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور میں اُس کا نسخہ ہدیۃً اُن کو بھیجتا تو عموماً ہفتہ عشرہ کے اندر ہی اندر اس کا مطالعہ فرما لیتے اور اس طرح غور سے مطالعہ فرماتے کہ کتابت و طباعت کی بعض اغلاط کی بھی نشاندہی فرما دیتے (تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کی جاسکے) اور مجھے اپنے تاثرات لکھتے جو میرے لیے بڑے خوش کن ہوتے۔ اُن کا اصرار کہ

یہ بھی مشورہ تھا کہ جن صحابۂ کرام کی روایات معارف الحدیث میں لی گئی ہیں اُن سب کا مختصر تعارفی تذکرہ بہتر تو یہ تھا کہ ساتھ ساتھ حاشیہ میں کر دیا جاتا۔ لیکن اب جبکہ کئی جلدیں اس کے بغیر شائع ہو چکی ہیں تو آخری جلد میں ایک ضمیمہ شامل کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جائے، میں نے حکیم صاحب کا یہ مشورہ قبول بھی کر لیا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو عمل میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس عاجز کے ساتھ حکیم صاحب کی غیر معمولی عنایت و محبت اور ممدوح کے ساتھ اس ناچیز کی روحی و قلبی مناسبت و وابستگی کی خاص وجہ غالباً دینی مسلک و مشرب کی یگانگت اور اس باب میں ذوق اور طرز فکر تک کی وحدت اور ہمارے اکابر و مشائخ، اسلاف جماعت دیوبند سے ان کی انتہائی عقیدت بھی تھی —— عملی زندگی میں بھی جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے علاوہ اوراد و وظائف کا بھی ایک درجہ میں اہتمام فرماتے تھے —— اخلاق میں تو بہت ہی بلند مقام تھا، میں نے اپنی عمر میں ایسے کریم النفس بہت کم دیکھے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا حکیم صاحب کئی سال سے قلب کے مریض تھے، گزشتہ رمضان مبارک کے پہلے عشرہ کے آخری دنوں میں قلبی شکایت شروع ہوئی۔ دو تین دن تک گھر ہی پر علاج معالجہ ہوتا رہا، اس ناچیز کو علم بھی نہیں ہوا، جب مرض نے خطرناک شکل اختیار کر لی تو میڈیکل کالج کے ہسپتال میں داخل کر دیے گئے، اگلے دن صبح کو مجھے معلوم ہوا اور میں عیادت کے لیے گیا۔ میں نے ان کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے تیماردار کے ذریعہ یہ پیام بھیجا کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن میری شرط یہ ہے کہ نہ میں آپ سے بات کروں نہ آپ مجھ سے کلام فرمائیں، کیونکہ اس وقت بات کرنا آپ کے لیے مضر ہو سکتا ہے، اس کے بعد حاضر ہوا۔ لیکن حکیم صاحب نے ہمیشہ کی عادت کے مطابق مصافحہ کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا اور کچھ بات بھی کرنی چاہی اور مجھے پھر عرض کرنا پڑا کہ اس وقت نہ میں بولوں گا نہ آپ بولیں —— یہی حکیم صاحب کی زندگی کا آخری دن تھا اور یہی راقم سطور کی ان سے آخری ملاقات تھی۔ —— اسی رات میں جو غالباً رمضان مبارک کی بارھویں شب یعنی عشرۂ رحمت کی دوسری رات تھی ہسپتال ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم۔

علی الصبح حکیم مسیح الزماں صاحب ندوی پرنسپل تکمیل الطب کالج نے مجھے ٹیلی فون سے اطلاع کی

اور یہ بھی بتایا کہ نماز جنازہ کے لیے ۵ بجے سہ پہر کا وقت طے ہوا ہے۔

جب میرے کسی بزرگ یا دوست یا محسن کا انتقال ہوتا ہے تو میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے ان کو آخری غسل دوں، کفن پہناؤں اور اپنے ہاتھوں سے قبر میں لٹا کر خدا کی رحمت کے سپرد کروں، اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اکثر یہ خواہش پوری ہو ہی جاتی ہے۔ الحمدللہ حکیم صاحب مرحوم کو بھی غسل دینے کی توفیق ملی، ان کے خاص شاگردوں اور نیازمندوں میں سے طبیہ کالج علی گڑھ کے پروفیسر حکیم افہام اللہ صاحب اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے پرنسپل حکیم مسیح الزماں صاحب ندوی بھی غسل میں شریک اور معاون رہے، اور سب سے زیادہ حصہ ہمارے تبلیغی مرکز لکھنؤ کے رفیق خاص مولوی محمد سلیم کا رہا جو اس کے خاص ماہر ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر اس عاجز کے ساتھ ہوتے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور خاندانی قبرستان میں جو جھوائی ٹولہ ہی میں حکیم صاحب مرحوم کے مکان کے بالکل قریب ہے تدفین عمل میں آئی اور اپنے اس مخلص محب و محسن کو قبر میں اتارنے اور لٹانے کی بھی اس عاجز کو توفیق ملی۔ (باقی صفحہ ۱۸۰ پر)

محمد منظور نعمانی

قاری محمد شبیر صاحب لکھنوی ثم رائپوری

(ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اس عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو توفیق الٰہی نے مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر (قدس سرہٗ) کی خدمت میں پہونچایا اور حضرت سے خادمانہ ربط و تعلق قائم ہوا اور پھر ہم خدام کی استدعا پر حضرت کی لکھنؤ بھی بار بار تشریف آوری ہوئی اور کئی کئی ہفتے قیام رہا تو لکھنؤ کے ہمارے بہت سے احباب و مخلصین نے بھی حضرت سے بیعت و اصلاح کا تعلق قائم کیا، ان میں سے کئی ایک پر خدا کی توفیق سے راہِ سلوک کی طلب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے اپنے کو بالکل ہی حضرت سے وابستہ کر دیا اور رائے پور کی خانقاہ ہی میں جا پڑے جہاں اس دور میں طالبین کو بالخصوص کھانے پینے کے معاملے میں بڑے مجاہدہ کی زندگی گزارنی پڑتی تھی ——— انہی میں ایک نہایت مخلص بندے قاری محمد شبیر صاحب بھی تھے۔ اصل وطن تو غالباً بارہ بنکی کے کسی دیہات میں تھا، لیکن اُن کے والد صاحب لکھنؤ کے مشہور عطر کے "کارخانہ اصغر علی محمد علی" میں ملازم تھے، اس لیے قاری صاحب لکھنؤ ہی میں رہتے تھے، جہاں تک معلوم ہے گھر کا گزارا اچھا خاصا متوسط درجہ کا تھا۔ لیکن انھوں نے رائے پور کی خانقاہ میں پہونچنے کے بعد پوری زندگی مثالی زہد و توکل اور انتہائی صبر و مجاہدہ کے ساتھ گزاری، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ جسم میں خون بالکل نہیں ہے۔ گویا کوئی مردہ ہے جو قبر سے اٹھ کر آگیا ہے۔ مگر اس جسمانی ضعف و نقاہت کے ساتھ دن اور رات ذکر و عبادت میں اتنی مشغولیت کہ عاجز راقم سطور نے اپنی پوری زندگی میں کوئی دوسرا ان کا عدیل و مثیل نہیں دیکھا اور اس کے باوجود ایسی گمنامی بلکہ کس مپرسی کہ خاص دوستوں کے علاوہ کوئی

نہیں جانتا اور سمجھتا تھا کہ یہ بھی کچھ ہیں۔

راقم السطور گزشتہ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی خدمت میں ۸-۱۰ دن قیام کی نیت سے سہارن پور حاضر ہوا۔ وہاں پہونچکر غالباً سب سے پہلے حضرت شیخ الحدیث ہی سے معلوم ہوا کہ ہمارے قاری محمد بشیر صاحب بخت مریض ہیں اور ان کو علاج اور دیکھ بھال کے لیے رائے پور سے سہارن پور ہی لے آیا گیا ہے اور شاہ مسعود صاحب کے بھٹ ہاؤس کے تحتانی حصہ میں مقیم ہیں۔ یہ عاجز زیارت وعیادت کے لیے گیا، دیکھ کر اندازہ ہوا کہ حالت نازک اور تشویش ناک ہے۔ خود ان کا بھی اندازہ تھا کہ وقت غالباً قریب ہی ہے ——

میرے سہارن پور پہونچنے کے دوسرے یا تیسرے دن رفیق محترم مولانا علی میاں بھی آگئے، ہم دونوں کو آخری عشرہ شروع ہونے سے پہلے واپس آجانا تھا، لکھنؤ کے دو اور مخلص دوست بھائی عبدالقادر اور حاجی اسماعیل، جن کا ارادہ آخر رمضان تک حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں سہارن پور قیام کا تھا، ان کو ہم دونوں نے مشورہ دیا کہ وہ زیادہ وقت قاری صاحب کے پاس اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال میں گزاریں اور اسی کو اپنا سب سے اچھا معمول اور وظیفہ سمجھیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان حضرات نے ایسا ہی کیا، لیکن قاری صاحب کا وقت موعود قریب آگیا تھا، ہماری واپسی کے ۲-۳ دن بعد بھٹ ہاؤس ہی میں انتقال ہوگیا اور ان کی ذاکر روح اپنے اصل مستقر میں پہونچ گئی۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ؀

بندہ کا اصل حال اور درجہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، لیکن اس عاجز نے قاری صاحب کو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پاک کا خاص مصداق سمجھا۔

مشکوٰۃ شریف میں مسند احمد اور جامع ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے ——— کہ

اغبط اولیائی عندی المومن	میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابل رشک میرے
خفیف الحاذ ذو حظ من الصلوٰۃ	نزدیک وہ مومن ہے جو ہلکے پھلکے حال میں دنیا کے ساتھ
احسن عبادۃ ربہ واطاعہ	سامان اور عیال وغیرہ کے لحاظ سے بہت ہلکا پھلکا ہو

فی السر وکان غامضا
فی الناس لا یشار الیہ
بالاصابع وکان رزقہ
کفافا فصبر علی ذلک
ثم نقد بیدہ فقال عجلت
منیتہ قلت بواکیہ قل تراثہ۔

نماز میں اس کا خاص حصہ ہو اور اپنے رب کی عبادت
واطاعت خوبی کے ساتھ اور صفت احسان کے ساتھ
کرتا ہو اور پوشیدہ خفا کے ساتھ اور خلوت میں
کرتا ہو اور وہ چھپا ہوا اور گمنامی کی حالت میں
ہو، اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کیے
جاتے ہوں (کہ یہ فلاں بزرگ اور کامل ہیں) اور
اُس کی روزی بھی بقدر کفایت ہو اور وہ اُس پر
صابر و قانع ہو ـــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے اپنے ہاتھ سے چٹکی بجائی اور فرمایا جلدی
آگئی اُس کو موت اور اُس پر رونے والیاں بھی کم ہیں۔
اور اُس کا ترکہ بھی بہت تھوڑا سا ہے۔

اس حدیث پاک میں قابل رشک اولیاء کی جو صفات بیان فرمائی گئی ہیں وہ جس طرح اس عاجز نے اللہ کے اس بندے (قاری محمد شبیر مرحوم) میں جمع دیکھیں کسی دوسری شخصیت میں ان کا اس طرح اجتماع دیکھنا یاد نہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہم بندوں کے گمان سے بھی بہتر معاملہ فرمائے، مغفرت اور رحمت خاصہ سے نوازے اور درجات عالیہ عطا فرمائے اور ان کے مقبول احوال و اوصاف کا کوئی حصہ ہم کو بھی نصیب فرمائے۔

بقیہ صفحہ ۱۸۶

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح اس نے حکیم صاحب مرحوم کو اس دنیا میں بہت سی نعمتوں اور بلندیوں سے نوازا تھا، اسی طرح قبر و برزخ کی اور اس کے آگے کی آخرت کی منزلوں میں اپنی خاص رحمتوں اور عنایتوں سے نوازے اور پوری پوری مغفرت فرمائے ـــــ اپنے ناظرین کرام سے بھی استدعا ہے کہ وہ بھی دعا فرمائیں اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رح و مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی رح

(ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

ہندوستان کی تقسیم نے جو بہت سے مسائل خاص کر ہم مسلمانوں کے لیے پیدا کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے وہ بزرگ یا عزیز جن سے انتہائی قریبی نسبی یا روحانی تعلق تھا وہ ہم سے امریکا اور روس سے بھی زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں نے قریباً ڈیڑھ سال سے ہر قسم کی کتابوں، رسائل اور اخبارات کی آمد و رفت پر بھی پابندی لگا رکھی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہم واقعات و حادثات کا وقت پر علم بھی نہیں ہو سکتا — حضرت مولانا خیر محمد جالندھری اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی متحدہ ہندوستان کے اکابر و مشاہیر علماء میں سے تھے۔ یقیناً ہندوستان کے طول و عرض میں سیکڑوں ایسے مسلمان ہیں جو ان بزرگوں سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ان بزرگوں کی وفات اب سے ۲-۳ مہینے پہلے ہوئی لیکن پاکستان کے اخبارات و رسائل نہ آسکنے کی وجہ سے یہاں اس کی اطلاع بہت دیر سے ہو سکی۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بڑے ممتاز صاحب درس اور وسیع النظر عالم تھے، خاص کر فن حدیث میں مولانا کا خاص مقام تھا، اسی کے ساتھ حکیم الامۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے، ملک کی تقسیم سے پہلے جالندھر میں ان کا مدرسہ "خیر المدارس" دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور جیسے مدارس کے طرز پر اس وقت کے پنجاب کا ایک بڑا اور بافیض

مدرسہ تھا، بلکہ جہاں تک علم ہے سندھ اور صوبہ سرحد میں بھی اُس وقت کوئی دینی درسگاہ اس درجہ کی نہیں تھی، تقسیم کے فیصلہ کے بعد جب مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے پاکستان کے علاقہ میں منتقل ہونا پڑا تو مولانا مرحوم نے ملتان میں قیام کا فیصلہ فرمایا اور وہیں "خیر المدارس" قائم کیا۔ پاکستان کے اس ابتدائی دور میں وہی سب سے بڑا مدرسہ تھا، بعد میں کراچی اور لاہور اور دوسرے شہروں میں بھی بڑے اور مرکزی مدارس قائم ہو گئے۔

تقسیم سے پہلے جب کہ خیر المدارس اور حضرت مولانا کا قیام جالندھر میں تھا کئی بار وہاں حاضری کا موقع ملا۔ قیام پاکستان کے بعد اگرچہ اس عاجز کے دو سفر مغربی پاکستان کے ہوئے، ایک ۵۲ء میں اور دوسرا ۶۸ء میں لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کسی سفر میں بھی ملتان اور خیر المدارس میں حاضری نہ ہو سکی، البتہ ایک دفعہ غالباً کراچی سے لاہور آتے ہوئے ملتان اسٹیشن سے گزرنا تھا، حضرت مولانا کو تار سے اطلاع دلوا دی تھی تاکہ کم از کم اسٹیشن ہی پر زیارت و ملاقات ہو سکے۔ حضرت ممدوح صاحبزادگان اور خیر المدارس کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ اسٹیشن پر تشریف لائے۔ میرے لیے کھانا بھی گھر سے پکوا کر ساتھ لائے، جب ٹرین ملتان اسٹیشن پر پہونچی تو حضرت مولانا تشریف فرما تھے، میں نے اتر کر مصافحہ و معانقہ کیا، مولانا نے ساتھ والے مجمع کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ان سب کو مصافحہ سے منع کر دیا ہے تاکہ گڑبڑ اور تمہیں زحمت نہ ہو اور اطمینان و سکون سے پاس بیٹھنے اور کچھ بات کرنے کا موقع مل جائے۔ (میں نے محسوس کیا کہ یہ خاص تھانوی ذوق و مزاج کی برکت ہے) پھر مجھے ساتھ لے کر پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں تشریف لے آئے جہاں اسٹیشن کے ذمہ دار حضرات کی اجازت سے پورے مجمع کے بیٹھنے کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا گیا تھا۔ سب لوگ حیرت انگیز نظم و سکون کے ساتھ بیٹھ گئے —— حضرت مولانا نے فرمایا کہ اگر بار محسوس نہ ہو اور طبیعت حاضر ہو تو اس موقع پر کچھ کہہ دیں۔ میں نے تعمیل کو سعادت سمجھ کر طلبا سے کچھ عرض کیا اور دعا ہوئی۔ —— جب میری ٹرین کی روانگی کا وقت آیا تو مولانا سے آخری مصافحہ کر کے روانہ ہو گیا —— یہی حضرت مرحوم کی آخری زیارت اور ملاقات تھی —— وفات کی صحیح تاریخ کسی خط سے معلوم نہ ہو سکی، اندازہ یہ ہے کہ گزشتہ رمضان مبارک یا شوال (نومبر یا دسمبر) میں وفات پائی —— اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور آپ کے علمی و دینی فیوض کے سلسلہ

کو جاری رکھ کر درجات میں مسلسل ترقی کا وسیلہ بنائے اور اخلاف کو اخلاص اور اتباع مرضیات کی توفیق دے۔

حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی، لدھیانہ کے مشہور قدیم علمی خاندان کے ممتاز فرد تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے آخری دور کے تلامذہ میں سے تھے، ابتدائی زمانہ تدریس میں گزرا، اچھے اچھے مدرسوں میں صدر مدرس رہے، بعد میں سیاسی تحریکات میں منہمک ہوگیا، کانگرس اور جمعیۃ علماء سے وابستہ اور اچھے عہدوں پر رہے۔ بار بار جیل بھی گئے، لیکن ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد مشرقی پنجاب کے دوسرے عام مسلمانوں کی طرح ان کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان منتقل ہونا پڑا۔

راقم سطور پر مفتی صاحب کا خاص الخاص احسان ہے، ناظرین الفرقان میری اس سرگزشت سے الفرقان ہی کے ذریعہ واقف ہو چکے ہیں کہ ابتدائی عربی تعلیم میں میرے کئی سال ضائع ہوئے جس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مجھے بہت کم عمری میں عربی یعنی اس کی صرف و نحو شروع کرا دی گئی تھی، اس کی مروجہ درسی کتابیں (میزان پنج گنج نحو میر وغیرہ) مجھے پڑھائی جاتی تھیں اور اس طرح پڑھائی جاتی تھیں کہ میں اس عمر میں بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا اس لیے وہ پڑھنا میرے لیے سراسر بوجھ تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس لاحاصل اور بغیر مفہوم پڑھائی سے ایک طرح کی بیزاری تھی، میرے وطن سنبھل میں کئی عربی مدرسے تھے، اور ہر سال میرا ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا، جب ایک مدرسہ میں پڑھتے پڑھتے سال پورا ہو جاتا اور گھر والے محسوس کرتے کہ مجھے کچھ نہیں آیا تو اگلے سال دوسرے مدرسہ میں بھیج دیا جاتا اس دوسرے مدرسہ میں سال پورا کرنے کے بعد بھی میں وہیں رہتا جہاں پہلے تھا —— کئی سال میرے اسی طرح گزر چکے تھے کہ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں مولانا مفتی محمد نعیم صاحب سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" میں صدر مدرس ہو کر آگئے، ہمارے ہی محلہ کے ایک عالم صاحب نے جو اچھے طبیب بھی تھے میرے والد صاحب سے مفتی صاحب کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ مجھے پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ اگلے ہی دن میں ان کی خدمت میں "مدرسۃ الشرع" بھیج دیا گیا، انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھ گچھ

کی، اس میں میرے ذاتی اور گھریلو حالات بھی پوچھے اور اندازہ لگایا کہ مجھے اس تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور بس مارے باندھے گھر والوں کے جبر سے ابتک مدرسوں میں جاتا رہا ہوں ــــــ انھوں نے اپنی باتوں سے مجھے مانوس کرکے بڑی شفقت سے فرمایا ــــــ کہ تم سوچ سمجھ کر اپنے بارے میں خود فیصلہ کرو، اگر تمھارا ارادہ عربی پڑھنے کا نہیں ہے کچھ اور پڑھنا یا کچھ اور کرنا چاہتے ہو تو صفائی سے ہم کو بتادو، ہم تمھارے والد صاحب کو مشورہ دیں گے کہ تم کو اس لائن پر لگائیں، اور اگر تمھارا ارادہ عربی پڑھنے کا ہو تو ہم تمھیں پڑھائیں گے اور خدا نے چاہا تو تم بہت جلد پڑھ لوگے ــــــ ان کے اس مشفقانہ اور حکیمانہ طرز عمل نے دل کے رُخ کو بدل دیا اور میں نے پڑھنے کا ارادہ کرلیا اور مفتی صاحب سے عرض کردیا۔ انھوں نے ایک خاص انداز سے پڑھانا شروع کیا اور واقعہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کئی سال میں نہیں پڑھ سکا تھا وہ میں نے ان سے چند مہینوں میں پڑھ لیا ــــــ مفتی صاحب تو اس سال کے بعد سنبھل تشریف نہیں لائے لیکن میری تعلیم کی گاڑی صحیح لائن پر چل پڑی اور علم کا جو حصہ مقدر تھا وہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمادیا ــــــ بہرحال میری تعلیم میں بنیادی حصہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ کا ہے اس لیے وہ میرے بہت بڑے محسن تھے ــــــ پچھلے دنوں دارالعلوم دیوبند جانا ہوا تو پہلے وہیں اُن کی خبر وفات سُنی ــــــ اس کے بعد ساہیوال (پاکستان) سے ان کے بڑے صاحب زادے مولانا ضیاء الحسن صاحب کا اطلاعی مکتوب بھی ملا ــــــ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے، بالخصوص اس ناچیز پر اُن کا جو علمی احسان ہے اُس کا اُن کو بہتر سے بہتر صلہ دار آخرت میں عطا فرمائے اور فضل خاص سے نوازے ــــــ ناظرین کرام سے بھی دُعا کی استدعا ہے۔

محمد منظور نعمانی

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مرحوم

(ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

الفرقان کے اکثر ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلویؒ کے حادثۂ انتقال کی اطلاع ہو چکی ہوگی، مولانا موصوف حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے کئی رشتوں سے قریبی عزیز اور برادر نسبتی تھے۔ اب سے ۳۲-۳۳ سال پہلے جب حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں اس عاجز کی آمد و رفت شروع ہوئی تو یہ تبلیغی کام جو انہی کی طرف منسوب ہے (اور اب عالمی کام بن چکا ہے) اُس وقت بہت محدود پیمانہ پر تھا، میوات اور دہلی شہر کے ایک مخصوص طبقہ کے علاوہ بس چند قریبی اضلاع کے کچھ مخلصین کا اُس سے تعلق تھا۔۔۔ اور در حقیقت اس کی کل کائنات بس یہ تھی کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اپنی مضطرب روح، اپنے بے چین قلب، اپنے نحیف جسم اپنے حال اور اپنی زبان سے اس کے داعی تھے، اُن کے تربیت یافتہ چند میواتی اُس کے ہاتھ پاؤں اور یہ مولانا احتشام الحسن صاحب اس کا انتظامی دماغ تھے ۔۔۔۔ ذی استعداد عالم اور صاحب قلم بھی تھے، اُن کا ایک چھوٹا سا رسالہ "پستی کا واحد علاج" اُس ابتدائی زمانہ میں بلا شرکت غیرے اس دعوتِ تبلیغ کا گویا تعارفی اور توضیحی لٹریچر تھا ۔۔۔۔ اُس زمانہ میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے حضرت مولاناؒ کے بعد انہی سے زیادہ واقف تھے ۔۔۔۔ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کا تعلق اس کام سے اُس وقت بس اتنا ہی تھا کہ اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں کچھ حصہ لے لیتے اور مہمانوں کی خبر گیری میں شرکت کر لیتے تھے ۔۔۔۔ لیکن حضرت کے وصال کے بعد دفعۃً اُن کا حال ایسا بدلا کہ گویا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی روح اپنی پوری جذبی

اور بے چینی کی کیفیت کے ساتھ اُن کے اندر آ گئی ــــ اور حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب کی صحت و توانائی نے اچانک جواب دے دیا اور گویا وہ حضرت کے مرض کے وارث بن گئے ــــ چند ہی روز کے بعد صحت کی اس خرابی سے مجبور ہو کر اپنے وطن کاندھلہ آجانا پڑا۔ کم وبیش اسی وقت سے امراض کا تسلسل رہا، لیکن قلم کے ذریعہ برابر کام کرتے رہے ــــ ادھر کئی سال سے غیر مسلموں میں دعوت اسلام کا اُن کے دل میں خاص داعیہ پیدا ہو گیا تھا اور یہی اُن کا مشن اور موضوع فکر بن گیا تھا، اس سلسلہ کے اُن کے متعدد رسالے اور مقالے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلق رکھنے والوں سے وہ اس کے لیے خط و کتابت بھی کرتے تھے گزشتہ سال جبکہ برسوں کی مسلسل بیماری کی وجہ سے وہ سفر کے بالکل لائق نہ تھے، انھوں نے راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں سے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی تک کا سفر بھی فرمایا۔ اگرچہ ہم دونوں اپنے کچھ تجربات اور اپنی خاص رائے کی بنا پر ان کی رفاقت اور ہم سفری کا فیصلہ نہیں کر سکے لیکن اُن کے جذبۂ صادق سے بہت متاثر ہوئے ــــ ادھر کئی مہینے سے تکالیف میں بہت اضافہ ہو گیا تھا بالآخر علاج کے لیے دہلی لے جانا طے کیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے آپریشن کا فیصلہ کیا ــــ آپریشن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آنتوں میں کینسر ہے جس پر طویل مدت گزر چکی ہے اور آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ بے چارے ڈاکٹروں نے اپنی سی کوشش کی لیکن وقت موعود آچکا تھا، جب تک ہوش اور زبان نے ساتھ دیا ذکر و دعا کا سلسلہ جاری رہا، وسط شوال میں اسپتال ہی میں انتقال فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تلمذ اور بیعت کا تعلق حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ سے تھا، بعد میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے تعلق قائم کر لیا تھا، حضرت نے وصال سے چند ساعت پہلے جن چھ حضرات کو اجازت دی تھی اُن میں مولانا مرحوم بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے۔

لہ دارالاشاعت محلہ مولویان کاندھلہ ضلع مظفر نگر سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ

(ربیع الاول ۱۳۹۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

۲۰/۲۱ صفر مطابق ۵/۶ اپریل کی درمیانی شب میں دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نے اپنے وطن مراد آباد میں[1] وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید فخر الدین احمد علیہ الرحمۃ کی عمر بچاسی سال بتائی گئی ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے طویل مرض الوفات ۱۹۵۷ء میں آپ کی مسند درس کو آباد رکھنے کے لیے آپ ہی کی خواہش پر مولانا (سید فخر الدین احمد صاحب) نے مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد کی اپنی دیرینہ مسند اور حلقہ احباب و وابستگان اور عیال و خدام کو خیرباد کہہ کر دار العلوم دیوبند کا قیام اختیار فرمایا۔ اور وفات سے بس چند ماہ پیشتر تک یہاں کی مقدس مسند حدیث آپ کے دم سے اسی شان سے آباد رہی جو آپ کے پیشرؤوں کی جلالت اور خدا کی نظر عنایت نے اسے بخش رکھی ہے اور جس کے ساتھ اس درس گاہ کا نام اپنے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے حلقہ تعارف میں وابستہ ہے۔

مولانا مرحوم، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، پھر خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحب کے چشمہ فیض سے بھی خوب خوب استفادہ کیا تھا۔ شروع ہی سے دار العلوم کے بہت سے چمکتے ہوئے فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ دار العلوم دیوبند ...

[1] آبائی وطن تو ہاپڑ (ضلع میرٹھ) ہے لیکن مولانا نے مراد آباد ہی کو وطن بنا لیا تھا

کی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم منصوبے کے ماتحت، مراد آباد کی سرزمین پر شاہی مسجد میں وجود پانے والی عربی درسگاہ جامعہ قاسمیہ کی مسند حدیث ایک مدت تک آپ کی ذات سے رونق پاتی رہی۔ ۱۹۴۷ء کے جن دنوں میں مغربی یو پی سے مغربی پاکستان کے دور دراز خطوں تک ہنگامۂ کشت و خون برپا تھا، یہی دن عربی مدرسوں میں تعلیمی سال کے آغاز کے تھے۔ راقم سطور کا یہ سال حدیث کی تعلیم یعنی فراغت حاصل کرنے کا سال تھا۔ لکھنؤ سے دیوبند جانا تھا جہاں تین سال پہلے سے تعلیمی سلسلہ تھا، مگر راستے مسدود۔ والد ماجد کی رائے سے اس وقت تک کے لیے جب تک کہ دیوبند کا راستہ قابل سفر ہو، مراد آباد میں اپنے تایا جناب مولوی محمد حسن بدر سنبھلی کے یہاں قیام کر کے حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے حلقۂ درس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس طرح کوئی دو مہینے اسی شاہی مسجد کی درسگاہ میں آپ سے استفادے اور تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ اور غالباً یہی آپ کو پہلی بار دیکھنے کا بھی اتفاق تھا۔

عمر شریف اُس وقت بھی ساٹھ کا خط تو پار کر ہی چکی ہوگی۔ سر کے بالوں پر تو سیاہی کافی تھی مگر ڈاڑھی جہاں تک یاد آتا ہے بالکل سفید تھی، قویٰ میں بھی ضعف کے آثار۔ مگر کیا حسنِ صورت وقد و قامت تھا کہ کہیں سے بھی آب و تاب نہیں گئی تھی۔ کھدر پوشی کے باوجود لباس کی نظافت، سپیدی اور سر سے قدم تک سلیقے اور قرینے کی گلکاری اس سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ مسند پر تشریف [illegible] حسن ادب کی لطافت بیان و ادا کی وضاحت و فصاحت اور آواز کی لطافت و نظافت سے درس کی تقریر یوں لگتی جیسے نرم و نازک ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے ہوں تقریر حشو و زوائد سے بالکل پاک۔ جچے تلے الفاظ پر مشتمل ہوتی۔ دیوبند کی بالعموم لمبی لمبی تقریروں کے چسکے کے باوجود یہ نیا ذائقہ زیادہ پسند آیا۔ اور اس لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی سب سے بڑی خصوصیت آج بھی بس یہی یاد ہے اسی کے ساتھ اُس وقت کا یہ تاثر بھی کہ مولانا کے پائے کے استاد کے لیے طلبا کی جیسی جماعت ہونی چاہیئے، نہ کثرت کے اعتبار سے وہ یہاں ہے نہ کیفیت کے اعتبار سے، اس لیے مولانا کی طبیعت کچھ کھلتی نہیں۔ کوئی شایانِ شان حلقہ میسر ہو تو طبیعت کے انشراح سے اس درس کا رنگ کچھ اور ہی نکلے۔ مولانا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ شایانِ شان کوئی مسند اور مدرسہ انھیں ملے۔ مگر ہماری اس

پیڑھی کے بزرگوں کی شان یہ نہ تھی کہ وہ اپنے مرتبے کے ایسے تقاضوں کے پیچھے دوڑا کریں۔ وضعداری اور بزرگان رفتہ کے ایما، کی پاسداری بھی ان کے یہاں بڑی چیز تھی، جہاں بٹھا دیے گئے وہاں سے از خود ہٹنے کی بات یہ اس بنا پر بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ چنانچہ دس سال مولانا کو اور وہیں گزر گئے اور وہ اسی مختصر سی درسگاہ اور چھوٹی سی جماعت طلبا، پر قانع رہے جو ۱۹۴۷ء میں راقم حروف نے دیکھی تھی۔ لیکن اُن کے لیے شایان شان جگہ مقدر تھی ایسی بے نفسیاں بھی کچھ نہ کچھ اثر رکھتی ہی ہیں جن بزرگوں کے حکم سے وہ مدرسہ شاہی کی تدریس پر قانع ہوئے بیٹھے تھے اُن ہی کے مسلمہ جانشین کی نظر انتخاب کا فیصلہ ہوا کہ اُس کی جانشینی اور بزرگوں کی مسند کو آباد رکھنے کی ذمہ داری مولانا قبول کریں۔ اب مولانا اُس مسند کی رونق تھے جس سے اونچی مسند کا تصور برصغیر ہند کا کوئی عالم نہیں کرسکتا۔

قویٰ میں بہت ضعف آچکا تھا، امراض چشم خاص طور سے لاحق ہو گئے تھے، مگر جس احساس ذمہ داری اور بلند ہمتی سے مولانا نے یہ بار امانت اُٹھایا وہ ایک مثال ہے۔ دارالعلوم کے دورۂ حدیث کی گرانباری کا تصور باہر کے لوگ نہیں کرسکتے۔ شیخ الحدیث اور شوقین طلباء کے لیے یہ ایک مجاہدہ کا سال ہے۔ کمر تختہ ہو جاتی ہے، آنکھیں پوری نیند کو ترسی ہوئی رہتی ہیں کھانے پینے کو ٹھیک سے وقت نہیں ملتا اور ملے بھی تو اس دماغ سوزی میں غذا اور اس کا نفع آپ سے آپ کم ہوتے جاتے ہیں۔ آخری بار زیارت گزشتہ سال اگست میں دیوبند کی قیام گاہ پر ہوئی۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ انبساط و شفقت کے تجربوں کے باوجود دیر تک خدمت میں حاضر رہنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ بات چیت سے ضعف، خصوصًا دماغی ضعف، انتہا کو ٹیک رہا تھا۔ مگر "چکی کی مشقت" اس عالم میں بھی اپنی جگہ تھی، درس بدستور ہو رہا تھا۔

اس سے مولانا کے احساس ذمہ داری اور عالی ہمتی پر روشنی نہیں پڑتی کہ تنہا یہ دونوں چیزیں کسی درجہ کی بھی ہوں، اس عالم ضعف و پیری میں، دارالعلوم کے روایتی درس حدیث کا بوجھ اٹھائے رکھنے کی قوت عطا نہیں کرسکتیں۔ اس سے مولانا کے اندر کسی ذوق و شوق کی اُس کیفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جس کی کرشمہ کاری بہت سے بزرگوں کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ مثلاً یوں ایک منٹ بھی کھڑے نہیں رہ سکتے تھے مگر جماعت میں لا کر کھڑے کر دیے جاتے تو پوری

نماز صحت مندوں کی طرح ادا کرتے تھے۔ عمر بھر کی خدمت، بے نفسی اور اخلاص نیت کی برکت سے حدیث نبوی کے ساتھ مولانا کے ذوق و شوق کی کیفیت بظاہر ایسی ہی بلند نسبت قائم ہو گئی تھی کہ اگر مسند پر جا کر بیٹھے اور اُدھر ضعف و نقاہت کے تمام احساسات دب گئے۔ اور جو لوگ دوسرے مقام پر چند کلمات کی ادائیگی میں بھی تکلف محسوس کرتے، وہ دیکھتے کہ

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

آخر ۱۹۷۶ء میں باقاعدہ امراض حملہ آور ہو گئے اور اب مقاومت جواب دے گئی تو مراد آباد لے آئے گئے لیکن خدا کے کرم سے افاقہ ہوا تو پھر یہاں کا قیام گوارا نہ تھا اور اسی احساس ذمہ داری اور ذوق و شوق نے ایک بار پھر دیوبند پہنچا دیا۔ لیکن اب مشیئت تھی ہی نہیں کہ یہ چشمۂ فیض جاری رہے۔ ناچار پھر مراد آباد تھوڑے ہی دن بعد واپس آنا پڑا اور مختلف علاجوں اور صحت و مرض کے نشیب و فراز وں کا مقررہ حصہ پورا کر کے بندہ اپنے رب سے جا ہی ملا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین و بعثہ فی زمرۃ عبادہ المنتخبین الغُرّ المحجلین ——

دارالعلوم دیوبند کے لیے اب مولانا کا بدل تلاش کرنا بڑا مسئلہ ہے۔ دیکھیے مشیئت الٰہی کا کیا فیصلہ سامنے آتا ہے۔

دارالعلوم کی صدارت کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت میں بھی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ کی جانشینی مولانا کے حصہ میں آئی۔ اور یہ منصب بھی آخر عمر تک آپ کے ساتھ وابستہ رہا۔ مذہبی اعتبار سے جمعیۃ کے مسلک سے آپ کو پوری ہم آہنگی بھی تھی۔ آزادی کی تحریک میں اس جماعتی نظام کے تحت آپ کا عملی حصہ بھی رہا۔ قید و بند کے مرحلے بھی طے کیے۔ مگر اصل ذوق علمی اور تدریسی ہی تھا۔ اس لیے نہ پہلے کبھی اس معاملے میں زیادہ نمایاں ہوئے نہ جمعیۃ کی صدارت کے بعد کوئی خاص عملی سرگرمی اختیار کی۔ بس ایک اعزازی نوعیت کے صدر تھے۔ اس لیے اس پہلو کا بس تذکرہ ہی اُن کی یاد کے اس موقع پر کیا جا سکتا ہے، کوئی تبصرہ بامعنی نہیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی گرانقدر تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور بجد دل نشین اور پر اثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ ــــ دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس پر عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب۔ قیمت مجلد صرف ۴/۵۰

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۵/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع۔ جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت موثر اور روح پرور تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۔/۷، انگریزی ۱۵/

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی سوانح حیات ـــ آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اس کے حواریوں کا چلایا ہوا "دین الٰہی" تاریخی قصہ ہو کر رہ گیا اور سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے صحیح اسلام کی طرف مڑ گیا۔ قیمت مجلد ۱۲/-

معارف الحدیث

(احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب، اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ)

مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ اس سلسلے کی ۶ جلدیں الحمد للہ مکمل ہو چکی ہیں۔ جلد اول ۹/۵۰ جلد دوم ۱۱/- جلد سوم ۱۳/۵۰ جلد چہارم ۱۰/- جلد پنجم ۱۲/۵۰ جلد ششم ۲/۵۰ (مجلد کے لیے جلد کی قیمت علاحدہ سے لگائی جاتی ہے۔)

انگریزی ایڈیشن۔ معارف الحدیث کی پہلی جلد اور نصف دوم کا انگریزی ترجمہ ایک جلد میں شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۳۲/-

تصوف کیا ہے؟

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۵/-

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت اور جامعیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قیمت مجلد صرف ۶/-

ملفوظات حضرت مولانا الیاسؒ

جن لوگوں نے حضرتؒ کو نہیں پایا وہ ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے آپؒ کو پوری طرح سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔

قیمت ــــ ۳/۵۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت

اسلام کا بنیادی کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ایک عہد و میثاق ہے جو اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس عہد کی حقیقت کو سمجھے اور اس کو زندگی بھر نباہنے کی کوشش کرے۔ قیمت صرف ۰۵/۔

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر اور شوق انگیز بیان ۔۔۔ قیمت صرف ۱/۵۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج کے موضوع پر اردو میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب ۔۔۔ اپنی اس خصوصیت میں اب بھی منفرد و ممتاز ہے کہ یہ بہت آسان اور دلنشین انداز میں حج کا طریقہ اور احکام و مناسک بھی بتاتی ہے اور وہ ذوق و شوق بھی پیدا کرتی ہے جو حج و زیارت کی جان ہے۔ قیمت ۴/=

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں؟" کا خلاصہ ہے۔ قیمت ۱/۲۵

فیصلہ کن مناظرہ ۔۔۔ اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب ۔۔۔ کتاب کے مقدمہ میں بریلی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہیے قیمت ۲/۵۰

نماز کی حقیقت

اسلام میں ایمان کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے۔ مگر کیا ہم نماز کو ایسی ہی اہمیت کے ساتھ ادا بھی کرتے ہیں؟ کیوں اس لیے کہ ہم عام طور پر اس کی اصلی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ بیحد مفید کتاب ہے۔ قیمت ۷۵/۔

انسانیت زندہ ہے

یہ کتابچہ مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پراثر واقعہ بیان کیا ہے جذبۂ انسانیت و اتحاد کی افزائش کے لیے بے حد مفید کتاب ہے قیمت صرف ۰/۸۰

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
اور مسئلہ حیات مسیح و نزول مسیح

مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ۔۔۔ رد قادیانیت پر مدلل کتاب ۔۔۔ اس میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے جو عوام و خواص کے لیے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت مجلد صرف ۳/۔

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر مولانا کا یہ مختصر رسالہ دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے۔ قیمت ۸۰/۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا۔ معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں ان کا تسلی بخش اور مدلل جواب۔ قیمت ۲/۵۰

کتب خانہ الفرقان کی چند دیگر مایہ ناز مطبوعات

تجلیات ربانی (حصہ اول)

(تلخیص و ترجمہ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی) اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین و ترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مصطفویہ کے حق میں میر کارواں کا کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب علیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس نے اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ قیمت ۱۳/۵۰

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ

حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی کے مکتوبات کا ذخیرہ حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کے پورے کام کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے گرانقدر مکتوبات کو اردو زبان میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے تلخیص کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ قیمت ۷/-

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا جو اپنے اندر بڑی کشش اور دلآویزی رکھتے ہیں، اب تک مخطوطہ کی شکل میں عربی زبان میں تھے مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ان کا انتخاب کر کے اپنے شگفتہ و رواں انداز میں اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ قیمت ۱/۲۵

حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔ تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا الیاسؒ کی مکمل سوانح حیات۔ مولانا کی شخصیت، ان کے اخلاق و عادات، ان کے امتیازی اوصاف، ان کے خاص افکار و نظریات ان کی دینی دعوت کا پس منظر، اس کا ارتقاء اور اس کے اصول و طریق کار کو سمجھنے کے لیے یہ واحد کتاب ہے۔ قیمت ۴/۵۰

صحبتے با اہل دل

مرتبہ مولانا ابو الحسن علی ندوی۔ حکیم نکتہ داں عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی (عرف پیر نخے میاں) کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین و کیفیت احسانی پیدا کرنے کا وافر سامان اور حکایات و تمثیلات کے پیرائے میں تصوف اسلامی کا عطر آگیا ہے۔ قیمت ۸/-

تذکرہ حضرت صوفی عبد الربؒ

حضرت صوفی سید عبد الرب علیہ الرحمہ کے حالات زندگی۔ انکے اثر پذیر بیان کا حل اور انکی بامقصد اور اصلاحی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس تذکرہ میں ان کی چند منتخب اصلاحی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ قیمت ۲/-

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از مولانا محمد عارف سنبھلی۔ ارشد القادری صاحب کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب (جدید ایڈیشن قیمتی اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا) قیمت ۶/-

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اہم اردو تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت

عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ
"امور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت" کا مفصل
تعارف، تین جلدوں میں مکمل حصہ اول ۴۹۶ صفحات زیر طبع
حصہ دوم ۴۰۶ صفحات -/۱۵ حصہ سوم ۱۲ ۳۰۲ صفحات زیر طبع

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

وہ شہرۂ آفاق اور انقلاب انگیز کتاب جس کے اردو،
انگریزی، ترکی، فارسی وغیرہ تراجم کے علاوہ صرف
عربی میں ۱۲ ایڈیشن عرب ممالک میں شائع ہو چکے ہیں
صفحات ۳۵۰، قیمت مجلد -/۱۲

پرانے چراغ

مولانا موصوف کی تازہ ترین تصنیف
معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استاذوں، اور
دوستوں سے متعلق تعارفی مضامین، مشاہدات و واقعات
اور تأثرات و معلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں
مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی،
مولانا مدنی، مولانا تھانوی، شاہ وصی اللہ رحمہم اللہ
جیسے بلند پایہ حضرات کے علاوہ مصنف کے کچھ
اساتذہ، متعلقوں اور چند گمنام ہستیوں کا تذکرہ
کیا ہے۔
صفحات ۳۶۴
قیمت مجلد مع گرد پوش -/۱۶

ارکان اربعہ

اسلامی عبادات کتاب و سنت کی روشنی میں اور مسیحیت
و یہودیت نیز ہندو مذہب کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ
تقریباً ۴۰۰ صفحات سائز $\frac{20 \times 36}{8}$ قیمت صرف -/۱۲

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید (م ۱۲۴۶ھ)
اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات
جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار
آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔
۲۷۲ صفحات۔ قیمت مجلد -/۱۲

دریائے کابل سے یرموک تک

مغربی ایشیا کے مسلم اور عرب ممالک افغانستان
ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن کے
ایک مطالعاتی دورہ کی مفصل روداد و ڈائری۔ جس میں
ان ممالک کی دینی، فکری اور اقتصادی صورت حال کی
سچی تصویر اور وہاں کی دینی و اصلاحی تحریکات، متضاد
عوامل و اثرات اور ذہنی و روحانی کشمکش کا دیانت دارانہ
جائزہ لیا گیا ہے۔ صفحات ۳۰۲۔ خوبصورت گرد پوش
سے مزین بہترین کتابت و طباعت۔ قیمت -/۱۴

ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں

یعنی موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی، تمدنی اور معاشرتی تعارف، ان کے عقائد، عبادات، مذہبی تہوار، رسم و رواج، معاشرت و اخلاق اور ان کی ملی خصوصیات کا بیان۔ ایک غیر جانبدارانہ جائزہ، ایک واقعی تصویر۔ قیمت =/۵

معرکۂ ایمان و مادیت

سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر قرآن، حدیث، قدیم تاریخ، جدید معلومات اور حالات حاضرہ کی روشنی میں۔ اور اصحاب کہف کا عجیب سبق آموز قصہ۔ قیمت =/۵

مولانا کے دیگر خطبات و مقالات

پیام انسانیت	۲/۵۰
ایک بہتر ہندوستانی سماج	۱/-
عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب	-/۸۵
خواص — ملت میں ان کا مقام	-/۵۰
محبت فاتح عالم	-/۲۵
طالبان علم نبوت	-/۶۰
مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں	-/۷۵
سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں	۱/-
اسلام مکمل دین مستقل تہذیب	-/۸۵
لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ	-/۷۵
دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں	-/۷۵
نشان راہ	-/۷۵
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	۱/-
مرد خدا کا یقین	-/۵۰
محسن عالم	-/۵۰

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ

چودھویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ اور عالم ربانی اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، کمالات، ارشادات و ملفوظات۔ قیمت =/۴

پاجا سراغ زندگی

مولانا مدظلہ کی چند اہم تقاریر کا مجموعہ جن میں درد و سوز اور ایمان و یقین کی کیفیات کے ساتھ ساتھ موصوف کے طویل علم و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے قیمت =/۴

مولانا کی تصانیف انگریزی میں

ٹریژرس آف اسلام		۳۰/-
ٹیلس آف دی پرافٹ		۵/-
سیویرس آف اسلامک اسپرٹ	اول	۲۰/-
〃 〃 〃	دوم	۳۵/-
سیرت سید احمد شہید		۴۰/-
اسلام اینڈ دی ورلڈ		۱۸/-
ویسٹرن سویلائیزیشن		۲۲/-
فیتھ ورسز میٹریلزم		۱۰/-
اسپیکنگ پلینلی ٹو دی ویسٹ		۵/-
دی ورلڈ آف اسلام ٹوڈے		-/۶۰
ریلیجن اینڈ سویلائیزیشن		۳/-
قادیانزم - اے کریٹکل اسٹڈی		۱/-
اسلام اینڈ احمدزم		۲/-
گلوری آف اقبال		۱۸/-
دی مسلمان		۱۰/-

مستند تفاسیر قرآن اور علوم قرآنی پر منتخب کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تفسیر ماجدی اول دوم	۳۵/-	قرآن اور تصوف	۵/-
تفسیر ابن کثیر مکمل مجلد	۱۳۰/-	فہم قرآن	۲/۷۵
تفسیر حقانی مکمل	۱۱۰/-	قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم	۱/-
تفسیر بیان القرآن مکمل چرمی	۱۶۰/-	رہنمائے قرآن	۱/۲۵
تفسیر موضح القرآن مکمل	۴۰/-	وحی الٰہی	۵/-
تفسیر حل القرآن مجلد	۱۰۰/-	بشریت انبیاء	۲/۵۰
” ” غیر مجلد	۹۰/-	اعلام القرآن	۳/۵۰
تفسیر مظہری	۲۱۵/-	فضائل قرآن	۱/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو	۲/۵۰	قصص و مسائل	۲/-
لغات القرآن غیر مجلد مکمل	۵۰/۵۰	تعلیم القرآن	۳/۷۵
قصص القرآن ” ”	۲۶/۲۵	جمع و تدوین قرآن	۳/-
ارض القرآن مکمل	۱۰/-	معجزۃ القرآن	۱/۷۵
[illegible] القرآن مجلد	۱۵/-	قرآن کا تعارف	۲/۷۵
قرآن اور تعمیر سیرت	۶/۵۰	قرآن کی باتیں	۲/-

تراجم احادیث اور متعلقات حدیث

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ایضاح البخاری ۱ تا ۱۳	۳۹/-	انتخاب صحاح ستہ	۸/-
[illegible] شریف مترجم	۱۰۰/-	ترجمان السنہ مکمل غیر مجلد	۹۴/-
تقریر بخاری	۱۲/۵۰	کتابت حدیث	۳/۵۰
نور الباری شرح بخاری	۱۱۵/-	نصرۃ الحدیث	۳/-
خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی اردو	۱۵/-	مآثر و معارف	۱۵/-
		معارف الحدیث مکمل مجلد	۸۵/-
ترجمہ مکمل	۲۵/-	تذکرہ علماء اور ان کے علمی کارنامے	۱۰/-

سیرت نبوی صحابۂ کرام اور مشائخ پر بہترین کتب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرت النبی مکمل	۱۳۳/-	الفاروق	۱۵/۷۵
رحمۃ للعالمین	۳۶/-	مشکل کشا	۲/۵۰
پیغمبر عالم	۱۰/-	فاطمہ کا چاند	۳/۲۵
رسول اللہ	۱/۸۰	اسوۂ صحابیات	۳/-
اصح السیر	۲۲/-	رسول اللہ کی صاحبزادیاں	۱/۷۵
خطبات مدراس	۴/۲۵	امت مسلمہ کی مائیں	۲/۵۰
رحمت عالم	۳/۲۵	سیر الصحابیات	۳/۷۵
اسوۂ حسنہ	۳/۷۵	سیر الصحابہ ششم	۹/۴۰
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	۱۲/-	” ” ہفتم	۹/۷۰
ہمارے حضور	۲/-	حیات الصحابہ مکمل مجلد چرمی	۴۲/-
پہلی تقریر سیرت	۳/-	چار ستارے	۳/-
دوسری تقریر سیرت	۳/۷۵	اسوۂ صحابہ اول	۹/۴۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	۳/۵۰	” ” دوم	۹/۳۰
” ” ” کلاں	۶/۷۵	صحابہ کی انقلابی جماعت	۲/-
سیرت خاتم الانبیاء	۲/-	تاجدار مدینہ کی صاحبزادیاں	۱/۲۰
سیرت خیر العباد	۱۲/-	تابعین	۱۲/-
خلفائے راشدین	۱۱/۹۰	اہل کتاب صحابہ و تابعین	۳/-
سیرت عمر بن عبدالعزیز	۲/۲۵	سو بڑے آدمی	۴/۲۵
سیرت النعمان	۲/-	حیات وحید الزماں	۵/-
امام رازی	۱۲/۵۰	حیات سلیمان	۲۶/۵۰
مہاجرین اول	۱۲/۵۰	حیات شبلی	۲۶/۵۰
” دوم	۱۱/-	علمائے حق اور ان کی داستانیں	۴/-
سیر انصار اول	۱۲/۵۰	غدر کے چند علماء	۲/۵۰
” دوم	۸/۸۰	علمائے ہند کا شاندار ماضی مکمل	۳۲/۵۰
المامون	۸/۸۰	صدیار جنگ	۱۲/-
ولی کامل	۴/-	خوان خلیل	۳/۵۰
الغزالی	۸/۸۰	سیرت طیبہ	۶/-
سوانح مولانا یوسف کاندھلوی	۱۵/-	ارواح ثلاثہ	۱۱/۵۰

تاریخ کے موضوع پر مستند و شاہکار کتابیں

کتاب	قیمت
تاریخ اسلام شاہ معین الدین	۵۲/-
تاریخ اسلام - اکبر شاہ خاں	۴۰/-
تاریخ ملت کامل ۱۱ حصے	۷۵/۷۵
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۸/-
تاریخ ادبیات ایران غیر مجلد	۲۰/-
تاریخ ہند پر نئی روشنی	۵/-
تاریخ المغرب	۱۵/۷۵
تاریخی مقالات	۱۰/۷۵
تاریخ دولت عثمانیہ مکمل دو حصے	۳۰/-
تاریخ اندلس اول	۱۲/-
تاریخ فقہ اسلامی اول	۱۶/۳۰
یادوں کی دنیا	۱۶/۲۵
تاریخ گجرات	۱۲/۵۰
اسلام اور عربی تمدن	۱۳/۷۵
اسلام کا سیاسی نظام	۹/۴۰
ہندوستان اسلامی عہد میں	۱۲/-
عہد مغلیہ مسلمان اور ہند	۱۶/۴۰
مختصر تاریخ ہند	۶/۲۵
ہماری بادشاہی	۶/۲۵
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	۱۶/۲۵
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	۵/۷۵
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	۳۰/۲۵

فقہ و فتاویٰ اور مسئلہ مسائل پر اہم کتابیں

کتاب	قیمت
رکعات تراویح	۲/-
رکعات تراویح جدید	۴/-
فتاویٰ رشیدیہ کامل	۱۵/-
فتاویٰ رحیمیہ اول	۱۷/-
〃 〃 دوم	۲۰/-
〃 〃 سوم	۲۰/-
علم الفقہ مکمل مجلد	۳۱/-
امداد الفتاویٰ	۳۰/-
آلات جدیدہ کے شرعی احکام	۲/۷۵
مسئلہ سود	۳/-
مسئلہ ختم نبوت	۳/۲۵
مسئلہ تعدد ازدواج	-/۶۰
بہشتی زیور مکمل سٹ	۶/-
فتاویٰ دار العلوم دیوبند	۹۸/-
فتاویٰ عالمگیری تا ۲۲ قسط	۸۸/-
نور الہدایہ ترجمہ ہدایہ سنی قسط	۳/-
تاریخ علم فقہ	۲/۵۰
اصلاح الرسوم	۳/-

اکابر و مشائخ کے تذکرے، مکتوبات، ملفوظات اور مقالات

کتاب	قیمت
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ	۱۲/-
تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن	۴/-
تذکرہ شاہ علم اللہ	۵/-
تذکرۃ الخلیل	۱۳/۵۰
تذکرۃ الرشید	۲۳/۵۰
تذکرۃ المحدثین	۱۲/۷۵
تذکرہ شیخ الہند	۶/-
تذکرہ مخدوم صابر کلیریؒ	۳/-
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	۱۲/-
مکاتب احمد سعید	۳/-
اکابر کے خطوط	۸/-
ارشاد السالکین	۲/۵۰
مکتوبات تصوف اول مجلد	۳/-
〃 دوم ۳/- سوم	۳/-
مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط	۵/-
مکاتیب شبلی	۱۶/۷۵
صحبتے با اولیاء	۷/۵۰
صحبتے با اہل دل	۸/-
سوانح حسنہ	۸/-
ملفوظات مولانا الیاسؒ	۳/۵۰
ملفوظات شیخ الاسلام	۲/۵۰
مقالات شبلی اول تا ہشتم	۳۰/-
مقالات امینی	۵/-
خطبات شبلی	۲/۷۵
ارشاد الملوک مع اکمال الشیم	۱۰/-
خطبات ماثورہ	۳/-
مقالات احسان	۱۵/۷۵

رد بدعت و قادیانیت پر بہترین کتابیں

کتاب	قیمت
رد بدعت	۲/-
آئینہ بدعت	۱/۳۰
بدعت کی باتیں	۵/-
بریلی فتنہ کا نیا روپ	۶/۵۰
فیصلہ کن مناظرہ	۲/۵۰
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	۲/۵۰
وہابی کی پہچان	-/۳۰
براہین قاطعہ	۶/-
تقویۃ الایمان	۱۲/-
چالیس بدعتیں	-/۸۰
تحریک وہابیت پر ایک نظر	-/۷۵
قادیانی مسلمان کیوں نہیں	۳/-
تحفۃ القادیان	۲/۵۰
قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ	-/۸۰
تحقیق لاثانی	۶/۵۰
عشرۂ کاملہ	۶/-

حج بیت اللہ اور نماز سے متعلق کتابیں

کتاب	قیمت
آپ حج کیسے کریں	۲/-
آسان حج	۱/۲۵
فضائل حج	۴/۵۰
رفیق حج	۲/۷۵
معلم الحجاج	۱۰/-
حجۃ الوداع	۱/۷۵
حج کا مسنون طریقہ	۲/۵۰
حج کی باتیں	۳/-
تجلیات کعبہ	۵/-
تجلیات مدینہ	۴/۵۰
سفر حجاز	۵/-
اعیان الحجاج	۵/۵۰
سب سے پہلا سفرنامہ حج	۳/-
حج و مقامات حج	۵/-

نماز

کتاب	قیمت
کتاب الصلوٰۃ مجلد	۲/-
نماز کی حقیقت	۱/۵۰
فضائل نماز	۱/۷۵
میری نماز	۲/۵۰
نماز مترجم	-/۴۰
نماز کی باتیں	۳/-
آئینہ نماز	۲/۵۰
آسان نماز	۱/۵۰
عورتوں کی نماز	-
نماز کیا ہے؟	-/۸۲

تبلیغی کتابیں

کتاب	قیمت
تبلیغی نصاب اول، پلاسٹک	۱۴/-
" دوم پلاسٹک	۱۵/۵۰
تبلیغ دین	۴/۵۰
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب	۵/-
تبلیغی تقریریں	۱/-
تبلیغ کیا ہے؟	۳/۷۵
تبلیغی سات نمبر	۲/۲۵
چھ باتیں	-/۱
تبلیغی تحریک کے بنیادی اصول	۳/۵۰
مفتاح التبلیغ	۴/-
تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں	۱/۵۰

کچھ ادبی کتابیں

کتاب	قیمت
شعر العجم مکمل	۴۳/۲۵
شعر الہند مکمل	۲۹/-
شعلۂ رقصاں	۴/۵۰
غزل انسائیکلوپیڈیا	۲۵/-
فن شاعری	۳/-
فریب تمدن	۱۲/-
گل رعنا	۱۲/۲۵
اقبال کامل	۱۲/۵۰
مکاتیب شبلی مکمل	۱۴/۷۵

فضائل و حقوق

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
فضائل اسلام	۱/۲۵	فضائل درود	۲/۲۵
فضائل قرآن	۱/۵۰	فضائل استغفار	-/۵۰
فضائل نماز	۱/۵۰	فضائل اذان و اقامت	-/۶۰
فضائل رمضان	۱/-	میاں بیوی کے حقوق	-/۷۵
فضائل حج	۴/۵۰	حقوق الزوجین	۳/۲۵
فضائل صدقات	۱۲/-	والدین کے حقوق	.
فضائل ذکر	۳/۲۵	حقوق البیت	۱/۷۵
فضائل تبلیغ	-/۶۰	حقوق الاسلام	-/۵۰

دین کی تعلیم دینے نیز اردو سکھانے کے لیے بہترین کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
اچھا قاعدہ	-/۴۰	اچھی باتیں اول	-/۶۰
اللہ کے رسولؐ	-/۸۵	" " دوم	۱/-
حضرت ابوبکرؓ	-/۸۵	" " سوم	-/۸۵
حضرت عمرؓ	-/۸۵	" " چہارم	۱/-
حضرت عثمانؓ	-/۸۵	" " پنجم	۱/-
حضرت علیؓ	-/۸۵	" " ششم	۱/۲۵
ہمارا ایمان	-/۷۵	حضرت خدیجہؓ	۱/-
اچھے قصے	۱/۵۰	حضرت سودہؓ	-/۵۰
آسان فقہ	-/۷۵	حضرت عائشہؓ	۲/۷۵

دار العلوم ندوۃ العلماء کا جدید عربی نصاب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
قصص النبیین مکمل	۶/۷۵	تمرین الصرف	۲/۲۵
القراءۃ الراشدہ مکمل	۹/۷۵	تمرین النحو	۲/۵۰
منثورات	۹/-	الادب العربی	۶/-
مختارات مکمل	۱۳/-	النبوۃ والانبیاء	۱۵/-
معلم الانشاء مکمل	۱۲/-	علم التصریف	۳/-

ہمارا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی - لکھنؤ

Regd. No. 1 LW/NP-62

Monthly AL-FURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

Vol. 45 Nos. 4,5,6 SPECIAL ISSUE, 1977. Phone : 25547

SELECTED READINGS

By **Maulana Manzoor Nomani**

	Rs. P.		Rs. P.
What Islam Is ?	18 00	Haj Made Easy	2 00
The Quran & You	15 00	Meaning and Message of Tradition	32 00
Islamic Faith & Practice	15 00		

By **Maulana Abul Hasan Ali Nadvi**

Islam & the World	18 00	Tales of the Prophets	5 00
Saviours of Islamic Spirit		Syed Ahmad Shaheed	40 00
Vol. I	40 00	Qadianism—a Critique	1 00
,, ,, Vol. II	35 00	Islam and Ahmadism	2 00
The Four Pillars of Islam	22 00	Islamic Concept of Prophethood	25 00
Western Civilisation Islam & Muslims	22 00	Basis of a New Social Order	1 00
Glory of Iqbal	20 00	Islam In a Changing World	1 50
The Musalman	10 00	Mercy For The Worlds	2 00
Faith versus Materialism	15 00	Islam—the Perfect Religion	1 50
Qadianism—a Critical Study	13 00	The Haj	6 00
Speaking Plainly to the West	5 00	Religion and Civilization	8 00
Muslims in Ind	18 00		

By **OTHER AUTHORS**

Mohammed the Ideal Prophet	20 00	Teachings of Islam	40 00
The Message of Quran	25 00	,, Vol. I & II	55 00
Key to the Garden of Bliss	24 00	Teachings of Tabligh	5 00
Fear of Hell	15 00	Bahishti Zewar	45 00
The Book of Thousand Lights	12 00	Sayings of Mohammad	5 00
The Glorious Caliphate	25 00	Punjsura Shareef	12 00
Isabella	20 00	Darood-o-Salam	8 00
The Balanced Way	4 00	Prayers of the Prophet	5 00
Rights of Husband & Wife	5 00	Nuzul-e-Isa	12 00

Can be obtained from :—

AL-FURQAN BOOK DEPOT

31, Naya Gaon West (Nazirabad),

LUCKNOW (India).

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۲۵/-
بنگلا دیش سے ۱۶/-
فی شمارہ ۱/۵۰

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ کے بعد اب نئی شرح اس طرح ہوگی
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۴ پونڈ

جلد (۴۵) بابت جولائی ۱۹۷۷ء مطابق ماہ رجب المرجب ۱۳۹۷ھ شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اسکا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چِٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانا چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: ــــــ ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ
آسٹریلین بلڈنگ ــــــ لاہور

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

الفرقان کا جو تھا انتخاب نمبر "وفیات نمبر" بفضلہ تعالیٰ سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق شروع جون میں شائع ہو گیا تھا ۔ اب تک کے پہنچے ہوئے بے گنتی خطوط سے یہ معلوم کر کے کہ دیکھنے پڑھنے والوں نے اس کو ہماری توقع سے بھی زیادہ نفع مند و موثر اور آخرت کے لیے مذکّر محسوس کیا ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ، جو کچھ ہوا صرف اسی کی مدد و توفیق سے ہوا فلہ الحمد والمنۃ

وفیات ہی کے سلسلہ کے کچھ مضامین جن کو اس نمبر میں شامل ہونا چاہیے تھا صفحات میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یا اس وقت کسی دوسرے سبب سے اس میں شامل نہیں ہو سکے تھے ۔ حسب وعدہ اس شمارہ کے ذریعہ نذر ناظرین کرام کیے جا رہے ہیں، اس لیے یہ شمارہ جیسا کہ "وفیات نمبر" کے "سخنہائے گفتنی" میں لکھا گیا تھا اسی کا ضمیمہ یا تکملہ ہے ۔ اس میں سب سے پہلا مضمون وہ ہے جو راقم سطور نے ۱۳۶۲ھ میں اپنے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ کی وفات پر لکھا تھا، جن کا میری تعلیم و تربیت میں دوسرے تمام اساتذہ سے زیادہ حصہ تھا، تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس کا حق تھا کہ وفیات نمبر میں بھی سب سے پہلے نمبر پر شائع ہوتا لیکن غلطی سے یہ اشاعت ہی سے رہ گیا، اس شمارہ میں دوسرا مضمون (جو غالباً وفیات کے سلسلہ کا سب سے زیادہ طویل و مبسوط مضمون ہے) وہ ہے جو راقم سطور نے اپنے محترم رفیق اور گرامی منزلت دوست مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے حادثۂ رحلت پر اگست ۶۲ء میں لکھا تھا اور اس وقت کے ہفتہ وار "ندائے ملت لکھنؤ" کی اسی مہینے کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا تھا، اور چونکہ اس دور میں "ندائے ملت" اور "الفرقان" کا حلقہ بڑی حد

یک مشترک تھا اس لیے الفرقان میں اس کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔ ——— لیکن اب وفیات نمبر کی ترتیب اور تیاری کے وقت یہ احساس ہوا کہ اس مضمون کا بھی حق ہے کہ وفیات کے سلسلہ کے راقم سطور کے دوسرے مضامین کے ساتھ اس کو بھی الفرقان کے موجودہ ناظرین تک پہنچا دیا جائے اور یہ بھی اُس کے صفحات اور فائل میں محفوظ ہو جائے۔

اس شمارہ کے آخر میں اس عاجز کی وہ تقریر بھی شائع کی جارہی ہے جو اپنے عزیز بھائی حاجی محمود حسین مرحوم کی تدفین کے وقت ——— جبکہ قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی ——— قبرستان ہی میں کی گئی تھی ——— مرحوم سے متعلق جو مضمون "وفیات نمبر" میں ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں اس میں اس تقریر کا بھی ذکر کیا گیا تھا ——— اس تقریر کا موضوع موت اور اُس کے بعد آنے والے عالم قبر و برزخ اور قیامت و آخرت کے وہ منازل اور احوال ہیں جو قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں بیان فرمائے گئے ہیں ——— اللہ تعالیٰ ان پر یقین نصیب فرمائے اور ان کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کی ہم سب کو توفیق دے۔

الفرقان کے آغاز سے ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) تک جن اکابر اور محسنوں یا اعزہ و اقارب کی وفات پر تاثراتی اور تعزیتی مضامین الفرقان میں لکھے گئے تھے، جو ناظرین کرام نے "وفیات نمبر" میں ملاحظہ فرمائے یا اس شمارہ میں نظر سے گزریں گے ——— ان کے علاوہ بھی بہت سے اپنے خاص بزرگوں اور محسنوں کی رحلت اسی مدت میں ہوئی اور ان کا بھی حق تھا کہ الفرقان میں اُن کی وفات پر بھی اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار کیا جاتا اور حسب معمول ان کے لیے بھی دعا کی استدعا اپنے ناظرین سے کی جاتی۔ لیکن سخت رنج و افسوس ہے کہ اس وقت اپنی علالت یا کسی بڑے سفر کے سلسلہ سے طویل غیر حاضری یا ایسے ہی کسی اور سبب سے اُس وقت الفرقان میں کچھ نہیں لکھا جا سکا بلکہ ذکر بھی نہیں کیا جا سکا (اور بعد میں زیادہ وقت گزر جانے پر خیال آیا۔ "بعد از وقت" سمجھ کر نہیں لکھا گیا) ——— بہر حال ان اکابر اور محسنوں کے اس حق کی ادائیگی میں اس عاجز سے بڑی تقصیر ہوئی ——— اب "وفیات نمبر" کی ترتیب کے وقت اس کا بہت زیادہ احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن سب حضرات کے درجات بلند فرمائے اور مجھے توفیق دے کہ اُن کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کا خصوصیت سے اہتمام کر کے اس تقصیر کی تلافی کی کوشش کروں۔

اس دنیا سے رحلت کر کے عالم آخرت کی طرف منتقل ہو جانے والے اُن حضرات کو ہم جیسوں کے احساسات و تاثرات کا قطعاً انتظار نہ ہو گا لیکن خود اپنا احساس یہ ہے کہ آخرت میں جب اُن سے ملاقات ہو گی تو اپنی اس تقصیر کی وجہ سے بڑی شرمندگی ہو گی ـــــ خاص کر ان چند اکابر اور محسنوں کے بارہ میں اپنی اس تقصیر کا احساس زیادہ ہے اور دل پر اُس کا بوجھ ہے۔

حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا اکرام الحسن صاحب کاندھلوی، مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری، شفاء الملک حکیم شمس الدین صاحب لکھنوی، حافظ خیراتی صاحب لکھنوی۔

مناسب معلوم ہوا کہ "دینیات نمبر" کے اس ضمیمہ میں ان حضرات کا بھی مختصر تذکرہ کر کے اپنے ناظرین سے اُن کے لیے دعائے مغفرت و رحمت کی استدعا کی جائے ـــــ اس سے انشاء اللہ ان حضرات کو نفع بھی پہنچے گا اور اپنی تقصیر کی اس ایک گونہ تلافی سے اپنے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ

اب سے ۵۷ - ۵۳ سال پہلے جب یہ عاجز دار العلوم دیوبند کا طالب علم تھا تو اس وقت بالخصوص علوم قرآن و حدیث میں امتیازی مہارت اور تبحر کے لحاظ سے استاذنا امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے بعد مولانا ممدوح ہی کا درجہ اور مقام سمجھا جاتا تھا۔ اور حُسنِ تقریر و بیان نیز ایمانی حقائق کو انسانی عقل و فطرت کے عین مطابق ثابت کر دینے کے فن میں تو وہ فرد فرید اور اپنے دور کے غزالی تھے ـــــ الاسلام، العقل والنقل اور حقیقت روح جیسے متعدد رسائل کے علاوہ اُن کے علمی متروکات میں دو چیزیں خاص طور سے ایسی ہیں جن سے ان کے علمی مقام کو آج بھی کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے اور انشاء اللہ قرآن و حدیث کے طلبہ و اساتذہ ہمیشہ اُن سے استفادہ کرتے رہیں گے ـــ ایک شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن پر ان کے تفسیری فوائد اور دوسری صحیح مسلم شریف کی شرح "فتح الملہم" (جو افسوس ہے کہ مکمل نہیں ہو سکی صرف تین جلدیں اس کی لکھی جا سکیں جو اسی زمانہ میں چھپ بھی گئی تھیں بعد میں دوسرے مشاغل نے اس کی تکمیل کی فرصت نہیں دی)

حضرت مولانا کا ارادہ اردو زبان میں صحیح بخاری شریف کی ایک مختصر شرح لکھنے کا بھی تھا۔ غالباً مولوی محمد علی ایم اے (لاہوری مرزائی) کی شرح بخاری اردو کی اشاعت کے بعد سے اس ضرورت کا احساس اور داعیہ پیدا ہوا تھا۔ یہ عاجز سنہ ۴۵ء میں ایک دفعہ دیوبند حاضر ہوا تو حسب معمول حضرت مولانا کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی۔ اس ملاقات میں مولانا نے اپنے اس ارادہ اور منصوبہ کا خاصی تفصیل سے ذکر فرمایا اور معلوم ہوا کہ مولانا اس کام کو جلد ہی شروع فرمانے والے ہیں اور دوسرے مشاغل سے یکسو ہو کر اس میں مشغول ہو جانے کا عزم فرما چکے ہیں ——— لیکن اللہ کی مشیت ٹھیک اسی زمانہ میں ہندوستان کی داخلی سیاسی کشمکش اور تحریکِ پاکستان نے حضرت مولانا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ انھوں نے "اس جمعیۃ علماء اسلام" کی صدارت و سربراہی قبول فرمائی جو مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت ہی کے لیے "جمعیۃ العلماء ہند دہلی" کے مقابلہ میں بنائی گئی تھی اور پھر اسی میدان میں اتر گئے اور ہمہ تن اسی میں مشغول ہو گئے۔

پھر ۴۷ء میں پاکستان بن جانے کے بعد جیسا کہ چاہیے تھا وہ اُس کے مرکز اور دارالسلطنت کراچی منتقل ہو گئے اور اس کو حقیقی معنی میں "اسلامی مملکت" بنانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ اللہ کا مقرر وقت موعود آگیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

اگرچہ ۳۰ سال پورے گذر جانے کے بعد بھی پاکستان اُن کی آرزوؤں اور امیدوں کے مطابق صحیح معنی میں دارالاسلام اور اسلامی مملکت نہ بن سکا اور مستقبل کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے ——— لیکن حضرت علامہ عثمانیؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات جنھوں نے خالص اسی نیت سے اور اسی امید پر اُس جدوجہد میں حصہ لیا تھا، اپنی صادق نیت کی بنا پر اجر کے مستحق ہو چکے۔ "انما الاعمال بالنیات وانما لامرئٍ مانوی" الحدیث ——— تاہم ہم جیسوں کے نزدیک یہ بڑا خسارہ ہوا کہ صحیح بخاری کی اردو میں شرح لکھنے کا جو ارادہ حضرت مولانا نے فرمایا تھا آخری دور کی اس سیاسی مشغولیت کی وجہ سے وہ عمل میں نہ آسکا اور امت ایک بڑی نعمت سے محروم رہ گئی۔

مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ

مولانا مرحوم نے اپنی یہ تاریخ خود سنائی تھی کو بچپن میں میں نے صرف قرآن مجید حفظ کیا تھا اس کے

علاوہ میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا، گھر کے حالات بھی ایسے نہیں تھے، ہاں وعظ کی کچھ مشق کر لی تھی۔ اُس وقت ہمارے گھرانے کا جو معاشی سلسلہ تھا میں اُس کے تعلق سے روزانہ شام کو دریبہ جایا کرتا تھا (جو دہلی کا صرافہ بازار تھا) اُس کے قریب ہی چاندنی چوک کا فوارہ اس زمانہ میں مناظرہ کا اڈا تھا۔ مشہور آریہ سماجی مناظر پنڈت رام چندر دہلوی آریوں کی طرف سے اور فلاں فلاں مولوی صاحب جن کو اس سے دلچسپی تھی مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کرتے تھے، میں بڑے شوق اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا مناظرہ میں بھی کر سکتا ہوں، چنانچہ ایک دن پنڈت رام چندر سے میں بھڑ گیا۔ وہ مناظرہ میں قرآن کے حوالے بہت دیتا تھا اور آیتیں پڑھا کرتا تھا، میں چونکہ حافظ تھا اس لیے اس کی غلطیاں پکڑتا تھا اور آگے پیچھے کی آیتیں پڑھ کر جواب دیتا تھا سننے والوں پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا اور انھوں نے سمجھا کہ میں نے خوب جوابات دیئے اور رام چندر کو ہرا دیا —— مناظرہ ختم ہونے کے بعد جب میں گھر لوٹنے لگا تو فلاں مولوی صاحب[1] نے جو مناظرہ میں موجود تھے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ صاحبزادے تم نے کہاں پڑھا ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے صرف قرآن مجید حفظ کیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ تم کو پڑھ لینا چاہیے پھر تم بہت اچھے مناظر ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ میرے گھر کے یہ حالات ہیں مجھے دن بھر کام کرنا ہوتا ہے اس لیے میں کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ تم دن یا رات کا کوئی تھوڑا سا وقت نکال لو اور ہمارے پاس آ جایا کرو ہم اُسی وقت میں تم کو پڑھائیں گے اور خدا نے چاہا تو تم بہت جلدی ہی اپنی تعلیم پوری کر لو گے۔ چنانچہ میں نے اُن کے ہاں جانا اور پڑھنا شروع کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے حالات ایسے کر دیے کہ میں نے کسی طرح تعلیم پوری کر لی۔

راقم سطور نے مولانا مرحوم کو سب سے پہلے اپنے بچپن میں جبکہ میری عمر غالباً دس سال کی بھی نہ ہو گی ایک مناظر ہی کی حیثیت سے دیکھا اور جانا تھا۔ میرے وطن سنبھل (ضلع مرادآباد) کی انجمن معاون الاسلام کا سالانہ جلسہ اُس زمانہ میں بڑی شان سے ہوا کرتا تھا۔ جلسہ کے تین روزہ پروگرام میں کسی ایک دن دو گھنٹہ کا وقت مناظرہ کے لیے رکھا جاتا تھا اور خاص کر آریہ سماج کو مناظرہ کی دعوت دی جاتی

---

[1] مولانا مرحوم نے ان مولوی صاحب کا اور اس مدرسہ کا نام بھی بتلایا تھا جس میں وہ مدرس تھے لیکن راقم سطور کو اب یاد نہیں۔

تھی ——— تو اُس سال کے جلسہ میں مولانا بھی بلائے گئے تھے۔ مناظرہ کے مقررہ وقت پر آریہ سماجی حضرات آئے ——— اُن کے دو مناظر تھے ایک پنڈت رام چندر دہلوی اور دوسرے پنڈت شانتی سُروپ، دونوں نے ایک ایک گھنٹہ مناظرہ کیا، مسلمانوں کی طرف سے مولانا مرحوم ہی مناظر تھے۔ بہرحال راقم سطور نے اُن کو پہلی دفعہ اس مناظرہ کے دن ہی دیکھا۔ اس وقت مولانا کی عمر ۲۵۔۳۰ سال کے درمیان رہی ہوگی، اُس زمانے میں وہ ہلکے پھلکے جسم کے تھے۔ جن لوگوں نے مولانا کو بعد ہی کے دور میں دیکھا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ مولانا کبھی ایسے جسم کے بھی رہے ہوں گے۔

پھر جب پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو دوسرے بہت سے علماء کی طرح مولانا مرحوم بھی سیاست کے میدان میں آ گئے اسی زمانہ میں "جمعیۃ العلماء ہند" قائم ہوئی اور مولانا اس کے ناظم قرار پائے اور طویل مدت تک وہی اس کے ناظم اور روح رواں رہے۔ پھر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۹۵۷ء کے بعد اس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ پہلے تحریک خلافت کے سلسلہ میں اور اس کے بعد جنگ آزادی کے سلسلہ میں بار بار جیل گئے ——— مولانا کی ابتداء وہ تھی جو اوپر ذکر کی گئی اور انتہا یہ کہ وہ اکابر و مشاہیر علماء ہند کی صف اول میں امتیازی مقام رکھتے تھے ———

ان فی ذالک لعبرۃً لاولی الابصار۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو تقریر و بیان کا بڑا کمال عطا فرمایا تھا۔ دلّی کی ٹکسالی زبان بولتے تھے۔ تقریر میں دریا کی سی روانی ہوتی تھی بعض تقریریں کتابی شکل میں بھی چھپی تھیں۔ ان کا خاص علمی اور تصنیفی کارنامہ قرآن مجید کا "ممکن حد تک عام فہم" ترجمہ اور قرآنی مضامین کو آسان اردو زبان میں سمجھانے والی اُن کی تفسیر "تسہیل القرآن" اور "تیسیر القرآن" ہے۔ یہ تفسیر دو جلدوں میں چھپی تھی، عام اردو خواں طبقہ کے لیے بلاشبہ آسان ترین اور بہترین قابل اعتماد تفسیر ہے[1]۔

مولانا مرحوم آخری دور میں تلاوت قرآن اور ذکر و تسبیح سے زیادہ شغف رکھتے تھے ——— ۴ر دسمبر ۵۹ء جمعہ کا دن تھا بعد نماز مغرب روزانہ کے معمول کے مطابق اوراد و وظائف میں مشغول تھے اسی حال میں قلب پر دورہ پڑا اور جان بحق ہو گئے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

---

[1] مکتبہ برہان اردو بازار دہلی سے طلب کی جا سکتی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ

لدھیانہ (پنجاب) کے مشہور قدیم علمی خاندان کے ممتاز فرد تھے، اللہ تعالیٰ نے بڑی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا تھا بڑے ذہین و ذکی، مجاہدانہ جذبات سے بسریز اور اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے۔ تحریک خلافت کے آغاز سے لیکر جو اُن کی نوجوانی اور طالب علمی کا زمانہ تھا ہندوستان کی آزادی (اگست ۱۹۴۷ء) تک مسلسل برطانوی حکومت کے خلاف گویا میدان جنگ میں رہے، عمر کا خاصا حصہ جیلوں میں گزرا، مجلس احرار اسلام کے بانیوں میں تھے اور طویل مدت تک اس کے صدر رہے ——— پھر جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد مشرقی پنجاب کے مسلمان پاکستان جانے پر مجبور ہوئے تو مولانا کو بھی اپنے پورے خاندان کے ساتھ اُس پاکستان میں منتقل ہونا پڑا جس کے قیام کی انھوں نے اپنی سیاسی رائے اور عقیدہ کی بنا پر آخری حد تک مخالفت کی تھی ——— پھر جب ۵-۶ مہینے کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ سیوہاروی مرحوم وغیرہ کی کوششوں کے نتیجہ میں آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کی پہلی سیاسی کانفرنس مولانا آزاد مرحوم کی صدارت میں ہوئی تو مولانا سیوہاروی کی دعوت پر اُس میں شرکت کے لیے مولانا لدھیانوی مرحوم پاکستان سے تشریف لائے ——— پھر احباب و رفقا کے مشورہ سے یہی طے ہو گیا کہ مولانا ہندوستان ہی میں قیام کریں، چنانچہ دہلی میں قیام کا فیصلہ کر لیا گیا۔ بعد میں اہل و عیال بھی دہلی ——— آگئے، آپ کا یہاں آجانا مسلمانوں کے حق میں بہت بہتر ہوا، آپ ان لوگوں میں تھے جو گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ اربابِ حکومت سے جرأت کے ساتھ ہر طرح کی بات کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو گہری سیاسی بصیرت کے ساتھ مومنانہ جرأت بھی بھرپور عطا فرمائی تھی ——— ۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ بھی ان کا ایک دوسرے طرز کے جہاد میں گزرا۔

مرشدنا حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری قدس سرہ کے خواص اہلِ تعلق میں سے تھے اور حضرت اُن کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، راقم سطور پر مولانا مرحوم کا یہ خاص احسان ہے کہ حضرت رائے پوری اور اُن کی خانقاہ کا بار بار انہی سے تذکرہ سن کے قلب میں حضرت کی عقیدت و عظمت پیدا ہوئی اور پھر حاضری اور تعلق کی توفیق ملی۔

۲۵ محرم ۱۳۷۶ھ (۲ ستمبر ۱۹۵۶ء) کی صبح اچانک قلب پر دورہ پڑا اور چند منٹ میں جاں بحق ہو گئے ——— خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

مولانا اکرام الحسن کاندھلویؒ

مولانا مرحوم "جماعت تبلیغ" کے موجودہ امیر کارواں حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کے والد ماجد اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کے قریبی عزیز تھے، سنا تھا کہ بی اے تک انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور غالباً وکالت بھی پاس کی تھی۔ لیکن صورت اور حالت دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کو اس کوچہ کی کبھی ہوا بھی لگی ہوگی۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت وارادت کا تعلق تھا، بارہا رائے پور کی خانقاہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ ایک ہی حجرہ میں قیام کا اتفاق ہوا۔ اور ان پر بار بار رشک آیا ——— شعر وسخن کا نہایت اعلیٰ ذوق تھا، اساتذہ کے ہزاروں منتخب اشعار یاد تھے، کبھی کسی موقع پر شعر سناتے تو معلوم ہوتا کہ خاص اسی موقع اور محل کے لیے کہا گیا ہے۔

حضرت رائے پوری قدس سرہ کے ہی مشورہ بلکہ ایک گونہ امر سے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے مہتمم بنائے گئے اور زندگی کے آخری دن تک اس منصب پر رہے ——— اس وقت ان کے صرف حادثۂ رحلت کا ذکر کرنا ہے ——— اب سنہ، مہینہ تو کچھ یاد نہیں، ایک دفعہ یہ عاجز دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ یا عاملہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے دیوبند گیا ہوا تھا، وہاں سے فارغ ہو کر حسب معمول حضرت شیخ الحدیث کی زیارت کے لیے سہارنپور اترا۔ جب حضرت کے دولت کدہ کے قریب پہنچا تو ایک دوست ملے، انھوں نے کہا کیا آپ کو مولانا اکرام الحسن صاحب کی اطلاع پہنچ گئی؟ ——— میں نے کہا خیریت تو ہے؟ کیسی اطلاع؟ انھوں نے کہا کہ مولانا کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ظہر کی سنتیں پڑھتے ہوئے انتقال ہو گیا پھر تفصیل معلوم ہوئی کہ مولانا مسجد کے برابر کے اپنے حجرہ میں آرام فرما رہے تھے، ظہر کی اذان پر اُٹھے، وضو کر کے سنتیں پڑھنے لگے، سجدہ میں تھے کہ مسجد کے خادم کی نظر پڑی، اس نے محسوس کیا کہ مولانا کا جسم ایک طرف کو جھک رہا ہے اور گر جانے کا خطرہ ہے، اُس نے قریب پہنچ کر سہارا دیا ——— معلوم ہوا کہ مولانا کا صرف جسم یہاں ہے اور روح اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچ چکی ——— کیسی قابل رشک ہے یہ موت جس پر ہزار زندگیاں قربان! ——— اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے ساتھ ہمارے حسن ظن سے بھی بہتر معاملہ فرمائے۔

حادثہ کی اطلاع فوراً ہی ٹیلی فون کے ذریعہ دہلی حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کو دیدی گئی

تھی اور وہ اسی وقت کار سے روانہ ہو گئے تھے ـــــ مغرب سے کچھ پہلے ہی تشریف لے آئے ـــــ اس عاجز نے اس کو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام سمجھا کہ اس نے دیوبند سے اچانک سہارن پور پہنچا کر مولانا مرحوم کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت نصیب فرمائی۔

حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ

حضرت مفتی صاحب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ کے ممتاز تلامذہ اور ہمارے دور کے علماء کبار میں سے تھے، بالخصوص حدیث اور فقہ میں نظر بہت وسیع تھی۔ طویل مدت تک راندیر (ضلع سورت گجرات) میں افتا ہی کے منصب پر رہے۔ پھر ایک وقت جب دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے لیے ان کی ضرورت محسوس ہوئی تو صدر مفتی کی حیثیت سے وہاں بلالیے گئے۔ دارالعلوم ہی کے زمانہ قیام میں راقم سطور کو ان کے علمی مقام اور خصوصیات سے کچھ واقف ہونے کا موقع ملا ـــــ یہ ان کے بڑھاپے کا دور تھا۔ سن اس وقت ۸۰۔۹۰ کے درمیان رہا ہوگا لیکن قوت کار کا اس وقت بھی یہ حال تھا کہ کھانے پینے اور تھوڑے سے آرام کے وقت کے علاوہ دن بھر اور رات کے بھی بڑے حصہ میں فتویٰ نویسی یا مطالعہ یا ایسے ہی کسی کام میں مسلسل مشغول رہتے، معلوم ہوتا تھا کہ تھکنا جانتے ہی نہیں۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعصاب کیسے بنائے ہیں ـــــ عمر آگے بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ قدرتی طور پر جسمانی ضعف بھی بڑھتا گیا لیکن ان کے کام کی مقدار اور رفتار میں غالباً کچھ بھی فرق نہیں آیا ـــــ یہاں تک کہ ـــــ میں فالج کا سخت حملہ ہوا اور بظاہر بالکل معذور ہو گئے اور دارالعلوم سے اپنے وطن شاہجہاں پور آ گئے۔ پھر یہ حال ہو گیا کہ اٹھ بیٹھ تو نہیں سکتے تھے لیکن لیٹے لیٹے مطالعہ، تصنیف اور فتویٰ نویسی کا کام پھر بھی کرتے رہتے تھے۔ برسوں اسی حال میں رہے ـــــ ابن حزم نے "محلّی" میں فقہ حنفی پر جو سخت حملے کیے ہیں مفتی صاحب اپنے اسی حال میں اس کا جواب لکھ رہے تھے جس کے چند اجزا "السیف المجلی" کے نام سے چھپ بھی چکے ہیں۔ اسی کے مطالعہ سے خاص کر فن حدیث میں ان کے بلند مقام اور وسعت مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خاص علمی کارنامہ امام محمدؒ کی "کتاب الآثار" کی شرح ہے جو کئی جلدوں میں لکھی تھی، کئی سال ہوئے اس کی صرف ایک جلد دیوبند کے کتب خانہ نعمانیہ نے چھپوائی تھی۔

کاش یہ پوری کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آجاتی۔

راقم سطور حضرت کے انتقال سے قریباً سال ڈیڑھ سال پہلے زیارت و عیادت کے لیے شاہجہاں پور حاضر ہوا تھا تو بستر پر اس حال میں دیکھا کہ جسم گویا بالکل حرکت کے قابل نہیں ہے۔ سماعت بھی قریباً رخصت ہو چکی ہے۔ کان کے قریب بہت زور سے کوئی بات کی جاتی تو بمشکل کچھ سمجھ پاتے لیکن آنکھیں اور دماغ اس حال میں بھی صحیح سالم تھے۔ معلوم ہوا کہ اس حالت میں بھی آنے والے فقہی سوالات کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھ دیتے ہیں ـــــ ان کا یہ حال یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا غیر معمولی نمونہ تھا خاصی مدت اسی حال میں رہے اور وقتِ موعود آجانے پر گزشتہ ہی سال انتقال فرمایا۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ

شفاء الملک خواجہ حکیم شمس الدین صاحب لکھنوی

حکیم صاحب لکھنؤ کے نامور اور حاذق طبیب و معالج اور شہر کے اعیان و رؤسا میں سے تھے، ساتھ ہی عالم دین اور حافظ قرآن بھی تھے۔ نہایت با اخلاق، باوضع اور لکھنوی تہذیب کا کامل نمونہ، ذوقِ علمی اور مزاج دینی تھا اس لیے ہم جیسوں کے ساتھ ـــــ جن کا علم و دین سے کچھ تعلق سمجھا جاتا ہے ـــــ بڑی عنایت اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ جب کبھی علاج معالجہ کے سلسلہ سے حکیم صاحب کے یہاں جانا ہوتا تو عام مطب سے اٹھ کر اپنے خاص کمرے میں لے جاتے، وہیں نبض دیکھتے، حال سنتے اور نسخہ تجویز فرماتے اور کچھ علمی و دینی لائن کی باتیں بھی ضرور کرتے ـــــ آخری سالوں میں حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم کر لیا تھا اور اس کا اچھا خاصہ رنگ حکیم صاحب پر چڑھ گیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی حکیم صاحب کا بڑا اکرام فرماتے تھے اور معالج کی حیثیت سے ان کو اپنا محسن سمجھتے تھے۔

راقم سطور کو اس کا رنج و قلق رہے گا کہ طویل علالت کے بعد ۲۰ مئی کو جس دن حکیم صاحب کا انتقال ہوا یہ عاجز اس روز لکھنؤ میں نہیں تھا اس لیے نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت بھی نہ ہو سکی ایک دو دن کے بعد جب سفر سے واپسی ہوئی اور معلوم ہوا تو قبر پر حاضر ہوا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا کا خاص اہتمام نصیب ہوا۔ اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے اور ان کے احسانات کا بہترین صلہ انھیں دارِ آخرت میں عطا فرمائے۔

حافظ خیراتی مرحوم

اب سے ۳۰-۳۱ سال پہلے جب دفتر الفرقان بریلی سے لکھنؤ منتقل ہوا تو ابتدائی چند مہینوں تک راقم سطور کی رہائش بھی دفتر کے ساتھ ہی گوئن روڈ پر رہی۔ یہ جگہ رفیق محترم مولانا علی میاں کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم کے مکان اور مطب کے بالکل قریب تھی اور اس کے قریب ہی محمد علی لین والی مسجد میں پانچوں وقت کی نماز کے لیے جانا ہوتا تھا یہاں کے نمازیوں میں ایک بڑے میاں تھے جن کی شکل وصورت اور باتوں سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ لکھنؤ کے باشندے ہیں۔ کپڑے بھی بالکل معمولی غریبوں کے سے پہنتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حافظ خیراتی ہیں لکھنؤ ہی کے بلکہ اسی محلہ کے قدیم باشندے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت خوشحال بلکہ اچھے دولت مند ہیں، بخیل بالکل نہیں ہیں لیکن اپنی کمائی دولت اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے۔ مصارف خیر میں خوب خرچ کرتے ہیں۔

اس زمانے میں راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں کا تبلیغی جماعت کے کام سے عملی تعلق بھی اچھا خاصا تھا بلکہ ہمیں دونوں لکھنؤ میں اس کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ اس سلسلہ کا ہفتہ وار تبلیغی اجتماع ہر جمعرات کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ہوتا تھا جو شہر سے خاصے فاصلہ پر تھی۔ ہم لوگ ضرورت محسوس کرتے تھے کہ شہر میں جماعت کا کوئی تبلیغی مرکز ہو جہاں باہر سے آنے والی جماعتیں قیام بھی کرسکیں، معلوم ہوا کہ یہاں محمد علی لین کے قریب ہی بہت موقع سے ایک قدیم مسجد ہے جو آباد نہیں ہے، اور اس کے ساتھ ایک مکان اور خاصی افتادہ زمین بھی ہے جس پر ایک صاحب قابض ہیں اور حافظ خیراتی صاحب مسجد کو درست کرا کے آباد کرنا چاہتے ہیں اور جو صاحب قابض ہیں عدالتی کارروائی کے ذریعہ اُن کو بے دخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مقدمہ عدالت میں ہے اور حافظ صاحب اس سلسلہ میں ہزاروں خرچ کر چکے ہیں۔ ہم نے جاکر اُس مسجد کو دیکھا اور طے کر لیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو کامیابی عطا فرما دی تو یہی مسجد ان شاء اللہ تبلیغی مرکز بن جائے گی ——— الحمد للہ حافظ صاحب کی مخلصانہ کوششیں کامیاب ہوگئیں۔ پھر مرحوم نے مسجد کی تعمیر میں کافی اضافہ کیا اور ہمارے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق مسجد کے ساتھ ایک رہائشی مکان اور چند حجروں کی بھی تعمیر کرائی ——— اس میں دوسرے اہل خیر نے بھی شرکت کی لیکن بنیادی طور پر حافظ خیراتی مرحوم ہی نے

گویا اُس کو بنوایا اور بظاہر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس عمل کو پوری طرح قبول فرمایا۔ مسجد کے ساتھ والے مکان میں قریباً ۲۰ سال راقم سطور کا بھی قیام رہا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پانی کی بڑی کمی تھی۔ مرحوم نے ہم لوگوں کے توجہ دلانے پر قریباً ۲۰-۲۵ ہزار روپیہ صرف کر کے دارالعلوم میں ٹیوب ویل لگوایا اور بہت بڑا واٹر ٹینک بھی بنوایا۔ دارالعلوم کی پانی کی ضروریات بڑی حد تک اُسی سے پوری ہوتی ہیں۔ ۷-۸ سو طلبہ اور اساتذہ پانچوں وقت وضو کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے بڑا کارِ خیر انجام دے گئے۔

انتقال سے کچھ پہلے تیس ہزار روپے اپنے ایک معتمد کے سپرد کیے کہ میرے بعد یہ فلاں فلاں دینی مدرسوں کو دیدیے جائیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

سال میں دو تین دفعہ خاصے وسیع پیمانے پر بہت اعلیٰ قسم کی دعوت کرتے، جن لوگوں کو نیک اور متقی سمجھتے اُن کو اور غربا کو خاص طور سے مدعو کرتے اور بڑے ذوق وشوق سے کھلاتے اور گھروں پر ان کے گھر والوں کے لیے بھی بھیجتے ——— لیکن خود اپنا کھانا پینا لباس ہی کی طرح بہت سادہ اور معمولی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا جو اپنی کمائی کو ان کی طرح صرف آخرت کے لیے صرف کرتا ہو ——— اس عاجز کے ساتھ نیز رفیق محترم مولانا علی میاں کے ساتھ نہایت مخلصانہ تعلق تھا۔ بڑا رنج وقلق ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ ان کے انتقال کے دن ہم دونوں میں سے کوئی بھی لکھنؤ میں نہیں تھا ——— اگر میں ہوتا تو اپنے ہاتھ سے غسل دیتا، کفن پہناتا اور خود قبر میں اتارتا۔ لیکن ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔ اللہ تعالیٰ دعا اور ایصالِ ثواب کے ذریعہ اس کی تلافی کی توفیق دے۔

معلوم ہوا کہ روزمرہ کے معمول کے مطابق مغرب کی نماز پڑھ کر اپنی قیام گاہ پر کچھ پڑھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم کھانا لیکر پہونچا تو دیکھا کہ حافظ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ——— اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کے ساتھ اپنی خاص شانِ کریمی کا معاملہ فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کی زندگی سے سبق لینے کی توفیق دے۔

ناظرینِ کرام سے استدعا ہے کہ ان سب مرحومین کے لیے مغفرت ورحمت اور رفعِ درجات کی دعا فرمائیں۔ اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔ واجرکم علی اللہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

محمد منظور نعمانی

استاذی حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ

(رمضان و شوال ۱۳۶۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا)

راقم سطور کے اساتذہ کی فہرست الحمدللہ خاصی طویل ہے لیکن سب سے زیادہ حصہ میری تعلیم میں حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے ــــــ مولانا ممدوح اگرچہ ہمارے مخصوص علمی اور درسی حلقہ سے باہر کوئی خاص شہرت نہیں رکھتے تھے لیکن علم و تدریس میں مقام بہت بلند تھا ــــــ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ جن کو دینی علوم (حدیث، تفسیر وغیرہ) میں مہارت کا مقام حاصل ہو وہ "معقولات" (منطق و فلسفہ وغیرہ) میں بھی کوئی اچھی دست گاہ رکھتے ہوں، لیکن مولانا انھیں مستثنیات میں سے تھے، تفسیر و حدیث اور فقہ کا طالب علم اُن کو ان علوم میں ماہر سمجھتا تھا اور منطق و فلسفہ اور علم کلام کے طلبہ ان کو ان فنون کا خصوصی استاد جانتے اور مانتے تھے۔ منطق میں "میر زاہد علی القطبیہ مع غلام یحییٰ" بحر العلوم کی "شرح سلم" اور "حواشی علی الحواشی الزاہدیہ" اور "قاضی مبارک"۔ فلسفہ میں "صدرا" کلام میں "خیالی" اور اصول فقہ میں "توضیح تلویح" ان کتابوں کے درس سے حضرت استاذ کو خاص شغف تھا، اور جس طرح وہ ان کو پڑھاتے تھے میں نے کسی دوسرے کو اس طرح پڑھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ درس حدیث کے طرز میں اپنے استاذ حدیث حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متبع تھے، لمبی تقریر نہ فرماتے بلکہ مختصر مگر جچی تلی بات کہتے، غرض اصحاب درس علما میں مولانا ممدوح کا خاص مقام تھا ــــــ علم کلام کے مشکل ترین مسائل اور مباحث آپ کے غور و فکر کے خاص جولان گاہ تھے، میں جب سنبھل حاضر ہوتا تو اکثر اس تدبر و تفکر کا کوئی نیا نتیجہ ضرور سنتا ــــــ بہت کم گو تھے، بلکہ گویا بلا ضرورت بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن کسی اہم مسئلہ پر جب تقریر فرماتے تو بڑے جوش سے بولتے تھے۔ ہماری قدیمی درس گاہوں میں جن فنون کا درس رائج ہے اُن کی بیشتر اہم اور انتہائی کتابیں ناچیز نے مولانا ہی سے پڑھی

تھیں، پھر دینیات کی تکمیل کے لیے آپ نے خود ہی مجھے "دارالعلوم دیوبند" بھیج دیا تھا۔

تعلیم و تربیت اور خصوصی شفقت کے علاوہ ایک بہت بڑا احسان مولانا مرحوم کا اس عاجز پر یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی میں ایک دفعہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان "مولوی فاضل" کی تیاری کا میں نے ارادہ کیا اور پراسپکٹس بھی منگوالیا۔ مولانا کو میرے اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے بڑی دردمندی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ: دیکھو تمھارے والد اس لیے تم کو پڑھارہے ہیں کہ اللہ و رسول کے دین کا علم تمھیں آجائے، تم اس پر عمل کرو اور دین کی کچھ خدمت بھی کرسکو —— اب اگر تم نے امتحان دے لیا تو کسی اسکول میں بس نوکری کرلوگے، تمھارے ابا کو تم سے اگر نوکری ہی کرانی ہوتی تو وہ تمھیں انگریزی پڑھا سکتے تھے۔" —— یہ بات مولانا نے کچھ ایسی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ کہی کہ وہ وسوسہ بالکل ہی جاتا رہا، ورنہ اگر میں وہ امتحان دے لیتا تو غالب یہی ہے کہ آج کسی "اسکول" میں بس عربی یا فارسی کا ٹیچر ہی ہوتا —— علم پر عمل، اور خدمت دین تو اب بھی نصیب نہیں، مگر الحمد اللہ اس کی ہوس موجود ہے شاید اللہ پاک اپنے ان نیک بندوں کی برکت سے جن سے کوئی نسبت حاصل ہے اور جن کی محبت اللہ نے اپنے خاص فضل و کرم سے دل میں پیوست کردی ہے یہ دولت بھی نصیب فرمادیں ؎

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

مولانا مرحوم کی عمر اس وقت قریب بہتر برس کے پہونچ چکی تھی، اور تحصیل علم کے بعد پوری زندگی درس و تدریس ہی میں گزری، اس لیے تلامذہ کا دائرہ خاصا وسیع ہے جن میں بہت سے آج بڑی بڑی علمی شہرتیں رکھنے والے بھی ہیں —— اس کمال علمی کے ساتھ عملی حیثیت سے بھی ہم اخلاف کے لیے نمونہ تھے،

شوال کا پہلا ہفتہ گزر رہا تھا کہ پہلے نزلہ اور پھر بخار کی شکل میں آخری علالت شروع ہوئی جو یوماً فیوماً شدت اختیار کرتی گئی، تا آنکہ ۱۱ر شوال چہار شنبہ کے دن صبح کے ۸ بجے اس علالت کی انتہا روح و جسم کی مفارقت پر ہوئی انا للہ وانا الیہ راجعون!

ایک گونہ میری خوش قسمتی کہ میں اپنی علالت کی مجبوری سے ان دنوں سنبھل ہی میں مقیم تھا، اس لیے اس آخری مرض میں بھی خدمت کا کچھ موقع مل گیا، بلکہ آخری غسل بھی اپنے ہاتھ

ہاتھوں سے اس ناچیز نے دیا ــــــ اور بدقسمتی یہ کہ خود بیماری کا مارا ہوا تھا اس لیے خدمت کی سعادت کا حصہ حاصل نہ کر سکا۔

اے اللہ جاننے والا تیرا بندہ تیرے حضور حاضر ہو چکا، ارحم الراحمین! اس پر رحمت فرما، اس کو اپنے دار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر و اجر عطا فرما، ــــــ آمین! یا ارحم الراحمین!!

محمد منظور نعمانی

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

[مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے سانحۂ ارتحال پر جو مختصر تعزیتی نوٹ الفرقان کے ربیع الثانی سنہ ۸۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، ناظرین کرام وہ "وفیات نمبر" میں پڑھ چکے ہیں ــــــ اس میں مولانا مرحوم سے متعلق حضرت مدیر الفرقان کے اس تفصیلی مضمون کا حوالہ دیا گیا تھا جو اسی زمانہ میں ہفتہ وار "ندائے ملت لکھنؤ" میں شائع ہوا تھا، اور زیر نظر شمارہ میں اسکی اشاعت کا وعدہ کیا گیا تھا ــــــ حسب وعدہ وہ مضمون نذر ناظرین ہے ــــــ مناسب سمجھا گیا کہ یہ الفرقان کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جائے ــــــ مرتب]

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو پہلی دفعہ میں نے اب سے تقریباً ۳۸-۳۹ سال قبل جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ مرادآباد میں دیکھا تھا، میں اس وقت اپنے وطن سنبھل مرادآباد میں معقولات کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور حدیث پڑھنے کے لیے آئندہ سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا۔ (یہ آخر ۲۴ء یا شروع ۲۵ء کی بات ہے) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اُس وقت بالکل نوجوان تھے، میری عمر اس وقت ۱۸-۱۹ سال کی تھی اور مولانا ۲۴-۲۵ سال کے ہوں گے، وہ عمر میں مجھ سے ۵-۶ سال بڑے تھے، اس اجلاس میں مولانا نے اپنا ایک عربی قصیدہ بھی سُنایا تھا، اُسی وقت کسی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے بہت ممتاز طالب علم ہیں۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتے ہیں اور عربی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ (عربی کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میری دلچسپی اُس وقت انھیں باتوں سے زیادہ ہو سکتی تھی) اس اجلاس میں میں نے ان کی تقریر نہیں سُنی، نہ ملاقات کی نوبت آئی۔

دارالعلوم دیوبند میں اگلے سال میں دارالعلوم دیوبند پہونچا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہنے کو تو دارالعلوم کے "نائب مہتمم" تھے لیکن عملاً دراصل وہی مہتمم تھے۔ اللہ نے انھیں بڑی نگاہ دی تھی، اُن کا طریقہ تھا کہ طلبہ میں سے جس میں خاص جوہر دیکھتے اُس کو دارالعلوم میں لے لیتے، اِس کے لیے انھوں نے "معین المدرسین" کا ایک درجہ قائم کر رکھا تھا، ابتدائی تقرر ایسے فارغین کا اسی حیثیت سے ہوتا تھا، جب میں دارالعلوم دیوبند پہونچا ہوں تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب غالباً "معین مدرس" کی حیثیت سے دارالعلوم کے اُستاد مقرر ہو چکے تھے اور چند ابتدائی و متوسط اسباق ان سے متعلق تھے، میری عادت چونکہ ملنے ملانے کی بہت کم تھی اس لیے اُس زمانہ میں مولانا سے میرا کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا ——— یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا بہت اچھے مناظر بھی تھے، اُسی زمانہ میں ایک معرکہ کا مناظرہ شاہجہانپور میں قادیانیوں سے ہوا تھا اس میں ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ہی نے مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کیا تھا، قادیانیت سے متعلق ابتدائی دور میں مولانا نے کچھ پمفلٹ بھی لکھے تھے۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب مولانا کلکتہ کے ایک دینی اور تبلیغی ادارہ سے وابستہ تھے، اس ادارہ کا نام اب مجھے یاد نہیں رہا۔

ابھی میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت طالب علم ہی کے مقیم تھا کہ مولانا علاقہ مدراس کے کسی مدرسہ میں بھیج دیے گئے۔ دینی مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کے اُس زمانہ کے معیار کے لحاظ سے وہاں مولانا کی تنخواہ بہت معقول تھی، مولانا کے پاس جلد ہی حج کے قابل روپیہ جمع ہو گیا۔ مولانا نے فریضۂ حج کی ادائیگی میں تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور حج کو روانہ ہو گئے۔ اس طرح مولانا نے حج بھی بالکل نوجوانی میں اُس دور میں کیا جب کہ سفر حج سخت مجاہدہ کا سفر تھا اور نئی عمر میں حج کو جانے کا رواج بہت ہی کم تھا۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت)

میری طالب علمی کے آخری سال کے بالکل آخری ہفتوں میں تقدیر الٰہی سے کچھ واقعات دارالعلوم دیوبند میں ایسے پیش آئے کہ اُس وقت کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین استاذنا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور ان دونوں بزرگوں کے ساتھ اساتذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے دارالعلوم دیوبند سے اپنے آپ کو الگ کر لیا اور اِس "شر" سے اللہ تعالیٰ نے یہ خیر پیدا فرمایا کہ گجرات میں ایک عظیم الشان دارالعلوم (جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) قائم ہو گیا[1] اور یہ سب

---

[1] ڈابھیل (ضلع سورت) میں یہ مدرسہ قائم تو پہلے سے تھا لیکن ان حضرات اکابر دوشا ہمیر کے پہنچنے کے بعد "جامعہ اسلامیہ"

حضرات وہیں منتقل ہو گئے، مولانا حفظ الرحمان صاحب بھی ان حضرات کے ساتھ وہیں چلے گئے ۔۔۔۔۔ یہاں اس کا بھی اظہار مناسب ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند کے نظام کی اصلاح کی جس تحریک یا کوشش کے نتیجہ میں یہ واقعات پیش آئے تھے، اس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خاص حصہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ اس ناچیز کا تعلق بھی اسی زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند والی برادری کے علاوہ ہم دونوں کو جوڑنے والا خاص رشتہ حضرت استاذ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق و رابطہ تھا، اس کے سوا ہم دونوں میں ایک درجہ کی ہم مذاقی بھی تھی۔ اس وقت سیاست کے میدان میں تو خاموشی تھی اس لیے اس کے علاوہ جو دینی و ملی کام ہو رہے تھے اور جو خاص جلسے اور اجتماعات ان کے سلسلہ میں کبھی کبھی ہوتے تھے اُن میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی، خاص کر "جمعیۃ العلماء" کے جلسوں میں، جو اُس وقت صرف "علماء" ہی کی جمعیت تھی۔

۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی میں مولانا کا حصہ

اسی زمانہ میں جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے متعلق تھے یہ واقعہ پیش آیا کہ "جمعیۃ العلماء ہند" جو اپنے یوم پیدائش ہی سے جنگ آزادی میں کانگریس کے ساتھ شریک تھی۔ "نہرو رپورٹ" کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے (۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں) اس نے اپنی راہ کانگریس سے الگ کر لی ۔۔۔۔۔ اس کے بعد غالباً شروع ۱۹۳۰ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور اس میں نہرو رپورٹ منسوخ قرار دے کر آزادی کی جنگ شروع کر دینے کا اختیار گاندھی جی کو دے دیا گیا۔ گاندھی جی نے حکومت کو ایک نوٹس دینے اور گویا اتمام حجت کر دینے کے بعد نمک سازی کی شکل میں سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کر دی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ڈابھیل سے جا کر گاندھی جی کی اس نمک سازی کی تحریک میں شریک ہوئے۔ میں اس زمانہ میں امروہہ میں مدرس تھا، کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تھا۔ واپسی میں محض اتفاق سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ڈابھیل یا احمد آباد سے آ رہے تھے اور اپنے وطن سیوہارہ جانے کے لیے دہلی سے مرادآباد جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے تھے۔ مجھے بھی اسی ٹرین سے امروہہ آنا تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ ہم میں سے پہلے کس نے دوسرے کو دیکھا۔ بہر حال ملاقات ہو گئی اور دونوں ایک ہی ڈبہ میں بیٹھے، دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ مولانا نمک سازی کی سول نافرمانی میں گاندھی جی کے ساتھ کام کر کے واپس

آرہے ہیں — مولانا کے ساتھ ایک پڑیا میں بندھا ہوا اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا نمک بھی تھا جو میری فرمائش پر انھوں نے نکال کر دکھایا اور میرے ساتھ ٹرین کے عام مسافروں نے بھی بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

امروہہ میں جمعیۃ کا تاریخی اجلاس اور مولانا حفظ الرحمٰن

اسی ۱۹۳۰ء میں بلکہ اسی زمانہ میں جب گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی تھی۔ امروہہ میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس ہوا اس اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کئی مہینے پہلے ہو چکا تھا۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ اس زمانہ میں میرا قیام بھی امروہہ ہی میں تھا۔ اس وقت "جمعیۃ العلماء" کا ایک ممبر اور اس کی برادری کا ایک فرد ہونے کے علاوہ اس اجلاس سے میری غیر معمولی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ . . . .

امروہہ میں جو عنصر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا پیرو تھا اس نے "جمعیۃ" کے اجلاس کو ناکام بنانے ہی کی غرض سے ٹھیک انھیں "تاریخوں میں جن میں جمعیۃ کا اجلاس ہونے والا تھا، مولانا محمد علی مرحوم کی بنائی ہوئی اس "نئی جمعیۃ علماء کانپور" کا اجلاس امروہہ ہی میں رکھ دیا جو کچھ ہی دنوں پہلے "جمعیۃ العلماء ہند دہلی" کی مخالفت ہی میں بنائی گئی تھی۔ اور جمعیۃ العلماء ہند کے خلاف ان ناخدا ترسوں نے زور شور کے ساتھ امروہہ اور اس کے اطراف میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ صرف وہابیوں، دیوبندیوں کی اور (معاذ اللہ) دشمنان رسول کی جماعت ہے۔

بہر حال اس حملہ اور اس چیلنج نے قدرتی طور پر ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا تھا جو جمعیۃ کے ساتھ ساتھ اکابر دیوبند سے بھی وابستہ تھے اور پھر ہم نے بھی جمعیۃ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے جی جان کی بازی لگا دی۔

اُس وقت کا سیاسی ماحول

اس وقت کا سیاسی ماحول یہ تھا کہ ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک کوئی عوامی سیاسی تحریک نہ چلنے کی وجہ سے سیاسی میدان میں ایک قسم کی بے حسی اور جمود پیدا ہو گیا تھا، خاص کر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ پہلے تو شدھی سنگٹھن کی تحریک اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کو بد دل کیا تھا اور بعد میں نہرو رپورٹ کے قضیہ نے ان کے بہت سے ان عناصر کو بھی کانگریس سے دور کر دیا تھا۔ جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہے تھے، الغرض ان وجوہ سے کانگریس کی چھیڑی ہوئی اس جنگ کے لیے مسلمانوں میں کوئی امنگ بلکہ

واقعہ یہ ہے کہ کسی درجہ کی ہمدردی بھی اس وقت نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس صرف دو چار کو مستثنیٰ کر کے ان کے عام اخبارات اور مولانا محمد علی و شوکت علی مرحوم جیسے ان کے لیڈر بھی اس کے خلاف تھے کہ اس جنگ میں مسلمان شریک ہوں، بہرحال یہ فضا تھی جس وقت کہ جمعیۃ کا اجلاس امروہہ میں ہونے والا تھا۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب کا ریزولیشن

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جو اُس وقت جمعیۃ کے اکابر میں یا اس کے ہائی کمانڈ میں تو نہیں تھے مگر اپنے سیاسی ذہن اور جرأت و فعالیت کی وجہ سے اپنے اقران میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ کانگریس کی جنگ آزادی میں شرکت کے متعلق ایک ریزولیشن اجلاس کی تاریخ سے کافی دنوں پہلے ہی دفتر کو بھیج دیا اور ساتھ ہی اشاعت کے لیے اُسے اخبارات کو بھی دے دیا، اس وقت خود جمعیۃ کے اندر اس مسئلہ پر خاصا اختلاف رائے تھا بلکہ اجلاس شروع ہونے کے دن تک جمعیۃ کے جو ارکان مختلف مقامات سے امروہہ پہونچے تھے اور اُن سب کی نجی گفتگوؤں کا خاص موضوع مولانا حفظ الرحمن کا یہ ریزولیشن ہی بنا ہوا تھا، اُن کی باتوں سے ہم لوگوں نے اندازہ یہ کیا تھا کہ ریزولیشن پاس نہ ہو سکے گا —— بہرحال اجلاس شروع ہوا۔ سب سے پہلے دستور اور رواج کے مطابق صدر استقبالیہ (سید ابو النظر رضوی مرحوم) نے اپنا خطبہ پڑھا، اس کے بعد اجلاس کے صدر منتخب حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحب اجمیریؒ کا خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ ان دونوں خطبوں میں شد و مد کے ساتھ اور خاص کر خطبۂ استقبالیہ میں استدلال کے پورے زور کے ساتھ مولانا حفظ الرحمن صاحب کی اس تجویز کے خلاف رہنمائی دی گئی تھی لیکن جب مسئلہ سبجکٹ کمیٹی میں آیا تو مولانا کی اس تجویز کو چار نہایت اہم اور باوزن شخصیتوں کی حمایت اور تائید حاصل ہو گئی۔ ایک جمعیۃ العلماء ہند کے اس وقت کے مستقل صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دوسرے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ تیسرے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور چوتھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، یہ ناچیز سبجکٹ کمیٹی میں شریک تھا —— جب اس ریزولیوشن پر بحث شروع ہوئی تو ایک دو موافقانہ اور مخالفانہ تقریروں کے بعد حضرت مفتی صاحب اور سید صاحب نے علی الترتیب بڑی مدلل اور بصیرت افروز تقریریں ریزولیشن کی حمایت میں کیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمانی جذبہ و جوش اور درد سے

بھری ہوئی ایک تقریر فرمائی جس میں ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کی اہمیت اور خاص کر مسلمانوں کے لیے اس کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ حضرت ممدوح نے ماضی قریب اور ماضی بعید کے تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انگریزوں نے عالم اسلام کے ساتھ کیا کیا ہے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں انگریزوں کا کتنا حصہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے دشمن نمبر ۱ انگریز اور صرف انگریز ہیں لہٰذا انگریزی اقتدار کے خلاف جو جنگ کسی کی طرف سے شروع ہو، ہمیں بلاشرط اس میں شریک ہو کر اس کو تقویت پہونچانا چاہیے ——— حضرت مولانا کی ذاتی عظمت کے ساتھ ان کی اس درمندانہ اور جذبات سے بھرپور تقریر نے شرکاء اجلاس میں سے بہت سوں کی رائے بدل دی اس کے بعد جو کسر رہی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ساحرانہ خطابت نے پوری کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نہ صرف یہ کہ پاس ہوئی بلکہ تقریباً بالاتفاق پاس ہوئی۔ جن چند حضرات کو اس سے اتفاق نہیں تھا انھوں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی سوائے ایک دو صاحبوں کے۔

یہ واقعہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جس ناموافق ماحول میں اپنی یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کی تھی اور اخبارات میں اعلان کیا تھا اور پھر جس شان کے ساتھ وہ پاس ہوئی، اس نے مولانا کو اس نوعمری ہی میں سیاسی دنیا میں خاص اہمیت دے دی، اس کے بعد سے برابر وہ اس میدان میں اپنی ——— صلاحیتوں اور قربانیوں کی وجہ سے آگے ہی بڑھتے رہے۔

سب کچھ ملت کے لیے

ان کے جاننے والے سب جانتے ہیں کہ اس میدان میں اُنھوں نے جو کچھ کیا اور جو قربانیاں دیں وہ ملت ہی کے لیے دیں، وہ اُس وقت اپنے اور اپنی جماعت کے سیاسی موقف کی تائید میں کہا کرتے تھے اور یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ "ہندوستان کی آزادی کی یہ جنگ کامیاب ہو کر رہے گی، دیر یا سویر انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا، اگر آزادی کی جنگ میں اور اس کی قربانیوں میں ہمارا حصہ نہ ہوا تو آزادی کے ثمرات میں بھی ہمارا حصہ نہ ہوگا اور ہم رعایتوں کی بھیک مانگا کریں گے لیکن آج اگر ہم جنگ میں شریک ہوں گے اور قربانیاں دیں گے تو کل جب ملک آزاد ہوگا تو ہم بھی اس میں برابر کے حصہ دار ہوں گے اور ہمیں حق ہوگا کہ "ڈنڈا لے کر کھڑے ہوں" اور کہیں کہ ہم بھی ملک کے لیے لڑے تھے اور ہم نے بھی قربانیاں دی تھیں اس لیے ملک کی آزادی میں ہمارا بھی حصہ ہے۔" (مولانا کی اس طرح کی تقریر ناچیز کو کئی دفعہ

کی یاد ہے اور بالخصوص "ڈنڈا لے کر کھڑے ہونے" کے الفاظ خاص اُنھیں کے ہیں)

بہرحال سنہ ۳۰ئہ سے لے کر سنہ ۴۷ئہ تک مولانا نے جنگِ آزادی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اور جو قربانیاں دیں وہ اسی نیت سے اور گویا اسی چیز کو بطور نصب العین کے سامنے رکھ کر دیں اور وقت آنے پر پورے ملک نے اور پوری ملتِ اسلامیہ نے دیکھ لیا کہ آزادی کے بعد جب مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں کی گئیں تو اس بندۂ خدا نے اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کہ اس آزادی کے لیے ہم نے بھی قربانیاں دی ہیں اور ہمارا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اس لیے کسی ناانصافی اور حق تلفی کو ہم برداشت نہیں کریں گے۔

سب سے بڑی خدمت

آزادی کے بعد ملت کے لیے جو کچھ مولانا نے کیا اور جو خدمات انجام دیں سب جانتے ہیں کہ اس کی فہرست کتنی طویل ہے لیکن اُن کی سب سے بڑی خدمت اور اُن کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی توفیق اللہ نے اُن کو سنہ ۴۷ئہ کے فسادات میں دی۔ جس وقت دہلی میں مسلمانوں کو لوٹا اور جلایا جا رہا تھا اور مسلمانوں کا گویا قتلِ عام ہو رہا تھا اور کسی مسلمان کا اپنے گھر یا اپنے خاص حلقہ سے باہر نکلنا گویا موت کے منہ میں جانا تھا، اُس وقت مولانا حفظ الرحمٰن سر ہتھیلی پر رکھے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اسی دلی میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کبھی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اور دوسرے ذمہ دارانِ حکومت سے ملتے، کبھی خطرے میں گھرے ہوئے مسلمانوں کے پاس پہنچتے اور انھیں محفوظ مقامات پر منتقل کرنے کا انتظام کرتے۔

پھر جب گاندھی جی دلی آگئے تو مولانا حفظ الرحمٰن ہی نے اُن کے سامنے دلی کی اُس وقت کی صورتِ حال رکھی اور زبان سے اور ساتھ ہی داڑھی پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے کہا کہ ہندوستان کی ہماری راجدھانی میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے، گاندھی جی کو چونکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے خلوص اور سچائی پر اعتماد تھا اس لیے وہ بے حد متاثر ہوئے اور وزیر اعظم پنڈت نہرو، وزیر داخلہ سردار پٹیل اور کابینہ کے تیسرے اہم رکن مولانا آزاد مرحوم سے گفتگو کرنے کے بعد بھی جب وہ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہیں ہوئے تو انھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر مرن برت کا اعلان کر دیا۔ حالات کو درست کرنے کے لیے یہ

آخری ہتھیار تھا جو گاندھی جی استعمال کر سکتے تھے، یعنی انھوں نے فسادات کے روکنے اور ملک میں امن قائم کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔" گاندھی جی کی شخصی عظمت کا ملک اور حکومت پر جو اثر پڑ سکتا تھا اس کے علاوہ اس برت کا ایک اہم اور دور رس پہلو یہ بھی تھا کہ گاندھی جی کی طرف سے گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ حکومت امن قائم کرنے اور مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی اور اس کی انتظامی مشنری پر اس بارے میں اب مجھ کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اُن کے اس برت کا ملک کے عوام پر اور خصوصیت کے ساتھ حکومت پر بہت اثر پڑا اور اُسی دن سے ہوا کا رُخ بدلنے لگا اور امید پیدا ہوگئی کہ برت کے نتیجہ میں امن قائم ہو جائے گا۔ چند روز کے بعد جب حکومت اور عوام کے نمائندوں نے گاندھی جی کے سامنے امن کی ذمہ داری لی اور انھیں اطمینان دلایا تو گاندھی جی نے چند شرطیں قبول کرا کے برت توڑ دیا۔ تو کہنا یہ ہے کہ گاندھی جی کے برت نے ملک میں امن کی جو فضا قائم کی اور مسلمانوں کے قتل و غارت اور لوٹ مار کا جو سلسلہ اُس وقت ختم ہوا وہ بالواسطہ مولانا حفظ الرحمٰن کا کارنامہ ہے۔ اگر موصوف جراءت و اعتماد سے کام لے کر گاندھی جی کے سامنے بات اس طرح نہ رکھتے تو اصلی صورت حال گاندھی جی کو کبھی نہ معلوم ہو سکتی اور خدا ہی جانتا ہے کہ خون کا وہ سیلاب کب تک بہتا رہتا۔

خدمت کا ایک لامتناہی سلسلہ

پھر ۱۹۴۷ء کے بعد سے اس ۱۹۶۲ء تک کے پندرہ سالوں میں وہ برابر ملت ہی کے کاموں میں لگے رہے۔ اس عرصہ میں جب کبھی اور جس وقت بھی دفتر جمعیۃ میں اُن کے پاس دلّی جانا ہوا تو یہی دیکھا کہ مختلف مقامات کے مسلمان ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور اپنے مسائل و مصائب اُن کے سامنے رکھ رہے ہیں اور مولانا جو کچھ ان کے لیے کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی دیکھا کہ وہ اپنے اُن کاموں کے لیے جو حکومت سے متعلق ہوتے اُن کے پاس آتے اور مولانا اُن کے لیے بھی جو کچھ کر سکتے اُس میں دریغ نہ کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کی اُن کی شدید مصروفیت دیکھ کر اُن پر رشک بھی آتا تھا اور دل میں اُن کی وقعت بڑھتی تھی۔ یہ مسائل جن کو لے کر لوگ اُن کے پاس آتے تھے عموماً شخصی اور جزئی ہوتے تھے لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کسی سے یہ کہا ہو کہ بھائی یہ شخصی اور جزوی مسائل ہیں۔ میرے سامنے ملت کے بڑے اجتماعی مسائل ہیں جن سے مجھے فرصت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اُن جیسا شخص یہ کہتا تو بالکل بے جا نہ ہوتا۔

ان سے اپنا کام کرانے کے لیے کسی تعلق، تعارف اور سفارش کی بالکل ضرورت نہ تھی جو کچھ کر سکتے تھے کسی کے لیے اس سے دریغ نہیں تھا۔

کوئی دو برس پہلے کی بات ہے وہ کسی کام سے لکھنؤ تشریف لائے، اپنے معمول کے مطابق ملاقات کے لیے میرے پاس بھی تشریف لائے اور تشریف لے گئے۔ تین چار ہی دن کے بعد دار العلوم دیوبند کے ایک کام کے سلسلہ میں ہم دونوں کو دیوبند میں جمع ہونا تھا۔ جب ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ اس دن جب میں لکھنؤ سے روانہ ہونے لگا اور ٹرین میں بیٹھ گیا تو ایک صاحب آپ کا سفارشی خط لے کر پہونچے، میں نے اُن سے کہا کہ بھائی جب میں امکانی خدمت کے لیے یوں ہی حاضر ہوں تو آپ لوگ میرے دوستوں کو سفارش کے لیے کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مولانا نے بتایا کہ خدا کے فضل سے ان صاحب کا وہ کام کل ہو گیا۔ مجھے مولانا سے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں میں کسی کے لیے کوئی سفارش نہیں لکھی، وہ خط جعلی ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں تمھارے قلم کا تو نہیں تھا بلکہ اس شخص نے بتایا بھی تھا کہ مولانا کو جلدی تھی اسلیے خط انھوں نے خود اپنے قلم سے نہیں لکھا ہے بلکہ دوسرے آدمی سے لکھایا ہے ——

بہرحال لوگ ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے، لیکن جیسا کہ میں نے ابھی بتایا مولانا اپنے پرائے، متعلق، غیر متعلق متعارف، غیر متعارف ہر ایک کی خدمت کے لیے حاضر تھے۔ میں جتنا بھی غور کرتا ہوں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ بہت بڑی بات ہے، اور اللہ کے ہاں بھی اسکی بڑی قدر ہے۔

یادگار کارنامہ

ملت کی خدمت کے اس لامتناہی سلسلہ کے علاوہ اسی سلسلہ کا اُن کا ایک عظیم اور قابلِ یادگار کارنامہ یہ بھی ہے کہ حکومتی پارٹی (کانگرس) کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہونے والی بے انصافیوں اور خاص کر فسادات کے سلسلے میں انھوں نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جس طرح کی تقریریں پچھلے چند برسوں میں کیں (جو پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور اخبارات کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔) اُن میں انہوں نے ملت کی مخلصانہ اور دردمندانہ وکالت اور حق گوئی و بیباکی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اور اس مجاہدانہ گفتار کے علاوہ فسادات کے سلسلہ میں ان کا مستقل "خادمانہ کردار" یہ رہا کہ ملک کے جس حصہ میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی انھوں نے وہاں جلدی سے جلدی پہونچنے کی کوشش کی اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے اس کے کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا اور ان کاموں کے تقاضے کے سامنے اپنی صحت بلکہ زندگی

ملک کے مسئلہ کو بھی بھلا دیا۔ پچھلے سال نومبر میں علی گڑھ وغیرہ میں فسادات ہوئے تو انھوں نے علی گڑھ کا دورہ اس حالت میں کیا کہ ان کے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا تھا اور اس کے اثر سے پانی کی کافی مقدار پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے کھانسی کی سخت تکلیف تھی، جسم گھلا جا رہا تھا لیکن انھیں اپنے اس حال کی کچھ خبر بھی نہ تھی اور ڈاکٹری معائنہ کرانے کے لیے انھیں فرصت نہیں مل رہی تھی۔ علی گڑھ سے انھیں سیدھا دیوبند آنا تھا، دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا اسی دن اجلاس تھا۔ ہم لوگ پہلے پہونچ چکے تھے لیکن مولانا راستہ میں موٹر فیل ہو جانے کی وجہ سے چار پانچ گھنٹے لیٹ پہونچے، ہم لوگوں نے اُن کی کھانسی کی تکلیف اور ان کی صورت دیکھ کر ان سے کہا کہ خدا کے لیے آپ اپنے اوپر رحم کریں، چند روز آرام کر لیں اور قاعدہ کا علاج کرا لیں۔ بہرحال اس دن دیوبند ہی میں یہ بات طے ہو گئی کہ اب وہ دہلی پہونچ کر سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کرائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن ملت کی بدنصیبی کہ ڈاکٹری معائنہ سے معلوم ہوا کہ ان کی کھانسی معمولی کھانسی نہیں ہے بلکہ اُن کے پھیپھڑے میں پانی کی بہت بڑی مقدار ہے، پانی نکالا گیا اور علاج شروع ہوا، چند روز کے بعد طے ہوا کہ مولانا علاج کے لیے بمبئی جائیں، وہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مولانا تو کینسر میں مبتلا ہیں اور پھیپھڑے میں پانی اسی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ وہ پھیپھڑے میں کینسر لیے ہوئے اور پانی بھرے ہوئے ملت ہی کے کاموں سے علی گڑھ اور دیوبند دوڑ رہے تھے۔

اتفاق یا لطیفۂ غیبی

یہ عجیب اتفاق ہے یا لطیفۂ غیبی کہ بستر علالت پر مستقل لیٹ جانے سے پہلے ملت کے کاموں کے سلسلہ میں مولانا کی زندگی کا آخری سفر علی گڑھ اور دیوبند کا ہوا "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا دینوی مرکز، اور دارالعلوم دیوبند اس کا دینی مرکز!

مولانا کا خاص جوہر

اس عاجز کی نظر میں مولانا کا خاص جوہر جو اُن کے مختلف النوع محاسن اور کارناموں کا گویا سرچشمہ تھا وہ اُن کی جرأت و فعالیت، محنت و جفاکشی اور خود اعتمادی تھی، وہ جس چیز کو صحیح اور ضروری سمجھتے تو حالات خواہ کیسے ہی ناسازگار ہوتے وہ مایوس نہ ہوتے اور اس کے لیے جد و جہد کے میدان میں کود پڑتے اور محنت و جانفشانی سے میدان اکثر سر ہی کر لیتے عیش پسندی اور آرام طلبی سے انہوں نے ہمیشہ اپنے کو دُور رکھا آزادی سے پہلے تو گویا مسلسل زمانۂ جنگ تھا اور مولانا کا تبادلہ گھر سے جیل اور جیل سے گھر کی طرف ہوتا رہتا تھا، اس زمانہ کی مستقل عادتوں میں سے اُن کی ایک یہ عادت بھی تھی کہ دن کو وہ ہمیشہ زمین پر سوتے تھے تاکہ جیل کی زندگی میں زمین پر سونا شاق نہ ہو۔

یہ عادت انھوں نے آزادی کے بعد بھی بلکہ پارلیمنٹ کی ممبری کے زمانہ میں بھی قائم رکھی۔ سہ پہر کو جب پارلیمنٹ کے اجلاس سے "جمعیۃ" کے دفتر واپس آتے تو ظہر کی نماز پڑھ کر ہمیشہ زمین ہی پر سوتے ـــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا اور عاجز کا قیام کہیں ساتھ ہوا۔ مولانا نے اپنے معمول کے مطابق زمین پر سونا چاہا، مجھے یہ بات بہت بری معلوم ہوئی کہ میں پلنگ پر سوؤں اور مولانا زمین پر اس لیے میں نے بھی اُن کے ساتھ زمین پر سونا چاہا لیکن مولانا نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ مجھے بارہا اُن کی فرمانبرداری کرنا پڑی۔

رائے میں صلابت

مولانا کی ایک خصوصیت ان کی رائے کی صلابت اور مضبوطی سے اپنے موقف پر قائم رہنے کی عادت تھی۔ الّا یہ کہ خود اپنی رائے بدل جائے یا وہ خود معاملہ کو غیر اہم اور قابل درگزر سمجھ کر اپنی رائے پر اصرار مناسب نہ سمجھیں۔ اس معاملہ میں مولانا اتنے پکے تھے کہ اپنے بڑے بڑے واجب الاحترام بزرگوں کی رائے سے اگر کسی معاملہ میں ان کو اختلاف ہوتا اور وہ اس کو اہم سمجھتے تو پوری قوت سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے اور اپنا موقف چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے۔ ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں مولانا عبد الحق مدنیؒ کی صدارت میں ہوا تھا اس میں اُس وقت کے اٹھے ہوئے مسلمانوں کے ایک خاص مسئلہ کے بارے میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ایک تجویز پاس کرانا چاہتے تھے اور ان کو اس پر اصرار تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ارکان جمعیۃ میں سے چند اور صاحب رائے حضرات اس کو مناسب نہیں سمجھتے تھے، لیکن جب حضرت شیخ نے اُس کے حق میں اپنے خاص انداز میں تقریر فرمائی جس میں برہمی کا عنصر بھی شامل تھا تو دوسرے حضرات نے تو خاموشی ہی میں خیریت سمجھی لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اس خاص نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق کے باوجود جو اُن کو حضرت شیخ سے تھا (جس کو سب جاننے والے جانتے ہیں۔) پوری مضبوطی کے ساتھ اپنی رائے پر قائم رہے اور جب تجویز اکثریت کی تائید سے پاس ہو گئی تو انھوں نے مفصل اور مدلل اختلافی نوٹ لکھا اور اصرار کیا کہ میرا اختلافی نوٹ کارروائی میں شامل کیا جائے اور اس کو شامل کرا کے چھوڑا۔

غالباً دو سال پہلے کی بات ہے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ یا مجلس عاملہ کے اجلاس کے موقع پر کسی سلسلۂ گفتگو میں مولانا نے خود اس عاجز سے فرمایا کہ اپنے اکابر سے پوری عقیدت مندی کے باوجود ان میں سے کسی کی بیعت میں صرف اس وجہ سے نہیں کر سکا کہ اس تعلق کے بعد ہمارا ماحول اختلافِ رائے کی بالکل اجازت نہیں دیتا اور اس کو بے ادبی اور محرومی کی نشانی سمجھا جاتا ہے ـــــ اسی سلسلۂ گفتگو میں

مجھے پہلی دفعہ مولانا سے یہ معلوم ہوا کہ باضابطہ بیعت کے بغیر ان کا ایک گونہ اصلاحی تعلق حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب نقشبندیؒ سے رہا تھا ـــــ البتہ اس آخری علالت کے دوران مولانا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب غالباً وہ اس خانے کو پُر کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ عرفی طور پر کسی شیخ سے بیعت نہ ہونے کے باوجود اپنے اکابر و مشائخؒ کے ساتھ ان کو جو گہرا قلبی تعلق تھا اور ان حضرات کی جو شفقت و محبت اپنی ملی خدمات کی وجہ سے ان کو حاصل تھی اس کے ہوتے ہوئے عرفی بیعت نہ ہونے سے کوئی خاص کمی نہیں رہتی۔ ہمارے اکثر اکابر و مشائخ کی نگاہ میں عرفی بیعت کی وہ اہمیت نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے صاحب ارشاد اکابر سے بار بار سنا ہے کہ اصل چیز بس مخلصانہ تعلق و محبت ہے۔ "المرءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ"

تواضع اور وضع کی پابندی

مولانا اپنی ملی اور ملکی خدمات کی وجہ سے خاص کر ۱۹۴۷ء کے بعد اگرچہ ایک بلند ترین مقام پر فائز تھے اور مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ملک کی بھی صف اول کی شخصیتوں میں انکا شمار ہوتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس بلند مقامی کی وجہ سے اس شخص میں بڑائی کی ذرا بھی خو بو نہیں آئی ـــــ بعض ناواقف حضرات کو ان کے پر زور انداز گفتگو سے شبہ ہو جاتا تھا کہ وہ شاید احساس بالاتری میں مبتلا ہیں، لیکن ان کے سب جاننے والے جانتے ہیں کہ اس بیماری نے اللہ کے اس بندے کو چھوا بھی نہیں در اصل اُن کا بات کرنے کا یہ انداز ہمیشہ سے اور بالکل فطری تھا۔ خاص کر بحث اور اختلاف رائے کے موقع پر اپنے بے تکلف دوستوں بلکہ بڑوں کے سامنے بھی ہمیشہ سے اسی انداز میں بات کرتے تھے۔ بہرحال یہ انداز گفتگو ان کا بالکل فطری تھا نیچے سے نیچے کی سطح کے جن آدمیوں کے ساتھ بھی جو تعلق اور برتاؤ ان کا بیس پچیس سال پہلے تھا وہی اس آخری دور میں بھی رہا۔

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی یا مدرسی کے زمانہ سے ان کا یہ معمول رہا تھا کہ عشاء کے بعد کسی طالب علم کے حجرہ میں کچھ دیر بیٹھتے اور یہ مجلس بڑی بے تکلف گویا یارانہ پارٹی ہوتی۔ بعض طلبا بھی شریک ہو جاتے مولانا نے اب تک اپنی اس وضع کو اس طرح نباہا کہ آندھی مینہ کچھ ہو لیکن مولانا جب دیوبند میں ہوتے تو عشاء کے بعد کی یاروں کی یہ مجلس قضا نہ ہوتی۔ یہ عاجز چونکہ عشاء کے بعد جلدی سونے کا عادی ہے۔ اور مزاج بھی قدرت نے کچھ خشک اور کم آمیز بنایا ہے۔ اس لیے افسوس ہے کہ مجھے کبھی اس لطفِ صحبت

میں شرکت کا موقع نہیں ملا بس مولانا ہی سے کبھی اس کی روداد سن لیتا۔

دار العلوم دیوبند سے تعلق مولانا نے دار العلوم دیوبند میں پڑھا، اس کے بعد بہ حیثیت استاد بھی کچھ دن وہاں رہے، اور اب قریباً اٹھارہ انیس سال سے اس کی مجلسِ شوریٰ کے اہم ترین رکن تھے۔ لیکن دار العلوم اور جماعت دار العلوم کے ساتھ مولانا کا تعلق ان سب تعلقات سے (جو صرف قانونی اور ضابطہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔) بالاتر گہرا روحانی اور قلبی تعلق تھا۔ وہ دار العلوم کو صرف ایک دینی درس گاہ اور اپنی مادرِ علمی ہی نہیں بلکہ دینی مسلک اور روحانی مرکز یقین کرتے تھے اور اسی حیثیت سے اس سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ ملت کے وقتی تقاضوں کے مطابق "روشن خیال" اور "وسیع المشرب" ہونے کے باوجود دینی مسلک اور طرزِ فکر میں جماعت دیوبند کے اکابر و اسلاف کے گویا پورے مقلد تھے ــــ ملت کے اجتماعی مسائل اور مصالح کے پیش نظر خاص کر ۱۹۴۷ء کے بعد کبھی کبھی ایسے بعض کام بھی انھیں کرنے پڑے جو بظاہر ان کے اور ان کے اکابر کے مسلک کے خلاف تھے۔ لیکن وہ انھوں نے سوچ سمجھ کر شریعت کے "اختیارِ اھون البلیتین" کے اصول پر کئے۔ پھر بھی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "میں تو ایک دنیا دار آدمی ہوں، میرا عمل سند نہیں ہے، مسئلہ وہی ہے جو علمائے حق بتائیں"۔ اسی طرح اگر کبھی انھوں نے کوئی ایسا کام کیا جو بظاہر ان کی غیر معمولی جراءت مندی اور بے لاگ حق گوئی و بیباکی سے میل نہیں کھاتا تو وہاں بھی انہوں نے اپنی فہم کے مطابق ملت کے اجتماعی مصلحت کو مقدم رکھ کر اپنی فطری خودی کو دبایا اور انشاء اللہ وہ اپنے اس مجاہدے اور قربانی پر اجر کے مستحق ہوں گے۔

تقریر و تصنیف مولانا کو اللہ تعالیٰ نے تقریر و بیان کا جو ملکہ دیا تھا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ملک کا وہ کونسا گوشہ ہے جہاں کے لوگوں نے ان کی تقریریں نہیں سنیں، تقریر و خطابت کا یہ ملکہ اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ تھا۔ مولانا نے ملک و ملت کے لیے اسے خوب استعمال کیا خاص کر پارلیمنٹ کی ان کی تقریریں تو یادگار رہیں گی۔

تقریر کی طرح تحریر اور تصنیف و تالیف سے بھی مولانا کو خاص مناسبت تھی جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے سب سے پہلی کتاب "بلاغ مبین" لکھی تھی[1] جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دعوتی مکاتیب کو جمع کیا تھا جو

---

[1] بعد میں معلوم ہوا کہ اس سے پہلے مدراس کے زمانہ قیام میں انہوں نے ایک کتاب فقہ حنفی کے بعض مسائل پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب میں مسلک حنفی کی تائید میں لکھی تھی، جس کا نام غالباً حفظ الرحمٰن فی تائید مذہب النعمان" تھا جو اسی زمانہ میں چھپ کر شائع ہو گئی تھی۔ وہی ان کی پہلی تصنیف تھی۔ ۱۲

آپ نے اپنے زمانہ کے چھوٹے بڑے فرمانرواؤں کو بھیجے تھے۔ ان میں ہر ایک کے متعلق مفصل تاریخی بحث بھی کی تھی۔ یہ کتاب مولانا نے غالباً ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی اس کے بعد قومی و ملّی خدمات کے ساتھ ساتھ (جس کے سلسلہ میں بار بار جیل بھی جانا پڑا۔) ۱۹۴۷ء تک تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور اور اس عرصہ میں "اسلام کا اقتصادی نظام" "فلسفہ اخلاق" اور چار جلدوں میں "قصص القرآن" جیسی ضخیم کتابیں آپ نے لکھیں۔ مولانا فطری طور پر اُن مصنفوں میں تھے جو تھوڑے وقت میں زیادہ لکھتے ہیں۔ اگر وہ دوسرے کاموں سے یکسو ہو کر صرف تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو اپنے زمانہ کے کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتے اور غالباً ہر مہینہ دو مہینے میں ایک کتاب تیار کر دیا کرتے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ ملّت اسلامیہ ہند کے کاموں میں ہمہ تن ایسے مشغول ہو گئے کہ اس کے بعد لکھنے لکھانے جیسے کسی علمی کام کی ان کے اوقات میں بالکل گنجائش نہیں رہی اس کے باوجود زندگی کے آخری دو سالوں میں انھوں نے دوڑتے بھاگتے دو کام کر ڈالے، ایک سیرت پر اپنی قدیم تصنیف "رسول کریمؐ" کو گویا دوبارہ لکھا جس کے بعد ضخامت کے لحاظ سے بھی وہ سابق کے مقابلہ میں قریباً دو چند ہو گئی ہے (اب سے تھوڑے ہی دنوں پہلے "رسول کریمؐ" کا یہ جدید اڈیشن شائع ہو چکا ہے۔) دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ "قصص القرآن" کی پہلی جلد جو معیار تحقیق کے لحاظ سے خود ان کی نگاہ میں بھی ہلکی ہو گئی تھی، اس کو انھوں نے پچھلے دنوں میں گویا از سر نو مرتب کیا، انشاء اللہ عنقریب یہ بھی چھپ کر سامنے آجائے گی۔

آخری علالت اور سانحۂ وفات

یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ گذشتہ دسمبر میں دار العلوم کی مجلس شوریٰ کی شرکت کے لیے جب مولانا علی گڑھ سے دیوبند پہونچے تو وہ سخت کھانسی میں مبتلا تھے اور صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا جسم گھلا جا رہا ہے، ہم لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ کچھ دن کے لیے سفر اور دوسرے کام چھوڑ کر علاج کرائیں اور آرام کریں۔ اس کے چند روز بعد ہی جب ڈاکٹروں نے مولانا کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان پھیپھڑوں میں پانی کی کافی مقدار ہے۔ چنانچہ دلی میں وہ پانی نکالا گیا اس کے بعد مولانا علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے۔ جن دنوں مولانا بمبئی میں زیر علاج تھے، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کویت کے سفر سے واپسی میں بمبئی ٹھہرے، میں نے ان کو لکھ دیا تھا کہ وہ بمبئی میں مولانا کو دیکھ کر آئیں اور ممکن ہو تو اُن کے معالجوں سے بھی ان کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں صحیح صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کریں، مولانا ندوی اسپتال میں مولانا سے بھی ملے اور وہاں کے ایک معالج ڈاکٹر سے پرائیوٹ طور سے بات کرنے کا بھی ان کو خاص موقع مل گیا، اس نے بتایا کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے پھیپھڑے میں کینسر

ہے اور اس کا محل وقوع ایسا نازک ہے کہ نہ آپریشن کیا جا سکتا ہے اور نہ برقی شعاعوں سے ہی اس کا علاج کیا جا سکتا ہے بس دوائیں ہی استعمال کی جا سکتی ہیں اور ان سے کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے، مولانا ندوی کے ذریعہ یہ بات جس وقت مجھے معلوم ہوئی اس وقت تک عام طور پر یہ بات لوگوں کے علم میں نہیں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہو کہ اسی دن سے مولانا کے بارے میں ایک مایوسانہ تشویش دل میں پیدا ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا بمبئی سے دہلی آ گئے اور ان کی صحت و مرض کی رفتار کا حال نجی خطوط سے اور اخبار "الجمعیۃ" کی اطلاعات سے معلوم ہوتا رہا۔ ۲۲ر اپریل کو میں مولانا سے ملاقات اور مزاج پرسی ہی کے لیے دہلی گیا اس وقت مولانا کی حالت دیکھنے میں تشویشناک نہیں تھی بس کینسر کا نام ہی سب کو تشویش میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

میں مولانا کے پاس شام کے وقت گیا تھا یہی ملاقات کا عام وقت بھی تھا، تھوڑی دیر کے بعد جب اور حضرات اٹھنے لگے تو میں نے بھی اٹھنے کا ارادہ کیا اور اجازت چاہی، مولانا نے مجھے روک لیا، میں نے عرض کیا کہ اس شرط پر بیٹھوں گا کہ آپ باتیں نہ کریں، میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری وجہ سے آپ باتیں کرتے ہیں اور اس سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں مولانا کو یہ بتا چکا تھا کہ میرا پروگرام یہاں سے حضرت رائے پوری (اقدس سرہٗ) کی خدمت اقدس میں حاضری کے لیے رائے پور جانے کا ہے، تھوڑی دیر کے بعد جب مغرب کا وقت بالکل قریب آ گیا اور میرے علاوہ جو دیگر حضرات مولانا کے پاس اس وقت تھے وضو وغیرہ کے لیے اٹھ گئے اور اتفاق سے میں اکیلا رہ گیا تو مولانا نے فرمایا کہ "مجھے ایک بات کہنی تھی، میں کل گذشتہ رائے پور حضرت کی خدمت میں جانے کا پروگرام بنا چکا تھا موٹر وغیرہ کا پورا انتظام ہو گیا تھا اور یہاں میں نے کسی کو اس کی اطلاع نہیں کی تھی سوچا یہ تھا کہ خاموشی سے صبح نکل جاؤں گا اور رات تک واپس آ جاؤں گا، لیکن کل رات سانس کی تکلیف بڑھ گئی اور مجھے وہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ اب جس دن بھی میری طبیعت ذرا بہتر ہو گی میں انشاء اللہ رائے پور حاضر ہوں گا۔ آپ حضرت کی خدمت میں یہ بات اور میرا سلام بھی عرض کر دیں۔"

میں اپنے پروگرام کے مطابق دہلی سے رائے پور گیا اور حضرت اقدس کی خدمت میں مولانا کا سلام پہونچایا اور آنکھوں دیکھا حال بتایا اور حاضری کے ارادہ کے بارے میں مولانا نے مجھ سے جو کچھ فرمایا تھا وہ بھی عرض کیا ـــــ اگرچہ حضرت کی خانقاہ میں بعد ختم روزانہ پابندی کے ساتھ مولانا کی صحت کے لیے دعا ہوتی تھی لیکن اُس دن حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا پر مرض غالب آ چکا ہے، آپ انھیں لکھ دیں کہ ایسی

حالت میں وہ یہاں آنے کا ارادہ نہ فرمائیں انھیں تکلیف ہوگی چنانچہ میں نے خط لکھ دیا۔

میں ابھی رائے پور ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ علاج کے لیے مولانا کے امریکہ جانے کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ اسکے بس دو چار ہی دن کے بعد وہ امریکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ۱۲ر جولائی کو واپسی ہوئی، میں ۱۴ر کو دہلی جا کر مولانا سے ملا۔ اس وقت مولانا کا بیان یہ تھا کہ وہاں کے معالجین نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جہاں تک کینسر کا تعلق ہے اس کا پورا علاج ہو چکا ہے اب جو شکایتیں باقی ہیں وہ آہستہ آہستہ رفع ہو جائیں گی، لیکن بعض دوسرے بھی ذرائع سے یہ بات ہم لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی کہ امریکہ کے معالجین نے مولانا کو مایوس ہو کر واپس کیا ہے اور صرف ان کے دل کی تسلی اور تقویت کے لیے علاج کی کامیابی کا یقین دلایا ہے۔ مولانا کی ظاہری حالت اور ضعف و نقاہت کو دیکھ کر بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ مولانا اصل مرض سے نجات پا چکے ہیں، لیکن یہ اندازہ بھی بالکل نہیں تھا کہ ان کا وقت اتنا کم باقی رہ گیا ہے، میں مولانا سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اس وقت تو آپ کے پاس آنے والوں کا سخت ہجوم ہے، اب انشاء اللہ میں چند روز کے بعد پھر آؤں گا، اس درمیان میں یہ اطلاع ملتی رہی کہ اگرچہ ٹمپریچر تو بدستور ہے لیکن کمزوری آہستہ آہستہ گھٹ رہی ہے اور قوت کچھ بڑھ رہی ہے۔ اگست کے پہلے ہفتہ میں میں نے دہلی جانے کا پروگرام بنا لیا تھا کہ بالکل اچانک ۲ر اگست کی صبح کو مولانا کے انتقال کی خبر سن لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کی حکمتیں خود ہی خوب جانتا ہے ہم بندوں کو چارۂ دم زدن نہیں۔ لیکن ہم کم نگاہوں نے تو یہی محسوس کیا کہ وہ ایسے وقت پر اٹھائے گئے جب کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے بظاہر ان کی بڑی ضرورت تھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ کسی موت ہی سے حیات کا سامان پیدا کردے۔ "یخرج الحیّ من المیت ویخرج المیت من الحی" اس کی شان ہے۔

اپنا ایک خواب

جی چاہتا ہے کہ اس تذکرے کو اپنے ایک خواب پر ختم کردوں ـــــ مولانا کے انتقال کے ۴، ۵ دن بعد (جبکہ میں اس مضمون کا کافی حصہ لکھ چکا تھا) رات کے آخری حصہ میں میں نے خواب دیکھا کہ مولانا کے متعلق کوئی بہت تشویش انگیز خبر آئی ہے۔ غالباً یہ ان کی حالت نہایت نازک ہے، میں اس خبر کے ملتے ہی دہلی روانہ ہو گیا۔ مولانا کا قیام ایک بہت وسیع کوٹھی میں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں لوگوں کا کوئی اژدھام نہیں ہے جو غیر معمولی

حالت میں ہونا چاہیے تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہیں، میں اندر چلا گیا دیکھا کہ مولانا نہایت تندرست بیٹھے ہوئے ہیں، جسم پُر گوشت ہے، رنگ سرخ و سفید ہے، داڑھی سیاہ اور چمک دار ہے (حالانکہ مولانا جوانی میں بھی کبھی ایسے نہیں تھے) میں نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے بلکہ خفا ہو کر کہا کہ "آپ اچھے خاصے بیٹھے ہیں اور اپنے سارے دوستوں کو آپ نے پریشان کر دیا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے متعلق اس خبر کی اشاعت نے دنیا کو کس قدر پریشان کیا ہے۔"

مولانا نے مجھ سے فرمایا "میں اچھا نہیں ہوں، تمھیں ایسا نظر آ رہا ہوں" ــــــ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوتی رہیں پھر فرمایا کہ "میری کتاب "ولایت" تو تمھارے پاس ہوگی؟" ــــــ مجھے خواب ہی میں یاد آیا کہ مولانا نے اکابر اولیاء اللہ میں سے کسی بزرگ کی کتاب کا اردو میں ترجمہ یا اس کی تلخیص کی تھی اور "ولایت" ہی کے نام سے اب سے بہت پہلے وہ چھپ بھی گئی تھی۔ اسی بنا پر میں نے مولانا سے کہا "یاد تو آیا" بہت دن ہوئے آپ کی وہ کتاب دیکھی تھی اب پتہ نہیں کہ میرے پاس ہے یا نہیں ــــــ مولانا نے فرمایا کہ "اب اس کا نیا اڈیشن تیار ہوا ہے" اور یہ کہہ کر اس کا ایک نسخہ مجھے دیا۔ یہ جیبی سائز کی بہت حسین کتاب تھی، ٹائٹل پر نہایت خوشخط، اس کتاب کا نام "ولایت" لکھا ہوا تھا اور نیچے مولانا کا نام تھا۔ مجھے خواب میں مولانا کو صحت مند دیکھ کر اور ان کی یہ کتاب پا کر اتنی خوشی ہوئی کہ فرط مسرت سے ہی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی میں نے اپنے کو مسرت و خوشی سے لبریز پایا۔ گھڑی دیکھی تو تین بجے تھے۔ اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی، مولانا کے لیے خصوصیت سے دعا کی۔ اتنے میں فجر کی اذان ہو گئی اس کے بعد میں پھر لیٹ گیا، میری آنکھیں بند تھیں اور میں ایسی حالت میں تھا کہ نہ وہ پوری بیداری کی حالت کہی جا سکتی ہے اور نہ نیند کی، اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ نہایت حسین نورانی حروف میں لکھی قرآن مجید کی یہ آیت میری نظر کے سامنے ہے:-

"هو الذی یقبل التوبة عن عباده و یعفو عن السیئات"

یہ خواب ظاہر ہے کہ تعبیر سے مستغنی ہے۔ امید ہو کہ مولانا نے ملت کے لیے جو کچھ کیا اور اللہ کے لاکھوں بندوں نے ان کی علالت کے زمانہ میں ان کی صحت و حیات کے لیے جو دعائیں کیں جو یقیناً آخرت کے لیے ذخیرہ بنتی رہیں، انشاء اللہ ان سب کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ انکے ساتھ خاص الخاص رحمت و کرم کا ہوگا۔ وہ رؤف بالعباد اور ارحم الراحمین ہے۔

محمد منظور نعمانی

"موعظۃ المقبرہ"

قبرستان کا وعظ

(محرم ۱۳۶۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

[۲۹ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ کی شب میں برادر عزیز حاجی محمود حسین مرحوم مغفور کی تدفین کے وقت (جبکہ قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی) موت اور آخرت سے متعلق جو مختصر تقریر کی گئی تھی اور "الفرقان" کے گزشتہ شمارہ میں جس کی اشاعت کا وعدہ بھی کیا گیا تھا وہ حسب وعدہ ہدیۂ ناظرین کرام ہے]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (آل عمران ع ۱۹)

محترم حاضرین! ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر ہے، ایک بھائی نے اسی وقت مجھ سے کہا ہے کہ اس وقفہ میں مَیں کچھ عرض کروں اور ان کے اس کہنے ہی پر مجھے یاد آیا کہ یہ ایک طرح سنت نبویؐ بھی ہے ——— صحیح بخاری شریف میں تو ایک مستقل باب اس کے متعلق قائم کیا گیا ہے جس کا عنوان ہی ہے "باب موعظۃ المحدث عند القبر" بہرحال اس سنت کی ادائیگی کی نیت ہی سے میں چند کلمات عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور

مجھے اور آپ کو ان سے فائدہ پہونچائے۔

میں نے جو آیت سورۂ آل عمران کی ابھی تلاوت کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

"ہر جاندار کو موت کا مزہ ضرور چکھنا ہے۔ اور تمھارے اعمال کے نتائج پوری طرح تم کو قیامت کے دن ہی ملیں گے، پس جو اس دن دوزخ کے عذاب سے بچ جائے اور جنت میں بھیج دیا جائے وہی کامیاب ہوگا، اور یہ دنیوی زندگی تو بس ایک دھوکے کا سودا ہے"۔

اس ترجمہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس آیت میں موت اور آخرت کا ذکر ہے اس کے پہلے جزو میں بتلایا گیا ہے کہ ہر جاندار کو مرنا ہے اور ہر ذی حیات کو ایک دن ضرور موت آنی ہے ——— اور اگر قرآن حکیم میں اس کو نہ بھی بتلایا گیا ہوتا جب بھی ہم میں سے ہر ایک کو بطور خود یہ یقین ہے کہ ہر زندہ کو ایک دن مرنا ضرور ہے، چنانچہ وہ انسان جو قرآن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، مرنے میں ان کو بھی کوئی شک نہیں ہے، اور کیونکر کوئی شک کر سکتا ہے جب کہ اس دنیا کا پوری عمر کا تجربہ یہ بتلا رہا ہے کہ ہر زندگی کا انجام موت ہی پر ہوتا ہے ——— بہر حال یہ حقیقت کہ "ہر زندہ کو موت کا مزہ چکھنا ہے" ایک یقینی بلکہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے جس سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا ——— لیکن انبیاء علیہم السلام، اللہ تعالیٰ سے اطلاع پاکر موت سے آگے کے متعلق یہ بھی بتلاتے ہیں کہ موت فنائے محض نہیں ہے، بلکہ درحقیقت مرنے والا ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے کہ جس طرح روزمرہ انفرادی طور پر لوگ مرتے اور اس عالم سے اس دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح اس دن اس پورے عالم اور سارے جہان پر ایک دم فنا طاری کر دی جائے گی اور اس وقت جو بھی ذی حیات اس سارے سنسار اور ساری کائنات میں ہوں گے وہ سب موت کی گھاٹی سے اتار کر اس دوسرے عالم میں منتقل کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد یہ دنیا جس میں ہم آباد ہیں قطعی طور سے درہم برہم اور فنا ہو جائے گی، اور جو لوگ اس دنیا سے منتقل ہوتے رہے ہیں ان ہی سے ایک دوسرا عالم اللہ تعالیٰ کی قدرت سے برپا ہوگا ——— پھر یہاں جس نے جو برے یا بھلے عمل کئے ہیں

اور جس طرح کی اچھی یا بری زندگی گذاری ہے وہاں اسی کے مطابق اس کو جزا یا سزا ملے گی ـــــ یہی مطلب ہے آیت کے اس جزو کا کہ "اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ"

بہر حال ہماری یہ دنیا دار العمل ہے اور دار الجزا وہ دوسرا عالم ہو گا جس میں ہم کو موت کے بعد پہونچنا ہے۔ پھر وہاں ہم کو جو زندگی عطا ہوگی وہ یہاں کی سی محدود اور چند روزہ زندگی نہ ہوگی بلکہ ہمیشہ رہنے والی اور لامحدود ہوگی ـــــ اب ہمارے اختیار میں ہے کہ خواہ اس لامحدود زندگی کو برے اعمال کر کر کے دکھ اور جہنم کی زندگی بنا لیں، یا برائیوں اور گناہوں سے پرہیز کر کے اور نیکیاں کر کر کے سکھ اور جنت کی زندگی بنا لیں۔ غرض اپنے کو دوزخی یا جنتی بنانے والے خود ہم اور ہمارے اعمال ہی ہیں۔ بالکل صحیح کہا ہے کہنے والے نے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۔۔۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جب یہ معلوم ہو گیا کہ بس یہی دنیا دار العمل ہے اور آئندہ ابد الآباد تک یہاں کے کئے ہوئے اعمال کے نتائج ہی سے ہمیں واسطہ پڑنا ہے تو سوچئے کہ کس قدر خطرناک غلطی اور کیسے خسارہ میں ہیں وہ لوگ جو اس زندگی کی مہلت کو غفلت میں گزار رہے ہیں، اور یہاں سے جانے کے بعد جب دوسرے عالم میں ان کو ہمیشہ رہنا ہے وہاں کے راحت و آرام کے لئے وہ کوئی تیاری نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس دنیا کی لذتوں اور یہاں کے دھندوں میں وہ اس طرح منہمک ہیں کہ گویا ان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور کبھی موت نہیں آنی ہے،

اس غفلت سے نکالنے کیلئے اور دنیا کے متوالوں کو آخرت کی یاد دلانے کے لئے اللہ کے سارے پیغمبر آئے اور اللہ کی تمام کتابوں میں یہ درس دیا گیا۔ لیکن انسان ایسا غافل اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے کہ اس کے باوجود وہ آخرت سے بالکل بے پروا ہو جاتا ہے اور اپنی موت کو بالکل بھلائے رہتا ہے ـــــ پھر اس کی غفلت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے انسان کو روز مرہ مرتے اور اس دنیا سے سفر کرتے دیکھتا ہے لیکن پھر بھی وہ انبیاء علیہم السّلام کے دیئے ہوئے اس سبق کو اور اپنی موت کو یاد نہیں کرتا۔ وہ اپنے سے زیادہ

عمر والوں ہی کو نہیں بلکہ ہم سنوں، اپنے سے چھوٹوں، بلکہ اپنی گود کھلایوں تک کو دیکھتا ہے کہ وہ بیمار پڑے، بیماری نے شدت اختیار کی، حکیموں اور ڈاکٹروں کی ہزار کوششوں کے باوجود علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، اور کوئی دوا ساز نہیں کر رہی، اب مریض کا آخری وقت قریب آگیا، نزع اور جانکنی کا آغاز ہو گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد موت کے فرشتہ نے آکر روح کو قبض کر لیا، اب وہ ہم جیسا انسان بے جان لاشہ ہو کے رہ گیا ــــ نہلانے والوں نے پلنگ سے اتار کر ایک ٹوٹے پھوٹے تختہ پر رکھ کر جیسے چاہا نہلا دیا، کفنا دیا، اور نماز جنازہ پڑھ کے کسی سنسان اور وحشت ناک جنگل میں ہزاروں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے بیچ میں ایک اور قبر کھود کے دفنا دیا اور پچاسوں من مٹی اوپر سے ڈال کر سب اس مرنے والے کو اکیلا چھوڑ کے اپنے اپنے گھر چلے آئے،

ذرا غور تو کیجیے ہر مرنے والے کی موت ہمارے لئے کتنا عبرت اور نصیحت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے، لیکن غافل انسان آئے دن قدرت کا یہ تماشا دیکھتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان سب منزلوں سے ہم کو بھی گزرنا ہے اور ہماری زندگی کا انجام بھی بس یہی ہونا ہے۔ درحقیقت غفلت کا یہ درجہ کہ دوسروں کی موت دیکھ کر بھی اپنی موت یاد نہ آئے اور دوسروں کو دنیا سے جاتا دیکھ کر بھی سفر آخرت کی تیاری کی فکر پیدا نہ ہو، بالکل آخری درجہ ہے ــــ موت تو سب سے بڑی مُذَکِّر ہے، حدیث پاک میں ہے "کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظاً"، یعنی موت ہی انسان کیلئے کافی واعظ ہے،

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ازالۂ غفلت کی خاص تدبیر بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَکْثِرُوا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ" (یعنی لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی موت کو بکثرت یاد کرو اس سے تمھارے دلوں کی غفلت دور ہو جائے گی) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ رات کا جب بیشتر حصہ گزر جاتا اور تھوڑا سا حصہ باقی رہتا تو آپ اپنے گھر والوں کو غفلت کی نیند سے اٹھاتے اور فرماتے:-

"اُذْکُرُوا اللّٰہَ اُذْکُرُوا اللّٰہَ جَاءَتِ الرَّاجِفَۃُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَۃُ جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِیْہِ جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِیْہِ" (یعنی اٹھو اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، دنیا کو تہ و بالا کر دینے والا

قیامت کا زلزلہ بس آنے ہی والا ہے، اس کے پیچھے جو آنا ہے (یعنی نفخہ ثانیہ اور پھر حشر نشر) وہ بھی آہی رہا ہے، دیکھو موت اپنی ساری سختیوں اور مصیبتوں کے ساتھ آپہنچی، دیکھو موت سر پر آگئی)

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غافلوں کو ہوشیار کرنے اور غفلت سے چونکانے کے لئے موت ہی کو یاد دلاتے تھے۔ لیکن ہماری غفلت اس درجہ کی ہے کہ موت سے بھی ہمارا نشہ نہیں اترتا اور اپنے جیسے دوسروں کو مرتا اور زمین میں دفن ہوتا دیکھ کر بھی ہم کو اپنی موت اور قبر کی بیچارگی و تنہائی یاد نہیں آتی اور ہم نہیں سوچتے کہ جب ہمارے لئے یہ وقت آئے گا جو یقیناً آنا ہے تو ہم پر کیا گزرے گی۔

محترم بزرگو اور عزیز بھائیو! اس وقت جب تک کہ ہم زندہ ہیں، تندرست ہیں، چلتے پھرتے ہیں، ہمارے لئے ممکن ہے اور ہمارے اختیار میں ہے کہ اپنی قبر میں آرام و راحت اور روشنی و انسیت کا انتظام کرلیں اور اس تنگ و تاریک کوٹھری کو اپنے لئے پر بہار اور وسیع گلزار بنالیں۔ لیکن اگر ہم نے زندگی کی یہ مہلت یونہی غفلت میں گزار دی اور حیاۃ آخرت کے لئے جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ ہم نے نہ کیا، اللہ سے نڈر اور محاسبۂ آخرت سے بے پروا ہو کر ہم اللہ کی نافرمانیاں اور اس کے بندوں کی حق تلفیاں کرتے رہے تو یقین کیجئے کہ یہ قبر آپ کے لئے صرف ایک تنگ و تاریک کوٹھری ہی نہ ہوگی بلکہ یہ ایک چھوٹا سا دوزخ ہوگا جس میں آگ ہوگی اور طرح طرح کے زہریلے کیڑے مکوڑے ہوں گے جو کروٹ کروٹ آپ کو ڈسیں گے، پھر وہاں آپ کی کوئی خبر لینے نہ آئے گا، کوئی یار مددگار نہ ہوگا، آپ پیاسے ہوں گے تو کوئی آپ کو پانی دینے والا نہ ملے گا، آپ کے دائیں بائیں آگ بھڑکے گی تو کوئی اس کو بجھانے والا نہ ہوگا، آپ چیخیں چلائیں گے تو کوئی سننے والا نہ ہوگا، اور پھر یہ ایک دو دن کی بات نہ ہوگی بلکہ اگر آپ کے اعمال رحمت اور معافی کے قابل نہ ہوئے تو قیامت تک قبر میں یہی عذاب مسلط رہے گا (اعاذنا اللہ من ذالک)

حدیث پاک میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "انما القبر روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النار" (یعنی قبر یا تو جنت کے گلزاروں میں کا

ایک گلزار ہے اور یا پھر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے)

ایک اور حدیث میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز قبر پکارتی ہے "انا بیت الغربۃ، انا بیت الوحدۃ، انا بیت التراب، انا بیت الدود" یعنی میں بیگانگی اور ناشناسائی کا گھر ہوں، میں تنہائی کی کوٹھری ہوں، میں خاک اور مٹی کا گھر ہوں، میں کیڑوں سے بھرا خزانہ ہوں"

آگے اسی حدیث میں ہے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب اللہ کا کوئی مومن صالح بندہ دفن کیا جاتا ہے تو قبر محبت اور پیار کے ساتھ اس کا استقبال کرتی ہے اور وہ قبر اس کے لئے اتنی وسیع اور کشادہ کر دی جاتی ہے کہ جہاں تک اس کی نظر جاتی ہے وہ کشادگی ہی کشادگی دیکھتا ہے، لیکن اگر کوئی بدکردار اور خدا کا نافرمان بے ایمان دفن کیا جاتا ہے تو قبر کا معاملہ اس کے ساتھ گویا ایک بے درد دشمن کا سا ہوتا ہے، وہ اس کے لئے انتہائی تنگ ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کو بھینچتی ہے کہ اس کی ادھر کی پسلیاں اُدھر ہو جاتی ہیں اور اس قدر سخت زہریلے سانپ اس کے ڈسنے کیلئے مسلط کر دیئے جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک زمین میں پھنکار مار دے تو زمین ہمیشہ کیلئے بے گیاہ ہو جائے اور سبزہ اُگانے کی اس میں مطلق صلاحیت نہ رہے"

اب ذرا سوچیے کہ جب ہم کو یقیناً مرنا اور قبر میں جانا ہے، اور قبر میں ہمارے ساتھ جو معاملہ ہوگا اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبریں ہم کو دی ہیں ہم ان کو بھی صحیح اور قطعی یہ صحیح سمجھتے ہیں اور قبر کے بعد اگر خدانخواستہ ہم اپنی بداعمالیوں کے باعث جہنم میں بھیج دیئے گئے تو پھر وہاں قبر سے بھی سخت تر عذاب ہونے پر ہم یقین رکھتے ہیں، تو پھر قبر و آخرت سے بے پروا ہو کر ہمارا غفلت کی زندگی گزارنا اور موت کو بھلا کر یہاں کی چند روزہ خوش عیشیوں میں مست و مگن رہنا خود اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم ہے۔

بزرگو اور عزیزو! جو کچھ کرنا ہے اس زندگی میں کر لو، بلکہ اسی وقت کر لو، معلوم نہیں کس وقت موت کا فرشتہ پیام اجل لے کر آ جائے اور پھر تم کچھ بھی نہ کر سکو ۔۔۔۔ خدا کی قسم یہاں کی جو پوری زندگی ہم نے غفلت سے گزاری اور جس کے دن رات بلکہ جس کے مہینے

اور برس ہم غفلت سے گزارتے چلے جارہے ہیں، وہاں اس کا ایک ایک لمحہ بڑی حسرت سے یاد آئے گا اور پھر اگر ہم چاہیں گے کہ اس غفلت کی تلافی کیلئے ہم کو ایک ہی دن یا تھوڑی ہی دیر کے واسطے پھر دنیا میں بھیج دیا جائے، یا بس دو رکعت یا ایک سجدہ ہی کی مہلت اور دے دی جائے، یا صرف توبہ و استغفار کیلئے ہی صرف ایک لمحہ کے واسطے ہم کو پھر سے دنیوی زندگی بخش دی جائے تو ہم کو اس کا موقع نہ دیا جائے گا، ہم غافلوں اور مجرموں کے لئے وہ وقت بڑی رسوائی اور بڑی حسرت کا ہوگا۔ قرآن پاک میں اس ذلت و حسرت کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے:-

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ۝

یعنی اس دنیا کے مجرم اللہ پاک کے حضور میں اپنی مجرمانہ صورت میں سر افگندہ کھڑے ہوں گے، اور اس وقت بڑی عاجزی اور زاری سے عرض کریں گے کہ خداوندا! اب ہمارے آنکھ کان کھل گئے، ہم نے سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا اور کانوں سے سن لیا، اب بس یہ التجا ہے کہ ہمیں پھر سے دنیا میں بھیج دے، ابکے ہم نیک ہی کام کریں گے اب ہمکو پورا یقین آگیا۔ لیکن چونکہ ان کی یہ درخواست غلط اور بے محل ہوگی، اس لئے نہیں سنی جائے گی۔ اور صاف کہہ دیا جائے گا:

فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

یعنی تم جس طرح دنیا کی بدمستیوں میں گم ہو کر اس دن کی آمد کو بھولے ہوئے تھے اسی طرح آج ہم نے تم کو بھلا دیا، اور نظر انداز کر دیا ہے (یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے) لہذا دنیا میں تم نے جو غفلت کی زندگی گزاری اور ہمارے احکام سے بے پروائی برتی اب اس کے بدلے میں بس عذاب ہی عذاب چکھو اور اپنے کئے کو بھرو۔

اور قرآن مجید ہی میں ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے:

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا

فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ٥ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ٥ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ٥ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ٥

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ

جب ان مجرموں اور خدا فراموشوں پر موت طاری ہوتی ہے اور وہ اپنی بدکرداریوں اور غفلت کیشیوں کے نتائج بد ان کو آنکھوں سے نظر آنے لگتے ہیں تو یہ گڑگڑا کر کہتے ہیں، خداوندا! ذرا مجھے پھر اسی دنیا میں واپس بھیج دے جس کو میں چھوڑ کر آرہا ہوں تاکہ میں اچھے عمل کر لوں ——— لیکن ہرگز ایسا نہ ہوگا، یہ اس کی صرف بکواس ہوگی جو وہ بکے گا۔ قیامت کے دن تک تو وہ عالم برزخ میں گرفتار رہے گا اور وہاں اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھتا رہے گا، پھر جب قیامت کا وقت آئے گا اور صور پھونک دیا جائے گا اور حشر و نشر سے ایک دوسرا عالم برپا کر دیا جائے گا تو اس دن ان کے رشتے ناطے بھی نہ رہیں گے یعنی کوئی عزیز قریب پھر پاس بھی نہ پھٹکے گا اور نہ کوئی بات پوچھے گا، اور بس فیصلہ یوں ہوگا کہ جن کے پلہ میں ایمان اور اعمال صالحہ کا وزن ہوگا وہی نجات پا سکیں گے اور فلاح و کامرانی صرف ان ہی کیلئے ہوگی، اور جن کے پلوں میں یہ وزن نہ ہوگا یعنی جو "ایمان صادق" اور "اعمال صالحہ" کی دولت سے تہی دامن اس دنیا سے گئے ہوں گے وہ وہاں سخت خسارہ میں ہوں گے، ان کیلئے بس تپتا ہوا جہنم ہوگا جس میں وہ پڑے رہیں گے، دوزخ کی آگ ان کے چہروں کو جھلستی ہوگی اور دوزخ میں انکی صورتیں بہت بگڑی ہوئی اور ناقابل دید ہوں گی۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار اعلان کر دیا ہے کہ جس کو جو کچھ کرنا ہو اس دنیا کی زندگی میں کرلے، اس کے بعد کسی کو عمل کی کوئی مہلت ملنی نہیں ہے،

پس اے خدا کے بندو! زندگی کی اس مہلت کو جس کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ کس وقت ہم سے چھین لی جائے غنیمت جانو! اور اس کی قدر و قیمت پہچانو، اگر اب تک غفلت سے دن گزارے ہیں تو اب غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور آخرت کی اس زندگی کیلئے جو حقیقی زندگی ہے، تیاری میں لگ جاؤ،

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ لوگ دنیا اور علائق دنیا سے دست بردار ہو کے اور فقیری کا چولا پہن کے کسی جنگل میں جا بیٹھیں اور گھر بار آل اولاد کو چھوڑ کے بس تسبیح پڑھیں، نہیں نہیں، شریعت کا مطالبہ یہ نہیں ہے، نہ خدا کو راضی کرنے اور اپنی آخرت کو درست کرنے کیلئے اس کی ضرورت ہے اللہ پاک تو ہم سے صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی اور اس کے رسول کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گذاریں، ہمارے دلوں میں ایمان ہو، ہمارے اعمال صالح ہوں، ہم دنیا کے سب ضروری کام کریں لیکن احکام الٰہی کے پابند ہو کر۔

بھائیو! یہ دنیا تو مومن کیلئے بھی ہے اور کافر کیلئے بھی، لیکن فرق یہ ہے کہ مومن احکام الٰہیہ کا پابند رہ کر اس میں تصرف کرتا اور اس کو برتتا ہے اور کافر اس پابندی کے بغیر اس سے پٹتا ہے، تو اللہ کی رضا اور آخرت کی نجات و فلاح حاصل کرنے کیلئے اس کی ضرورت نہیں کہ آپ بالکل "تارک الدنیا" ہو جائیں، بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ دنیا میں آپ جو کچھ کریں اللہ کے قانون کے ماتحت کریں، اور صرف نماز روزہ ہی میں نہیں بلکہ کھانے میں، پینے میں، تجارت اور سوداگری کرنے میں، اپنے چھوٹوں بڑوں اپنے عزیزوں دوستوں، اپنے پڑوسیوں اور عام انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں آپ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایت کا اتباع کریں، اور بس یہی حقیقت ہے "اسلام" کی جس پر نجاتِ اخروی اور رضاءِ الٰہی کا مدار ہے۔

میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ الحمدللہ ایک حد تک ایمان ہم میں ہے لیکن جو کمی ہے (اور یقیناً بہت زیادہ کمی ہے) تو اس کا سبب وہ غفلت ہے جو ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے نہ خدا کی گرفت اور اس کا محاسبہ ہمیں یاد آتا ہے اور نہ آخرت کی فکر کبھی ہمیں بے چین کرتی ہے۔ پس سب سے بڑا اور سب سے پہلا کام ہمارا اس غفلت کو زائل کرنا اور دلوں کو اللہ اور آخرت کی طرف متوجہ کرنا ہے، اور یہ غفلت دور ہو سکتی ہے بس بار بار اپنی موت کو یاد کرنے اور موت کے بعد قبر و حشر اور پھر آخرت میں پیش آنے والے واقعات کا دھیان کرنے سے — بس میں آپ حضرات میں سے ہر ایک سے عرض کروں گا کہ اگر زیادہ نہیں تو دن رات میں کم از کم

ایک وقت وہ ضرور ایسا مقرر کرلیں جس میں پوری یکسوئی کے ساتھ وہ یہ سوچا کریں کہ ایک دن ضرور ہم بھی اسی طرح مرنے والے ہیں جس طرح دوسروں کو مرتا ہوا ہم دیکھتے ہیں، پھر سوچیں کہ وہ وقت کتنا سخت ہوگا، پھر جب مجھے قبر میں اتار دیا جائیگا تو میرا کیا حال ہوگا۔ اس کے بعد قیامت تک کیسے گزرے گی، پھر حساب کتاب کے وقت جب میرے گناہوں کی فہرست میرے سامنے ہوگی اور میرے خلاف میرے ہاتھ پیر تک گواہی دیں گے تو میری کیسی رسوائی ہوگی، اور اگر میں قابل مغفرت نہ ٹھہرا اور جہنم میں مجھے ڈلوا دیا گیا تو وہاں میری کیا گت بنے گی ـــــ اس طرح یہ تصور کرکے اللہ کے خوف کو دل میں پیدا کریں اور اسی کے ساتھ اپنے روزمرہ کے اچھے برے اعمال کا محاسبہ بھی کریں، اس طرح انشاءاللہ چند روز عمل کرنے سے یہ غفلت دور ہوجائے گی اور خدا نے چاہا تو ایک وقت یہ کیفیت ہوجائے گی کہ کہ ہر کام کے وقت دل میں یہ کھٹک پیدا ہونے لگے گی کہ یہ اللہ کو راضی کرنے والا کام ہے یا ناراض کرنے والا کام ہے؟ اور اسی کیفیت کا نام تقویٰ اور خشیۃ اللہ ہے جو ساری سعادتوں کی بنیاد ہے اور یہی "ولایت" کا مقام ہے۔

پھر آپ کو موت سے کوئی وحشت اور اس کے بعد آنے والی منزلوں میں کوئی دکھ اور کوئی اذیت نہ ہوگی بلکہ آپ خوشی اور مسرت کے ساتھ موت کا استقبال کریں گے اور ہر منزل میں اللہ کے فرشتے رضاء الٰہی کی بشارت سنا کر آپ کو مطمئن کریں گے اور مبارکباد دیں گے جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

یعنی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ والوں کو کوئی خوف وخطر نہیں، اور نہ کسی قسم کا رنج وغم ہی ان کو ہوگا، یہ وہ لوگ ہیں جو سچے مومن اور صاحب تقویٰ ہیں، ان کیلئے بشارت ہے حیات دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی،

بعض روایات میں آیا ہے کہ موت کا فرشتہ جب کسی مومن صادق اور عبد صالح کے پاس قبض روح کے لئے آتا ہے تو پہلے ہی اس سے کہہ دیتا ہے لَا تَخَفْ مِمَّا اَنْتَ قَادِمٌ عَلَيْهِ،

(یعنی جس دوسرے عالم میں تم کو اب جانا ہے اس سے ڈرو مت، وہاں تمہارے لئے راحت ہی راحت ہے) تو اس کی ساری وحشت اور سارا ڈر ختم ہو جاتا ہے، پھر فرشتہ اس سے کہتا ہے "لا تحزن علی الدنیا ولا علیٰ اہلہا والبشر بالجنۃ" (یعنی دنیا اور دنیا والے تمہارے اعزہ اور اقارب جو تم سے چھوٹ رہے ہیں ان کا کوئی صدمہ نہ کرو، اور خوش ہو جاؤ کہ دنیا کے بدلے جنت اور اہل دنیا کے بدلے اہل جنت سے اب تمہارا واسطہ رہے گا) تو وہ ہنسی خوشی اس دنیا سے کوچ کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ سے خاص دلی لگاؤ رکھنے والے اس کے مومن صالح بندہ کے پاس موت کا فرشتہ جب آتا ہے تو پہلے اللہ کی طرف سے اس کو سلام پہنچاتا ہے اور کہتا ہے "ربک یقرءک السلام" (یعنی تمہارا رب تعالیٰ تم کو سلام کہتا ہے) ـــــ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ کے فرشتے جب اس قسم کے پیغامات کسی خوش نصیب بندہ کو پہونچاتے ہوں گے تو وہ کس قدر خوش اور مسرور ہوگا اور کیسا ہشاش بشاش اس دنیا سے جاتا ہوگا۔

اور اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کو موت اور مابعد الموت کے متعلق یہ بشارت تو خود قرآن پاک سنا رہا ہے کہ "یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ"۔

حضرات! اللہ کے یہ انعامات اور فرشتوں کی یہ بشارتیں حاصل کرنا ہم میں سے ہر ایک کے لئے ممکن ہے، شرط صرف یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ غفلت کی حالت کو دور کر کے اللہ کی خشیت اور تقویٰ اپنے اندر پیدا کر لیں اور پھر اپنی زندگی اس کی ہدایت کے مطابق گزاریں کسی عارف نے کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو، ہمہ خنداں بدند و تو گریاں،
ہمچنیں زی کہ وقت مردن تو، ہمہ گریاں بدند و تو خنداں

مطلب یہ ہے کہ "تجھے کچھ یاد ہے کہ جس وقت تو نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا تو تیرے سب گھر والے تو شاداں و خنداں تھے مگر تو رو رہا تھا، اب اس دنیا میں اس طرح اللہ

اللہ والوں کی سی زندگی بسر کر کہ جس وقت تو اس دنیا سے کوچ کرنے لگے تو سب تو تیرے لئے روتے ہوں مگر تو خوش و خرم وہشاش بشاش جاتا ہو کہ گویا قید خانہ سے چھوٹ کر اپنے گھر جا رہا ہے"۔

تفسیر ابن جریر میں ایک روایت ہے کہ کسی مومن صادق اور بندۂ صالح کے پاس جب موت کے فرشتے پہونچتے ہیں تو پہلے اس سے کہتے ہیں کہ "ہم تم کو لے چلیں یا اسی دنیا میں چھوڑ دیں؟" ـــــ تو وہ کہتا ہے کیا آپ مجھے پریشانیوں اور مصیبتوں کے اس گھر میں چھوڑنا چاہتے ہیں، "فقدّموني الى الله تعالىٰ" (مجھے جلدی اللہ کی طرف لے چلو)

اور بعض اصحابِ طمانیت کو موت کے وقت اس کی بھی مسرت ہوتی ہے کہ اب ہم اس عالم میں پہونچ جائیں گے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام اور حضرات انبیاء سابقین پہلے تشریف لے جا چکے ہیں اور وہاں انشاء اللہ ان حضرات کی زیارت و ملاقات کی دولت نصیب ہوگی، چنانچہ شفاء قاضی عیاض میں منقول ہے کہ حضرت بلالؓ کی وفات کا جب وقت آیا تو ان کی بیوی کی زبان سے نکلا "واحزناه" (یعنی ہائے کیسے غم کا وقت ہے) حضرت بلالؓ نے فوراً کہا، نہیں نہیں "واطرباه غداً نلقى الاحبة محمداً وحزبه" (بڑی خوشی کا موقع ہے ہم کل انشاء اللہ اپنے گزر جانے والے دوستوں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے جا ملیں گے)

مگر یہ کیفیت اور یہ دولت جب ہی ہم کو حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے کو اس لائق بنائیں ورنہ اگر یونہی ہم غفلت کی زندگی گزارتے رہے اور محاسبہ آخرت سے بے پرواہ ہو کر شیطانی راہوں پر چلتے رہے جو ہمارا عام حال ہے تو ہمارے لئے پھر مصیبت ہی مصیبت اور حسرت ہی حسرت ہوگی۔

ہم میں سے بہت سے اس غلط فہمی میں ہیں کہ زندگی بھر تو خوب عیش کے گلچھرے اڑا لو، جب موت کا وقت آئے گا تو توبہ کر لیں گے، اللہ غفور رحیم ہے ـــــ انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ محض شیطانی وسوسہ ہے، اول تو کسے خبر ہے کہ موت کا جب وقت آئے گا تو توبہ کی مہلت بھی

مل سکے گی؟ ـــ اسکے علاوہ یہ کہ توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کا قانون صاف صاف قرآن پاک میں بیان فرمادیا گیا ہے کہ توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری صرف ان لوگوں کی ہے جو نادانی سے بُرے کام کر بیٹھتے ہیں اور پھر جلدی سے اپنے کئے پر پچھتا کے سچے دل سے توبہ کر لیتے ہیں، لیکن جو لوگ ایسے ڈھیٹ ہیں کہ مدۃ العمر تو بیباکی سے گناہ کرتے رہے اور جب موت سامنے آکھڑی ہوئی تو گڑگڑا کے توبہ کرنے لگے، تو ایسے ناہنجاروں کی توبہ کچھ بھی نہیں ـــ قرآن حکیم نے نہایت واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے:۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ ط

پھر یہ بھی تو کسی کو معلوم نہیں کہ موت میں کتنا وقت باقی ہے، کیا پتہ کہ یہ دن ہی زندگی کا آخری دن اور یہ رات ہی زندگی کی آخری رات ہو، آخر آئے دن ہم اور آپ یہ خبریں سنتے ہی رہتے ہیں کہ فلاں صاحب اچھے خاصے بیٹھے تھے اچانک ہارٹ فیل ہو گیا اور دو منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئے، بہرحال ہر دن بلکہ ہر گھڑی اور ہر لمحہ کو توبہ و استغفار کی آخری مہلت سمجھنا چاہئیے اور جلد سے جلد اللہ پاک سے اپنا معاملہ صاف کر لینا چاہئیے، اب تک جو وقت غفلت میں گزرا اور جو سیاہ کاریاں اس غفلت میں ہم سے ہوئیں اُن کیلئے ٹوٹے ہوئے دل سے اللہ پاک سے معافی مانگی جائے اور آئندہ کیلئے دل کے پورے عزم کے ساتھ اس کی فرمانبرداری کا عہد کیا جائے اور پھر اُس سے مغفرت و رحمت کی امید رکھی جائے ـــ اگر ہماری یہ توبہ، یہ معافی طلبی سچے دل سے ہوگی تو یقیناً وہ ہمارے سارے پچھلے گناہ معاف فرما دے گا، حدیث پاک میں ہے:۔

"التائب من الذنب کمن لا ذنب له" (یعنی گناہ سے سچی توبہ کرنے کے بعد آدمی بالکل بے گناہ سا ہی ہو جاتا ہے)

بلکہ ایک حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ "کیوم ولدته امه" (سچی توبہ کے بعد آدمی گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے دن بے گناہ اس دنیا میں آیا تھا) ـــ اور قرآن پاک کے ایک اشارہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کرنیوالوں کے پہلے گناہ بھی نیکیوں سے بدل دیئے جاتے ہیں۔ سورۂ "فرقان" کی ایک آیت ہے:۔

"اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن خوش نصیبوں نے سچی توبہ کر کے اپنی باقی زندگی "ایمان صادق" اور "عمل صالح" کے ساتھ گزاری تو ان کے گناہوں کو بھی اللہ پاک نیکیوں سے بدل دے گا ۔ اللہ اکبر! کیا ٹھکانا اس رحمت کا !!

لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ بس زبان سے یہ کہہ دینے سے کہ "اللہ میری توبہ ہے" یا "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ" کی تسبیح پڑھ لینے سے آپ ان رحمتوں کے مستحق ہو جائیں گے ، نہیں ہرگز نہیں! توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ غلطیوں اور معصیتوں پر دل پوری طرح نادم و پشیمان ہو اور آئندہ کیلئے دل سے یہ قطعی اور حتمی فیصلہ ہو کہ اب یہ غلطی اور معصیت نہ ہوگی۔

ہاں اگر لغزش بشری سے پھر وہی خطا ہو جائے تو پھر ایسی ہی توبہ کرے ، اللہ پاک بخشنے والا اور رحمت فرمانے والا ہے ۔ بہر حال توبہ کے وقت دل کی ندامت و پشیمانی اور اپنی سابقہ غلط کاریوں پر رنج و ملال اور آئندہ کیلئے گناہوں سے اجتناب کا عزم ضروری ہے ، اس کے بغیر صرف زبان سے ہزار بار بھی توبہ کی جائے تو بے سود ہے ،

خوب یاد رکھئے ! انسان ہر ایک کو فریب دے سکتا ہے اور خود بھی اپنے نفس کے فریب میں مبتلا ہو سکتا ہے ، لیکن اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا ، وہ "علیم بذات الصدور ہے" خوب جانتا ہے کہ آپ کی توبہ اور آپ کی طلب مغفرت صرف زبانی ہے یا دل سے ہے ۔

اب میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں اپنے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی و مغفرت چاہتا ہوں ، اور آپ کیلئے بھی اس سے مغفرت و رحمت کی دعا کرتا ہوں ، آپ بھی اپنے لئے اور میرے لئے اسی کی دعا فرمائیں اور اپنی دعاؤں میں میرے ان مرحوم بھائی کو بھی شریک کریں جن کے دفن کرنے اور خدا کی رحمت کے سپرد کرنے ہی کیلئے ہم آپ اس رات کے وقت یہاں جمع ہیں ۔

(اس کے بعد دعا و استغفار ہی پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا)

Regd. No. 1 LW/NP-62

onthly ALFURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow (U. P.)

l. 45 No. 7 JULY, 1977 Phone : 25547

الفرقان
لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	۱۵/-
پاکستان سے	۲۵/-
بنگلا دیش سے	۱۶/-
فی شمارہ	۱/۵۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے

بحری ڈاک سے	۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے	۴ پونڈ

جلد (۴۵) | بابت اگست ۱۹۷۷ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ | شمارہ (۸)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانا چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ — لاہور

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

محمد منظور نعمانی

["تبلیغی جماعت" اور اُس کے کام سے متعلق بہت مدت پہلے کی خود اپنی ایک گفتگو جو اب تک حافظہ میں محفوظ رہی، مناسب معلوم ہوا کہ اس کو قلم بند کر کے الفرقان کے صفحات میں بھی محفوظ کر دیا جائے۔ انشاء اللہ بندگانِ خدا کے لیے نفع مند ہوگی]

تقریباً ۲۵-۲۶ سال پہلے کی بات ہے، اس وقت راقم سطور کی رہائش لکھنؤ کے محلہ بلوچپورہ میں تھی، مکان کے بالکل برابر میں محلہ کی بارونق اور آباد "صدیقی مسجد" تھی، رمضان مبارک کا مہینہ تھا اور میں اسی مسجد میں معتکف تھا، ایک صبح کو ۹-۱۰ بجے کے قریب محلہ کے ایک بھائی آئے اور انھوں نے کہا کہ "ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کوئی سرکاری آدمی معلوم ہوتے ہیں اور غالباً غیر مسلم ہیں" میں نے کہا اُن سے کہہ دیجیے کہ میں اس وقت باہر نہیں آسکتا اس لیے وہ خود میرے پاس یہیں مسجد میں آجائیں! —— وہ صاحب آگئے اور شریفانہ انداز میں آداب اور مزاج پرسی کے بعد انھوں نے صفائی سے بتلا دیا کہ میرا تعلق حکومت کے محکمہ سی آئی ڈی سے ہے اور اگر آپ اجازت دیں تو مجھے تبلیغی جماعت سے متعلق کچھ باتیں آپ سے دریافت کرنی ہیں[1] —— میں نے اُن سے کہا، آپ بے تکلف

---

[1] اُس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تبلیغی جماعت کے کام میں عملی حصہ لینے کا اور جماعتوں کے ساتھ سفر کرنے کا بھی کچھ زیادہ موقع مل جاتا تھا جس کی وجہ سے باہر کے لوگ راقم سطور کو بھی جماعت کے خواص اور ذمہ داروں میں سمجھتے تھے حالانکہ واقعہ میں میری یہ حیثیت نہیں تھی۔ افسوس ہے کہ بعد میں ضعفِ ہمت اور بعض دوسرے مشاغل کے غالب آجانے کی وجہ سے جماعت کے ساتھ سفروں اور دوسرے عملی کاموں میں بہت کمی آگئی اور اب تو معذوری نے بالکل خانہ نشین ہی کر دیا۔ "یفعل اللہ ما یشاء"

دریافت فرمائیں جو کچھ معلوم ہوگا وہ انشاء اللہ بتلا دوں گا ——— انھوں نے اپنے بیگ سے ایک کاغذ نکالا جس میں انگریزی میں غالباً کچھ سوالات لکھے ہوئے تھے، اور "جماعت" سے متعلق کوئی بات پوچھی، میں نے کہا کہ اس کے علاوہ اور جو کچھ دریافت فرمانا ہو وہ بھی بتلا دیجیے۔ انھوں نے اور دو چار سوال کیے، ——— میں نے کہا کہ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس جماعت کی کچھ تاریخ اور اس کے کام کی خاص نوعیت اور طریقۂ کار پہلے کچھ تفصیل سے آپ کے سامنے بیان کر دوں، اس کو آپ غور اور توجہ سے سن لیں اس کے بعد آپ سوالات کریں۔ اس طرح آپ جوابات کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکیں گے۔

پھر میں نے اپنی معلومات کے مطابق حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا اور میوات کے علاقہ میں جس طرح انھوں نے اس کام کو شروع کیا اور اس کے جو نتائج نکلے اس کا کچھ تذکرہ کیا، پھر تدریجی طور پر دوسرے علاقوں میں جس طرح یہ کام پھیلا اور کام کا طریقہ اور اس کے خاص اصول اور تبلیغی جماعتوں کے سفروں کا مقصد اور ان کا دنوں اور راتوں کا پروگرام اور اُن کے اجتماعات اور ان کی دعوت! ان سب کی اس گفتگو میں اس عاجز نے وضاحت کی ——— اس ضمن میں اس کا بھی ذکر آ گیا کہ تبلیغی جماعت کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ممبر یا رکن ہے نہ صدر یا سکریٹری جیسا اس کا کوئی عہدہ دار ہے، نہ کہیں اس کا دفتر ہے نہ اس کا کوئی رجسٹر ہے جس میں جماعت سے تعلق رکھنے والوں کے نام لکھے جاتے ہوں، نہ اس کا کوئی فنڈ ہے ——— یہ بس ایسی "جماعت" ہے جیسی ہماری مسجدوں میں روزانہ پانچ وقت نماز کی جماعت ہوتی ہے۔

میں نے اپنی یہ بات قریباً ایک گھنٹہ میں پوری کی، وہ صاحب بہت غور سے اور بظاہر بڑی توجہ سے سنتے رہے، اور کچھ نوٹ بھی کرتے رہے ——— اگر میری کوئی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھ سکے تو درمیان ہی میں انھوں نے فرمائش کی کہ یہ بات میں نہیں سمجھ سکا آپ دوبارہ کہہ دیجیے، اور میں برابر اُن کی فرمائش کی تعمیل کرتا رہا ——— اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ اب جو کچھ آپ کو دریافت فرمانا ہو وہ دریافت فرمائیں!

انھوں نے اپنا سوالنامہ ہاتھ میں لیا اور ہر سوال کے سامنے خود ہی اس کا جواب غالباً اشارۃً نوٹ کرنا شروع کیا اور مجھ سے کہا کہ مجھے اپنے سب سوالوں کا جواب مل گیا اور اس کا بھی خود ہی اظہار کیا کہ آپ کی اس وقت کی باتوں سے مجھے بہت روشنی ملی اور میری روح کو بہت کچھ حاصل

ہوا ——— آخر میں انھوں نے کہا مگر ایک بات ایسی ہے کہ میرے دل نے تو مان لیا کہ واقعہ وہی ہوگا جو آپ نے بتلایا ہے لیکن میں اس کے بارہ میں اپنے افسروں کو مطمئن نہیں کر سکوں گا، اور وہ یہ کہ آپ نے بھی بتلایا اور مجھے خود بھی کچھ معلوم تھا کہ تبلیغی جماعت کا کام ملک بھر میں ہو رہا ہے، اسی طرح پاکستان میں بھی ہو رہا ہے اور کئی ایک باہری ملکوں میں بھی ہو رہا ہے ——— اور آپ نے بتایا کہ اس کا کوئی ممبر اور صدر سکریٹری بھی نہیں ہے اور کہیں اس کا دفتر نہیں ہے اور رجسٹر تک نہیں ہے اور فنڈ بھی نہیں ہے اور چندہ بھی نہیں کیا جاتا ہے ——— تو یہ بات کسی کی سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے کہ ان سب چیزوں کے بغیر اتنا بڑا کام کیسے ہو رہا ہے اور کس طرح چل رہا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اُن کی اس بات کا جواب ذہن میں ڈالا ——— میں نے کہا کہ آپ کی یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے اور مجھے امید ہے کہ میری بات سنکر انشاء اللہ آپ اس بارہ میں بھی مطمئن ہو سکیں گے ——— (میں نے کہا) آپ مجھے یہ بتائیے کہ ہندو دھرم کے ماننے والے کہاں کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ سارے ملک میں ہیں اور پاکستان میں بھی ہیں اور برما اور لنکا اور نیپال میں بھی ہیں اور تھوڑے تھوڑے چین جاپان اور یورپ کے ملکوں میں بھی ہیں ——— پھر میں نے کہا کہ اور بدھ مذہب کے ماننے والے کہاں کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں بھی ہیں لیکن زیادہ چین اور جاپان اور برما اور تبت وغیرہ ملکوں میں ہیں ——— پھر میں نے کہا کہ عیسائی مذہب کے ماننے والے کہاں کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ امریکہ اور یورپ کے سب ملکوں میں اور ایشیا اور افریقہ کے بھی سب ہی ملکوں میں اور ساری دنیا میں عیسائی موجود ہیں ——— میں نے کہا اور اسلام کے ماننے والے کن کن ملکوں میں ہیں؟ انھوں نے کہا زیادہ تو عرب ملکوں میں ہیں اور ہندوستان اور پاکستان میں اور تھوڑے بہت دنیا کے سارے ہی ملکوں میں ہیں۔

اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے تاریخ ضرور پڑھی ہوگی، کیا تاریخ اور اتہاس سے اس کا کچھ پتہ چلتا ہے کہ ہندو دھرم کے بانیوں نے یا مہاتما گوتم بدھ یا حضرت عیسیٰؑ نے یا پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اُن کے ابتدائی ساتھیوں اور پیروکاروں نے اپنے دھرم اور دین و مذہب کے پھیلانے کے لیے کوئی پارٹی بنائی تھی یا کوئی انجمن قائم کی تھی جس کے ممبر اور صدر سکریٹری وغیرہ عہدہ دار تھے اور چندہ کے ذریعہ اس کے لیے کوئی فنڈ قائم کیا تھا؟ ——— انھوں نے کہا کہ

نہیں، تاریخ سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی

میں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ جو کام خالص دینی اور مذہبی ہوتے ہیں جن میں دنیا کی لگاوٹ نہیں ہوتی اور جو صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنے کے لیے اور خاص کر مرنے کے بعد نجات اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں، اُن کے لیے باقاعدہ پارٹی یا انجمن بنانے اور ممبر بھرتی کرنے اور چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اُن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اللہ کی طرف اور اُس کے راستہ کی طرف بلایا جاتا ہے، اور جو اس راستہ پر آ جائیں اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح بندگان خدا کو اللہ کی طرف اور اس کے راستہ کی طرف بلاؤ، اور جس حد تک بھی ہو سکے اپنے کو اور اپنی ہر چیز کو اس کے لیے وقف کر دو ـــــ بس اسی طرح کام چلتا اور پھیلتا رہتا ہے۔ اللہ کے پیغمبروں اور ہادیوں نے اسی طرح کام کیا ہے، تبلیغی جماعت کا کام بھی اسی طریقہ پر ہو رہا ہے ـــــ میری یہ بات سن کر ان صاحب نے کہا بس اب میں نے سب کچھ لیا اور میں دوسروں کو بھی سمجھا سکتا ہوں اور مطمئن کر سکتا ہوں۔

اپنا حال

قریباً ہ مہینے پہلے "وفیات نمبر" میں اپنا جو حال لکھا گیا تھا اب بھی وہی حال ہے کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے ـــــ ڈاکٹروں اور سرجنوں کی قریباً متفقہ رائے ہے کہ کولھے کی ہڈی کے جوڑ میں جو نقص پیدا ہو گیا ہے (جس کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہے) اُس کا علاج آپریشن اور ہڈی کی تبدیلی کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے ـــــ اسی کے ساتھ ان میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ آپریشن نہ کرایا جائے بلکہ موجودہ حالت ہی پر قناعت کی جائے، اپنی صرف ناگزیر ضرورتوں ہی کے لیے، بس گھر کے اندر ہی چلا جائے اور کچھ دواؤں کا استعمال جاری رکھا جائے۔

سردست اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اپنی ضروریات کے لیے گھر میں چل پھر لیتا ہوں ـــــ ٹانگ کی تکلیف کے علاوہ کوئی اور تکلیف اور بیماری الحمدللہ اس وقت نہیں ہے۔

قرآن مجید کے ہفتہ وار مقامی درس کا سلسلہ جو علالت ہی کی وجہ سے بہت مدت سے بند تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب پھر جاری ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ حدیث شریف کے درس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے لیکن مرکزی مسجد تک نہ جا سکنے کی وجہ سے اب یہ درس ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب اپنے مکان ہی پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو جاری رکھے اور قبول فرمائے۔

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(سلسلہ)

معارف الحدیث کا یہ سلسلہ عاجز راقم سطور کی علالت کی وجہ سے قریباً ایک سال منقطع رہا، اگرچہ بیماری کا اثر باقی ہے اور ابھی "صاحب فراش" ہی ہوں لیکن الحمدللہ اس قابل ہوگیا ہوں کہ بیٹھ کر لکھ پڑھ لیتا ہوں —— آج بنام خدا ٹوٹے ہوئے اس سلسلہ کو پھر شروع کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ اس کے اتمام و تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور قبول فرمائے۔

اس سلسلہ کی آخری قسط گزشتہ رمضان المبارک سنہ ۹۶ھ (ستمبر سنہ ۷۶ء) کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی، اس میں قرض کے لین دین سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات درج ہوئے تھے اور حسب معمول ان کی تشریح کی گئی تھی ——

اس قسط کا آخری عنوان تھا

"قرض لینے اور ادا کرنے کے بارہ میں آنحضرتؐ کا طرز عمل"

اس عنوان کے تحت صرف ایک حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی سنن ابی داؤد کے حوالہ سے یہ درج کی گئی تھی کہ انھوں نے بیان فرمایا کہ —— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا کچھ قرض تھا، تو جب آپ نے وہ ادا فرمایا تو (میری واجبی رقم سے) زیادہ عنایت فرمایا" —— اس کی تشریح میں یہ شرعی مسئلہ بھی بیان کر دیا گیا تھا کہ مقروض و مدیون اگر قرضہ ادا کرنے کے وقت (بغیر سابقہ شرط کے) صاحب قرض کو اپنی طرف سے بطیب خاطر اس کی اصل رقم سے زیادہ دے تو یہ سود نہ ہوگا بلکہ یہ تبرع اور

احسان کے قبیل سے ہوگا اور ایسا کرنا سنت نبوی ہے ___

آج کی صحبت میں اسی سلسلہ کی دو حدیثیں اور درج کی جا رہی ہیں۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَجُلًا تَقَاضَى رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَغْلَظَ لَهُ فَهَمَّ أَصْحَابُهُ فَقَالَ دَعُوهُ فَإِنَّ بِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا وَاشْتَرُوا لَهُ بَعِيرًا فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ وَقَالُوا لَا نَجِدُ إِلَّا أَفْضَلَ مِنْ سِنِّهِ قَالَ اشْتَرُوهُ فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ فَإِنَّ خَيْرَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً ___ رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے قرضہ کا تقاضا کیا اور سخت کلامی کی تو آپ کے اصحاب کرام نے (جو اُس وقت موجود تھے) اُس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اُن سے فرمایا "اس کو چھوڑ دو کچھ نہ کہو کیونکہ صاحب حق کو کہنے کا حق ہے اور اس کا قرض ادا کرنے کے واسطے ایک اونٹ خرید لاؤ اور اس کو دیدو۔ انھوں نے واپس آکر کہا کہ (اس شخص کا اونٹ جس حیثیت کا تھا اس طرح کا اونٹ نہیں مل رہا ہے) صرف ایسا اونٹ ملتا ہے جو اس کے اونٹ سے زیادہ عمر کا اور زیادہ بڑھیا ہے، آپ نے فرمایا وہی خرید لاؤ اور اس کو وہی دیدو۔ کیونکہ وہ آدمی زیادہ اچھا ہے جو بہتر اور برتر ادا کرے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بلکہ اُس سے پہلے سے عرب میں یہ عام رواج تھا کہ ایک ایک آدمی اپنی ضرورت کے لیے دوسرے آدمی سے اونٹ قرض لے لیتا اور یہ معاملہ روپے پیسے کے حساب سے نہ ہوتا بلکہ یہ طے ہو جاتا کہ اسی عمر اور اسی حیثیت کا دوسرا اونٹ اس کے بدلے مقررہ مدت تک دیدیا جائے گا ___ تو رسول اللہ نے اس رواج کے مطابق کسی وقت کسی شخص سے اونٹ قرض لیا تھا ___ غالباً مقررہ وقت آجانے پر وہ تقاضا کرنے آیا اور اُس نے ادب و تمیز کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا، صحابہ کرام میں سے جو حضرات اُس وقت حاضر و موجود تھے انھوں نے اُس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اس کو کچھ نہ کہو، اس کا ہم پر حق ہے اور صاحب حق کو سخت سست کہنے کا حق ہے ___ ہاں تم یہ کرو کہ جس عمر کا اور جس حیثیت کا اس شخص کا اونٹ تھا ویسا ہی خرید کر لا دو اور اس کو ادا کر دو ___ صحابہ کرام نے ویسا اونٹ تلاش کیا،

کہیں نہیں ملا ہاں عمر اور حیثیت کے لحاظ سے اُس سے بڑا اور بڑھیا اونٹ مل رہا تھا۔ انھوں نے واپس آکر حضور سے یہی عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ جو بڑا اور بڑھیا مل رہا ہے وہی خرید لاؤ اور اس کو وہی دیدو ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ جو آدمی زیادہ بہتر اور برتر ادا کرتا ہے وہی زیادہ اچھا ہے۔ اس حدیث میں امت کے لیے جو سبق ہے وہ کسی وضاحت اور تشریح کا محتاج نہیں۔

کسی ذریعہ سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ شخص جس کا اس حدیث میں ذکر ہے اور جس نے تقاضا کرنے میں ادب و تمیز کے خلاف رویہ اختیار کیا تھا، کون تھا، غالب گمان یہی ہے کہ کوئی غیر مسلم یہودی وغیرہ ہوگا ——— اس سلسلہ معارف الحدیث میں (اُس حدیث کی تشریح میں جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ کی زرہ مبارک ۳۰ صاع جَو کے عوض ایک یہودی کے یہاں رہن رکھی ہوئی تھی) تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں وغیرہ غیر مسلموں سے بھی قرض لے لیتے تھے اور وہیں اس کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي رَبِيعَةَ قَالَ اِسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعِينَ أَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ إِلَيَّ وَقَالَ بَارَكَ اللّٰهُ تَعَالَى فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ

رواہ النسائی

حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چالیس ہزار قرض لیا، پھر آپ کے پاس سرمایہ آگیا تو آپ نے مجھے عطا فرما دیا اور ساتھ ہی مجھے دعا دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اہل و عیال اور مال میں برکت دے ——— قرض کا بدلہ یہ ہے کہ ادا کیا جائے اور قرض دینے والے کی تعریف اور شکریہ ادا کیا جائے۔ (سنن نسائی)

(تشریح) ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرض بھی لیتے تھے اور ادائیگی کے وقت ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے اصول پر حق واجب سے زیادہ اور بہتر ادا فرماتے تھے اور دعائے خیر سے بھی نوازتے تھے ——— آخری حدیث میں چالیس ہزار قرض لینے کا ذکر ہے۔ بظاہر اس سے مراد چالیس ہزار درہم ہیں ——— اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات آپ بڑی بڑی رقمیں بھی

قرض لیتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسے قرضے آپ جہاد وغیرہ دینی مہمات ہی کے لیے لیتے ہوں گے ورنہ آپ اور آپ کے اہل وعیال کی معیشت کا حال تو یہ تھا کہ بقول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کبھی دو دن متواتر پیٹ بھر کے جَو کی روٹی بھی نہیں کھائی اور بسا اوقات فاقوں کی نوبت آتی تھی اور مہینوں گھر میں چولھا گرم نہیں ہوتا تھا، صرف پانی اور کھجور پر گزارہ ہوتا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

(تلخیص مکاتیب رشیدیہ)

مولانا حافظ عبد الرحمٰن مغسر امروہیؒ[1] کے نام

از بندہ رشید احمد عفی عنہ، عنایت فرمائے بندہ حافظ عبد الرحمٰن صاحب مد فیوضہم بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ کل آپ کا خط پہونچا۔ فوتِ زوجہ[2] محترمہ کا قصہ دریافت ہو کر سخت تاسف ہوا۔ اول

---

[1] مولانا حافظ عبد الرحمٰن مغسر امروہیؒ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ آپ کے اجداد میں ہیں۔ آپ کا آبائی وطن سندیلہ تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا عنایت اللہ مرحوم بمبئی میں مقیم تھے، وہیں آپ تولد ہوئے۔ عالم طفولیت میں اپنے بہنوئی کے پاس مکہ میں رہے۔ وہیں قرآن مجید حفظ کیا۔ وہاں اس عہد طفولیت میں بھی شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع ملا۔ مکہ معظمہ سے واپس آئے تو مدرسہ دیوبند میں داخلہ لیا۔ وہاں دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ حضرت قاسم العلوم والمعارف مولانا نانوتویؒ سے جامع ترمذی پڑھی۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات ۱۲۹۷ھ تک دیوبند میں رہے۔ پھر مراد آباد تشریف لے آئے اور حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ سے جو اس وقت مدرسہ شاہی مراد آباد کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے، استفادہ کیا اور اکثر کتب صحاح ستہ پڑھیں۔ بعدہ حضرت محدث گنگوہیؒ کے حلقہ درس میں داخل ہو گئے۔ حضرت محدث گنگوہیؒ نے غالباً ۱۳۰۱ھ میں دورۂ حدیث کا ایک خاص نظام قائم فرمایا تھا۔ اس سلسلے کے سب سے پہلے دورہ حدیث کے شرکاء میں ایک آپ بھی تھے۔ الغرض قاسمی و رشیدی علوم

---

[2] ۱۳۰۲ھ میں آپ کی ان زوجہ محترمہ کا انتقال ہوا۔

خانہ ویرانی پیر اسی موافق مزاج کی مفارقت .... سو یہ مصائب، تقدیری ہیں۔ اگرچہ بندے
کو مخالف طبع ہونے کے سبب سے ناگوار ہوتے ہیں مگر بقولہ انا ارحم لعبدی الخ ان سب تکالیف
کو نوش و شیریں جاننا اور عین مصلحت و حکمت سمجھنا لازم ہے اور نشان ایمان کا ہے۔ اگر بندۂ عاجز و مجبور کہ
کسی ذرہ تقدیر خداوندی برابر امر کا مختار نہیں، جزع و فزع کرے اور ناشکری اور شکوہ کرے تو کیا سود
(فائدہ) ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اپنے اوقات کو ضائع کرے اور عبث اپنے اجر کو گھٹا دے۔ اور
حق تعالیٰ نے صابرین کے درجات جو فرمائے ہیں ان سے حرماں (محرومی) حاصل کرے۔ بس ایسے وقت میں صبر
کرے اور سب کام اپنے اور جملہ مخالف و موافق طبع اپنے کو اپنے پروردگار ارحم کے سپرد کر کے یقین کرے
کہ یہی اس بندے کے حق میں مناسب تھا اور بتکلف شاداں و فرحاں اپنے آپ کو بنا دے کیوں کہ بندۂ
ناعاقبت داں مثل صغیر ولد بے تمیز کے ہے کہ وہ بھلے برے سے واقف نہیں۔ اگر اس کا پدر شفیق اس کی
تربیت میں عمل حجامت و حلق مُو وغیرہ کرتا ہے تو لاریب، ناگوار طبع صغیر ہے اور شور و غوغا و گریہ و زاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

معارف سے حظ کامل حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت محدث امروہیؒ سے بھی سند فراغ حاصل ہوئی۔ قاسم العلوم حضرت
مولانا نانوتویؒ اور حضرت محدث گنگوہیؒ سے بیعت کا تعلق تھا۔ خلافت حضرت حاجی امداد اللہ نور اللہ مرقدہ سے حاصل
ہوئی۔ کچھ کم ستر سال درس دیا۔ بمبئی، پونا اور مرادآباد کے مدارس اسلامیہ میں درس دینے کے بعد ۱۳۲۱ھ میں بعد وفات
حضرت محدث امروہیؒ امروہہ تشریف لائے اور مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں اپنے استاذ کی مسند درس پر بیٹھ کر
ہزاروں تشنگانِ علوم کو سیراب کیا۔ درمیان میں کچھ عرصہ مدرسہ ریاست ہنڈ ہوا اور مدرسہ ڈابھیل سے بھی تعلق ہو گیا تھا
آپ نے ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۶۰ھ کو امروہہ میں وصال فرمایا اور احاطۂ جامع مسجد امروہہ کے اندر اپنے استاد معظم حضرت
محدث امروہیؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر ہوئی۔ بیضاوی شریف کامل کا حاشیہ اور مختصر المعانی
و مطول کے حواشی آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کو فہم قرآن میں امتیاز خاص حاصل تھا ـــــ آپ کے نام آئے ہوئے مکاتیب
رشیدیہ میں سے چند غیر مطبوعہ مکاتیب "نظام کانپور" کے "تصوف نمبر" میں معروف نوٹ شائع کرا چکا ہوں۔ یہاں صرف چار
مکتوب بغرض افادہ پیش کرتا ہوں۔ یہ مکتوبات مجھے حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صدیقی مفسر امروہیؒ کے چھوٹے
صاحبزادے مولانا عبدالمومن صاحب سے حاصل ہوئے تھے ـــ احقر نے آپ پر ایک مستقل مقالہ لکھ کر رسالہ "دارالعلوم دیوبند"
بابت ۱۳۷۰ھ کی دو قسطوں میں شائع کرا دیا تھا۔ تذکرۃ الکرام اور نزہۃ الخواطر جلد ۸ میں بھی آپ کے حالات درج ہیں۔

کرتا ہے مگر عین مصلحت، صغیر کی اس میں ہے۔

پس بندہ زیادہ صغیر سے نادانقت، اور حق تعالیٰ بہت سے بہت زیادہ ارحم، والدین سے ـــــ پھر کس طرح عاقل، فعل حکیم ارحم کو ناگوار جانے۔ بلکہ اگر اس کو اس کے انجام و حقیقت سے اطلاع ہو جاوے تو نہایت شاداں ہووے۔ لیکن چونکہ اس کو اس کے مصالح بھی معلوم نہیں تو لا اقل (کم سے کم یہ ہو) کہ اپنے عقیدے کو درست کر کے بتکلف اپنے نفس کو اس پر لاوے کہ صبر کرے اور شکر نہ دکھ، شکوہ اور کفران نعمت ـــــ پس آپ بفضلہ تعالیٰ عاقل، ہوشیار اور ذکی الطبع عالم ہیں آپ سے یہی امید ہے کہ نہایت صبر کر کے اس مضمون کو پیش نظر رکھ کر شکر فرماویں گے اور حق تعالیٰ سے مکافاتِ ظاہری اپنے مصائب کی چاہیں گے تو حکم ہے لئن شکرتم لازیدنکم۔ الآیۃ

بعد اس کے یہ اظہار ہے کہ بندے نے اس مرحومہ کو ثوابِ قرآن و ذکر بھی پہونچایا ہے اور دعا مغفرت کی بھی کی ہے۔ حق تعالیٰ اس کو بخشے اور ظنِ غالب، مغفرت کا ہی ہے کہ وعدہ صادق، مخبر صادق کا (یہ) ہے کہ جس نے فرائض ادا کیے اور طاعت زوج کی، وہ داخلِ جنت ہووے گی۔ علی ہذا رضا، جوار موجبِ دخولِ جنت ہے .... اور ایصالِ ثوابِ قطعی، ثوابِ مالی ہے اور بدنی بھی علی الراجح موصول ہوتا ہے .... مولوی عبدالکریم صاحب[1] و حافظ مسعود احمد[2] و عزیز الرحمٰن[3] وغیرہم کی طرف سے بھی بعد سلام مسنون یہ ہی مضمونِ تعزیت مرقوم ہے ـــــ فقط والسلام

عنایت فرمائے بندہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب سلمہ مطالعہ فرمایند ـــــ آپ کا خط آیا، حال معلوم ہوا۔ بندہ اس مرحومہ کے واسطے دعا کرتا ہے اور کچھ پڑھ کر ثواب بھی پہونچایا ہے، اور ظنِ غالب حق تعالیٰ کے کرم سے اس کی نجات و مغفرت کا ہے۔

جو لوگ بدوں دیکھے بیعت، بندے سے چاہتے ہیں نہ معلوم کہ کیا سمجھتے ہیں۔ مگر خیر چونکہ

---

[1] مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی حضرت محدث گنگوہیؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے (تذکرۃ الرشید جلد اول)

[2] حضرت گنگوہیؒ کے صاحبزادے [3] حضرت گنگوہی کے بھانجے۔ (تذکرۃ الرشید جلد اول)

ان کی خواہش ہے ان کے حسن ظن کی وجہ سے بیعت ان کی قبول کرتا ہوں اور داخل سلسلہ کر لیتا ہوں۔ بایں شرط کہ اتباع سنت کا رکھیں اور اجتناب بدعات سے کرتے رہیں، صوم و صلوٰۃ اور زکوٰۃ و حج بشرط وجوب ادا کریں اور موافق شرع شریف کے عمل درآمد رکھیں۔ حق تعالیٰ ان کو اور بندے کو اپنے فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت میں حشر فرمادے اور ان کے زمرۂ خاص میں جائے خاص عطا فرمائے۔ آمین

آمدنی وقف مسجد کی کہ اس مسجد میں اس کی ضرورت نہیں اور نہ آئندہ کو حاجت معلوم ہوتی ہے، اقرب مسجد میں کہ حاجت مند ہو اور وہاں ضرورت ہو صرف کریں۔ مدرسہ وغیرہ میں صرف نہ کریں۔ اگرچہ بعض علماء مطلقاً منع لکھتے ہیں مگر بضرورت دوسری مسجد میں صرف کرنے کو متاخرین حنفیہ نے جائز لکھا ہے کیونکہ اگر اس دوسری مسجد میں صرف نہ ہووے گا تو ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ میرا سلام مسنون سب صاحبوں کی خدمت میں پہونچا دیں اور جو جو داخل سلسلہ ہوئے ہیں ان کو بھی ــــــ دو آپ کو مولوی عبدالکریم صاحب اور حافظ مسعود احمد سلام مسنون کہتے ہیں، ابوالنصر بھی ــــــ

از بندۂ رشید احمد عفی عنہ، مولوی عبدالرحمٰن صاحب سلمہ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند ــــــ

آپ کا خط آیا۔ حال دریافت ہوا۔ ترک شغل پر رنج تو نہیں ہوتا بلکہ افسوس ہوتا ہے اور معذور بھی آپ کو جانتا ہوں۔ اولاً درس کا شغل مانع ہے اور دوسرے بندہ خود اس میں کوتاہی کرتا ہے تو پھر آپ میں اثر ہے تو اپنا ہی اثر ہے لہذا آپ کو معذور جانتا ہوں۔ البتہ جیسا اپنی کوتاہی پر تاسف ہوتا ہے اپنے دوستوں کی کوتاہی پر بھی تاسف ہوتا ہے مگر اب اس پہلے ہی شغل لطائف کو کرتے رہو، مضائقہ نہیں۔ اگر سلطان الذکر کا شغل نہ ہوا نہ ہو۔ فقط

...... حاجی محمد اکبر صاحب[1]، مرزا صاحب[2]، مولوی محمد حسن صاحب (منگلوری)[3]، مولوی محمد حسن (نواب پوری)[4] اور دیگر جملہ احباب کو سلام مسنون پہونچے۔

---

[1] حضرت گنگوہیؒ کے ماموں زاد بھائی۔ [2] حاجی محمد اکبر مرادآبادیؒ ـ پنجابی برادری کے ایک سربرآوردہ بزرگ تھے۔ [3] شاہی مراد آباد کے انتظامی امور میں حصہ لیتے تھے۔ [4] مرزا صاحبؒ بھی حضرت گنگوہیؒ سے تعلق رکھنے والے مراد آباد کے ایک بزرگ تھے [3-4] یہ دونوں بزرگ مراد آباد کے ساکن تھے۔ دونوں کا تعلق حضرت گنگوہیؒ سے تھا۔ دونوں کے محلوں

(منگلور اور نواب پورہ) کی نسبت سے ان میں فصل کیا جاتا تھا۔ ان میں سے مولانا محمد حسن مرادآبادی منگلوری آخر میں بھوپال

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ، مولوی عبدالرحمٰن صاحب سلمہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج ۲۷ رمضان کو روز یک شنبہ ہے آپ کا خط آیا تھا۔ تامل رہا کہ تم کون سے عبدالرحمٰن ہو۔ مگر دینہ کی قربت .... سے اہل بمبئی کو ظن غالب سے قرار دیا ہے بہرحال اگر وہی ہو یا کوئی اور ہو جواب مسئلہ تو ضرور لکھنا ہے۔

مکانات کرایہ کے مالِ تجارت نہیں ہوتے پس اس کا کرایہ خواہ کسی قدر آوے جب بعد قبض کے قدر نصاب ہو کر حولان حول ہو جاوے اور وہ باقی رہے تو اس کرایہ کے روپے میں زکوٰۃ ہووے گی اور جو روپیہ قبل حول کے اس نے تعمیر مکانات میں صرف کر دیا۔ اگرچہ وہ مکانات مشتغل ہی ہیں مگر اس صرف شدہ روپے پر زکوٰۃ نہیں آوے گی اس واسطے کہ وہ صرف ہو گیا، باقی نہیں رہا اور جو کچھ اس کی لاگت سے بنایا ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں کیوں کہ مشتغل تجارت کا (مال) نہیں ہوتا۔

اگر کوئی اور مسئلہ پیش آوے گا، دو چار سال میں تو البتہ خط پھر بھی لکھو گے ورنہ خیر ——

یہ نہیں کہتا ہوں کہ خط لکھا کرو مگر چھ ماہ یا کم زیادہ میں اگر خیریت معلوم ہو جاوے تو بہتر ہے۔ اگرچہ جواب کا وعدہ نہیں کرتا ہوں۔ باقی تمھارے ہم درس سو وہ کیوں بیٹھے رہتے۔ جب سے دو تین دفعہ آدمی جالیے اب شعبان کی بائیسویں کو صحاح ستہ کا یہ جو تھا دور تمام ہوا پہلے دور میں تم تھے اور حافظ احمد[1] و حبیب الرحمٰن دیوبندی[2] و جمیل الدین[3] کا (بھی) پہلا دور تھا اور یہ جو تھا تمام ہوا۔ بسبب امراض کے کہ وسط سال سوم میں واقع ہوئے اور دیگر عوارض کے دسبب) (اس سال) شعبان پر ختم دورہ ہوا۔ ورنہ ربیع الثانی پر ختم ہوتا تھا۔ فقط والسلام۔ حافظ مسعود احمد گنگوہ ہیں۔ بخیریت ہیں۔ سلام ان کا پہونچے۔ مولوی عزیز الرحمٰن کا بھی سلام پہونچے۔

---

[1] مولانا حافظ محمد احمد ابن حضرت قاسم العلوم والمعارف رحمہما اللہ

[2] حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

[3] مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی جو حکیم اجمل خاں مرحوم کے استاد تھے۔

حافظ اللہ دیہ کاندھلویؒ کے نام[۵]

بخدمت حافظ اللہ دیہ صاحب سلمہ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند ـــــ

آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ یہاں کی کیفیت سنو

کہ مسعود و محمود ماہ شعبان سے مبتلائے بخار ہیں۔ گاہ نہایت شدت کا و گاہ تخفیف، اور رمضان میں چند روز کو کچھ صحت بھی ہوگئی تھی، مگر اب تک بیمار ہیں۔ پڑھنا لکھنا سب فوت ہوا۔ اور ان کی والدہ ماہ شوال سے مبتلائے بخار ہے۔ اور بندہ کو رمضان میں اور کچھ شوال میں تو بخار خفیف تھا، مگر نصف شوال سے لرزہ و بخار اور خارش خشک ہے۔ صحت تو نہیں مگر جو کچھ ہے، شکر ہے۔ کیوں کہ اس قدر نہیں کہ (ہم) از خود رفتہ ہوگئے ہوں۔ جو کچھ مصلحت ہمارے حق میں ہے۔ وہی عین اصلاح ہے۔

پسر مسعود اس ہی بخار میں فوت ہوگیا اور میرے چچا حسین علی بھی ۱۸ رمضان کو بخار میں فوت ہوئے اور دیگر چند عزیز اہل قرابت کے فرزند تلف ہوئے۔ ہنوز وبا باقی ہے۔ قریب ساڑھے تین سو کے مر چکے ہیں آئندہ نہ معلوم کس قدر موت باقی ہے۔ مولوی محمد قاسم صاحب اب تندرست ہیں۔ محرم میں وہ بیمار ہوئے تھے، جب بندہ وہاں گیا تھا، اور اس کے بعد چند دورے قے و کھانسی و نزلہ کے ہوئے مگر اب صحت ہے۔

---

[۵] حافظ اللہ دیہ بیگ کاندھلہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اولاً حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہوئے۔ حاجی صاحب کی وفات کے بعد حضرت محدث گنگوہیؒ سے تعلق بیعت قائم کیا۔ آخر میں حضرت گنگوہیؒ کے مجاز بھی ہوگئے تھے۔ (ماخوذ از تبرکات مرتبہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی)

[۶] مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سلمہ نے حافظ اللہ دیہ کے نام آئے ہوئے یہ دو مکتوب گرامی مجھے بھیجے ہیں جو نادر اور غیر مطبوعہ ہیں، اور وہ ان کی مرتبہ کی ہوئی کتاب تبرکات میں اس وجہ سے شامل نہ ہوسکے تھے کہ بروقت ترتیب حاصل نہیں ہوئے تھے۔ ان میں ایک خط فارسی میں ہے اس کی اصل اور ترجمہ دونوں شائع کیے جارہے ہیں۔ اردو والا خط حضرت نانوتویؒ کی وفات سے پہلے کا ہے۔ غالباً فارسی خط بھی قدیم ہے۔

دل لگا ہے سنے ذکر یں، شکر کرتا ہوں، اور اپنے واسطے بھی اس دولت کو طلب کرتا ہوں، اگر نصیب ہو جاوے۔ ذکر نفی واثبات اور اسم ذات میں سے جس میں زیادہ دل لگے، اس کو جلسۂ صبح میں کرتے رہیے، اگر بارہ تسبیح سے شب میں فراغت ہو جاوے، قرآن شریف کو پڑھے جاؤ، اور استغفار کر کے شروع کرو، جب تمھاری سعی کامل ہووے گی اور پھر بھی بھول جاؤ گے تو تم پر کچھ نقصان نہ ہووے گا اگر جلد اچھا پڑھا جاوے جلد پڑھو، جو آہستہ میں اچھا پڑھا جاوے آہستہ پڑھو۔

حکیم صاحب کی خبر آخر ذی قعدہ میں آنے کی ہے، مگر ہنوز محقق نہیں ——— کہ بھوپال میں بھی بیماری ہو گئی۔ فقط۔ جملہ احباب کو سلام مسنون فرما دیویں۔

اور یہاں کے سب لوگوں کی طرف سے سلام ہو پہنچے۔ کوئی شخص یہاں بخار سے نہیں چھوٹا بعض کو صحت ہو گئی اور بعض ہنوز مبتلا ہیں۔ بس ایک ایک نام کہاں تک لکھوں کہ خط لکھنا بھی دشوار ہے۔ حافظ الٰہی بخشؒ کو بھی سلام ہو پہنچے۔

؎ حافظ الٰہی بخش دہلویؒ ——— ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی سے کاندھلہ آ گئے تھے۔ کاندھلہ میں آخوں جی کی مسجد میں قیام کیا۔ حافظ الٰہی بخش، حاجی امداد اللہ صاحب کے خاص متوسلین میں شمار ہوتے تھے۔ حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ حاجی صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"مجموعہ ارشاد الطالبین کہ فارغ بود بدست حافظ الٰہی بخش دہلوی و کریم بخش سہارنپوری کہ حامل رقعہ اند فرستادہ آمد۔" (امداد المشتاق ص۳۵۲)

حافظ صاحب نے ساری عمر قرآن پاک کی تعلیم و تعلم میں گذاری۔ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی دہلوی کے نانا حضرت مولانا رؤف الحسن کاندھلوی نے ان ہی سے قرآن شریف پڑھا تھا۔ حافظ صاحب نے طویل عمر پا کر سنہ [illegible] میں کاندھلہ میں وفات پائی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میاں الٰہی بخش کے انتقال سے رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ بخشے۔ ہمارے پرانے یار تھے۔ اللہ تعالیٰ جنت میں مقام عالی نصیب کرے۔" (بیاض یعقوبی)

(ماخوذ از تبرکات ص۳۹-۴۰ مرتبہ مولانا نور الحسن کاندھلوی)

حافظ صاحب کرم، حافظ اللہ دیا صاحب دام شوقکم باللہ تعالیٰ۔

از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــــــــ

مشہود آنکہ درین جا خیریت است، و صحت ایشان مطلوب۔ امروز سہ شنبہ خط ایشان رسید، مافیہا دریافت۔ حق تعالیٰ بزودی ایشان را از مخمصۂ دنیاوی نجات دہد۔ نوشتہ اند کہ در بعض امور مشاورہ ضرور است۔ اگر حرج نباشد تکلیف کردہ بیایند۔ این بندہ ہم مشتاق ملاقات است۔ و اگر حرج بود چندے دیگر صبر سازند۔ بنظر رو تصدیق، ضرورت مشورہ بود۔ اکنون ہر گونہ کہ ہست تصدیق کنانند و بعد ازیں ہر چہ خواہد بود، خواہد بود۔ مگر ایں امر ملحوظ دارند کہ حاص حق غیر را ضرر و ترک سازند، و در مشکوک وہم نسازند۔ و بعد تصدیق قبل رفتن منظور نگر اگر مہلت می شود بگنگوہ بیایند۔ و اگر مہلت نبود از آں جا ہم فارغ بودہ قصد سازند۔ ایں قصہ پاک کردن است، و اگر ضرورت مشورہ باشد، ہر وقت کہ خواہند بیایند۔ از طرف بندہ ہر گونہ مختار و اجازت دارند۔ و تا ہنوز خط از عرب نیامد بسیار انتظار است۔ و بے خبری تو حشت کہ نوشتہ اند موجب تردد شد۔ گمان می شود کہ حضرت ہم مدینہ منورہ رفتہ باشند۔ و اگر بعد ازیں خطے رسید ضرور اطلاع خواہم کرد۔ فقط

حافظ عبدالرحمٰن سلام علیک می رسانند و محمد حسین خاں ہم و پیر بخش و محمد بخش وغیرہ۔ دریں جا بہمہ وجود خیریت است۔ قصد تحریر خط برائے روانگی ڈاک بود۔ حامل ہذا صباح قصد کانند ہلہ می داشت۔ این وقت عشا از رفتہ بدلت اومی رسانم در آنجا۔ خدمت مولوی نورالحسن صاحب و میر رستم علی صاحب و مولوی مسعود علی صاحب۔ و دیگر ہر کہ خواہند سلام علیک رسانند۔

(ترجمہ مکتوب فارسی)

حافظ صاحب کرم، حافظ اللہ دیہ صاحب۔ دام شوقکم باللہ تعالیٰ

از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــــــــ

مشہود آنکہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی صحت مطلوب ہے۔ آج منگل کے دن آپ کا خط پہنچا اس کے مضمون سے آگاہی ہوئی حق تعالیٰ آپ کو مخمصۂ دنیا سے جلد نجات دے۔ آپ نے لکھا ہے کہ بعض امور میں مجھ سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ اگر حرج نہ ہو تو یہاں (گنگوہ) آنے کی زحمت برداشت کریں۔ بندہ بھی مشتاق ملاقات ہے۔ اگر کوئی حرج

ہو تو کچھ دن اور صبر کریں۔ مگر یہ بات ضرور ملحوظ رکھیں کہ خالص غیر کے حق کو چھوڑ دیں اور شک کے اندر وہم نہ کریں۔ تصدیق کے بعد مظفر نگر جانے سے پہلے اگر مہلت ہو تو گنگوہ آئیں۔ اگر مہلت نہ ہو تو مظفر نگر سے فارغ ہو کر یہاں کا قصد کریں۔ غرض کہ اس قصہ کو ختم کرنا ہے اور اگر ضرورت مشورہ ہو تو جس وقت بھی چاہے آئیں۔ بندہ کی طرف سے ہر طرح آپ کو اختیار ہے اور اجازت ہے۔ ابھی تک عرب سے خط نہیں آیا۔ بہت انتظار ہے۔ آپ نے جو وحشت خبریں لکھی ہیں ان سے فکر و تردد ہوا۔ گمان ہوتا ہے کہ حضرت الحاجی امداد اللہ (مہاجر مکیؒ) بھی مدینہ منورہ چلے گئے ہوں گے۔ اگر اس کے بعد (عرب سے) کوئی خط پہونچا تو میں آپ کو ضرور اطلاع دوں گا۔ حافظ عبدالرحمٰن[1] سلام مسنون پیش کہتے ہیں اور محمد حسین خاں و پیر جی محمد بخش بھی ——— یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ بذریعہ ڈاک خط لکھ کر بھیجنے کا ارادہ تھا مگر حامل رقعہ علی الصباح کاندھلہ جانے کا قصد رکھتا تھا اس لیے بہ عجلت اسی وقت لکھ کر اس کے ہاتھ بھیج رہا ہوں کاندھلہ میں مولوی نور الحسن[2] صاحب، میر رستم علی صاحب، مولوی سعادت علی صاحب اور ان کے علاوہ جس کسی کو چاہیں سلام پہونچا دیں۔

---

[1] حافظ عبدالرحمٰن صاحب پورب کے رہنے والے تھے مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا نور الحسن کاندھلوی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ حدیث کی تکمیل حضرت مولانا گنگوہیؒ سے کی۔ بعد فراغت تعلیم حضرت ممدوحؒ سے بیعت ہوئے اور استفادہ باطنی کیا۔ اور چند روز میں صاحب نسبت ہو گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے ان کو اجازت بیعت عطا فرمائی تھی۔ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب نے آپ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ گنگوہ میں وفات پائی۔

(تبرکات بحوالہ تذکرۃ الرشید)

[2] مولانا نور الحسن کاندھلوی —— آپ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے پوتے اور مولانا ابوالحسن صاحب کاندھلوی کے صاحبزادے تھے۔ ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم والد بزرگوار اور دادا سے حاصل کی۔ ۱۲۴۵ھ میں بغرض تعلیم دہلی آ گئے۔ وہاں دہلی کالج میں نور الانوار وغیرہ پڑھتے تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادیؒ اور مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد بھی مولانا سے پڑھتے رہے۔ حضرت مولانا محمد اسحٰق نے جس سال مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی غالباً اسی سال آپ نے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے دہلی اور آگرہ میں آپ سے تعلیم حاصل کی تھی آپ نے بہت سی تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ ۱۱ محرم ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی اور مفتی الٰہی بخش کے پائیں کاندھلہ میں دفن ہوئے۔

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی دامت فیوضہم

مکتوب تسکین

زندگی سے بیزاری کیوں

[حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ (جو پہلے عارفی ثم کراچوی) دامت فیوضہم، حکیم الامۃ حضرت مرشد تھانوی قدس سرہ کے اُن اکابر خلفاء میں سے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت مرشد کی ارشادی خصوصیات کو خوب خوب جذب کیا —— ممدوح نے اپنے ایک مسترشد کے خط کے جواب میں (جنہوں نے مصائب و مشکلات اور پریشانیوں کی وجہ سے "زندگی سے بیزاری" کا اظہار کیا تھا) ایک مفصل مکتوب تحریر فرمایا تھا۔

آج کی دنیا میں اچھے خاصے دینداروں بلکہ اصحاب علم و فضل میں بھی لاکھوں اس حال میں ہیں جو مختلف قسم کی بیرونی تکلیفوں اور پریشانیوں کی وجہ سے زندگی کو ایک مصیبت اور بلا سمجھتے ہیں اور یہ بات ان کی زبانوں پر بھی آتی رہتی ہے۔ ایسے سب حضرات کے لیے یہ مکتوب بلا شبہ اکسیر کا [illegible] رکھتا ہے۔

یہ مکتوب ماہنامہ "البلاغ کراچی" میں شائع ہوا تھا۔ ادارہ "البلاغ" کے شکریہ کے ساتھ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا حق ہے کہ زیادہ سے زیادہ بندگان خدا تک پہنچایا جائے]

محب محترم۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

الحمد للہ بہتر ہوں آنکھ کا حال بھی بہتر ہے۔ نزدیک و دور کا چشمہ مل گیا ہے لیکن ابھی لکھنے پڑھنے کی نہ صلاحیت ہے نہ اجازت ہے صحت و طاقت جو بہت گر گئی تھی الحمد للہ اب رفتہ رفتہ عود کر رہی ہے

گو اب بھی کافی اضمحلال ہے مگر مشاغل دیرینہ کے تقاضے بھی عود کر رہے ہیں اور بقدر ہمت ان کا حق ادا کرنا شروع کر دیا ہے، دعا فرماتے رہیں ——— آپ نے پچھلے خطوط میں بھی اور اس خط میں بھی پھر اس بات کی تکرار فرمائی ہے کہ "زندہ ہوں مگر زندگی سے بیزار ہوں، نیز یہ کہ شاد باید زیستن تا ناشاد باید زیستن"

آپ کا یہ انقباض زندگی میرے مذاقِ حیات پر ہمیشہ گراں گزرتا ہے، اس کے متعلق پہلے خطوط میں اظہار خیال کر بھی چکا ہوں۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر یہ ایام زندگی شاق ہیں تو پھر اس کا تدارک کیا ہے؟ اگر "شاد باید زیستن" اپنے اختیار میں نہیں تو ——— "ناشاد باید زیستن" بھی اپنے اختیار میں نہیں ہے ؎

مرگِ بے ہنگام فانی وجہ تسکیں ہو چکی

زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں آپ زندگی سے بیزار ہیں بیزار رہیں مگر یہ زندگی مستعار اسی وقت ختم ہوگی جو اس کے لیے وقت مقرر ہے، لیکن اب سوچنا یہ ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

آخرت میں مرنے کے بعد چین ملنے کا کیا یقین ہے؟ اگر یقین ہے تو اس یقین کی بنیاد یہی تو ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، مگر انھوں نے اپنی مغفرت و رحمت کے لیے کچھ شرائط بھی تو مقرر کیے ہیں! کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ وہ شرائط آپ نے کما حقہ پورے کر لیے ہیں، یا محض گمان ہی گمان ہے ——— اس لیے ان شرائط کو پورا کرنے کے لیے اہتمام بلیغ کی ضرورت ہے اور وہ اہتمام اسی طرح ممکن ہے جیسا کہ ذیل میں مذکور ہے اس لیے اپنی اس ذہنی حالت کو بدلیے اور مہلت یافتہ وقت کو غنیمت سمجھئے اور ورنہ یکسر ہے ع

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

ایک بار لکھنؤ میں واقف لکھنوی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے فرمائش کی، قبلہ کوئی ایسا شعر سنائیے جو آپ کی یاد کے ساتھ ہمیشہ یاد رہے تو انھوں نے یہ شعر سنایا ؎

وابستہ تھے اسی سے سب لطف زندگی کے ——— رخصت ہوئی جوانی اب کیا کریں گے جی کے

گویا اس شعر نے آپ کے مذاقِ زندگی کی ترجمانی کی یعنی آپ پیری میں بھی جوانی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور جب وہ نصیب نہیں تو اس کے فقدان پر زندگی کو قابلِ عبرت سمجھتے ہیں اور میرا مذاقِ زندگی یہ ہے۔ ؎

ہر چند پیر خستہ و بس ناتواں شدم — آنگہہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

میں جو محسوس کرتا ہوں وہی بات عرض کروں گا آپ خواہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، میرا وجود میرے خالق حقیقی کی عطا ہے اور اس کے ساتھ ہر آن ان کی شانِ ربوبیت متصرف ہے یعنی وہ میرے وجود کے رب ہیں اور میں ہمہ وقت ان کی آغوشِ رحمت میں پرورش پا رہا ہوں اور اس عارضی حیات میں حیاتِ آخرت کے لیے جتنے لوازمات بشری ایمانی اور روحانی کی ضرورت ہے میرا رب ہمہ وقت اس سے میری پرورش فرما رہا ہے، نابالغی کے زمانے تک اس نے اپنی شانِ پرورش کو ماں باپ کے ذریعہ سے پورا فرمایا، پھر بالغ ہوتے ہی تادمِ آخر براہِ راست اپنی پرورش میں لے لیا کیونکہ اب اپنے حقیقی پرورش کرنے والے کا علم اور معرفت کے لیے فہم اور قابلیت بالغ ہونے لگتی ہے اور ایسا علم و معرفت حاصل کرنا اس پر واجب ہو جاتا ہے، الحمد للہ کھلی آنکھوں نظر آتا ہے کہ جسمانی پرورش کے لیے طرح طرح کے سامان مہیا فرما دیے ہیں۔ راحت، عزت اور عافیت سب کا پورا پورا سرمایہ ہر وقت موجود ہے، جب میں اپنی نادانی سے بد پرہیزی کر لیتا ہوں اور صحت کو نقصان پہنچا لیتا ہوں تو اس کے لیے طبیب اور دواؤں کا انتظام موجود رہتا ہے، جب میں اپنے راحت کے سامانوں میں کوئی نقصان پہنچا لیتا ہوں تو اس کی تلافی/مکافات بحسن و خوبی اپنے وقت پر ہو جاتی ہے، اسی طرح جب میں اپنی روحانی اور ایمانی صحت کو اپنی غفلت کی وجہ سے نقصان پہنچا لیتا ہوں تو اس کی تلافی کے لیے اپنی شانِ رحمت سے بہت سی تدبیریں بتا دی ہیں اور ان پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور اس پر شفا کا وعدہ فرمایا ہے، اس طرح میری پرورش روحانی برابر ہو رہی ہے، جیسی جیسی عمر بڑھتی جاتی ہے اور فطری و بشری ضعف و نقاہت معذوریات (معذوریوں) کا اضافہ ہوتا جاتا ہے، اسی طرح ان کے اندازِ پرورش میں حسبِ ضرورت تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے، یہ جسمانی انحطاط ایک فطری امر ہے اور بشریت کے لوازمات میں ہے اور جو آخر عمر تک اضافہ پذیر ہوتا رہتا ہے، لیکن بقائے قوتِ روحانی اور ایمانی جو حیاتِ دنیوی کے لیے بھی ضروری ہے اور حقیقتاً سرمایہ آخرت ہے اس کے قائم رکھنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ

اپنی شانِ ربوبیت سے ہر حال میں ہمارے لیے ہر ضروری چیز مہیا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ جب جسمانی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے تو بہت سے ظاہری اعمال یعنی فرائض و واجبات سے بھی ہم کو غیر مکلف بنا دیا جاتا ہے، مگر باطنی اعمال کا اہتمام اور شدید و تر کر دیا جاتا ہے —— اس لیے اس حیاتِ دنیوی میں خواہ کتنا ہی انحطاط اور ضعف جسم میں ہو جائے، اعمالِ باطنی میں قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ اعمالِ باطنی کیا ہیں —؟

یہ وہ اعمال ہیں جن سے روح کو اور ایمان کو قوت پہونچتی ہے اور اپنے ربِّ حقیقی کی شانِ ربوبیت کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور اعظم الغایات جنّت میں لے جانے کی صلاحیت اور قابلیت پیدا ہوتی ہے، اور اس کا حاصل کرنا ہر مومن پر فرض ہے۔ اعمالِ باطنی سے قبل یہ بات سمجھئے کہ اس وقت آخر عمر میں حالاتِ زندگی کیا ہیں؟ یہی ہیں کہ دل کمزور، دماغ کمزور، اور اعصاب کمزور، ہاضمہ کمزور، غرضکہ تمام اعضاء رئیسہ کمزور، طبیعت میں پستی، ہمت اور طاقت کا فقدان، اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف افکار اور پریشانیاں، کچھ اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے، کچھ اپنے عزیزوں اور احباب کے متعلق فکر و اہتمام، اس کے علاوہ اپنوں اور غیروں سے کچھ تلخیاں، کچھ ناگواریاں، کچھ صدمات، کچھ سانحات کے اثرات وغیرہ وغیرہ —— لیکن میری اس زندگی پر متصرف کون ہے؟ کس کی مشیت میرے ساتھ وابستہ ہے؟ میرے ہی پروردگار کی مشیت کارفرما ہے جو بہت ہی بڑے رحیم و رحمان ہیں، علیم و حکیم علی الاطلاق ہیں، جو میرے وجود کی پرورش فرما رہے ہیں۔ اب اس عمر میں جسمانی قویٰ کی پرورش اسی قدر کافی ہے جب تک ان کی مشیت میرے جسمانی وجود قائم رکھنے کے لیے ہے۔ لیکن حیاتِ آخرت کے لیے روحانی پرورش نہایت ضروری اور اشد ضروری ہے اور یہ میری موجودہ جسمانی انحطاط کی حالت جو سبب ہے اسی روحانی قوت کی پرورش کا ساز و سامان ہے، یعنی اسی پر احساسِ زندگی اور احساسِ بندگی منحصر ہے اور یہی عالم عالمِ محویت ہے جب کہ مسلمان "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کا مصداق بنتا ہے۔ ایامِ جوانی میں جب کہ مجھ کو حیاتِ روحانی کو قوی بنانے کے امکانات زیادہ تھے اور جسمانی طاعات و عبادات سے روح اور ایمان کو تقویت پہونچائی جا سکتی تھی، وہ وقت میں نے بڑی غفلت سے بسر کیا اور نفس و شیطان سے مغلوب ہو کر اپنی روح اور ایمان کو ضعیف اور مضمحل کر ڈالا۔ روح اور ایمان کی بقا و قوت سے ناواقف رہا۔ اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے پروردگار نے اس حالتِ ضعیفی میں جن مجبوریوں میں اور معذوریوں میں مجھ کو مبتلا کیا ہے یہ کس قدر رحمت و شفقت کا معاملہ ہے جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جسمانی انحطاط تو قانونِ قدرت کے مطابق ہونا ہی چاہیے تھا۔ روح میں ترقی و

قوت یہ بھی تقاضائے فطرت ہے۔ کیونکہ یہ روح کی قوت و صحت سرمایۂ آخرت ہے جو مقصود و غایت کائنات حیاتِ انسانی ہے۔ اب یہ اس زمانے میں جب کہ جسم میں انحطاط ہے اور اعمال جسمانی کے لیے معذورات ہیں تو پھر اعمالِ باطنی کی سخت ضرورت ہے تاکہ روح اپنی غذا قوت و بقاء حاصل کرسکے، یہی اعمالِ باطنی ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہیں صبر و شکر استغفار وغیرہ اب یہی شکر ہے جو ابتدا ہی سے جس کا ادا کرنا ہم پر واجب ہے اور اس کا ہم نے ایامِ شباب میں اور آج تک حق ادا نہیں کیا اور ہماری روح اس غذائے خاص سے محروم ہی رہی یہی صبر ہے جس کی اہمیت ہم نے کبھی نہ سمجھی اور ہمیشہ بے صبری اور حالاتِ ابتلا میں شکوہ شکایت کی عادت رہی یہی استغفار ہے کہ جس کی اہمیت ہماری نظر میں کبھی نہیں ہوئی اور ہماری روح مختلف قسم کے معاصی سے مجروح اور مضمحل ہوتی رہی اب یہ وقت جب کہ ہمارا وجود ابھی قائم ہے ان تمام نقصانات کی تلافی کا ابھی وقت ہے۔ ورنہ یقیناً انجامِ آخرت کے لحاظ سے خسرانِ عظیم ہے، اِن تمام امور کی اہمیت اور ضرورت روح کی پرورش کے لیے اس قدر اشد ہے کہ یہ تینوں امور ہم پر واجب کر دیئے گئے ہیں ان امور کی تفصیل زیادہ طویل ہوگی اس لیے مختصر بات یہ ہے کہ صبر و شکر اور استغفار کا مراقبہ اور استحضار اٹھتے بیٹھتے کیا جائے تاکہ روح کی پرورش کی تکمیل ہو اور وہ اپنا مقام فطری حاصل کرے اور اگر یہ ہر وقت ممکن نہ ہو کچھ وقت مقرر کرے ان امور کا استحضار و تکرار کیا جائے انشاء اللہ جس قدر بھی اہتمام کیا جائے گا قلب اور روح کی صلاحیتیں اور استعداد درست ہوں گی اور مقصودِ حیات حاصل ہوگا مثلاً شکر کے مراقبے کے لیے یہ چند امور پیش نظر رکھے جاویں مثلاً بغیر کسی استحقاق کے دولتِ اسلام و ایمان کا حاصل ہونا۔ ماں باپ کے آغوشِ شفقت میں پرورش پانا، علوم ظاہری کی تعلیم و تربیت ہونا، ذریعہ معاش کا بقدر کفایت آسانی سے میسر ہونا، پھر اپنے اعضائے جسمانی کا صحیح اور درست ہونا اور اسی طرح ہزاروں نعمتیں جو ہمارے گرد و پیش ہمہ وقت موجود رہی ہیں ان کا استحضار کرنا اور اپنے ماحولِ زندگی کا اکثر و بیشتر حسب لخواہ ہونا اسی طرح امورِ صبر پر غور کیا جائے مثلاً اپنے جسم کی غیر اختیاری مجبوریاں، بیماریاں، خاطر خواہ سامانِ راحت کا فقدان، ماحول کے اثرات، دوسروں کے معاملات میں ناگواریاں، تلخیاں وغیرہ وغیرہ ان سب کو منجانب اللہ سمجھ کر صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا اور صبر کرنے والوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ نے وعدے فرمائے ہیں اپنی معیت، رحمتوں اور مغفرتوں کی بشارت، ان کا طلب گار اور امیدوار

رہنا اور ان اُمور کو کفارۂ سیئات اور رافع درجات ہونے کا یقین رکھنا۔ اسی طرح استغفار کو اپنا شعارِ زندگی بنانا۔ اپنی پچھلی زندگی میں جن غفلتوں، معصیتوں، کوتاہیوں اور حق تلفیوں کا ارتکاب ہو چکا ہے ان کی تلافیٔ مافات کا اہتمام کرنا اور جس کی تلافی ناممکن اس کے لیے توبۃ النصوحا اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت، پناہ مانگنا، اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا کے فتنوں سے، انقلابات کے نقصانات سے ارضی سماوی آفات و حادثات اسانحات سے اور آفاتِ ناگہانی سے پناہ مانگنا بھی عبادت ہے اور یہی سب کچھ سرمایۂ آخرت ہے جس کے مہیا کرنے کے لیے ہم مکلف ہیں۔

ان اعمالِ باطنی کے ساتھ ساتھ اس ضعیفی کی حالت میں جس قدر بھی توفیق ہو اور جس قدر بھی تحمل ہو تو کچھ نوافل اور کچھ ذکرِ لسانی کا اہتمام رکھنا بھی ضروری ہے۔ مسنونہ نمازیں تہجد، اشراق، چاشت، اوابین اور صلوٰۃ التسبیح، جس قدر آسانی سے تلاوتِ قرآن پاک ممکن ہو ورنہ جس قدر آیاتِ قرآنی زبانی یاد ہوں ان کا ورد رکھنا بھی بڑی سعادت کی بات ہے۔ اس کے علاوہ ذکرِ لسانی، تسبیحاتِ مسنونہ کثرت سے استغفار کثرت سے ورد کلمہ طیبہ اور درود شریف اور جب کبھی موقع ملے اپنی ضروریات، اپنی احتیاج اور اپنی مشکلات اور اپنی پریشانیوں کے متعلق دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ اور اپنے والدین آباء اجداد اور اپنے دوست احباب جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا اہتمام بھی التزاماً رکھا جائے یہ بھی ادائے حقِ محبت کے لیے ہم پر واجب ہے اور یہی وقتِ مہلت جو ہم کو نصیب ہے یہ حقِ محبت ادا کر کے ہم کو سعادتِ اُخروی حاصل کرتا ہے اور اگر توفیق ہو تو دینی کتابوں کا مطالعہ اور دینداروں کی صحبت بہترین رفیقِ زندگی ہے ضعیفی اور انحطاط عمر کا زمانہ خود ایک ایسی حالت ہے کہ ایک مومن سراپا موردِ رحمتِ الٰہی بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کہ جب کچھ نہ بن پڑے، صرف معاصی سے بچتا رہے، تو اس کا خاموش رہنا، معمولی ضروریات کے لیے چلتے پھرتے رہنا۔ یہاں تک کہ سوتے رہنا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ یہ لمحات بہت ہی مغتنم ہیں اور ہر لمحۂ افزائش سرمایۂ آخرت ہے۔ گو کما حقہ پورا نہ ہو پھر بھی قابلِ ہزار شکر ہے۔ اگر اس وقت کی ناقدری کی گئی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بطورِ مہلت ہم کو عطا فرمایا ہے۔ حقیقتاً یہ بڑا کفرانِ نعمت ہے اور خسرانِ عظیم ہے۔ کیونکہ سمجھنے کی بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حکیم علی الاطلاق ہیں اور ہمارے رحیم و کریم مربی ہیں، پھر یہ ہماری حالتِ شکستہ اور تکالیف جسمانی اور دماغی افکار و پریشانی

جن میں ہم مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ مشیت الٰہیہ کا یہ فعل عبث تو نہیں ہے بلکہ یقیناً اور حقیقتاً یہ لمحات زندگی بامیدِ مستقیمہ الٰہی کے واسطے ہم کو عطا کیے گئے ہیں تاکہ ہمارا مقصودِ حیات اور روح کی صلاحیتوں کی تکمیل بدرجۂ اتم ہو جائے تاکہ وہ حیات ابدی و سرمدی کے لیے سرمایۂ خاص بن جائے اس حقیقت کو جان لینے اور اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہر لمحۂ حیات کو غنیمت اور اہم سمجھنا چاہیے اور صبر و شکر کے تقاضوں کو پورا کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے رحم و کرم سے اس عمر کی اہمیت کی طرف متوجہ فرمایا ہے کہ آخر وقت یعنی نزع کی حالت میں ہوش آنے کے بعد بندہ یوں کہتا ہے کہ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ لیکن اس وقت یہ تمنا بندے کے لیے لاحاصل ہے۔ مگر ہم کو یہ مہلت دی گئی جو قابلِ ہزار شکر ہے۔ اس کو انعام الٰہی سمجھیں اور اس کا شکر کثرت ذکر سے ادا کرتے رہیں۔

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم واللہ المستعان

مرتب مولانا مجیب اللہ ندوی
جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ

مجلس بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی مدظلہ

(۲ مارچ ۱۹۷۷ء مطابق ۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ)

کئی مہینے بعد الٰہ آباد حاضری کا موقع ملا مختلف اسباب کی بنا پر دو دن حضرت مولانا کی کوئی خاص مجلس نہ ہو سکی، آج صبح ہی کئی حضرات کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ راقم الحروف بھی ساتھ تھا، راستہ میں فرمایا کہ تصوف یہ ہے کہ آدمی خالق کے لیے بھی مخلص ہو جائے یعنی جس طرح آدمی کو خدا سے خلوص کے ساتھ تعلق ہو اسی طرح مخلوق کے لیے بھی خلوص رکھتا ہو، کوئی غرض اور توقع رکھ کر ان سے معاملہ کرتا ہو، اور خلوص قلب سے ہونا چاہیے محض زبان سے نہیں، اور جو شخص مخلوق کے معاملہ میں مخلص نہ ہو وہ خدا کے معاملہ میں بھی مخلص نہیں ہو سکتا۔ بس تصوف اسی کا نام ہے کہ آدمی کے اندر یہ بات پیدا ہو جائے۔

حضرت مولانا کے اس ارشاد کی تشریح کے لیے ہم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں جو انھوں نے سیرت النبی جلد پنجم میں لکھی ہے وہ قلب کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے عمل کی بنیاد اور اساس ہے اس لیے مذہب کی عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش ہو اور نہ جلب منفعت طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو اسی کا نام اخلاص ہے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ — اللہ کی عبادت مخلص ہوکر کرو۔ خبردار

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ — خالص اطاعت ہی اللہ کے لیے ہے۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے لیکن اس کی نسبت یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاوا اور نمائش ہے تو اس کی قدر وقیمت فوراً نگاہوں سے گرجائے گی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ دنیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو........... اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق ومعاملات اور نہ بندوں کی خدمت عبادت کا درجہ پاتی ہے۔

فرمایا کہ طبیعت ایسی پائی ہے کہ اگر شعر وادب میں بھی کوئی چیز کھٹکتی ہے تو اس میں تبدیلی کردینے کو جی چاہتا ہے، چنانچہ جگر مرادآبادی کے اس شعر میں میں نے اپنے مذاق کے مطابق تھوڑی سی تبدیلی کردی ہے

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

مجھے اس میں ایک تو "گلشن پرست" کا لفظ کھٹکتا ہے، دوسرے "نباہ کیے جارہا ہوں میں" کے لفظ میں تکلف محسوس ہوتا ہے اور محبت میں تکلف نہ ہونا چاہیے اس لیے میں نے اس شعر کو اس طرح کردیا ہے

گلشن سے عشق ہے مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں کو دل سے پیار کیے جارہا ہوں میں

پھر اپنا یہ شعر پڑھا

جور وستم سے جس نے کیا دل کو پاش پاش
احمد نے اس کو بھی تہ دل سے دعا دیا

اس شعر کو پڑھتے وقت آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں اور فرمایا کہ اس شعر کے سلسلہ میں پوری ایک تاریخ میرے سینے میں دفن ہے جسے میں بیان نہیں کرسکتا ——— مولانا کو حق گوئی کے جرم میں جن بیشمار تکلیفوں سے سابقہ پڑا تھا یہ اسی کی طرف اشارہ ہے، مولانا کسی کی دل آزاری جانتے ہی نہیں۔

فرمایا کہ صحابہؓ کی تنقیص سے گریز کرنا چاہیے اس لیے کہ ان کی تنقیص سے بالواسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص ہوتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ صحابہ میں کوئی نقص سے خالی نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا مکمل نمونہ سامنے آیا ہی نہیں، اور جب آپ کی تعلیم و تربیت کے مکمل دوچار نمونے بھی سامنے نہیں آئے تو آپ کی بعثت کا پورا مقصد ہی حاصل نہیں ہوا بتائیے یہ کتنی اہم بات ہے پھر قرآن پاک نے تو ان کے بارے میں کہا ہے

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ	لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ایمان کو
وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ	محبوب بنا دیا ہے اور تمھارے قلب میں اس کو
وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ	مزین کر دیا ہے، اور کفر، فسق اور نافرمانی
هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ	سے نفرت دیدی ہے، یہی لوگ اللہ کے
وَنِعْمَةً (حجرات)	فضل و کرم سے ہدایت پر ہیں۔

غور کیجیے کہ پہلے تو قرآن نے ان کے اعلیٰ ایمان کی تصدیق کی پھر ان کی طرف سے یہ صفائی دی کہ وہ کفر سے تو کبھی ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے نزدیک فسوق (گناہ) اور عصیان (نافرمانی) بھی انتہائی ناپسندیدہ چیز ہے پھر قرآن نے بار بار ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ

رضی اللّٰہ عنہم ورضوا عنہ	اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں

یعنی رضا دونوں طرف سے ہے خدا کی طرف سے بھی اور صحابہ کی طرف سے بھی، مولانا نے اس ٹکڑے کی تلاوت اس بلند آہنگی اور کیفیت کے ساتھ بار بار فرمائی کہ ایسا محسوس ہوا کہ یہ آیت پہلی بار سنی گئی ہے اور صحابہ کی عظمت کی مجسم تصویر سامنے آگئی۔ درمیان میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا، نماز بعد پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دل میں یہ بات ڈالی ہے۔ ترمذی شریف میں آیا ہے

لا تمس النار مسلما رانی ورأی	اس مسلمان کو دوزخ کی آگ نہیں چھو سکتی جس نے
من رأنی (مشکوٰۃ مناقب الصحابہ)	مجھے دیکھا اور جس نے میرے دیکھنے والے کو دیکھا

غور کیجیے جب ایک نظر دیکھ لینے کا یہ اثر ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی ہوا تک نہیں لگ سکتی تو پھر جن حضرات نے برسوں صحبت اٹھائی ہے اور سفر و حضر میں آپ کا ساتھ دیا ہے ان کا مرتبہ کتنا زیادہ ہوگا، صحابہ معصوم تو نہیں تھے مگر محفوظ عن المعاصی ضرور تھے اس لیے ان کی تنقیص کرنے میں قرآن

کی بہت سی آیات اور رسالت کی تنقیص لازم آتی ہے۔ اس لیے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

پھر فرمایا کہ اسی طرح ہر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ ضرور موجود رہیں گے جو شریعت اور اسوۂ نبوی کا پورا نمونہ ہوں گے عقلاً بھی ایسا ہونا ضروری ہے ورنہ بعثت نبوی جو قیامت تک کے لیے ہے عملی طور پر اس کا انقطاع لازم آئے گا۔

اسی ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ ایک جگہ ۵۰۔ ۶۰ علماء موجود تھے اور یہ تمام حضرات غور کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی حفاظت کیسے کی جائے، یہ وہ دور تھا جس میں ہر طرف فسادات ہو رہے تھے اور لوگ پریشان تھے تمام حضرات گھنٹوں غور کرتے رہے اور میں خاموش بیٹھا رہا آخر میں لوگوں نے کہا کہ آپ بھی کچھ فرمایئے۔ میں نے قرآن کی یہ آیت تلاوت کی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ — ہم نے ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت ضرور فرمائے گا، یہ مطلب اپنی جگہ پر صحیح ہے مگر اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حفاظت بھی فرمائے گا قرآن کی حفاظت اللہ تعالیٰ مسلمانوں ہی کے ذریعہ تو کرائے گا، جب مسلمان نہیں رہیں گے تو قرآن کی حفاظت کرے گا کون؟ اگر بغیر مسلمانوں کے قرآن کی حفاظت مقصود ہوتی تو لوح محفوظ میں تو وہ محفوظ تھا ہی جس طرح آم ہو اور اس کے کھانے والے نہ ہوں تو آم کا ہونا بالکل بے کار ہو جائے گا" اسی طرح دنیا میں قرآن کا ہونا ضروری ہے تو اس کے حاملین کا ہونا بھی ضروری ہے میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان تدبیر اختیار نہ کریں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم قرآن کی حفاظت اپنے عمل کے ذریعہ کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت بھی فرمائے گا، یہ تقریر سنکر لوگوں کی پریشانی میں کمی آگئی۔

فرمایا کہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (توبہ) — اے نبی کفار و منافقین سے جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں جا رہے تھے تو ان کو حکم دیا گیا کہ

فَقُولَا لَہٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّہٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ)

اس سے تم لوگ بات نرمی سے کرنا ممکن ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے اور ڈرے۔

ان دونوں آیتوں کے بارے میں عاجز کے ذہن میں آتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رأفت و رحمت تھے اس لیے آپ کو سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اور حضرت موسیٰ کی طبیعت میں ذرا سختی تھی اس لیے ان کو نرم انداز اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔

فرمایا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ نے بخاری شریف پر جو حاشیہ لکھا ہے اس کی آخری چار پارے کے حواشی حضرت مولانا نانوتویؒ کے لکھے ہوئے ہیں ایک بار مولانا احمد علیؒ کہیں جا رہے تھے آپ کے ساتھ کچھ شاگرد اور متوسلین بھی تھے، راستہ میں ایک دیہاتی نے ان کو دیکھ کر کہا کہ "ڈاکوؤں کا گروہ جا رہا ہے" شاگردوں نے اسے مارنا چاہا مگر آپ نے سختی سے منع کر دیا اور گھر واپس آ کر بکس کھولا جس میں سیکڑوں خطوط تھے اور ان میں بڑے شاندار شاندار الفاظ میں مولانا کو خطاب کیا گیا تھا لوگوں کو دکھلایا پھر فرمایا کہ اتنے آدمی اگر مجھے ایسا سمجھتے ہیں اور اگر ایک شخص یا چند آدمی ایسا سمجھتے ہیں تو برا ماننے کی کون سی بات ہے۔

فرمایا کہ قرآن کے الفاظ درست کرنا اور اس کے معنی کو سمجھنا بہت ضروری ہے مگر اس سے زیادہ ضروری اس پر یقین رکھنا ہے، الفاظ اور معنی کے سمجھنے والے تو بہت مل جاتے ہیں مگر قرآن پاک کے بیان کردہ حقائق کا یقین بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اس کے بعد آپ نے سورہ نازعات کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝
(النازعات)

جب وہ زبردست ہنگامہ آئے گا یعنی وہ دن جس میں ہر انسان اپنے کرتوت کو یاد کرے گا اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ کر دی جائے گی تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو خدا کے سامنے حاضر ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔

ان آیات کو اپنے خاص انداز میں تلاوت فرمایا اور بعض الفاظ کو بار بار دہراتے رہے پھر حاضرین سے سوال کیا آپ بتائیں کہ کیا واقعی ہم کو ان آیات پر پورا یقین ہے؟

اس ضمن میں فرمایا کہ ایک ان پڑھ صاحب دل بزرگ نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قسم کیوں کھائی ہے؟ وہ بولے اس کی وجہ تو علما جانیں ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جب ایک عام آدمی بھی کوئی بات قسم کھا کر کہتا ہے تو ہم یقین کر لیتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اللہ میاں نے قسم کھا کھا کر باتیں کہیں مگر ہم کو اس کا یقین نہیں آیا"—— اس حقیقت افروز بات کو مولانا نے ایسے رقت آمیز انداز میں بیان فرمایا کہ دل مسوس اٹھا اور اپنی بے یقینی کی تصویر سامنے آگئی۔ مولانا گرگاؤں کے قریب ہی ایک گاؤں ڈانڈی ہے، وہاں ایک بار مولانا کا بیان تھا، مولانا کے ساتھ مولانا عتیق احمد صاحب، قاری عبد الحفیظ صاحب اور مولانا یحییٰ صاحب وغیرہ بھی تھے۔ بیان کے بعد دیر تک آپس میں صحابہ کا اور خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوتا رہا اس کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ ساری فضا معطر ہو گئی ہے مولانا نے دوسرے حضرات سے اس احساس کا ذکر کیا تو سب نے اس کی تائید کی۔

درمیان مجلس میں تھوڑی دیر کے لیے مولانا کسی ضرورت سے زنان خانہ تشریف لے گئے غالباً ہم لوگوں کی راحت کا خیال کر کے اس درمیان مولانا کے محب فانی سے شاعر کامل جالی صاحب نے شیخ اور مرید کے تعلق پر یہ مرصع غزل سنائی۔

ہیں مستفیض لذتِ دردِ جگر سے ہم — زندہ ہیں آج صرف اسی کے اثر سے ہم

پیتے ہیں صبح و شام کسی کی نظر سے ہم — کچھ ہو گئے ہیں اپنے سے بھی بے خبر سے ہم

نظریں فریب کھا نہ سکیں راہِ عشق میں — ہر شے کو دیکھتے ہیں انہی کی نظر سے ہم

بخشا ہے جس نے درد ہمیں، درد کی دوا — لے دولت مانگتے ہیں اسی چارہ گر سے ہم

کانٹوں کا بھی تو حق ہے محبت کی راہ میں — سیراب ان کو کرتے ہیں خونِ جگر سے ہم

مرضی سے اپنی کام نہ تجویز سے غرض — وہ لے چلے جدھر سے چلے ہیں ادھر سے ہم

جب سے ہوئے ہیں آ کے یہاں پر اسیرِ دام — آزاد ہو گئے ہیں ہر ایک دردِ سر سے ہم

کیف و سرور، درد و الم اور سوز و ساز — ہمراہ اپنے لائے ہیں سب ان کے در سے ہم

دامن ہے ایک رہبرِ کامل کا ہاتھ میں

بے خوف اس لیے ہیں رہِ پرخطر سے ہم

محمد منظور نعمانی

تحدیث نعمت

(۱۳)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمہ

حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت و محبت اور اس عاجز و عاصی پر حضرت ممدوح کی عنایت و شفقت بھی اللہ تعالیٰ کی خاص قابل شکر اور لائق ذکر نعمتوں میں سے ہے۔ حضرت ممدوح کا اصل وطن ضلع اعظم گڑھ (یو پی) کے مشہور قصبہ کوپا گنج کے قریب ایک گاؤں "فتحپور تال نرجا" تھا ——— حضرت کا تذکرہ تو بار بار بہت پہلے سے سنا تھا لیکن زیارت کا اتفاق پہلی دفعہ اب سے قریباً ۳۰-۳۲ سال پہلے ۶۵ھ یا ۴۶ء میں ہوا تھا، مہینہ غالباً جون کا تھا، راقم سطور کا قیام اس زمانہ میں بریلی میں تھا اور تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت اس دور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ زیادہ نصیب ہوئی تھی (جس میں پہلے تو ضعف بہت اور بعض خاص مصروفیات کی وجہ سے کمی آئی اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے بالکل ہی محرومی ہو گئی ہے جس کو یہ عاجز اپنا بڑا خسارہ سمجھتا ہے۔ بہرحال اسی دور میں) ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ مشرقی یوپی کے چند اضلاع اعظم گڑھ، گور کھپور وغیرہ کے دورہ کا پروگرام بنا۔ ——— اس جماعت میں ہمارے نہایت محترم بزرگ دوست صوفی سید عبد الرب صاحب (ایم۔ اے) مرحوم بھی تھے اور ان کے خاص دوست اور رفیق مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری بی۔ اے بھی (جو ابھی پچھلے مہینے انتقال فرما کر انھیں کے ساتھ جا ملے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً) اور ان کے ایک دوسرے خاص رفیق ماسٹر محمد ابراہیم صاحب الٰہ آبادی (ایم۔ اے) بھی ساتھ تھے۔

یہ تینوں حضرات ہم مشرب و ہم مذاق تھے، انگریزی تعلیم گاہوں اسکولوں یا کالجوں کے اساتذہ تھے، تینوں کو حکیم الامت حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور تینوں کو تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا ———

ہماری یہ جماعت ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو پہنچی، وہاں غالباً تین دن قیام کا پروگرام تھا یہ تینوں حضرات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اچھی طرح واقف بلکہ اُن کے نیازمندوں میں تھے ——— میں صرف غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، ان تینوں حضرات نے کہا کہ مئو کے اس قیام ہی کے دوران میں ہم کسی وقت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لیے فتحپور تال نرجا جانا چاہتے ہیں، میں نے بھی ان حضرات کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ "جماعت" کے امیر ہمارے مولانا حبیب اللہ صاحب بلیاوی تھے، اُن سے اجازت لیکر فتحپور جانے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ ہم چاروں میں سے کوئی بھی اس سے پہلے فتحپور نہیں گیا تھا ——— اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں سے کوپاگنج کے لیے یکے جاتے ہیں، وہاں سے فتحپور پیدل جانا ہو گا۔ ہم لوگ شام کو بعد مغرب روانہ ہو سکے اور پروگرام یہ بنایا کہ رات کو کوپاگنج کسی مسجد میں قیام کریں اور علی الصبح وہاں سے فتحپور کے لیے روانہ ہو جائیں۔ ہم لوگ رات کو کچھ دیر سے کوپاگنج پہنچ سکے۔ کسی سے کھانے کی دوکان کے بارہ میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایسی کوئی دوکان یہاں نہیں ہے (یا یہ کہ اب بند ہو چکی ہے۔) جن صاحب سے ہم نے دوکان کے بارہ میں دریافت کیا تھا ان کو ہم نے ان کے دریافت کرنے پر یہ بتلا دیا تھا کہ ہم لوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ مئو آئے تھے، اس وقت فتحپور جانے کے لیے آئے ہیں، رات کو یہیں کسی مسجد میں قیام کریں گے اور صبح انشاء اللہ فتحپور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لیے جائیں گے ——— یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کھانا کسی دوکان سے نہیں مل سکے گا ہم لوگوں نے طے کیا کہ چنے یا دال موٹ یا مٹھائی جیسی کوئی بھی چیز مل جائے تو اسی سے کام چلا لیا جائے، اتنے میں کچھ صاحبان آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ لوگ کچھ نہ خریدیں ہم کھانا لاتے ہیں، ہم لوگوں نے شکریہ اور دعا کے ساتھ مناسب انداز میں اُن سے معذرت کر دی کیونکہ ہم اس سفر میں تبلیغی جماعت کے عام اصول کے مطابق کسی پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ بہرحال اس وقت جو کچھ کسی دوکان سے مل گیا وہ لے کر مسجد میں آ گئے، پہلے عشا کی نماز ادا کی پھر کھانے کے ارادہ سے بیٹھے ہی تھے کہ ایک،

حاجی صاحب ایک طشت میں ہم تینوں کے لیے پورا کھانا لیکر مسجد میں تشریف لائے، اور کہا کہ میں حضرت مولانا کا خادم ہوں، آپ حضرت کے مہمان ہیں، اور یہ کھانا گویا حضرت ہی کی طرف سے ہے اس کو آپ قبول فرمالیں، اُن کی بات سے یہ اندازہ کر کے کہ یہ اللہ کے مخلص بندے اور حضرت کے تربیت یافتہ ہیں، اُن کے شکریہ اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ اُس کا کھانا ہی سعادت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ سمجھکر کھایا۔ کھانا بہت اعلیٰ قسم کا تھا جیسا کہ خاص مہمانوں کے لیے اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے (یہ بات ظاہر تھی کہ وہ فوری طور پر تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ پہلے سے تیار شدہ تھا، یہ خدا ہی جانتا ہے کہ ان حاجی صاحب نے کیوں تیار کرا کے رکھا تھا) پھر صبح کو انھوں نے ناشتہ بھی ایسا ہی کرایا اور اپنے ذاتی یکہ سے (جو بہت اعلیٰ قسم کا تھا) ہم لوگوں کو فتحپور تال نرجا پہنچایا ——— اللہ تعالیٰ ان کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے، ۳۰-۳۲ سال پہلے کی بات ہے افسوس ہے کہ ان کا نام اب یاد نہیں رہا۔

راقم سطور کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا یہ پہلا موقع تھا۔ حضرت نے بڑی عنایت فرمائی، جتنی دیر مجلس میں حاضری رہی، اصلاح نفس اور تزکیۂ اخلاق ہی حضرت کی گفتگو کا موضوع رہا ——— اُس وقت حضرت ممدوح میں ایک خاص قسم کی اضطرابی اور بیتابی کیفیت محسوس ہوتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ پورے وجود میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہے۔ ہم لوگ صبح کو پہنچے تھے، اپنے پروگرام کے مطابق شام کو مئو واپس آگئے۔ حضرت کی خدمت میں اس پہلی حاضری اور زیارت کو راقم سطور نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت سمجھا۔

اس کے ۳-۴ سال بعد ۱۹۴۹ء میں فتح پور تال نرجا ہی میں حضرت کی خدمت میں دوسری دفعہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کچھ ہی پہلے فرقہ وارانہ فسادات کی ایک طوفانی لہر بنگال سے اٹھ چکی تھی اور بہت سے مسلمانوں کے سامنے (۱۹۴۷ء کے بعد) پھر یہ سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا نہیں؟ ——— یہ عاجز انہی دنوں میں کسی ضرورت سے مئو گیا تھا، وہاں ایک خواب دیکھا جس نے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ہندوستان ہی میں مقیم رہیں گے یا پاکستان تشریف لے جائیں گے؟ ——— میں نے ضروری سمجھا کہ فتحپور حاضر ہو کر حضرت کی زیارت بھی کروں اور اگر موقع ملے تو اس بارہ میں دریافت کروں، چنانچہ حاضری کا پروگرام بنا لیا۔ (جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے مئو سے گوپا گنج تک یکے چلتے تھے آگے فتحپور کے

ن میل پیدل چلنا ہوتا تھا۔ ایک دن میں ایک یکہ سے روانہ ہوگیا، اس یکہ پر ۴-۵ آدمی اور بھی سوار
ے جو سب کو یا جانے والے تھے ——— راستہ میں میں نے یکہ والے سے کہا کہ مجھے فتحپور تال نرجا جانا ہے
آج ہی واپس لوٹنا ہے اگر تم مجھے فتحپور تک پہنچا سکو تو پہنچا دو، جو کرایہ تم کہو گے میں خوشی سے دوں گا
تمہارا احسان بھی مانوں گا ——— یکہ والے نے راستہ کی خرابی کا عذر کیا، بالآخر وہ اس پر آمادہ ہوگیا
جا تک راستہ زیادہ خراب نہیں ہے وہ مجھے وہاں تک یکہ ہی سے پہنچا دے گا ——— اسی یکہ پر
ے تعلیم یافتہ ہندو نوجوان بھی تھا اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتحپور کس کے پاس جائیں گے؟ میں نے
وہاں ہمارے ایک بزرگ ہیں میں اُن سے بس ملنے جا رہا ہوں ——— اس نے کہا اچھا وہ جو فتحپور
شاہ صاحب ہیں، آپ اُن کے درشن کرنے جا رہے ہیں؟ ۔ میں نے کہا ہاں میں انہی کے درشن کرنے جا رہا
ں ——— میں نے اس نوجوان سے پوچھا آپ اُن کو جانتے ہیں؟ اُس نے کہا میں نے بس ان کا نام سُنا
، مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا بہت شوق ہے ——— میں نے کہا کہ آپ کو ان کے درشن کرنے کا
ں شوق ہے؟ اُس نے کہا کہ میں کانپور کا رہنے والا ہوں میرے ہاں رنگ کا بیوپار ہوتا ہے، میں اُس کے
سلسلہ میں ملک بھر میں گھومتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں سے واسطہ پڑتا ہے یہاں کوئی میں بھی ہمارے
ے بیوپاری حاجی صاحب ہیں وہ بڑے ہی ایماندار سچے اور دھرمی آدمی ہیں، مہاتما ہیں، ایسا آدمی میں نے
ں نہیں دیکھا، نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں، میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم میں ایسی سچائی اور
ن داری کہاں سے آگئی؟ تو انھوں نے مجھے کہا کہ مجھ میں تو کچھ بھی اچھائی نہیں ہے میں تو بہت گندہ آدمی
ں، ہاں یہاں سے قریب ہی فتحپور تال نرجا ایک گاؤں ہے اس میں ہمارے ایک بزرگ مولانا صاحب ہیں
ں اُن کے پاس آتا جاتا ہوں اگر تمھیں میرے اندر کوئی اچھائی نظر پڑتی ہے تو وہ اُن کا اثر ہوگا۔ اور بھی
ا آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے اس لیے مجھے بھی اُن کے درشن کرنے کا
وق ہے۔ اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ ہمارے
س کا بگاڑ جب ہی ٹھیک ہوگا جب یہ ملنگ " (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔
کو پا گنج پہنچکر یہ نوجوان اور دوسرے لوگ جو یکہ پر سوار تھے سب اتر گئے۔ مجھے اس یکہ والے نے
ن میل آگے وہاں تک پہنچا دیا، جہاں تک راستہ یکہ کے لیے زیادہ خراب نہیں تھا۔ اس کے آگے میں
پیدل چل کر فتح پور پہونچ گیا۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میری اس حاضری سے کچھ ہی پہلے کنت خوبرید

فسادات کا ایک سلسلہ بنگال سے شروع ہو چکا تھا جس نے مسلمانوں کے سامنے ۴۷ء کے فسادات کے بعد پھر یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا انھیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا؟ اور ایک خواب کی بنا پر خود حضرت مولانا کے متعلق میرے ذہن میں یہی سوال پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایسے وقت پہنچا تھا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے تھے۔ — جب حضرت ظہر کی نماز کے لیے باہر تشریف لائے تو ملاقات ہوئی — اسی وقت فرمایا مجھے تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے — ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت نے وہ گفتگو فرمائی۔ اس وقت کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ حضرت نے مجھے ملکی حالات اور حکومتی معاملات کے بارہ میں باخبر اور صاحب رائے سمجھتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا اندازہ ہے جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہے کیا وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان فسادات اور لوٹ مار سے تنگ آ کر مسلمان یہاں سے چلے جائیں، یا یہ جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی منشا کے خلاف ہو رہا ہے اور وہ قابو نہیں پا سک رہے ہیں — میں نے اس بارے میں تفصیل سے اپنا خیال عرض کیا، جس کا حاصل یہ تھا کہ حکومت کے جو اصل ذمہ دار ہیں یعنی پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے خاص رفقاء کار وہ تو نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کی زیادتیاں ہوں، لیکن پچھلے سالوں میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جس طرح کی کشمکش رہی اس نے اور پھر تقسیم کے فیصلہ اور پاکستان کے قیام نے عام ہندو ذہن کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بٹوارہ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی حق نہیں رہا۔ خود کانگریس والوں میں بھی اس مسلم دشمنی رجحان کا اچھا خاصا غلبہ ہو گیا ہے، اس لیے ان فسادات کو روکنے کے لیے جس قسم کی سختی کی ضرورت ہے حکومت کے ذمہ دار اس کی جرأت نہیں کرتے۔

پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خود حضرت کا ارادہ ان حالات میں ہندوستان میں قیام کا ہے یا یہاں سے تشریف لے جانے کا؟ حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کے بعض احباب بہت دنوں سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں وہاں منتقل ہو جاؤں، لیکن میرا ارادہ یہیں رہنے کا ہے اور میں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔

تنہائی کی یہ گفتگو غالباً آدھ گھنٹے سے بھی کم میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد حضرت کی عام مجلس شروع ہو گئی جس کا انداز حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی ظہر بعد کی مجلس ارشاد سے بہت ملتا جلتا تھا، مجلس میں بعض طالبین اصلاح کے خطوط پڑھے گئے، جن میں انھوں نے اپنے احوال لکھے تھے اور ہدایت و رہنمائی چاہی تھی اور حضرت کی طرف سے اُن کے جو جوابات دیے گئے تھے وہ بھی پڑھے گئے — اس

دوسری حاضری سے قلب میں حضرت کی عظمت میں اور اضافہ ہوا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ حاضری سنہ ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی۔ اس کے کافی عرصہ بعد تک حضرت کا قیام اپنے اصلی اور آبائی وطن فتحپور ہی میں رہا، جہاں پہنچنا طالبین کے لیے آسان نہ تھا، اس وجہ سے چند قریبی اضلاع کے سوا دوسرے علاقوں کے اہل طلب خال خال ہی پہنچتے تھے —— پھر تقدیر الٰہی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اپنے بعض اہل وطن کی کچھ بے عنوانیوں سے آزردہ ہو کر آپ گورکھپور تشریف لے آئے، جو مشرقی یوپی کا بڑا اور مرکزی شہر ہے، اور اس کو مستقر بنا لیا کئی سال وہاں قیام رہا اس زمانہ میں گورکھپور ایک دینی و روحانی مرکز بن گیا اور طلب و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا راقم سطور گورکھپور کے اس زمانۂ قیام میں بھی ایک عقیدت مند زائر کی حیثیت سے طلب دعا اور استفادہ ہی کی نیت سے چند بار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر کچھ مدت کے بعد آپ نے وہاں سے الٰہ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ فرما لیا، یہاں پہنچکر حضرت کی مقبولیت کا اس پیمانہ پر ظہور ہوا جو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بعض خواص اولیا کے لیے ہوتا ہے —— یہ عاجز اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہاں بھی حاضر خدمت ہوتا رہا اور اپنی نااہلی کے باوجود حضرت کی عنایت و شفقت میں برابر اضافہ محسوس کرتا رہا۔

الٰہ آباد ہی کے زمانہ قیام میں حضرت کی آمد و رفت بمبئی شروع ہوئی جس کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ حضرت کو بعض ایسے امراض لاحق ہو گئے جن کی وجہ سے زیادہ گرمی بھی سخت مضر اور زیادہ سردی بھی سخت خطرناک، اور چونکہ بمبئی میں نہ زیادہ سردی ہوتی ہے نہ زیادہ گرمی اس لیے حضرت کے معالج اطباء نے مشورہ دیا کہ سخت سردی اور گرمی کے موسم میں حضرت کا قیام بمبئی رہا کرے، چنانچہ کئی کئی مہینے حضرت کا قیام بمبئی میں رہنے لگا —— پھر اللہ تعالیٰ نے بمبئی میں حضرت کے اس قیام کو وہاں کے لوگوں کے لیے رحمت اور رشد و ہدایت کا ایسا وسیلہ بنا دیا جس کے ظہور کے بعد محسوس ہوا کہ دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمبئی میں نور ہدایت پھیلنے کے لیے ایک غیبی انتظام تھا —— شاید ہی اللہ کے کسی بندے سے اہل بمبئی کو اتنے وسیع پیمانہ پر اس طرح کا دینی فائدہ کبھی پہنچا ہو —— اللہ تعالیٰ نے وہاں کے تاجروں اور دوسرے اونچے طبقوں میں حضرت کے سیکڑوں عشاق پیدا کر دیے، جو دنیادار تھے وہ اللہ والے بن گئے، اِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ —— پھر زندگی کے آخری سال (سنہ ۶۶ء) میں تو آپ کا قیام الٰہ آباد میں کم اور بمبئی ہی میں زیادہ رہا——

اس عاجز کو اس آخری دور اور آخری سال میں دو دفعہ بمبئی میں حضرت کی خدمت میں کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ پہلی بار فروری میں حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی نیت سے بمبئی کا مستقل سفر کیا اور دو ہفتے تک حضرت ہی کا مہمان رہ کر بے انتہا عنایتوں اور شفقتوں سے متمتع ہوتا رہا، پھر اس کے قریباً ۶ مہینے کے بعد مارشیس اور حجاز مقدس جانے کے لیے میں ستمبر میں بمبئی پہنچا، اندازہ یہ تھا کہ ہوائی سفر کے قانونی مراحل ایک دو دن میں طے ہو جائیں گے اور میں ان شاء اللہ اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو جاؤں گا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ سے بھی زیادہ بمبئی میں قیام کرنا پڑ گیا۔ ان دنوں میں بھی میں زیادہ تر حضرت ہی کی خدمت میں اور آپ ہی کا مہمان رہا ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے میرا بمبئی کا یہ جبری قیام، میرے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی خیر و برکت کا اور اس سفر کے لیے حضرت کی صحبت و دعاؤں سے بہترین زاد راہ حاصل کر لینے کا ایک وسیلہ تھا۔

اپنے اس سفر سے پہلے ہی یہ بات معلوم تھی کہ حضرت مولانا کا ارادہ اس سال اپنے خاص رفقا اور اعزہ کے ساتھ سفر حج کا ہے اور یہ بھی کہ غالباً رمضان مبارک سے پہلے ہی تشریف لے جائیں گے۔ یہ عاجز اپنے پروگرام کے مطابق پہلے مارشیس اور ری یونین گیا اور وہیں سے "رابطہ عالم اسلامی" کے اجلاس کی شرکت کے لیے مکہ معظمہ چلا گیا۔ اجلاس سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، حجاز مقدس میں مجموعی طور پر قریباً ایک مہینہ قیام کے بعد ۲۰ نومبر کی صبح بمبئی واپسی ہوئی، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی بھی واپسی سفر میں ساتھ تھے۔ ہم دونوں اسی دن ۱۰ بجے حضرت کی خدمت میں زیارت اور دعا کی درخواست کے لیے حاضر ہوئے ـــــ آپ ۲ ہی دن کے بعد ۲۲ نومبر کو سفر حج کے لیے منصوری جہاز سے روانہ ہونے والے تھے لیکن ہم دونوں کو ایک اہم ضرورت سے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا ضروری تھا اسی لیے اگلے دن ۲۱ نومبر کی صبح بمبئی سے دہلی جانے والے طیارہ میں غالباً جدہ ہی سے ریزرویشن کرا لیا گیا تھا، اس مجبوری سے ہمارے لیے بمبئی میں دو دن بھی قیام کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے اسی وقت ہم دونوں حضرت سے رخصتی مصافحہ اور دعا کی درخواست کر کے واپس آ گئے ـــــ یہ عاجز حج سے متعلق اپنی دو کتابوں "آپ حج کیسے کریں" اور "آسان حج" کے چند نسخے حضرت کے قافلہ کے لیے حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے دوپہر کو پھر حاضر خدمت ہوا، حضرت نے بڑی محبت کے ساتھ

کرتا ہیں قبول فرمائیں۔ اس حاضری میں میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس کا امکان ہے کہ مجھے بھی اس سال حج میں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اس کے لیے حضرت دعا بھی فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا میں دعا کروں گا آپ کوشش کیجیے ضرور آئیے ۔۔۔۔۔ وہم و سوسہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ حضرت کی آخری زیارت اور آخری ملاقات ہے۔

یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں اپنے پروگرام کے مطابق ۲۰ نومبر کی صبح بمبئی سے روانہ ہو کر دہلی آ گئے اور اگلے دن ۲۲ کی صبح اپنے مستقر لکھنؤ پہنچ گئے۔ ۔۔۔۔ اسی دن حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ مظفری سے حجاز مقدس کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۳ ہی دن ہوئے تھے ۲۵ نومبر کی شام کو بمبئی سے سیٹھ عبدالستار صاحب کا دیا ہوا تار دارالعلوم ندوۃ العلماء میں موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آج صبح مظفری جہاز میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وصال ہو گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) دو دن کے بعد ۲۷ کو ہمارے ایک دوست مخلص حاجی محمد یعقوب کا ۲۵ نومبر ہی کا بمبئی سے لکھا ہوا خط ملا جس میں یہ تفصیل تھی کہ ۔۔۔۔ "حضرت کے رفقا کا مظفری جہاز سے بذریعہ وائرلیس دیا ہوا تار آج دن کے ۱۱ بجے بمبئی پہنچا جس میں بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۵ بج کر ۵ منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا اور جہاز کے کپتان کا کہنا ہو کہ جہاز کے قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھ کر میت کو سمندر کے سپرد کر دیا جائے اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ میت کو جدہ لے جائیں۔ آپ لوگ مغل کمپنی سے کیپٹن کو تار دلوا دیجیے کہ وہ جدہ تک لے جانے کی اجازت دے اور انتظام کرے ۔۔۔۔۔ چنانچہ کوشش کی گئی اور مغل کمپنی نے جہاز کے کپتان کو تار کے ذریعہ اس کی ہدایت دیدی اور ایک تار سعودی عربیہ میں حکومت ہند کے سفیر حضرت کامل قدوائی کو بھی دیدیا گیا تاکہ وہ سعودی حکومت سے حضرت کی میت کو جدہ میں اتارنے اور مکہ معظمہ میں تدفین کی اجازت حاصل کر لیں" ۔۔۔۔ کامل قدوائی صاحب اور حجاز مقدس کے مقیم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام مولانا احمد اللہ صاحب گورکھپوری وغیرہ نے انتہائی جدوجہد کر کے سعودی حکومت سے یہ اجازت حاصل بھی کر لی لیکن اللہ کی مشیت کہ اس اجازت کی اطلاع مظفری کے کپتان کو نہ پہنچ سکی اس لیے جدہ کے ساحل کے قریب پہنچ کر اس نے حضرت کے رفقاء سے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ آپ لوگ نماز جنازہ پڑھ کے میت کو سمندر کے سپرد کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا ۔۔۔۔ اور اب معلوم ہوا کہ تقدیر الٰہی میں یہی طے ہو چکا تھا کہ بیت اللہ کے راستہ میں جہاز میں حضرت کا انتقال ہو اور حجاز بحر کے ساحل

آپ کا دور تو ہے بفضل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید۔

کچھ صفات و امتیازات

حضرت کے احوالِ حیات اور صفات و امتیازات سے متعلق کچھ لکھنے کا حق دراصل انہی حضرات کو ہے جنھیں حضرت کی خدمت میں طویل قیام اور استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی، اس عاجز کی واقفیت کا طول و عرض تو بس وہی ہے جو ابتدائی سطروں میں لکھا گیا تاہم جی چاہتا ہے کہ اس موقعہ پر چند سطروں میں اپنے بعض احساسات اور تاثرات بھی عرض کروں۔

جلال و جمال

حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت سے پہلے آپ کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا اُس سے یہ سمجھا تھا کہ بڑے "صاحب جلال" بزرگ ہیں۔ پھر جب پہلی دفعہ (۱۹۴۵ء میں) حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی ـــــ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ـــــ تو "جلال" کی وہ کیفیت تو نہیں تھی لیکن اس کا کچھ رنگ ضرور محسوس کیا تھا، اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور نہیں ہوں جن کا احساس ان امور میں کچھ زیادہ قابل اعتبار ہو، لیکن گورکھپور اور الہ آباد کے زمانہ قیام میں جب جب حاضری ہوئی تو غایت شفقت اور رافت و رحمت کا رنگ ہی غالب پایا اور گزشتہ دو تین سالوں میں تو جب حاضری ہوئی تو محسوس کیا کہ رگ و ریشہ پیار و محبت سے بھرپور ہے۔

قرآن مجید میں "بالمومنین رؤف رحیم"[۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان فرمائی گئی ہے اس لئے اہل اللہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی خلفاء اور نائبین ہوتے ہیں۔ الوان کے اختلاف کے باوجود سب ہی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس گنہ گار کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں کو دیکھنا نصیب فرمایا ان سب کو اس صفت سے بھرپور دیکھا۔ لیکن حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خاص کر حیات کے اس آخری دور میں اس صفت کا انتہائی غلبہ تھا۔ جو بھی حضرت سے قریب ہوتا محسوس کرتا کہ رگ

---

[۱] یعنی اہل ایمان پر بہت زیادہ شفقت اور مہربانی فرمانے والے ۱۲

در پیشہ میں شفقت اور عنایت بھری ہوئی ہے ـــــ جو طالب بن کر آتا چاہتے کہ اس کے اعمال و اخلاق کی پوری پوری اصلاح ہو جائے اور اس کو تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے اسی کے ساتھ بہت سوں کی دنیوی ضروریات کی بھی فکر فرماتے اور ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے سخت بے چین ہوتے۔

غیر معمولی تاثیر

اس کے اظہار میں ہرگز کوئی بے ادبی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ظاہری وجاہت والی شکل و صورت بالکل عطا نہیں فرمائی تھی، اسی طرح آپ صاحب زبان و بیان مقرر بھی نہیں تھے، آج کل کی اصطلاح کے مطابق صاحب قلم بھی نہیں تھے۔ اگرچہ مدت سے معمول تھا کہ روزانہ صبح ایک عام مجلس میں کچھ اصلاحی بیان فرماتے تھے جس کا طریقہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اگلے اکابر علماء محققین و مصلحین میں سے کسی کی کوئی کتاب ہاتھ میں لے کر اس کی کوئی عبارت پڑھتے اور اس پر کچھ فرماتے، کبھی ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھتے اور اس کے مضمون کی وضاحت فرماتے، لیکن اس بیان کی زبان اور اس کا انداز اکثر و بیشتر اس قدر علمی ہوتا تھا اور اس میں درسی اور فنی اصطلاحات کا اس قدر استعمال ہوتا تھا کہ خاص مناسبت رکھنے والے اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے، پھر آواز بھی کبھی اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ مائیکروفون سامنے ہونے کے باوجود بہت سے حاضرین مجلس نہیں جانتے تھے کہ کیا فرمایا لیکن تواتر کے طور پر لوگوں سے سنا اور خود محسوس بھی کیا کہ تاثر سے شاید کوئی بھی طالب خالی اور محروم نہیں رہتا تھا، اور اثر بھی ایسا جو اکثر و بیشتر کایا پلٹ کر دیتا تھا۔

وفات سے قریباً دو ہی مہینے پہلے آخر ستمبر میں جب ایک ہفتہ کے قریب حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا تو ایک دن مجلس میں حضرت اپنی جگہ پر تشریف تو لے آئے لیکن دیر تک بس خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے وہ حدیث یاد آتی رہی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال بیان کیا گیا ہے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک حال تھا کہ آپ بہت

دیر تک خاموش رہتے اور محسوس ہوتا کہ مسلسل فکر اور غم کی حالت میں ہیں) پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ یہ ضروری نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ بیان کروں گا، یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے صرف بیٹھنے میں بھی اپنا فائدہ سمجھیں۔

بہرحال حضرت کی مجلس اس حقیقت کی روشن دلیل تھی کہ دینی فائدہ کا زیادہ تعلق زبان و بیان سے نہیں بلکہ قلب سے ہے[1]۔ حضرت کی مجلس کے حاضر باشوں میں جو عظیم انقلاب آیا اس کو ہر آنکھوں والا صرف ایک شہر بمبئی میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

علمی رسوخ اور وسعت مطالعہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عام شہرت اگرچہ ایک شیخ طریقت اور صاحب ارشاد مصلح و مربی کی حیثیت سے ہے لیکن علم میں بھی اتنا رسوخ اور استحضار تھا اور مطالعہ اتنا وسیع و عمیق تھا کہ اس دور کے اصحاب درس اور مصنفین میں بھی اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

ایک نیا انداز اور جذب و سلوک کا امتزاج

مشائخ طریقت میں اکثر وہ بیشتر وہ ہوتے ہیں جن کا ارشاد و اصلاح کا سارا کام بالکل اپنے شیخ کے منوال اور منہاج پر ہوتا ہے لیکن بعض ایسے شہباز بھی ہوتے ہیں جو شیخ کی کامل محبت اور متابعت کے باوجود ایک مستقل انداز اور طریقہ کے بانی دیکھے جاتے ہیں، اس کی مثال میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کے خلفاء میں حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اگر چھوٹے منہ سے کسی بڑی بات کے کہنے کا کوئی جواز ہو تو

---

[1] امام عبدالوہاب شعرانی رح کا مشہور مقولہ ہے من لم ینفعہ سکوتنا لم ینفعہ کلامنا۔ یعنی جس کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اس کو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ ۱۲

یہ عاجز حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ کا نام بھی اس کی مثال میں لے سکتا ہے ۔ حضرت ممدوح میں جذب و سلوک کا ایسا واضح امتزاج تھا جس نے ایک نرالے قسم کا بانکپن پیدا کر دیا تھا ۔

در دست نہ تیر نیست نہ دست کماں است ۔ ایں سادگی اوست کہ بسمل دو جہاں ست

در مدرسہ از جنبش لعل تو حکایت ۔ در میکدہ از مستی چشم تو نشان ست

محمد منظور نعمانی

یادِ رفتگاں

گزشتہ چند ہفتوں میں متعدد ایسے حضرات نے ہماری اس دنیا کو خیر باد کہہ کے عالم آخرت کی طرف رحلت کی جن کا حق ہے کہ الفرقان میں اُن کی وفات اور اُن کے حالات کا کچھ تذکرہ کر کے ناظرین کرام سے بھی انکے لیے دعائے رحمت و مغفرت کی درخواست کی جائے۔

مولانا شریف الحسن صاحبؒ (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)

مولانا مرحوم دیوبند ہی کے متوطن تھے، اب سے تقریباً ۳۲۔۳۳ سال پہلے جب راقم سطور کا قیام بریلی میں تھا وہاں کے مدرسہ اشاعت العلوم میں صدر مدرس اور استاذ حدیث کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا۔ اُس وقت وہ نوعمر ہی تھے، ۲۵۔۲۶ سال کے لگ بھگ سن رہا ہوگا، اُسی زمانہ میں اُن سے تعارف ہوا اور مزاجی مناسبت کی وجہ سے جلد ہی اچھا تعلق ہو گیا، ازراہ عنایت بار بار خود تشریف لاتے، اکثر حدیث ہی سے متعلق کسی موضوع پر گفتگو ہوتی، انہی گفتگوؤں سے اندازہ ہوا کہ کم عمری کے باوجود مولانا کا حدیث کا مطالعہ بہت اچھا ہے اور فن سے خاص مناسبت ہے۔—— کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے اس علمی امتیاز کی وجہ سے "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" (سورت) جیسی عظیم درسگاہ میں "شیخ الحدیث" کی حیثیت سے بلا لیے گئے۔

پھر ایک وقت آیا کہ دارالعلوم دیوبند میں ایک اچھے استاذ کی ضرورت محسوس کی گئی —— راقم سطور نے اپنی بریلی کی واقفیت کی بنا پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں مولانا مرحوم کے متعلق تحریک کی، اُس وقت اس عاجز نے فن حدیث سے اُن کی خصوصی مناسبت کا خاص طور سے ذکر کیا تھا اور خوب یاد ہے کہ یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر کسی وقت ہمارے موجودہ بڑے اساتذہ نہ رہے تو مجھے امید ہے کہ مولانا

شریف الحسن صاحب انشاء اللہ درس حدیث کی ذمہ داری سنبھال سکیں گے۔ بہرحال مجلس شوریٰ نے اُن کا بلانا طے کر دیا اور وہ بلا لیے گئے ——— پھر اب سے تقریباً پانچ سال پہلے (۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء) میں جب دار العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کی وفات ہوئی تو بخاری شریف اور ترمذی شریف دورۂ حدیث کی دونوں اہم کتابوں کے درس کی ذمہ داری مولانا شریف الحسن صاحب ہی نے سنبھالی ——— اس وقت اس عاجز کو قدرتی طور پر اس کی بڑی خوشی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جس توقع پر میں نے مولانا کے بارہ میں تحریک کی تھی اللہ تعالیٰ نے وہ پوری فرمائی ——— لیکن قضاء و قدر کا فیصلہ تھا کہ اُن سے یہ خدمت صرف ۴-۵ سال لی جائے ——— مولانا کی عمر ابھی صرف ۵۸ سال تھی، مگر جوانی ہی میں ذیابیطس کی شکایت ہو گئی تھی جس نے جسم کو بالکل گھلا کر صحت و توانائی کو بہت زیادہ متاثر کر دیا تھا ——— چند مہینے پہلے قلب کا دورہ پڑا تھا وہ گویا خطرہ کی گھنٹی تھی مگر بفضلہ تعالیٰ اس وقت صحتیاب ہو کر دونوں سبق معمول کے مطابق پڑھاتے رہے، مگر گزشتہ مہینے جون کے شروع ہونے کے ساتھ ہی دوبارہ دورہ پڑا اور ۲ و ۳ جون کی درمیانی رات یعنی شبِ جمعہ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور عالم آخرت کی طرف منتقل ہو گئے۔ اگلے دن جمعہ کی صبح نماز جنازہ اور تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ خاص کر اُن کی خدمت حدیث کو قبول فرما کر رحمت و مغفرت کا خصوصی معاملہ فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل اور دار العلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

مولانا سراج الحق مچھلی شہریؒ

جس دن مولانا شریف الحسن صاحبؒ نے دیوبند میں رحلت فرمائی اُسی دن راقم سطور کے بہت قدیمی دوست اور کرم فرما مولانا سراج الحق صاحب نے الہ آباد میں وفات پائی، کبھی کبھی الفرقان میں مولانا کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ مولانا مرحوم بہت اچھے ذی استعداد عالم اور بڑے فاضل تھے، لیکن معاش کی سہولت کے لیے "کامل" "فاضل" وغیرہ الہ آباد یونیورسٹی کے امتحانات دیکر اردو فارسی کی معلمی کی لائن اختیار فرمائی تھی جو اُن کے لیے دینی لحاظ سے بھی نہایت مبارک ثابت ہوئی، اسی راستے سے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی سے رابطہ قائم ہوا، جو حضرت حکیم الامت سے بیعتِ اصلاح و ارشاد کا وسیلہ بنا، پھر حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق قائم کیا اور اجازت سے بھی سرفراز ہوئے — اگرچہ مولانا کی عمر کا بڑا حصہ انگریزی اسکولوں کالجوں کے ماحول میں گزرا لیکن اتباع شریعت وسنت میں مولانا کا حال ہم جیسوں کے لیے سبق آموز اور قابل رشک تھا۔ اصل وطن مچھلی شہر ضلع جونپور تھا لیکن پہلے تعلیم کے لیے اور اس کے بعد معلمی کے سلسلہ میں الہ آباد قیام رہا اور اسی کو وطن بنا لیا۔

مولانا کا سن ۸۰ کے قریب تھا لیکن صحت وتوانائی پر بڑھاپے کا زیادہ اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ گزشتہ اپریل میں ایک دن فجر کی نماز کے لیے تیزی سے جا رہے تھے، پیچھے سے کتے نے حملہ کیا، مولانا نے پلٹ کر تیزی سے اس کو روکا، اس میں خود گر گئے اور کولھے کی ہڈی مجروح ہو گئی، اس کے علاج کے دوران بخار وغیرہ کی شکایت پیدا ہو گئی اور مرض بڑھتا گیا۔ بالآخر ۳ جون پنجشنبہ کے دن روح نے جسم کو چھوڑ کے عالم بالا کا سفر اختیار کیا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین —

حکیم سید مشتاق احمد صاحب کٹھوری مرحوم

ضلع میرٹھ میں کٹھور ایک قصبہ ہے، حکیم صاحب وہیں کے رہنے والے تھے، اپنے زمانہ کے قریباً سب ہی بزرگوں سے تعلق تھا اور ان سب ہی کی عنایت وشفقت حاصل تھی، تبلیغی جماعت کے کام سے بھی تعلق تھا اکثر اہم اجتماعات میں شرکت فرماتے تھے۔ اچھے کامیاب طبیب اور معالج تھے اور اس حیثیت سے بھی اس عاجز کے محسنوں میں تھے۔ عمر ۸۰ کے قریب ہی ہو گی لیکن بفضلہ تعالیٰ صحت بہت اچھی تھی — اب سے ۳-۴ سال پہلے ایک ایکسی ڈنٹ میں سخت زخمی ہو گئے تھے، اس کے بعد سے قریباً صاحب فراش ہی رہے، پچھلے چند مہینوں سے ورم جگر وغیرہ دوسرے امراض بھی پیدا ہو گئے تھے۔ وقت موعود قریب آ چکا تھا کوئی علاج سازگار نہ ہوا۔ جون کے غالباً دوسرے ہفتہ میں انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے اور اپنی خاص کریمانہ شان سے پسماندگان کی سرپرستی فرمائے۔

حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ

ہندوستان وپاکستان کے پڑھے لکھے اور دین ومذہب سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں میں کون ہو گا جس نے مکہ مکرمہ کے "مدرسہ صولتیہ" کا نام نہ سنا ہو، الفرقان میں تو حجاز پاک کے سفروں کے سلسلہ میں

بیسیوں بار اس کا ذکر آیا ہوگا ــــــ یہ مدرسہ اب سے قریباً ایک صدی پہلے ہندوستان کے مشہور اور مایۂ فخر مجاہد و مناظرِ اسلام، عالمِ ربانی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بلد اللہ الحرام مکہ مکرمہ میں قائم فرمایا تھا۔ اس کے ایک گوشہ میں مدت تک ہمارے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کا بھی قیام رہا، اس طرح یہ مدرسہ مکہ معظمہ میں ہمارے ان دونوں بزرگوں کی یادگار اور نشانی ہے جو گزشتہ ایک صدی میں ہونے والے بڑے بڑے انقلابات کے بعد بھی الحمد للہ باقی اور قائم ہے۔ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور اس چشمۂ فیض کو جاری رکھے۔

حضرت مولانا شیخ محمد سلیم رحمہ اللہ اپنے والد ماجد مولانا محمد سعید کیرانوی کے بعد حضرت بانیٔ مدرسہ علیہ الرحمہ والرضوان کے وارث اور جانشین تھے، قریباً نصف صدی سے اس مدرسہ کے اہتمام و نظم کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے، عالمِ دین اور خادمِ دین ہونے کے ساتھ بڑے خوش مزاج اور سراپا باغ و بہار تھے، ہر ملنے والا مزاج کی ظرافت و لطافت اور حسنِ اخلاق سے متاثر ہوتا تھا۔ یوں تو جب بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مکہ معظمہ حاضری نصیب ہوئی ہر دفعہ مولانا کی عنایات اور حسنِ اخلاق کا ذاتی تجربہ ہوا لیکن اب سے قریباً دس سال پہلے سنہ ۸۳ھ میں اس عاجز نے جب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اہلیہ مرحومہ کو ساتھ لیکر حج کا سفر کیا تو مکہ معظمہ کے پورے زمانۂ اقامت میں مولانا کی خاص عنایت کے نتیجہ میں مدرسہ صولتیہ ہی میں اور خاص اُس نو تعمیر کمرہ میں قیام رہا جو ٹھیک دفتر کے اوپر واقع تھا[1]، دفتر کے اس قرب کی وجہ سے اکثر دن میں کئی کئی بار یہ منظر دیکھنے کا موقع ملتا تھا کہ مدرسہ کا دفتر جو اوسط درجہ کا وسیع ہال ہے مختلف ملکوں مختلف طبقوں اور مختلف حیثیت کے حاجیوں سے بھرا ہوا ہے، کوئی اپنی رقم بطورِ امانت دفتر میں رکھنے کے لیے آیا ہے، کوئی اپنی رکھی ہوئی امانت میں سے کچھ لینے آیا ہے، کوئی اپنے لکھے ہوئے خطوط ڈاک کی نذر بھیجنے کے لیے دفتر میں دینے کے واسطے اور کوئی مدرسہ کے پتہ پر آئی ہوئی اپنی ڈاک لینے کے واسطے آیا ہے کوئی اپنی کسی مصیبت اور پریشانی کے سلسلہ میں مدد اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آیا ہے، غرض جتنے آدمی ہیں اتنے ہی

---

[1] سنہ ۸۳ھ میں اہلیہ مرحومہ کے حادثۂ انتقال پر الفرقان میں جو مضمون لکھا گیا تھا اس میں اس سفر کا اور مدرسہ صولتیہ کے اس نو تعمیر کمرہ میں قیام کا اور مولانا شیخ محمد سلیم علیہ الرحمہ کی خاص عنایات کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا، یہ مضمون اب سے دو ہی مہینے پہلے "وفیات نمبر" میں بھی شائع ہو چکا ہے، ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

اُن کے مسائل ہیں، اسی کے ساتھ خصوصی تعلقات والے ملاقات کے لیے بھی آ رہے ہیں، اور مولانا شیخ محمد سلیم صاحب ہر ایک سے اپنی مخصوص خداداد خوش مزاجی کے ساتھ بات کر رہے ہیں، ہر ایک کی سن رہے اور جو اپنے کرنے کا کام ہے ہاتھ کے ہاتھ کر رہے ہیں، خصوصی تعلقات والوں کے اکرام کا بھی حق ادا ہو رہا ہے ۔۔۔۔ آدمیوں اور کاموں کے اس ہجوم میں مدرسہ کا کام بھی جاری ہے۔ اُن کے صاحبزادے اور خلف الرشید برادر مکرم مولوی محمد شمیم صاحب بھی ان کاموں میں شریک ہیں اور دوڑ بھاگ کے کام وہی کر رہے ہیں ۔۔۔ یہ سلسلہ دن بھر اور کبھی دیر رات تک بھی جاری رہتا ۔۔۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس بڑھاپے میں مولانا کس طرح اتنا کام کر لیتے ہیں، سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک خاص قسم کے صاحب خدمت تھے اور اس خدمت کے سلسلہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و توفیق حاصل تھی۔

۲۱ر جولائی جمعرات کے دن اچانک حضرت مولانا انعام الحسن صاحب (بستی حضرت نظام الدین دہلی) سے اطلاع ملی کہ ۱۸ر جولائی دوشنبہ کی صبح تہجد کے وقت مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیئاتہ۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ برادر مکرم مولوی محمد شمیم صاحب طویل مدت سے مولانا مرحوم کے سارے کاموں میں اُن کے شریک تھے، جہاں تک اندازہ ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کو مولانا مرحوم کی خصوصیات کا پورا وارث بنایا ہے امید ہے کہ رب کریم مدرسہ صولتیہ کی، اور اسی طرح حجاج کی خدمت اُن سے بھی اسی طرح لے گا جس طرح حضرت مولانا مرحوم سے لی، اصل تو اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی مشیت ہے ورنہ کوئی بندہ اپنی ذات سے کچھ نہیں ۔۔۔۔۔

ناظرین کرام سے اس عاجز راقم سطور کی درخواست ہے کہ جن وفات یافتہ محسنوں یا دوستوں کا ان صفحات میں ذکر کیا گیا اُن کے لیے اہتمام سے مغفرت و رحمت کی دعا فرمائیں اور ہو سکے تو حسب ہمت ایصال ثواب بھی ۔۔۔ اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔ واللہ یحب المحسنین ○

Regd. No. 1 LW/NP-62

Monthly **ALFURQAN** 31, Naya Gaon West Lucknow (U. P.)

VOL. 45 NO. 8 AUGUST, 1977 Phone : 25547

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

تصانیف حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

کلمہ طیبہ کی حقیقت

اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ایمان افروز تشریح۔

نماز کی حقیقت

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے تمام ارکان کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اور اپنی نماز میں خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر اور شوق انگیز بیان۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسے عارفین و محققین کے طرز پر۔

آپ حج کیسے کریں؟

حج کے موضوع پر اردو میں بےشمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی منفرد و ممتاز ہے کہ یہ بہت آسان اور دلنشین انداز میں حج کا طریقہ اور احکام و مناسک بھی بتاتی ہے اور وہ ذوق و شوق بھی پیدا کرتی ہے جو حج و زیارت کی جان ہے۔

آسان حج

آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے پاکٹ سائز — بہترین طباعت

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

اور مسئلہ نزول مسیح و حیات مسیح

مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ۔ رد قادیانیت پر لاجواب کتاب۔ اس میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرایہ میں لکھا گیا ہے جو عوام و خواص سب کے لیے یکساں تسلی بخش ہے۔

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر مولانا کا یہ مختصر رسالہ دریا بکوزہ کا مصداق اور قادیانیت کے زہر کا مجرب تریاق ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا۔ معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں ان کا تسلی بخش اور مدلل جواب۔

فیصلہ کن مناظرہ

اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب۔ کتاب کے مقدمہ میں بریلی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے نیز یہ بتلایا گیا ہے کہ اب اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہیے۔

انسانیت زندہ ہے

یہ کتاب بھی مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پراثر واقعہ بیان کیا ہے۔ جذبہ انسانیت اور باہمی رواداری کی افزائش کے لیے بے حد مفید کتاب ہے۔

قیمتوں کی جانکاری کے لیے ہماری فہرست کتب مفت طلب کیجیے

کتب خانہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/۱۵
پاکستان سے -/۲۵
بنگلادیش سے -/۱۶
فی شمارہ ۱/۵۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۴ پونڈ

جلد (۴۵) | بابت ستمبر ۱۹۷۷ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ | شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں ( ) سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ — لاہور

(مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

آج جمعہ کا دن اور رمضان کی دسویں تاریخ ہے۔ ماہ مبارک کا پہلا عشرہ آج ختم ہو رہا ہے اور دوسرا آج رات ہی سے شروع ہو رہا ہے — میری نیت اور خواہش اور دفتر الفرقان کے کارکنوں کی کوشش یہ ہے کہ یہ شمارہ آخری عشرہ شروع ہونے سے پہلے شائع ہو جائے — اسی امید پر "نگاہ اولیں" کے ان صفحات میں عشرۂ اخیرہ سے متعلق کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کرام کو فائدہ اٹھانے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس عاجز راقم کو بھی ان کے طفیل میں نوازے۔

اللہ تعالیٰ خالق کون و مکاں اور مالک زمین و زماں ہے، حاکم مطلق اور غیر مسئول فرمانروا ہے، اُس کا حق ہے کہ اپنی جس مخلوق کو جو چاہے درجہ اور مقام عطا فرمائے، خانہ کعبہ اسی کی پیدا کی ہوئی لاکھوں میل لمبی چوڑی زمین کا ایک مختصر سا ٹکڑا ہے، اس نے اس کو اپنی خاص تجلی گاہ اور سارے عالم کا قبلہ قرار دیا اور یہ مقام و مرتبہ عطا فرمایا کہ مشرق و مغرب کے سارے بندے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں اور اس کا طواف کریں، اس کے ایک گوشہ میں لگے ہوئے ایک "کالے پتھر" کو ادب سے چومیں، اس کے در و دیوار سے چمٹ کے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کریں اور مرادیں مانگیں۔ — پھر اس کے صحن (مسجد حرام) کی ایک نماز کا ثواب دوسری عام مسجدوں کی ایک

ایک لاکھ نمازوں کے برابر قرار دیا ــــــ اُس کے چاروں طرف کے سیکڑوں مربع میل علاقہ کو اپنا "حرم" قرار دیا، اُس میں شکار کرنا بلکہ اُس کے خود رو جنگلی درختوں کا کاٹنا اور ان کے پتے جھاڑنا بھی قابل تعزیر جرم قرار پایا ــــــ کسی کو حق نہیں ہے کہ پوچھے کہ ملک عرب اور شہر مکہ میں واقع زمین کے اس ذرا سے ٹکڑے کو اور اس کے چاروں طرف کے علاقے اور بے آب و گیاہ جنگل کو یہ درجہ کیوں عطا فرمایا گیا؟ جس طرح کسی کا حق نہیں ہے کہ کوئی پوچھے کہ زمین کی تہ سے نکلنے والے بعض پتھروں کو ہیرا یا لعل و یاقوت کیوں بنایا گیا، یا گلاب کو یہ خاص رنگ اور یہ خوشبو کیوں دی گئی؟ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید ہ

زمین اور زمینی مخلوقات کی طرح زمانہ (یعنی دن و رات اور ہفتوں اور مہینوں کا سلسلہ بھی اللہ کی مخلوق ہے اور اس نے اپنے مالکانہ اور حاکمانہ اختیار سے زمانہ کے بھی بعض حصوں کو دوسرے حصوں پر فضیلت بخشی ہے۔ مثلاً نویں ذی الحجہ کو یوم الحج اور یوم العرفہ قرار دیا جس میں مغفرت و رحمت کی موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح سال کے بارہ مہینوں میں ایک مہینے رمضان مبارک کو خاص فضیلت بخشی ــــــ حدیث کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ "جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں۔"[1] ــــــ اسی طرح کتب حدیث میں رمضان مبارک سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] اس حدیث کا مطلب حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ رمضان مبارک میں چونکہ اللہ کے صالح اور نیک بندے عبادات اور دیگر طاعات و حسنات میں منہمک، اور معصیات سے سخت مجتنب ہو جاتے ہیں، وہ دنوں کو روزہ رکھ کر ذکر و تلاوت وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں اور راتیں تراویح اور تہجد میں بسر کرتے ہیں اور ان کے انوار و برکات سے متاثر ہو کر عوام مومنین کے قلوب بھی اس مبارک مہینے میں عبادات اور اعمال صالحہ کی طرف زیادہ راغب اور بہت سے گناہوں اور بُرے مشغلوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو اسلام و ایمان کے حلقہ میں سعادت اور تقوے کے اس عام رجحان کی وجہ سے وہ تمام طبیعتیں جن میں کچھ بھی صلاحیت

کے ایک خطبہ کے ضمن میں آپ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ جو بندہ اس مبارک مہینے میں اللہ کی رضا کے لیے کوئی نفلی عبادت کرے گا تو اس کے لیے اس کا اجر و ثواب دوسرے مہینوں کے فرضوں کے برابر لکھا جائے گا اور جو فرض عبادت اس مہینے میں ادا کرے گا اس کا ثواب دوسرے مہینوں میں ادا کی ہوئی اس فرض عبادت کے ثواب سے ستر گنا زیادہ ملے گا۔

ــــ رمضان مبارک کے بارہ میں آپ کا ایک یہ ارشاد بھی حدیث کی کتابوں میں روایت کیا گیا ہے کہ ــــ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ رمضان کیا چیز ہے تو میری امت یہ تمنا کرے کہ سارا سال رمضان ہی ہو جائے۔

اور اگر ایمانی نظر نصیب ہو تو رمضان مبارک کی سب سے بڑی برکت اور خصوصیت یہ نظر آئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی آخری مقدس کتاب ہدایت (جو مخلوق نہیں بلکہ اس کی صفت ہے) قرآن مجید کا نزول ہوا (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ) ــــ

ــــ پھر رمضان مبارک میں اس کے عشرۂ اخیرہ کو پہلے دونوں عشروں پر فضیلت و فوقیت بخشی گئی ــــ ماہ مبارک کے شروع ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتوں اور برکتوں کا جو نزول شروع ہوتا ہے اس میں مسلسل اضافہ اور ارتقا ہوتا رہتا ہے اس لیے قدرتی طور پر آخری عشرہ ان رحمتوں اور برکتوں کا عروج و کمال کا عشرہ ہوتا ہے۔ اسی عشرہ میں عموماً شب قدر ہوتی ہے جس کے بارہ میں خود اللہ تعالیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ہوتی ہے اللہ کی مرضیات کی طرف۔ اہل اور شر و خباثت سے متنفر ہو جاتی ہیں اور پھر اس مہینے میں ہر نیک عمل کا اجر و ثواب بھی دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنت کے دروازے اُن لوگوں کے لیے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے اُن پر بند کر دیے جاتے ہیں اور پھر شیطان ان پر اپنا جال نہیں پھینک سکتا اس تشریح کے مطابق رمضان میں جنت و رحمت کے دروازے کھلنے، دوزخ کے دروازے بند ہو جانے اور شیاطین کے بے بس ہو جانے اور جکڑ دیے جانے کا تعلق بس انھیں اہل ایمان سے ہے جو رمضان مبارک کی آمد پر اپنے حال میں اچھی تبدیلی کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور آخرت کی فکر ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ (ملخص از حجۃ اللہ البالغہ)

کا ارشاد ہے "لیلۃ القدر خیر من الف شہر" جس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس ایک رات کی عبادت کی قدر و قیمت ہزار سال کی مدت کی عبادت سے بھی زیادہ ہے جن میں شب قدر نہ ہو —— اس آخری عشرہ کی انہی خصوصیات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول اس میں اعتکاف کا تھا، گویا یہ دس دن اور راتیں آپ کی خلوت مع اللہ اور عبادت و مجاہدہ فی اللہ کے لیے وقف ہوتی تھیں۔

عاجز راقم سطور اس تمہید کے بعد رمضان مبارک کے آخری عشرہ اور اعتکاف و لیلۃ القدر سے متعلق (عین وقت پر یاد دہانی کے لیے) یہ چند حدیثیں ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ تاکہ اگر وہ خود کچھ نہ کر سکے تو اُن بندوں کے طفیل میں جن کو عمل کی توفیق مل جائے اس کو بھی کچھ نصیب ہو جائے۔

عشرہ اخیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجتھد فی العشر الاواخر مالا یجتھد فی غیرہ
(صحیح مسلم)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت وغیرہ میں وہ مجاہدہ کرتے اور وہ مشقت اٹھاتے تھے جو اس کے علاوہ دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل العشر شد میزرہ واحیی لیلہ وایقظ اھلہ
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ جب رمضان کا عشرہ اخیرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے پوری رات شب بیداری عبادت وغیرہ میں گزارتے اور اپنے گھر والوں ازواج مطہرات وغیرہ کو بھی جگا دیتے (تاکہ وہ بھی ان راتوں کی خاص رحمتوں اور برکتوں میں حصہ لیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس مبارک مہینے اور خاص کر اُس کے آخری عشرہ کے انوار و برکات اور دریائے رحمت کے جوش و تلاطم کو گویا آنکھوں سے دیکھتے تھے اس لیے آپ کا یہ مستقل حال تھا کہ اس ماہ مبارک میں اور خاص کر اس کے آخری دس دنوں اور ان کی راتوں میں ذکر و دعا نماز و تلاوت قرآن وغیرہ عبادات اور اس سلسلہ میں مجاہدہ کی مقدار بہت بڑھ جاتی تھی، راتوں کو بھی آرام بالکل نہ فرماتے اور اہل و عیال کو بھی اس کی ترغیب دیتے اور جگا دیتے ـــــ ہم امتی بھی آپ کے گھرانے کے غلام بلکہ غلاموں کے غلام ہیں، اللہ تعالیٰ خاص کر ماہ مبارک کے ان آخری دنوں اور راتوں میں اس جذبہ اور عمل کا کوئی حصہ ہم کو بھی نصیب فرمائے۔

اعتکاف

اعتکاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر طرف سے یکسو اور سب سے منقطع ہو کر بس اللہ سے لو لگا کے اُس کے در پر (یعنی کسی مسجد کے کونہ میں) پڑ جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کی عبادت اور اس کے ذکر و فکر اور اُس کے حضور رونے بلبلانے اور مانگنے میں مشغول رہے۔ اس اعتکاف کے لیے بہترین زمانہ رمضان مبارک اور خاص کر اُس کا عشرہ اخیرہ ہی ہو سکتا ہے ـــــ آخری عشرہ میں اعتکاف بھی حضور کا مستقل معمول تھا۔

عن عائشۃ قالت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یعتکف العشر الاواخر فی رمضان حتی توفاہ اللہ ثم اعتکف ازواجہ من بعدہ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول تھا کہ آپ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، وفات شریفہ تک آپ کا یہ معمول جاری رہا۔ آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اہتمام سے اعتکاف کرتی رہیں۔

ازواج مطہرات اپنے سکونتی حجروں میں اعتکاف فرماتی تھیں ـــــ خواتین کے لیے اعتکاف کی جگہ اُن کے گھر کے اندر کی وہی جگہ ہے جو انھوں نے نماز پڑھنے کے لیے مقرر کر رکھی ہو، اور اگر گھر میں نماز کے لیے کوئی خاص جگہ مقرر کی ہوئی نہ ہو تو اعتکاف کے لیے گھر کا کوئی

کونہ مقرر کرلیا جائے۔ وہی اُن کی مسجد اور جائے اعتکاف ہے۔

عن انس قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعتکف العشر الاواخر من رمضان، فلم یعتکف عاماً فلما کان العام المقبل اعتکف عشرین۔

(جامع ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال (کسی وجہ سے) آپ نے اعتکاف نہیں فرمایا تو جب اگلے سال رمضان آیا تو آپ نے ۲۰ دن کا اعتکاف فرمایا۔

حضرت انسؓ کی اس حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ کیا وجہ پیش آئی تھی جس کے باعث آپ ایک سال اعتکاف نہیں کر سکے تھے۔ سنن ابی داؤد وغیرہ میں ایک دوسرے صحابی حضرت ابی بن کعبؓ سے ایک حدیث مروی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال آپ کو اعتکاف کے زمانہ میں کوئی سفر پیش آگیا تھا اس کی وجہ سے اُس سال اعتکاف نہ ہو سکا تو اگلے سال آپ نے ۲۰ دن کا اعتکاف کیا ——— اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے مروی ہے کہ حیات طیبہ کے آخری رمضان مبارک میں بھی (جو وفات شریفہ سے ۵-۶ مہینے پہلے واقع ہوا تھا) آپ نے ۲۰ دن کا اعتکاف فرمایا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر منکشف ہو چکا تھا کہ عنقریب آپ اس دنیا سے اٹھا لیے جائیں گے اس لیے اعتکاف جیسے عمل کا شوق و شغف بڑھ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک ‎ ‎ ‎ آتش شوق تیز تر باشد

بہرحال رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول تھا جس کا آپ وہ اہتمام فرماتے جو مندرجہ بالا حدیثوں سے معلوم ہوا ——— الحمد للہ یہ سنت کسی درجہ میں زندہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس کی صحیح روح کے ساتھ باقی رکھے ———

شب قدر

ابھی اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ "شب قدر" (جس کی عظمت کا تذکرہ خود قرآن مجید میں

فرمایا گیا ہے) وہ عموماً رمضان کے آخری عشرہ ہی میں ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے بارہ میں یہی نشان دہی فرمائی ہے۔

عن عائشہ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تحروا الیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر من رمضان (صحیح بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں۔

مطلب یہ ہے کہ "شب قدر" رمضان کے عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہوتی ہے ـــ یعنی اکیسویں (۲۱) یا تئیسویں (۲۳)، یا پچیسویں (۲۵)، یا ستائیسویں (۲۷)، یا انتیسویں (۲۹)۔

شب قدر کی اگر کوئی ایک تاریخ متعین کردی جاتی کہ وہ فلاں رات ہے تو بہت سے لوگ بس اس رات کو عبادت اور دعا وغیرہ کا اہتمام کرتے، اور بندوں کے لیے یہ بڑے خسارہ کی بات تھی ـــ اللہ تعالیٰ نے ہم بندوں کے ساتھ بڑی رحمت فرمائی کہ اس بابرکت رات کو اس طرح متعین نہیں فرمایا ـــ قرآن مجید میں بس اتنا اشارہ فرمایا گیا کہ "قرآن لیلۃ القدر میں نازل فرمایا گیا ہے"۔ "اِنَّآ انزلناہ فی لیلۃ القدر" پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا "شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن" اس سے اشارہ دیا گیا کہ "لیلۃ القدر" "رمضان" میں تھی۔

ـــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ بالا حدیث میں مزید نشاندہی کے طور پر فرمایا کہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اُس کا زیادہ امکان ہے لہذا ان راتوں میں خاص اہتمام کیا جائے۔

بعض صحابہ کرام نے اپنے ذاتی تجربہ اور ادراک کی بنا پر یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ "شب قدر" ہمیشہ رمضان کی "ستائیسویں شب" ہوتی ہے ـــ لیکن دوسرے صحابہ اور امت کے اکثر علماء و عرفا کا خیال یہ ہے کہ "شب قدر" اکثر و بیشتر رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں اور خاصکر اس کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اس لیے ان راتوں کا تو خاص طور سے اہتمام کیا جائے لیکن ہوسکتا ہے کہ ان کے علاوہ کسی بھی رات میں ہو۔ اس لیے توفیق ہو تو اس امکان کی بنا پر ہر رات میں کچھ نہ کچھ اہتمام کیا جائے ـــ صحیح مسلم شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد مروی ہے "مَنْ یَقُمِ الْحَوْلَ یُصِبْ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ" (یعنی جو شخص پورے سال کی راتوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو گا وہ کسی نہ کسی رات شب قدر ضرور پالے گا) ــــ امت میں ایسے اہل ہمت بھی گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو ہر رات میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس خیال سے کھڑے ہوتے ہیں کہ شاید یہی رات شب قدر ہو۔ اُن کا مسلک اور مذہب یہ ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

لیکن اگر کسی کو اتنی ہی توفیق مل جائے کہ رمضان کی راتوں میں خاصکر عشرہ کی طاق راتوں میں سے وہ شب قدر کی رحمتوں اور برکتوں کی امید کے ساتھ اللہ کے حضور میں کچھ وقت کے لیے کھڑا ہو جائے، خشوع خضوع کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کوشش کرے، روئے، گڑگڑائے، اپنے گناہوں سے توبہ کرے، معافی اور مغفرت چاہے اپنے والدین اور اپنے سب محسنوں کے لیے مغفرت اور جنت مانگے اور اپنی جائز ضرورتوں کے لیے اُس سے دعا کرے تو بلاشبہ وہ بھی بڑا خوش نصیب ہے اور رب کریم ہرگز اس کو شب قدر کی برکتوں اور رحمتوں سے محروم نہ رکھے گا۔

شب قدر کی خاص دُعا

مسند احمد اور جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! اگر مجھے کبھی معلوم ہو جائے کہ آج کی رات شب قدر ہے تو میں اُس رات میں اللہ تعالیٰ سے کیا خاص دعا کروں؟ کیا مانگوں؟ آپ نے مجھے یہ دعا تلقین فرمائی

"اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ کَرِیْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ"

اے میرے اللہ تو قصور وار بندوں کو بہت معاف کرنے والا اور بڑا رحیم کریم ہے اور قصور معاف کر دینے کو تو پسند فرماتا ہے تو بس مجھے معافی دیدے۔

زندگی میں پہلے بھی بار بار رمضان مبارک اور اس کا آخری عشرہ اس ناچیز راقم سطور کو اور

ناظرین کرام کو نصیب ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سال (۱۳۹۷ھ) میں بھی نصیب فرمایا، خدا ہی جانتا ہے کہ ہم میں سے کس کس کے لیے یہ آخری رمضان اور اس کا آخری "عشرہ اخیرہ" ہے اور ان کے لیے ان کی رحمتوں اور برکتوں سے فائدہ اٹھانے کا یہ آخری موقع ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ان سطروں کے لکھنے والے اور ان کے ناظرین کو رمضان مبارک اور عشرہ اخیرہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے اور ان محروموں میں سے نہ کرے جنھیں یہ ہدایات پہنچیں اور انھوں نے کوئی نفع نہ اٹھایا، بےشک یہ محرومی بڑی محرومی ہے۔

اعتذار

الفرقان میں ایسے اشتہارات شائع کرنے سے پرہیز کیا جاتا ہے جن میں کسی جاندار کی تصویر ہو۔ لیکن گزشتہ شمارہ (بابت اگست ۱۹۷۷ء) کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر ادارہ کے اصول کے خلاف ایک باتصویر اشتہار شائع ہو گیا ـــــ ہوا یہ کہ راقم سطور جو الفرقان کی ترتیب و تیاری اور اشاعت کے کاموں کا ذمہ دار ہے دو ہفتے علیل رہا اور ان دنوں میں دفتر بھی نہیں آسکا۔ اسی دوران جب گزشتہ شمارے کی طباعت کا وقت آیا تو دفتر کے ایک کارکن نے اشتہار کا یہ بلاک جو مشتہر ایجنسی کی طرف سے آیا ہوا تھا بغیر دیکھے پریس بھجوا دیا۔ اس طرح لاعلمی میں یہ تصویر والا اشتہار چھپ گیا۔

ہمیں اس دفتری فروگذاشت پر افسوس ہے۔ (مرتب)

درسِ قرآن ——— مولانا محمد منظور نعمانی

(۵ر اگست ۱۹۷۷ء یوم جمعہ)

● خدا سے ڈرو، آخرت کی فکر اور تیاری کرو!
● اُس دن کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا، نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔
● قیامت کب آئے گی؟ یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔

اعوذ، بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِي
وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا ۚ
إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّ
نَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ○ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ
الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ
غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○

(لقمان ۳۴)

اے لوگو، آدم کے فرزندو، اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو اور اُس دن کا خوف کرو جب کوئی باپ اپنے بیٹے کے اور کوئی بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام نہ آئے گا، یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے (اٹل ہے) بس دیکھو کہیں دنیا کی زندگی تم کو (غفلت اور) دھوکے میں نہ ڈال دے، اور فریب دینے والا (شیطان)

تم کو خدا کے معاملہ میں مبتلائے فریب نہ کر دے۔ بے شک اللہ ہی کو ہے قیامت کا
علم (وہی جانتا ہے کب وہ برپا ہوگی) اور (اپنے علم و حکمت کے مطابق وہی مینھ
برساتا ہے، اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم مادر میں (حاملہ ماؤں کے پیٹ میں) ہے، اور
کسی متنفس کو علم نہیں کہ کل وہ کیا کرے گا، اور کسی کو خبر نہیں کہ کس سرزمین میں وہ
مرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بہت باخبر ہے۔

(سورۂ لقمان آخری آیات)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ لقمان کی بالکل آخری آیتیں ہیں، اسی درس کے سلسلہ میں پہلے بھی کئی بار میں نے یہ بات کہی ہے کہ اکثر بڑی اور متوسط درجہ کی سورتوں میں ایسا ہے کہ قرآن پاک کے خاص دعوتی اور تذکیری انداز میں مختلف مضامین بیان ہوتے رہتے ہیں اور سورت کے خاتمہ میں اُس کا اہم پیغام ہوتا ہے اور اس کی حیثیت گویا مقطع کے بند کی سی ہوتی ہے۔ سورۂ لقمان کی یہ آخری آیتیں جن کی میں نے اس وقت تلاوت کی ان کی حیثیت بھی یہی ہے ـــــ ارشاد فرمایا گیا ہے "یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ" اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو، ـــــ ڈرنے کی بہت سی صورتیں اور قسمیں ہیں ایک ڈرنا شیر اور چیتے جیسے خونخوار درندوں سے یا رہزنوں، ڈاکوؤں اور خطرناک جانی دشمنوں سے ہوتا ہے ....

اور ایک ڈرنا مثلاً لائق بیٹے کا باپ سے یا سعادت مند شاگرد یا مرید کا اپنے شفیق استاد یا شیخ سے یا کسی صادق محب کا اپنے محبوب سے ہوتا ہے ـــــ پہلی قسم کے ڈر میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی جس سے ڈرتا ہے، اپنے بچاؤ کے لیے اُس سے دور بھاگتا ہے اور اگر قدرت ہو تو خود حملہ کرکے اُس کو ہلاک کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے ڈر کا تقاضا اس بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لائق بیٹا جو باپ سے ڈرتا ہے، اسی طرح سعادت مند شاگرد اور مرید جو اپنے استاد یا شیخ سے ڈرتا ہے، اسی طرح صادق محب جو محبوب سے ڈرتا ہے تو ان سب کے ڈر کی بنیاد قلبی تعلق اور محبت پر ہوتی ہے اور اس ڈر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جس سے ڈرتے ہیں جس طرح بھی ممکن ہو اُس کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان باتوں

سے بچتے ہیں جن سے اُس کی ناراضی کا خطرہ ہو ـــــ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہمارا اور ہمارے ماں باپ کا اور سب کائنات کا خالق اور پروردگار ہے اور اُس کے ہاتھ میں سب کی موت و حیات اور عزت و ذلت اور دکھ اور سکھ ہے اور وہ اپنے جلال و جمال اور کمالات و احسانات کی وجہ سے سب سے زیادہ محبت اور سب سے زیادہ ڈر کا مستحق ہے اور اس محبت اور ڈر کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کی کامل اطاعت و فرمانبرداری کی جائے، اُس کی نافرمانی سے اور اس کو ناراض کرنے والی ہر بات سے بچنے کی کوشش کی جائے ـــــ یہ قرآن پاک کی بنیادی ہدایتوں میں سے ہے، جا بجا عام بندوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "یَاأَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ" اسی طرح بہت جگہ خاص ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے "یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ" تو سورۂ لقمان کی اس آیت میں پہلی ہدایت یہی فرمائی گئی ہے کہ "اے لوگو! اپنے خالق پروردگار سے یعنی اس کی ناراضی اور اُس کے غضب و عذاب سے ڈرتے رہو۔

اس کے آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِی وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَیْئًا" (اور قیامت کے اُس دن سے خائف رہو جس دن کوئی اولاد والا اپنی اولاد کے کام نہ آئے گا اور اسی طرح اولاد اپنے ماں باپ کے کام نہ آئے گی) ـــــ اس دنیا میں کسی پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو کم از کم ماں باپ اور اولاد تو ضرور ہی ساتھ دیتے ہیں اور جس طرح بن پڑتا ہے کچھ نہ کچھ مدد کرتے ہیں، لیکن جب قیامت آئے گی اور اللہ تعالیٰ کے جلال کا ظہور ہوگا تو ہر شخص کے لیے ایسا سخت وقت ہوگا کہ ماں باپ کو اولاد کا ہوش نہ ہوگا اور اولاد کو ماں باپ کا خیال نہ ہوگا، ہر ایک کو صرف اپنی فکر ہوگی، "نفسی نفسی" کا عالم ہوگا ـــــ ایک حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں وارد ہوا ہے کہ "یقول متعلقاً بساق العرش، رب نفسی لا اسئلک غیرها" یعنی اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُس دن یہ حال ہوگا کہ عرش الٰہی کا پایہ پکڑے عرض کرتے ہوں گے "خداوندا بس مجھے بخش دیا جائے، میں اس کے علاوہ تجھ سے کچھ نہیں مانگتا" ـــــ اور شفاعت کی مشہور حدیث میں ہے

کہ جب قیامت برپا ہوگی اور تمام اولین و آخرین میدان حشر میں جمع ہوں گے تو سب بے حد پریشان ہوں گے، سب سے پہلے آدم علیہ السلام سے اُس کے بعد حضرت نوح سے اور پھر باری باری حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام سے عرض کیا جائے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کر دیجیے کہ ہمارے بارہ میں فیصلہ فرما دیا جائے، لیکن اللہ کے یہ سب اولوالعزم پیغمبر بھی اُس وقت خداوندی جلال سے اس قدر خوف زدہ اور لرزاں و ترساں ہوں گے کہ ہر ایک عذر کرے گا، ان میں سے کسی کو بارگاہ خداوندی میں کچھ عرض کرنے کی بھی جرأت نہ ہوگی ——— آخر میں یہ اہل محشر خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے شفاعت کے لیے عرض کریں گے، آپ فرمائیں گے "اَنَا لَہَا اَنَا لَہَا" آگے حدیث شریف میں ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ) میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہوں گا، جب اجازت مل جائے گی تو جا کر میں اللہ کے حضور میں سجدہ میں گر جاؤں گا، اور اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حمد و ثنا القا ہوگی وہ کرتا رہوں گا اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے سر اٹھانے کا حکم نہ ہوگا سجدہ میں پڑا رہوں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک ہفتہ کے بقدر سجدہ میں پڑا رہوں گا) پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوگا "یا محمد ارفع راسک، سَلْ تُعطہ واشفع تشفع" (اے محمد سجدہ سے سر اٹھاؤ، اگر کچھ مانگنا چاہتے ہو تو مانگو، تم کو عطا کیا جائے گا اور اگر شفاعت و سفارش کرنا چاہتے ہو تو کرو، تمھاری سفارش قبول کی جائے گی) آگے حدیث شریف میں ہے کہ اس اجازت کے بعد آپ سفارش فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حد مقرر کر دی جائے گی کہ اس درجہ کے اور اس نمبر کے مجرموں کو عذاب سے چھٹی دیدی جائے ——— چنانچہ اُن کو نکال لیا جائے گا، اس کے بعد جو لوگ رہ جائیں گے اُن کے لیے بھی حضور بار بار اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو کر اُسی طرح عرض معروض کریں گے اور ہر دفعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حد مقرر فرما دی جائے گی اور جو لوگ اُس حد اور اُس دائرہ میں آتے ہوں گے اُن کو نکلوا لیا جائے گا ——— پھر آخر میں اللہ تعالیٰ گنہگاروں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی طرف سے اور اپنی رحمت سے بھی بخشے گا۔

بہرحال قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے جلال کا ایسا ظہور ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام

بھی لرزاں و ترساں ہوں گے اور نفسی نفسی کا عالم ہو گا ـــــــ تو اس آیت میں پہلے تو فرمایا گیا کہ اے لوگو اپنے پروردگار سے یعنی اس کے عذاب اور غضب سے ڈرتے رہو۔ اس کے بعد فرمایا گیا کہ قیامت کے اس دن کا بھی خوف کرو جب باپ بیٹے کے اور بیٹا باپ کے کام نہ آسکے گا، ہر ایک اپنی فکر میں ڈوبا ہو گا۔

آگے فرمایا گیا ہے "اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ؁" یعنی اللہ کا یہ وعدہ کہ قیامت آئے گی حق ہے، اٹل ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ایسا نہ ہو کہ اس دنیوی زندگی کی دلچسپیاں اور سرمستیاں تم کو فریب میں مبتلا کر دیں اور تم قیامت کی طرف سے بے فکر اور غافل ہو جاؤ اور ایسا نہ ہو کہ تمہارا دشمن شیطان تمہیں خدا کے بارہ میں دھوکے میں ڈال دے، مثلاً تمہیں پٹی پڑھا دے کہ اللہ غفور رحیم ہے ارحم الراحمین ہے، ہماری زندگی اور ہمارے اعمال جیسے بھی ہوں وہ بخش ہی دے گا۔ یا مثلاً یہ کہ ہم اس کے حبیب کے امتی ہیں جنت ہمارے ہی لیے بنی ہے، دوزخ کی آگ ہمیں چھو ہی نہیں سکتی، اللہ نے آپ کے ہر امتی پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے ـــــــ تو اگر کوئی ایسا خیال کر کے خدا کی نافرمانی والی زندگی گزار رہا ہے تو وہ شیطانی فریب اور دھوکے کا شکار ہے اس نے خدا کی کتاب قرآن پاک اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بجائے شیطان کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ جس نے یہود و نصاریٰ وغیرہ اگلی امتوں کے لوگوں کو اسی طرح کے فریب میں مبتلا کر کے گمراہ اور برباد کیا تھا ـــــــ تو اس آیت میں آگاہی دی گئی ہے کہ لوگو عیش دنیا میں منہمک ہو کر خدا کو اور آخرت کو نہ بھول جاؤ اور شیطان کے دھوکے اور فریب سے بھی ہوشیار رہو۔ (فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ؁)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے " اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ...... تا ...... اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ؁" جب قیامت اور اس کی ہولناکیوں کا ذکر کیا جائے اور اس سے ڈرنے کی بات کی جائے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہو گا کہ وہ قیامت کب آئے گی؟ اور مکے کے کافر و مشرک جو قیامت و آخرت کے اور حشر و نشر کے منکر تھے وہ تمسخر اور استہزا کے طور پر بھی پوچھتے تھے کہ یہ قیامت جس کا آپ بار بار ذکر کرتے ہیں اور جس سے ہم کو ڈراتے ہیں بتلائیے کہ وہ کب کس سنہ اور مہینے میں اور

کس دن برپا ہوگی؟ اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل ایمان بھی چاہتے تھے کہ اگر معلوم ہو سکتا ہو تو معلوم ہو جائے کہ قیامت کب آنے والی ہے اور دلوں میں یہ سوال پیدا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا اس سوال کا ذکر کیا گیا ہے اور ہر جگہ اس کا ایک ہی جواب دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ قیامت کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اس نے اس کا علم کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا ــــ سورۂ اعراف کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝" اس آیت میں پوری صراحت اور قطعیت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ جو لوگ آپ سے قیامت کے بارہ میں سوال کرتے ہیں آپ ان سے صاف صاف فرما دیجیے کہ قیامت کے خاص وقت کا علم بس میرے اللہ ہی کو ہے ــــ اس آیت کے علاوہ بھی قرآن پاک میں کم از کم ۱۰-۱۲ جگہ پوری صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اس کے سوا کوئی اس کو نہیں جانتا ــــ سورۂ لقمان کی اس آخری آیت میں بھی یہی فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" (حق یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کو ہے قیامت کے خاص وقت کا علم) اس کے ساتھ آگے ۴ چیزوں کا اور ذکر فرمایا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قیامت کی طرح ان چار چیزوں کا علم بھی صرف اللہ ہی کو ہے ــــ ایک بارش کا علم کہ وہ کب ہوگی کتنی ہوگی کس علاقہ میں ہوگی، اس کے کیا اثرات و نتائج ہوں گے "يُنَزِّلُ الْغَيْثَ" کا لفظ ان سب چیزوں کو حاوی ہے ــــ دوسری چیز "مَا فِي الْاَرْحَامِ" کا علم، یعنی ماؤں کے پیٹوں میں ان کی بچہ دانیوں میں جو بچے ہیں ان کے بارے میں تفصیلی معلومات کہ وہ مذکر ہے یا مؤنث اس کے حالات کیا ہیں اور کیا ہوں گے، اس کے کیسے اخلاق اور اعمال ہوں گے، وہ شقی ہوگا یا سعید؟ "وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ" [illegible] سب چیزوں پر حاوی ہے۔ تیسری چیز، مستقبل میں ہونے والے واقعات [illegible] چوتھی چیز کہ کس کو کس سرزمین میں موت آنی ہے۔

الغرض اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے وقت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے اور بارش اور مَا فِي الْاَرْحَام اور آئندہ زندگی کے احوال، اور ہر متنفس کے مقام موت کا علم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ یعنی ان چیزوں کا کلی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نبی ورسول کو اللہ کی وحی سے یا کسی صالح امتی کو الہام سے یا خواب وغیرہ کے ذریعہ ان میں سے کسی خاص جزئی بات کا علم ہو جائے مثلاً یہ کہ آج انشاء اللہ بارش ہوگی، یا مثلاً یہ کہ فلاں عورت کے انشاء اللہ لڑکا پیدا ہوگا اور خدا نے چاہا تو بڑا خوش نصیب ہوگا، جیسے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ کی پیدائش کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کا اور حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں نے دی تھی ـــــ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ وحی یا الہام کے ذریعہ آئندہ ظاہر ہونے والے کسی واقعہ اور حادثہ کی یا کسی شخص کے کسی خاص جگہ وفات پانے کی کسی بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دیدی جائے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے ظہور کی اور بہت سے فتنوں کے قیامت سے پہلے ظاہر ہونے کی خبر دی ہے تو یہ اس آیت کے مضمون کے منافی نہیں ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان چاروں چیزوں کا کلی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور اُس کے سوا کوئی نہیں جس کا علم ان چیزوں کو حاوی اور محیط ہو۔

حدیث کی قریب قریب سب ہی کتابوں میں ایک حدیث پاک روایت کی گئی ہے وہ "حدیث جبرئیل" کے نام سے معروف ہے اور بہت مشہور حدیث ہے۔ آپ حضرات نے کتابوں میں وہ حدیث پڑھی ہوگی یا اس کا مضمون سنا ہوگا، اس درس کے سلسلے میں بھی بار بار اس کا تذکرہ آیا ہے ـــــ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، بہت صاف ستھرا ایک اجنبی شخص آیا جس کو مجمع میں سے کوئی شخص بھی نہیں جانتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ نووارد کوئی بیرونی شخص ہے اور پردیسی ہے، پھر اُس نے یہ عجیب وغریب حرکت کی کہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مجمع کے اندر سے بڑھتا ہوا ٹھیک حضور کے سامنے آکر اور آپ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا، اس کے اس رویہ سے سب لوگ

حیران اور ششدر تھے لیکن حضور کے ادب کی وجہ سے کوئی زبان نہ ہلا سکا۔ اس کے بعد اُس نو وارد نے سوال کیا: مَا الْاِیْمَانُ ؟" (بتلائیے ایمان کیا ہے؟) آپ نے ایمان کی وضاحت فرمائی اور بتلایا کہ ایمان کی اجمالی اور بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کو، اُس کے فرشتوں کو، اُس کی کتابوں کو، اُس کے رسولوں کو اور قیامت و آخرت کو اور ہر چیز کے مقدر من اللہ ہونے کو حق مانا جائے اور ان سب باتوں کو دل و زبان سے قبول کیا جائے —— اُس نو وارد نے حضور کا جواب سنکر کہا کہ "صَدَقْتَ" (یعنی آپ نے ٹھیک بتایا) صحابہ کو حیرت ہوئی کہ یہ سائل ہے یا ممتحن ہے؟ جو کہتا ہے کہ "آپ نے ٹھیک بتایا" —— اس کے بعد اس نے حضور سے "اسلام" کے بارہ میں اور اس کے بعد "احسان" کے بارہ میں سوال کیا کہ ان کی حقیقت پر روشنی ڈالئے! آپ نے اسلام کے بارے میں وضاحت فرمائی تو پھر اُس نے کہا "صَدَقْتَ" اسی طرح احسان کے بارہ میں حضور کا جواب سُن کر اُس نے کہا "صَدَقْتَ" (آپ نے ٹھیک کہا) صحابہ کرام یہ سب حیرت سے اور غالباً ناگواری سے دیکھتے اور سنتے رہے —— آخر میں اُس نو وارد نے حضور سے سوال کیا "مَتَی السَّاعَۃُ؟" (بتلائیے کہ قیامت کب آئے گی؟) اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا! "مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْھَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" یعنی اس کا علم جس طرح سائل کو یعنی تم کو نہیں ہے اسی طرح مسئول عنہ کو یعنی مجھے بھی نہیں ہے —— اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الاٰیۃ" یعنی آپ نے نو وارد سائل کو مذکورہ بالا جواب دینے کے بعد (جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کا علم جس طرح تم کو نہیں اسی طرح مجھ کو بھی نہیں ہے) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ تو اُن پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کسی مخلوق کو نہیں اور حوالہ کے طور پر حضور نے سورۂ لقمان کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الاٰیۃ"

اس حدیث کے آخر میں یہ بھی ہے کہ یہ سوال کرنے والے نو وارد دراصل اللہ کے مقرب فرشتے حضرت جبرئیل تھے، اُس وقت ایک اجنبی مسافر کی شکل میں آئے تھے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُن کو اُس وقت نہیں پہچانا تھا، اُن کے چلے جانے کے بعد آپ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ جبرئیل تھے تو حضور نے صحابہ کو بتلایا کہ "اِنَّہٗ جِبْرَئِیْلُ اَتَاکُمْ لِیُعَلِّمَکُمْ دِیْنَکُمْ" (یہ جبرئیل امین تھے یہ اس لیے آئے تھے کہ اس سوال جواب کے ذریعہ تم کو تمھارے دین کی اصولی

اور بنیادی تعلیم دیدیں) حضور کے اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان، اسلام اور احسان کی طرح یہ عقیدہ بھی دین کی اہم تعلیمات میں سے ہے کہ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے سید الملائکہ حضرت جبرئیل امین سید الانبیاء و المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں دیا گیا ـــــ اس حدیث کی بعض روایتوں میں یہ صراحت ہے کہ یہ واقعہ حضور کی حیات مبارک کے آخری دور کا ہے۔

اور اس میں بڑی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں بتلایا اور کسی پر یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ "قیامت کب برپا ہوگی" اور جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآن پاک میں جا بجا اس کا اعلان فرمایا گیا ہے اور بلاشبہ یہ عقیدہ قرآن پاک کے "محکمات" اور "بینات" میں سے ہے ـــــ اس مسئلہ کے بارہ میں قرآن مجید کی صاف صریح آیتوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے کھلے ارشادات کے برخلاف جو لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام ما کان وما یکون کا علم تھا اس لیے علوم خمسہ کو بھی آپ کا علم محیط تھا اور آپ کو قیامت کا وقت بھی معلوم تھا اور وہ اس کو حضورؐ کی محبت اور تعظیم کا تقاضا کہتے ہیں اُن کے اندر گمراہی کی وہی روح کام کر رہی ہے جس نے عیسائیوں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" اور "ثالث ثلٰثۃ" اور خدائی کا شریک کہلوایا ـــــ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو قریباً چار سو سال پہلے کے حنفی فقیہ اور محدث ہیں اپنی کتاب "موضوعات کبیر" میں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں لکھا ہے "فیھم مشبہ ظاھر من النصاریٰ" یعنی یہ لوگ بالکل عیسائیوں کے مشابہ ہیں اور اسی گمراہی میں مبتلا ہیں جس میں شیطان نے عیسائیوں کو مبتلا کیا تھا ـــــ شیطان محبت اور عظمت کے نام پر بڑی سے بڑی گمراہی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے تمام محبوبین کی وہ محبت وعظمت بھرپور نصیب فرمائے جو عین ایمان ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ رَسُوْلِکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُ اِلٰی حُبِّکَ۔

سورۂ لقمان کی اسی آیت کے ذیل میں تفسیر مدارک التنزیل اور تفسیر مظہری وغیرہ میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ کہ خلیفہ منصور عباسی نے خواب میں ملک الموت کو دیکھا تو اُن سے پوچھا

کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ انھوں نے ہاتھ کی پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا۔ کسی نے اس کی تعبیر پانچ سال دی کسی نے پانچ مہینے یا پانچ دن۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ملک الموت کے اشارہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُن پانچ باتوں میں سے ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اور سورۂ لقمان کی یہی آیت آپ نے تلاوت فرمائی۔ "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔"

بہرحال اس آیت میں صراحت اور وضاحت سے فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے خاص وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس کے علاوہ نزول باراں، مافی الارحام، مستقبل میں کیا ہوگا؟ اور کون کہاں کس سرزمین میں مرے گا؟ ان باتوں کا علم کُلّی بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور ہستی کو بھی ان علوم کا عالم مانتا ہے تو وہ قرآن کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے اور ایک درجہ کے شرک میں مبتلا ہے ۔۔۔ اسی لیے اس مسئلہ کو اس وقت میں نے کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سورۂ لقمان کی ان آخری آیتوں کا بلکہ پوری سورۃ کا خاص پیغام اور سبق یہ ہے کہ خدا کی پکڑ اور اس کے غضب و عذاب سے ڈرتے رہو اور اس روز قیامت کی فکر کرو جب کوئی کسی مجرم کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا ماں باپ اولاد کو نہ بچا سکیں گے اور اولاد ماں باپ کو نہ بچا سکے گی، اُس دن بس ایمان اور اعمال صالحہ ہی کام آئیں گے اور شفاعت بھی اُن کی ہوگی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ کی اجازت ہوگی ۔۔۔ قرآن پاک میں جا بجا فرمایا گیا ہے۔ "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ"۔ اور ۔۔۔ "وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی"

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ نَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ۔

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

ربا (سود)

دنیا کے دوسرے ملکوں اور قوموں کی طرح عربوں میں بھی سودی لین دین کا رواج تھا اور ہمارے یہاں کے سود خور مہاجنوں کی طرح وہاں بھی کچھ سرمایہ دار یہ کاروبار کرتے تھے جس کی عام مروج و معروف صورت یہی تھی کہ ضرورت مند لوگ اُن سے قرض لیتے اور طے ہو جاتا کہ یہ رقم وہ فلاں وقت تک اتنے اضافے کے ساتھ ادا کر دیں گے ــــ پھر اگر مقررہ وقت پر قرض لینے والا ادا نہ کر سکتا تو مزید مہلت لے لیتا اور اس مہلت کے حساب میں سود کی رقم میں اور اضافہ طے ہو جاتا۔ اس طرح غریب قرض داروں کا بوجھ بڑھتا رہتا اور سود خور مہاجن اُن کا خون چوستے رہتے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ اسلام کی تعلیم اور ہدایت تو اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ غریبوں کی مدد کی جائے، کمزوروں کو سہارا دیا جائے اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جائے اور یہ سب اپنی کسی دنیوی مصلحت و منفعت کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا اور آخرت کے ثواب کے لیے کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک قرآن مجید میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں جس طرح اُم الخبائث شراب سے لوگوں کو بچانے کے لیے تدریجی رویہ اختیار فرمایا، اسی طرح سود کے ظالمانہ اور لعنتی کاروبار کے رواج کو ختم کرنے کے لیے بھی اسی حکمت عملی کو استعمال کیا گیا۔ شروع میں طویل مدت تک صرف مثبت انداز میں اس بات پر زور دیا گیا کہ

اپنی دولت فی سبیل اللہ خرچ کرو، غریبوں کی مدد کرو، کمزوروں کو سہارا دو، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرو۔ رحم، سخاوت اور ایثار جیسے اخلاق کو اپناؤ، بتلایا گیا کہ تم بھی فانی ہو، تمہاری دولت بھی فنا ہو جانے والی ہے۔ اس لیے اس دولت کے ذریعہ آخرت کی ابدی فلاح اور جنت کماؤ، قارون جیسے پرستارانِ دولت کے انجام سے سبق حاصل کرو۔

اس تعلیم و ہدایت اور اس کے مطابق عمل نے معاشرہ کا مزاج ایسا بنا دیا اور فضا اس کے لیے ساز گار ہو گئی کہ اس ظالمانہ اور انسانیت کش کاروبار (ربوا۔سود) کی قطعی حرمت کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ چنانچہ اواخر سورہ بقرہ کی ۲۷۵ سے ۲۸۱ تک کی وہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں واضح طور پر ربوا (سود) کی حرمت کا اعلان کیا گیا ہے (یعنی "اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا" سے لیکر "وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" تک۔

ان آیتوں میں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ اگر پچھلے لین دین کے سلسلے کی کسی کی کوئی سودی رقم کسی مقروض کے ذمے باقی ہے تو وہ بھی اب نہیں لی دی جائے گی ——— انہی آیتوں میں آخر میں یہ بھی اعلان فرمایا گیا کہ سودی کاروبار کی حرمت کے اس اعلان کے بعد بھی جو لوگ باز نہ آئیں اور خداوندی قانون کی نافرمانی کریں ان کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے (فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) ——— اللہ کی پناہ!

یہ وعید (یعنی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ کی وعید) سودی کاروبار کے سوا زنا، شراب، خونِ ناحق وغیرہ کسی بھی بڑے سے بڑے گناہ کے بارے میں قرآن مجید میں وارد نہیں ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں یہ گناہ دوسرے سب گناہوں سے زیادہ شدید و غلیظ ہے ——— آگے درج ہونے والی حدیثوں سے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خوری کو انتہائی درجہ کے کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔ اور سود لینے والوں کے ساتھ اس کے دینے والوں یہاں تک کہ سودی دستاویز لکھنے والوں اور سودی معاملہ کے گواہ بننے والوں کو بھی مستحق لعنت قرار دیا ہے۔ اور بعض روایات میں سود کا گناہ زنا سے ستر گنا زیادہ بتلایا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اس باب کی مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھیے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجتنبوا السبع الموبقات قالوا یا رسول اللہ وما ھن؟ قال: الشرک باللہ والسحر وقتل النفس التی حرم اللہ إلا بالحق وأکل الربا وأکل مال الیتیم والتولی یوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات ـــــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات مہلک اور تباہ کن گناہوں سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون سات گناہ ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ کے ساتھ (اس کی عبادت یا صفات یا افعال میں کسی کو) شریک کرنا، اور جادو کرنا، اور ناحق کسی آدمی کو قتل کرنا، اور سود کھانا، اور یتیم کا مال کھانا، اور (اپنی جان بچانے کے لیے) جہاد میں لشکر اسلام کا ساتھ چھوڑ کے بھاگ جانا، اور اللہ کی پاکدامن بھولی بھالی بندیوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں جن گناہوں سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے یہ شدید ترین اور خبیث ترین کبیرہ گناہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "موبقات" فرمایا ہے (یعنی آدمی کو اور اس کی ایمانی روح کو ہلاک و برباد کر دینے والے) ان میں آپ نے شرک اور سحر اور قتل ناحق کے بعد اکل ربا، سود لینے اور کھانے کا ذکر فرمایا ہے اور اس کو روح ایمانی کے لیے قاتل اور مہلک بتلایا ہے۔ـــــ جس طرح اطبا اور ڈاکٹر اپنے تحقیقی علم وفن اور تجربہ کی بنا پر اس دنیا میں زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں، دواؤں، غذاؤں وغیرہ کے خواص بیان کرتے ہیں کہ فلاں چیز میں یہ خاصیت اور تاثیر ہے اور یہ آدمی کے فلاں مرض کے لیے مفید یا مضر ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے علم کی بنیاد پر انسانوں کے عقائد و افکار اور اعمال و اخلاق کے خواص اور نتائج بتلاتے ہیں کہ فلاں ایمانی عقیدہ اور فلاں نیک عمل اور فلاں اچھی خصلت کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت میں جنت کی نعمتیں اور دنیا میں قلب وروح کا سکون ہے اور فلاں کافرانہ ومشرکانہ عقیدے اور فلاں ظلم ومعصیت کا انجام اللہ کی لعنت اور دوزخ کا عذاب اور دنیا میں طرح طرح کی بے چینیاں اور پریشانیاں ہیں۔

فرق اتنا ہے کہ اطبا اور ڈاکٹروں کی تحقیق اور غور و فکر میں غلطی کا امکان ہے اور کبھی کبھی غلطی کا تجربہ بھی ہو جاتا ہے ـــــ لیکن انبیاء علیہم السلام کے علم کی بنیاد خالق کائنات اور علیم کل اللہ تعالیٰ کی وحی پر ہوتی ہے اس میں کم از کم ایمان والوں کے نزدیک غلطی کا احتمال اور کسی شک و شبہہ کی گنجائش ہی نہیں ـــــ مگر عجب معاملہ ہے کہ حکیموں ڈاکٹروں کی تجویز کی ہوئی دواؤں کو سب بلا چون و چرا اُن کے اعتماد پر استعمال کرتے ہیں، پرہیز کے بارہ میں وہ جو ہدایت دیں اس کی بھی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے اور اسی کو عقل کا تقاضا سمجھا جاتا ہے اور کسی مریض کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جاتا کہ وہ کہے کہ میں دوا جب استعمال کروں گا جب اُس کی تاثیر کا فلسفہ مجھے سمجھا دیا جائے لیکن اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اس کے رسول برحق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مثلاً سود کے بارہ میں فرمائیں کہ وہ نہایت خبیث کبیرہ گناہ اور "موبقات" میں سے ہے۔ خدا کی لعنت و غضب کا موجب اور روح ایمان کے لیے قاتل ہے اور سود خوروں کے لیے آخرت میں لرزہ خیز عذاب ہے تو بہت سے مدعیان عقل و ایمان کے لیے یہ کافی نہ ہو اور وہ اس کا "فلسفہ" معلوم کرنا ضروری سمجھیں اللہ تعالیٰ دلوں کو ایمان و یقین نصیب فرمائے۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتیت لیلۃ أُسْرِیَ بی علی قوم بطونُہُمْ کالبیوت فیہا الحیات تری من خارج بطونہم فقلت من ھؤلاء یا جبرئیل؟ قال ھؤلاء أکَلَۃُ الربوا ـــ رواہ احمد وابن ماجۃ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جس رات مجھے معراج ہوئی میرا گزر ایک ایسے گروہ پر ہوا جن کے پیٹ گھروں کی طرح ہیں اور اُن میں سانپ بھرے ہوئے ہیں جو باہر سے نظر آتے ہیں، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ (جو ایسے عذاب میں مبتلا ہیں) انھوں نے بتلایا کہ یہ سود خور لوگ ہیں۔ (مسند احمد، سنن ابن ماجہ)

تشریح :۔ شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم غیب کی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کرایا گیا، اسی ضمن میں جنت اور دوزخ کے بعض مناظر بھی دکھائے گئے تاکہ خود آپ کو "حق الیقین" کے بعد "عین الیقین" کا مقام بھی حاصل ہو جائے اور آپ ذاتی مشاہدہ کی بنا پر بھی لوگوں کو عذاب

وثواب سے آگاہ کر سکیں، اس سلسلہ میں آپ نے ایک منظر یہ بھی دیکھا جس کا اس حدیث میں ذکر ہے کہ کچھ لوگوں کے پیٹ اتنے بڑے ہیں جیسے کہ اچھا خاصا گھر اور اُن میں سانپ بھرے ہوئے ہیں جو دیکھنے والوں کو باہر ہی سے نظر آتے ہیں۔ اور آپ کے دریافت کرنے پر حضرت جبرئیل نے بتلایا کہ یہ سود لینے والے اور کھانے والے لوگ ہیں جو اس لرزہ خیز عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔
صحابۂ کرام نے حضورؐ کے اس مشاہدہ کو خود آپ کی زبان مبارک سے سنا اور اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے بعد کے راویان حدیث کو کہ ان کی محنت وعنایت کے طفیل میں حدیث کی مستند کتابوں کے ذریعہ یہ مشاہدہ ہم تک بھی پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ ویسا یقین نصیب فرمائے کہ دل کی آنکھوں سے یہ منظر ہم کو بھی نظر آئے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الربو اسبعون جزاءً ایسرها ان ینکح الرجل امه ——— رواه ابن ماجة والبیهقی فی شعب الایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سود خوری ستر حصے ہیں ان میں سے ادنیٰ اور معمولی ایسا ہے جیسے کہ اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرنا۔ (سنن ابن ماجہ۔ شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس سلسلہ معارف الحدیث میں بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ عربی محاورہ اور قرآن وحدیث کی زبان میں "سبعون" کا لفظ خاص معین عدد (۷۰) کے علاوہ کثرت اور بہتات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے بلکہ اکثر اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے ——— بہرحال اس حدیث کا مدعا اور پیغام یہ ہے کہ سود خوری اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بھی بدرجہا زیادہ شدید وخبیث گناہ ہے ——— جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے صرف یہی وہ گناہ ہے جس سے باز نہ آنے والوں کے خلاف قرآن پاک میں اللہ ورسول کی طرف سے اعلان جنگ کیا گیا ہے (فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ)

عن جابر قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم اٰکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء ——— رواه مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی

سود لینے اور کھانے والے پر اور سود دینے اور کھلانے والے پر اور سودی دستاویز لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر، آپ نے فرمایا کہ (گناہ کی شرکت میں) یہ سب برابر ہیں۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی معلوم ہوتا ہے اور عقل سلیم کے نزدیک بھی یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اصل خبیث اور موجب لعنت ظالمانہ گناہ سود لینا اور کھانا ہے ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے روایت کیے ہوئے اس ارشاد نبوی کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ سودی کاروبار ایسا خبیث اور لعنتی کاروبار ہے کہ اس میں کسی طرح کی شرکت بھی لعنت الٰہی کا موجب ہے اس بنا پر سود دینے والا، سودی دستاویز کا کاتب اور اس کے گواہ بھی لعنت میں حصہ دار ہیں۔ اس لیے جو خدا و رسول کی لعنت اور اُن کے غضب سے بچنا چاہے وہ اس کاروبار سے دور دور رہے۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا اقرض احدکم قرضاً فاھدی الیہ او حملہ علی الدابۃ فلا یرکبہ ولا یقبلھا الا ان یکون جری بینہ وبینہ قبل ذالک ——— رواہ ابن ماجہ والبیھقی فی شعب الایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی کسی کو قرض دے تو اگر وہ مقروض و مدیون آدمی قرض دینے والے کو کوئی چیز بطور ہدیہ دے یا سواری کے لیے اپنا جانور پیش کرے تو چاہیے کہ وہ اس کے ہدیہ کو قبول نہ کرے اور اس کے جانور کو سواری میں استعمال نہ کرے، الّا یہ کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے اس طرح کا تعلق اور معاملہ ہوتا رہا ہو۔

(سنن ابن ماجہ و شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) حدیث کا مدعا اور پیغام یہ ہے کہ سود کا معاملہ اتنا سنگین اور خطرناک ہے کہ اس کے ادنیٰ شبہ سے بھی بچنا چاہیے۔ جب کسی بندہ کو آدمی قرض دے تو اس کی پوری احتیاط کرے کہ اُس قرض کی وجہ سے ذرہ برابر بھی دنیوی فائدہ حاصل نہ ہو اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی بچے۔

عن عمر بن الخطاب ان آخر ما نزلت آیۃ الربوا وان رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربوا والریبۃ۔

رواہ ابن ماجۃ والدارمی

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ ربوا والی آیت (یعنی سورہ بقرہ کی جس آیت میں ربوا کی حرمت کا قطعی اعلان فرمایا گیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے) آخری دور میں نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہے۔ حضور اس دنیا سے اٹھا لیے گئے اور آپ نے ہمارے لیے اس کی پوری تفسیر و تشریح نہیں فرمائی، لہٰذا ربوا کو بالکل چھوڑ دو اور اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی پرہیز کرو۔

(سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) "ربوا" عربی زبان کا ایک عام معروف لفظ تھا جو نزول قرآن سے پہلے بھی بولا جاتا تھا اور وہاں کا ہر شخص اس کا مطلب سمجھتا تھا اور وہ وہی تھا جو اوپر تمہیدی سطروں میں بیان کیا گیا ہے اسی لیے جب حرمت ربوا والی آیت نازل ہوئی تو وہاں سب نے اس سے یہی سمجھا کہ سودی کاروبار (جس کا وہاں رواج تھا) حرام قرار دیا گیا، اس میں نہ کسی کو کوئی شبہ ہوا نہ کسی شبہ کی گنجائش تھی ـــــ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض ارشادات میں (جو آگے درج ہو رہے ہیں) خرید و فروخت کی بعض ایسی صورتوں کے بھی "ربوا" کے حکم میں ہونے کا اعلان فرمایا، جن میں کسی پہلو سے ربوا کا شائبہ تھا اور جن کو وہاں پہلے "ربوا" نہیں کہا اور سمجھا جاتا تھا مگر اس سلسلہ کی ساری جزئیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائیں بلکہ جیسا کہ حکمت شریعت کا تقاضا تھا اصولی ہدایت فرما دی اور یہ کام امت کے مجتہدین اور فقہا کے لیے رہ گیا کہ وہ آپ کی دی ہوئی اصولی ہدایات کی روشنی میں جزئیات کے بارہ میں فیصلہ کریں (تمام ابواب شریعت کا یہی حال ہے) لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو امت کے فقہا و مجتہدین کی صف اول میں ہیں، ربوا کے بارہ میں سخت وعیدوں سے ڈرتے اور لرزتے ہوئے یہ خواہش رکھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس باب (ربوا) کی وہ جزئیات بھی بیان فرما جاتے جو آپ نے بیان نہیں فرمائیں اور جن کے بارے میں اب اجتہاد سے فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اپنے اس انتہائی خدا ترسانہ اور محتاط نقطۂ نظر کی بنا پر انہوں نے اپنے اس ارشاد کے آخر میں فرمایا "فدعوا الربوا والریبۃ" یعنی اب اہل ایمان کے لیے راہ عمل یہ ہے کہ وہ "ربوا" اور اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی اپنے کو

بچائیں۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے زمانہ کے بعض دانشور مدعیان اجتہاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "ربوا" کی حقیقت مشتبہ بلکہ نامعلوم ہے اور پھر اس کی بنیاد پر وہ سود کی بہت سی مروجہ صورتوں کا جواز نکال لیتے ہیں۔

"ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

(باقی)

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

جواہر پارے

مکاتیب رشیدیہ (غیر مطبوعہ)

مولانا حکیم حافظ محمد صدیق قاسمی مراد آبادیؒ کے نام

(۱)

از بندہ رشید احمد عفی عنہٗ بعد سلام مسنون آنکہ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا۔ جو امور آپ نے استفسار کیے ہیں (ان میں سے) بعض کو تو کچھ لکھتا ہوں اور بعض (کے جواب) سے معذور ہوں، معاف فرما دیں۔ کوتہ قلمی کی وجہ سے تحریر میں ضبط نہیں کر سکتا۔

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوْٓا الخ[1] — جلالین میں اول قراءۃ تری بصیغۂ خطاب کو لیا اور رویت کو رویۃ بصری ٹھہرا کر الذین ظلموا کو مفعول بنایا اور اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ کو ظرف بنایا بمعنی رویۃ بصری کے۔ سو ترجمہ یہ ہوا کہ اگر دیکھے تو ظالموں کو وقت دیکھنے ظالموں کے عذاب کو۔ اور جواب لو کا محذوف نکالا۔ کہ آیت

عہ یہ مکتوبات مجھ کو حکیم محمد عمر صاحب مراد آبادی زید مجدہم نبیرۂ حضرت مولانا حکیم محمد صدیق مراد آبادیؒ سے حاصل ہوئے۔ موصوف کے شکریہ کے ساتھ ان خطوط کو الفرقان میں شائع کرا کے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے — مولانا حکیم محمد صدیق احمد قاسمی مراد آبادی کا تذکرہ اسی سلسلہ میں پہلے کیا جا چکا ہے — (نسیم احمد فریدی غفرلہٗ)

[1] ولو یری الذین ظلموا (الآیۃ) پارہ ۲ رکوع ۳

امرًا عظیماً اور اَنَّ القوۃ کو مجرور دلیل اس کی بنایا، اس میں تو کچھ خفا نہیں۔ پھر کہنا کہ و فی قراءۃ یرون بالتحتانیۃ اور اس قراءۃ پر اگر فاعل ضمیر سامع کی ہو تو بھی رویۃ بصری ہے اور سب معنی مثل سابق کے ہوں گے۔ اور جو الذین ظلموا کو فاعل بنا دیں تو اب رویۃ علمی کہتا ہے[1] یعنی اگر جانتے ظالموں۔ اور اَنَّ القوۃ للہ کو قائم مقام دو مفعول کا اور اذ یرون العذاب کو ظرف مثل سابق کے بمعنی رویۃ بصری۔ پس معنی یہ ہوئے کہ اگر جانتے ظالموں کہ قوۃ سب حق تعالیٰ کو ہے وقت دیکھنے عذاب کے اور جواب محذوف۔ پس اذ یرون العذاب کا ظرف ہونا دشوار ہے اور یہی اس میں اشکال ہے سو اگر اذ یرون العذاب کو مبدل منہ اور اَنَّ القوۃ کو اس کا بدل کر دیا جاوے تو معنی درست ہو جاتے ہیں۔ اس طرح — اگر جانتے ظالم وقت دیکھنے عذاب کو، اس کو کہ قوت سب حق تعالیٰ کو ہے اور اللہ کا عذاب شدید ہے — اور جواب لو کا محذوف ہے۔ اب کچھ خدشہ نہیں۔ اور دوسری توجیہ بھی ممکن ہے۔ تم کو یہی کافی ہے۔

من الآیات[2] اگر حال تتلوہ کی ضمیر سے واقع ہو گا تو عامل ذلک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بالضرور یہاں عبارت حذف ہو گئی اور غلطی کاتب ہوئی۔

سو اس طرح عبارت ہے: من الآیات حال او تتلوہ حال وعاملہما فی ذلک من معنی الاشارۃ۔ الخ

اور آیۃ یتفیؤ[3] الخ میں وجوہ جمع شمائل۔ و افرادِ یمین کی تفسیر کبیر میں مذکور ہیں۔ کہیں سے طلب کر کے دیکھ لیویں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ یمین جانب شرق کو قرار دیا ہے سو مخرجِ ظل واحد ہے اور پھر مغرب کی طرف جانے میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا شمائل کو جمع فرمایا ہے۔ اور پوری تقریر آیۂ شہادۃ بینکم[4] کی لکھ نہیں سکتا ہوں۔[5] اور حق یہ ہے کہ یہ بھی

---

[1] یعنی صاحب جلالین کہتا ہے

[2] پارہ ۲ رکوع ۱۳

[3] پارہ ۱۴ رکوع ۱۱

[4] پارہ ۷ رکوع ۳

[5] یہ مکتوب گرامی ایک علمی مکتوب ہے اور اہل علم حضرات خصوصاً مدرسین و معلمین علم تفسیر کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے بہتر یہ ہے کہ اس مکتوب کے مطالعہ کے وقت جلالین کو سامنے رکھا جائے۔ (نسیم احمد فریدی)

جو لکھا ہے، بخوبی بسط اس کی زبانی ہو سکتی ہے۔ تحریر میں بسبب عدم فرصت نہایت قاصر ہوں۔
لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ فقط والسلام
اور سب احباب کو سلام مسنون فرما دیں۔

---

(۲)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے لیے دست بدعا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور آپ کے حسن ظن سے اس عاجز کی دعا قبول فرما کر آپ کو کامیابی بخشے۔ مجھ سے سوائے دعائے خیر کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ بعد نماز عشاء پانچسو بار۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھ لیا کریں اور حق تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔ وہ ہی سب کا کفیل و کارساز ہے۔ فقط والسلام

از بندہ محمد یحییٰ السلام علیکم۔ والا نامہ باعث منت ہوا تھا۔ اُس کی تعمیل کی گئی۔
فقط والسلام

---

(۳)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ مولوی حکیم محمد صدیق صاحب۔ بعد سلام مسنون آنکہ۔ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے کیفیت مرض اہلیہ محمد فاروق سے ملال ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت بخشے۔ میں دست بدعا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع کریں۔ فقط والسلام

---

(۴)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ، عنایت فرمائے بندہ حافظ محمد صدیق صاحب بعد سلام مسنون الاسلام مطالعہ فرمایند ــــــ بندہ بخیریت ہے۔ مژدۂ عافیت باعث اطمینان ہوا۔ میں دعا گو ہوں۔ حصولِ مقاصد کے لیے دست بدعا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بار گراں قرض

لہ حکیم محمد صدیق صاحب کے چھوٹے صاحبزادے۔

سے سبکدوشی بخشئے۔ آمین

مولوی عبد الرحمن صاحب سلمہ بعد سلام مسنون الاسلام اینکہ بندہ آپ کے لیے دست بدعا ہے۔ کام جو کچھ آپ کو بتلایا ہے وہ کرتے رہیں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں وہ ہی کفیل وکارساز ہے۔ فقط والسلام۔

---

(۵)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ، بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند

بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے کیفیت دریافت ہوئی۔ میری طبیعت اب بحمد اللہ اچھی ہے اطمینان رکھیں۔ آپ کے لیے اور جملہ احباب کے لیے دست بدعا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اور آپ کے حسن ظن سے قبول فرمادے اور آپ کو صحت تامہ بخشے۔ میں سوائے دعائے خیر کے اور کیا کرسکتا ہوں۔ آمین فقط والسلام

از بندہ محمد یحییٰ عفی عنہ السلام علیکم۔ اچکن اور چادر تلاش کرکے ان شاء اللہ بھیجی جاوے گی۔ آپ کا خط جب آیا تو نواب صاحب[۳] جا چکے تھے۔ والسلام

---

(۶)

مولانا عبد الرحمن مراد آبادی[۴] کے نام[۵]

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ بعد سلام مسنون آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے لیے

---

[۱] حکیم محمد صدیق صاحب کے بڑے صاحبزادے [۵] یہ کلمات حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے تحریر فرمائے ہیں۔ [۳] غالباً نواب محی الدین خاں فاروقی مراد آبادی مراد ہیں جو قاضی بھوپال تھے۔

[۴] مولانا عبد الرحمن صاحب مراد آبادی، مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مراد آبادی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ عربی وفارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ جگر مراد آبادی نے بھی مولانا عبد الرحمن صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

دست بدعا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے قبول فرماوے اور مقاصد دارین بر لاوے۔
درود وظائف، تلاوت کلام پاک جس قدر جس وقت ہو سکے کر لیا کریں اور معمول کو ناغہ نہ ہونے دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہتر ہی ہوگا۔ اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا اور حق تعالیٰ کی طاعت وعبادت میں اپنے کو قاصر سمجھتے رہنا ہی بڑا مقصود ہے اس کو محمود سمجھیں نہ (کہ) مذموم ———

بخدمت مولوی محمد صدیق صاحب سلام مسنون۔ فقط والسلام

۵ ذی الحجہ روز سہ شنبہ (سنہ مذکور نہیں ہے)

[اس مکتوب کی پشت پر حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ نے حسب ذیل کلمات تحریر فرمائے ہیں۔]

از بندہ محمد یحییٰ عفی عنہ بعد سلام مسنون گزارش آنکہ نیازمند کو بھی گاہ گاہ دونوں حضرات دعائے سحری میں یاد فرمالیا کریں کہ حق تعالیٰ اپنی مرضیات میں چلاوے اور خاتمہ ایمان پر فرماوے۔ فقط والسلام

---

(۷)

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ، مولوی عبد الرحمٰن سلمہ بعد سلام مسنون آنکہ ——
بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے کیفیت معلوم ہوئی۔ میں دعاگو ہوں۔ جملہ مقاصد کے لیے دست بدعا ہوں اللہ پاک اپنے فضل وکرم سے قبول فرماوے۔
اطریفل زمانی کا استعمال مفید و مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۶ ماشہ سوتے وقت کھالیا کریں۔ اللہ تعالیٰ شافی مطلق ہے۔ فقط والسلام

از بندہ محمد یحییٰ سلام مسنون۔

---

(۸)

منشی محمد اسحاق صاحب مرادآبادی کے نام[1]

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ منشی محمد اسحاق صاحب سلمہ بعد سلام مسنون مطالعہ

---

[1] منشی محمد اسحاق صاحب محلہ نواب پورہ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ شاہی مرادآباد میں (باقی اگلے صفحہ پر)

فرمایند۔ آپ کا پرچہ آیا۔ حال معلوم ہوا۔ یہ عاجز بفضلہ تعالیٰ تندرست ہے۔ مولوی محمد صدیق کے مقروض ہونے سے پریشانی ہوئی۔ حق تعالیٰ ان کو سبکدوش قرض سے فرمادے۔ بندہ بھی دعا کرتا ہے اگر وہ دعوات جو حدیث میں قرض کے واسطے وارد ہوئی ہیں التزام کر کے پڑھیں تو لاریب باذنہ تعالیٰ صورتِ ادا پیدا ہو جاوے گی۔

اللّٰھم اکفنی بحلالک عن حرامک الخ ـــــ یہ محض اشارہ ہے۔ حصن حصین یا مشکوٰۃ میں دیکھ پڑھیں۔ فقط والسلام۔

سب احباب کو سلام مسنون فرمادیں۔ مولوی عبد الکریم صاحب کا بھی سلام مسنون پہونچے۔

دو ماہ رجب سہ شنبہ از گنگوہ

(سنہ مذکور نہیں ہے)

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

محرر و فتر اور محصل چندہ رہے۔ حضرت گنگوہیؒ سے آپ کو بیعت کا تعلق تھا۔ آپ کے چار صاحب زادے تھے جن کے نام یہ ہیں:-

محمد یوسفؒ، مولانا محمد یونس، مولانا محمد یحییٰؒ، حافظ محمد یامینؒ

یہ چاروں غالباً تقسیم ہند سے پہلے ہی لائل پور چلے گئے تھے۔ اول الذکر کو چھوڑ کر باقی تینوں صاحبزادے عالم اور حافظ تھے۔ مولانا محمد یونس اور مولانا محمد یحییٰ کے متعلق تو یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت مولانا انور شاہ محدث کشمیریؒ کے زمانے میں دار العلوم سے فارغ ہوئے تھے۔ ان بھائیوں میں صرف حافظ قاری محمد یامین لائل پور میں غالباً بقید حیات ہیں۔

مرتبہ مولوی فضل حق ترنگ زئی

متعلم دار العلوم حقانیہ

محبتِ الٰہی

افادات مولانا محمد اشرف صاحب ایم اے صدر شعبہ عربی

اسلامیہ کالج پشاور

جو مومن ہے وہ عاشق ہے، قرآن کریم میں آتا ہے والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ اللہ کو دل
ے دینے کا نام ایمان ہے۔ ہر مومن کے دل میں اللہ کی محبت کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے۔ جہاں ایمان ہوگا
اں خدا کی محبت ہوگی محبت کی دو صورتیں ہیں ایک ہے محبت طبعی یا فطری دوسری عقلی یا شرعی
نسان فطرت میں خدا سے محبت کرتا ہے۔ خدا نے ازل میں جب روحوں کو پیدا کیا اس پر اپنی ربوبیت
ی تجلی فرمائی اور پوچھا الست بربکم سب پکار اٹھیں بلیٰ۔ محبت کی تخم ریزی ہو گئی۔ فطرت میں
حبتِ الٰہی ودیعت ہو گی ایسا پتھر دل کون ہوگا جس کے سامنے وہ شہ دلربا آجائے۔ میر نے اچھا کہا ہے۔

وہ شہ دلربا جب سامنے آجائے ہے ۔۔۔ تھامتا ہوں دل کو لیکن پہلو سے نکل جائے ہے

خدا کو دیکھے اور اس سے پیار نہ کرے۔ پیار کے چار وجوہ ہوتے ہیں۔ یا جمال کی وجہ سے پیدا
ہو جاتا ہے۔ یا انسان کسی کمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ یا نوال کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ کہ شریف
آدمی محسن کا چاہنے والا ہوتا ہے۔ یا عظمت وجلال سے متاثر ہو کر بڑائی کا قائل ہو کر چاہنے لگتا
ہے۔ خدا سے زیادہ جمال والا کون ہے، وہ خود کتنا حسین ہوگا جس نے تمام حسن کو پیدا کیا ہے۔
ان اللہ جمیل۔ کمال کے لحاظ سے دیکھو تو حقیقت میں خدا سے زیادہ کمال والا کون ہوگا۔ الحمد للہ
سب کمال وجلال سب خوبی وجمال، نوال وعطاء اس کے لیے ہے، بہت پیارا سب سے اعلیٰ وارفع

ہے۔ جہاں کہیں سے جو کچھ کسی کو ملا ہے یا ملے گا یا ملتا ہے تو اُس ذات متعال سے ہے۔ ایسے دینے والے سے پیار نہیں کروگے۔ تو کس سے کروگے، جسم دیا، جان دی، روح دی، نان دیا اگر وہ نہ چاہے تو ایک پل کے لیے ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اس سے زیادہ عظمت و شان والا کون ہوگا، گویا جو بھی خوبی و محبوبی و کمال کسی کے دل کو کھینچ سکے۔ تو وہ اللہ کی ذات میں ہے، اس لیے اللہ نے اپنا اسم ذات جو بنایا وہ اللہ ہے۔ جو "لہٗ" سے نکلا ہے "لہٗ" اس جلن و سوز کو کہتے ہیں جو کسی محبت کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ تو اللہ دلوں کا پیارا ہے۔ جس کی محبت میں دل جل اُٹھے اللہ کا معنیٰ دلوں کا محبوب۔ تو جب اللہ سے پیار نہیں کروگے تو کس سے کروگے۔ تو دل میں بسانے کے لائق صرف اس کی ذات ہے۔ اس لیے غیروں کو دل میں لانا دل کا بے محل استعمال ہے جسے ظلم کہتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے شرک کو "ظلم" "عظیم" کہا ہے۔ جب دوسرا دل میں آتا ہے تو ظلم ہے۔ جب غیر کی محبت دل میں آتی ہے تو گویا شرک ہوجاتا ہے۔ کس کو لیتے ہو کس سے محبت کرتے ہو، خدا کے ہوتے ہوئے بھی غیروں سے محبت، اس جیسا کوئی رحیم و کریم اور محسن نہیں، جی چاہتا ہے کہ اس سے خوب پیار کرے۔ ایک گڈریا جنگل میں بیٹھا تھا، کہنے لگا اے اللہ تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں، تیرے لیے روغنی روٹی لاؤں، تیرے پاؤں دباؤں وغیرہ وغیرہ۔ اُس راستے پر موسیٰ علیہ السلام کا گذر ہوا، کہا کس سے باتیں کر رہے ہو کہا کہ خدا سے باتیں کرتا ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کافر ہوگیا، تھپڑ لگایا وہ بھاگ گیا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی ہوئی، کہا کہ میرا بندہ میرے ساتھ لگا تھا۔ میرے بندے کو مجھ سے جدا کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ اللہ میاں وہ تو کفر بک رہا تھا۔ ارشاد ہوا۔ تو برائے وصل کردن آمدی۔ نہ برائے فصل کردن آمدی۔ حکم ہوا جاؤ تلاش کرکے لاؤ۔ تو پیچھے گئے۔ گڈریا نے کہا کہ اے موسیٰ تیری ایک بات مجھے پار کرگئی۔ جو میاں نے دینا تھا وہ دے دیا۔ پہلے میری محبت طبعی تو تھی تیرے طمانچہ نے مجھے محبت کے اس مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں حقائق کھل جاتے ہیں۔ دا اب سمجھ گیا کہ محبت طبعی محبت شرعی کے ماتحت ہونی چاہیے۔ حضرت سید صاحبؒ فرمایا کرتے تھے۔ جوشِ طریقت ہوشِ شریعت کے تابع ہو محبتِ طبعی ہر ایک میں ہوتی ہے۔ یہ محمود ہے، مقصود نہیں۔ مقصود شرعی یا عقلی محبت ہے۔ جو کہ حدود ہی کی پابند ہو۔ ایک عاشق وہ جو اپنے جذبے کو دیکھتا ہے یہ ایک عاشق ہے، جو محبوب

کے جذبے کو دیکھتا ہے، سچا عاشق وہ ہے جو محبوب کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کر دے جو اپنی چاہت پر قربان ہوتا ہے۔ وہ بوالہوس ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

عشق نام ہے محبوب کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کرنا جو اپنا دل خوش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ محبوب کے دل کو خوش کرتا ہوں۔ بدعتوں میں پھنسا رہے گا۔ محب محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔ محبت الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ خدا کو بھی ایسے چاہو جیسے وہ چاہتا ہے کہ اسے چاہو ۔

نہ یہ چاہتا ہوں نہ وہ چاہتا ہوں　　　خدا کے لیے میں خدا چاہتا ہوں

خدا کی محبت ادب کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے۔

ادب سے دیکھ لیں مشتاق دور سے ان کو　　　مجال ہے جو انھیں کوئی ہم کنار کرے

حُبِ الٰہی کا تقاضا عظمتِ الٰہی ہے۔ جتنی محبت بڑھتی چلی جائے گی اتنی تعظیمِ حکمِ الٰہی بڑھتی چلی جائے گی، محبت کا یہ بھی خاصہ ہے کہ محبوب ناراض نہ ہو جائے اسے شریعت میں خشیت الٰہی کہتے ہیں۔ خشیت سانپ، بچھو، یا شیر بھیڑیے کے ڈر کی طرح نہیں بلکہ محبوب حقیقی کے ناراض ہو جانے کے اندیشے کا نام ہے، اس لیے قرآن میں رحمان سے خشیت کہا ہے۔ من خشی الرحمٰن بالغیب۔ محب کے لیے بڑی بات ہوتی ہے۔ محبوب کا ناراض ہونا۔ میاں روٹھ جائے گا۔ چہرہ پھیر لے گا۔ تمام شہر راضی ہو اور محبوب ناراض ہو تو اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا۔ وہ راضی ہو اور سب ناراض ہو جائیں تو کیا نقصان ہے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ تمام دنیا تمھیں قطب و ابدال کہے اور خدا کے نزدیک مردود ہو تو تمھارا کیا فائدہ اور اس کے نزدیک مقبول ہو اور دنیا تمھیں مردود کہے تو تمھارا کیا نقصان، عاشق بدنام کو پرواہ ننگ و نام کیا۔ میرا ایک شعر ہے ۔

مجھ کو کسی سے کیا غرض جب تو ہے میرا مدعا
دل میں فقط تو ہی رہے اتنی ہے میری التجا

یہ عاشق سوختہ ساماں ہوتے ہیں محبت ایک تیر ہے جو دل میں لگتا ہے یہ روشنی کا

تیر ہے جو دل کو محبت و معرفت سے منور کر دیتا ہے۔ جب پیارا وہی ہو گیا تو غیر پر کیا نگاہ کرے لا الٰہ الا اللہ کی تکمیل بغیر حب تام کے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا: والذین آمنوا اشد حبا للہ۔ عاشق ضابطہ کو نہیں دیکھتا وہ منشائے محبوب پر نظر رکھتا ہے، کیسے اور کیوں پر اس کی نگاہ نہیں ہوتی عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن۔ دل بدست دگراں دادن و حیراں بودن۔ اللہ میاں کو دل دے کر اس کے کہنے کے مطابق زندگی گزارنا جتنی محبت بڑھتی چلی جائے گی۔ اتنا مطیع و فرمانبردار ہوتا چلا جائے گا۔ نری محبت جس میں طاعت نہ ہو جھانچہ ہے۔ جس محبت میں، اتباع ربانی نہیں حقیقتاً نفس کا فریب ہے، عاشق کا شیوہ ہے ؎

ارید وصاله ویرید هجری	فاترک ما ارید لما یرید
میل ما سوئے وصال و میل او سوئے فراق	ترک کار خود گرفتم تا برآید کار دوست

اس کے بندے تو یکار اٹھتے ہیں۔ ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب	کہ حیف باشد از غیر او تمنائے

اور ان کا حال یہ کہتا ہے ؎

میری چاہت تیری چاہت	تیری چاہت میری چاہت
من تو شدم تو من شدی	من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں	من دیگرم تو دیگری

اس سے اس کی رضا کے سوا دوسری چیز مانگنا بے کار ہے۔ میاں کے بن کر اسی میں لگے رہو اس کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کر دو جو تصرف کرے تکویناً و تشریعاً اس کے لیے تیار رہو۔ اگر اس کی رضا کے لیے جان بھی چلی جائے تو سستا سودا ہے۔ مجازوالے کہاں سے کہاں تک پہنچتے ہیں۔ مولا کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہو مولانا روم فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود	گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

اللہ کے تصرفات کے سامنے گیند بننا چاہیے، جدھر پھینکا ادھر کو چلا، تراش خراش جو کہ مالی باغ میں کرتا ہے باغ کو خوبصورت بنانے کے لیے کرتا ہے اگر یہ تصرفات نہ ہوں تو آدمی

آدمی بنا نہیں کرتا۔ یہ تصرفات نفس کو مارتے ہیں عشق کا تقاضا ہے "میں میوں" کا مٹانا اور جب نفس سے یہ نکل جائے تو آدمی بن جاتا ہے۔ محبت کہتے ہیں اپنے کو میاں کے حوالے کر دو۔ جو بھی تصرف کرے اس پر راضی رہو ؎

زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

ہر تصرف کو اپنی فلاح و بہبود سمجھے اور یقین رکھے کہ اسی میں میری خیر ہے۔ حکیم کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ تم راستے پر چل رہے ہو تو پیچھے سے کوئی آیا آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ بہت غصہ آیا جب ہاتھ ہٹایا دیکھا محبوب ہے۔ اب چاہو گے آنکھیں نکال لے، لیکن ہاتھ نہ ہٹائے راضی بہ رضا ہو، شیخ جیلیؒ کا قول ہے۔ اپنی رضا کو مولیٰ کی رضا پر قربان کر دو تو دنیا میں جنت کا مزہ آئے گا موت بھی پیاری ہو جاتی ہے۔ محبت ایسا سیماب ہے جس میں بے قراری میں قرار آتا ہے ؎

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید بہ ایں ہمہ بے تابی

مومن کے دل میں محبت کی چنگاری تو ہوتی ہے، لیکن اب اتنی بھڑک اٹھے کہ دوسری محبتوں کو جلا دے اور ان پر غالب آجائے خدا کے لیے سب کچھ بھی قربان کرنا پڑے تو باک نہ ہو، ایک شخص ہمارے بزرگوں میں کسی کے پاس آئے کہنے لگے کہ اللہ کی محبت ہے، لیکن شادی کے بعد خدا کی محبت سے زیادہ دلہن کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ بزرگ نے فرمایا کہ اگر وہ اللہ میاں کو برا بھلا کہے تو پھر محبت رہے گی کہنے لگا اگر وہ ایسا کہے تو میں سزا کے طور پر اس کے سر کے بال کاٹ دوں گا۔ حضرت نے فرمایا: پھر اللہ کی محبت دل میں ہوتی ہے۔ اگر بڑھانا چاہتے ہو تو دل جلوں کی صحبت میں بیٹھو ؎

جو آگ کی تاثیر وہی عشق کی تاثیر
ایک خانہ بہ خانہ ہے ایک سینہ بہ سینہ ہے

یہ محبت کی چنگاری دلوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اہل حق کی صحبت اختیار کرو یہ چنگاری تم کو بھی پھونک دے گی، لیکن خدا کا جلا ہوا پھول بن جاتا ہے۔ جل کر تو دیکھو اس کی آگ میں، اس کے احکام کی تعمیل اس کی رضا کے لیے اختیار کرو اور کہو کہ اے اللہ اپنی رضا کی خاطر میرے اندر کو اپنی محبت سے جلا دے۔

درونم را بعشق خویشتن سوز به تیر درد دل جان و دلم دوز
دلم از نقش باطل پاک فرما براہ خود مرا چالاک فرما

اے اللہ ایسی محبت عطا فرما دے جو کبھی بجھ نہ سکے، یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ اللہ کا ذکر رضائے حق کے لیے کرو لیکن دھیان محبت میں ڈوب کر کرو۔ اللہ میاں اپنی نگاہ کو میرے دل پر جمائے ہیں ان کی پیار بھری نگاہیں میرے دل کو موہ رہی ہیں۔ اگر اللہ کی محبت غالب نہ ہو تو غیر کی محبت آدمی کو راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ طبعی محبت کے متفاوت مدارج ہیں، ماں چاہے نہ چاہے بچے سے محبت ہوتی ہے۔ اسلام طبعی محبت کے تقاضے کو ختم نہیں کرتا بلکہ پابند حدود کرتا ہے محبت ایمانیہ کا دائرہ خدا سے شروع ہو کر پوری مخلوق کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ منبع محبت خدا کی ذات ہے۔ محبت کی اصل سزاوار صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔ اب جب غیر سے محبت ہوگی تو خدا سے فرع کے طور پر ہوگی خدا جس سے کہے محبت کرو اس سے محبت اور جس سے بغض کو کہے اس سے بغض کرو۔ الحب للہ والبغض للہ۔ ہمارا دل صرف اسی کا ٹھکانا ہو اور بزبانِ حال پکار رہا ہو ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

(بشکریہ ماہنامہ "الحق" پاکستان)

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

شفیق ترین استاذ

حضرت مولانا محمد اویس ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

آج یکم رمضان ہے۔ ٹھیک ایک سال پہلے آج ہی کے دن ہمارے مشفق استاذ و معلم قرآن حضرت مولانا محمد اویس ندوی سفر آخرت کی پہلی منزل قبر میں منتقل ہوئے تھے۔ آج جبکہ صبح ہی سے مولانا کی یاد بہت آرہی ہے، جی چاہا کہ کچھ نقوش و تاثرات قلم بند ہو جائیں۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ اس سے لکھنے والے اور پڑھنے والوں کو نفع پہونچا دے۔

ناچیز پر اللہ تعالےٰ کے عظیم ترین انعامات میں سے ایک یہ ہے کہ بچپن سے اب تک انتہائی مشفق اور مخلص اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا — مکتب سے لے کر مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے صف اول کے اساتذہ تک سب کی بے پایاں شفقتیں، عنایتیں حاصل رہیں — کاش کہ اس نعمت کے شکر کی بھی توفیق مل جاتی تو نہ جانے کیا کچھ مل گیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کوتاہیوں کو معاف کرے اور حقیقی قدر و شکر نصیب فرمائے۔ آج بھی جب دارالعلوم میں گذرا ہوا زمانہ اور اپنے اساتذہ کی شفقتیں یاد آتی ہیں تو انتہائی حسرت و ندامت ہوتی ہے — اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعائیں ہی تسلی و تلافی کا وسیلہ ہیں، اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ اہتمام کی توفیق دے اور قبول فرمائے۔

ان اساتذہ میں سر فہرست تھے استاذ تفسیر حضرت مولانا محمد اویس ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

۱۹۶۹ء میں جبکہ راقم سطور کی عمر ۱۴ سال کی تھی درجہ ششم عربی میں پہلی مرتبہ مولانا سے استفادہ کا موقع ملا۔ اسی وقت سے ہر دن ان کی شفقت و محبت کے نقوش گہرے ہوتے گئے — اس وقت بس انہی نقوش کا اظہار مقصود ہے۔ میرے دل پر سب سے زیادہ اثر طلبہ کے ساتھ ان کے

انتہائی مشفقانہ اور محبت بھرے سلوک کا ہے غالباً درجۂ ششم عربی ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے ایک دفعہ مولانا نے حسب معمول پان کی ڈبیہ، جو لکھنوی انداز کی تھی کھولی، لیکن اس میں پان ختم ہو چکے تھے ـــــ مولانا نے یہ دیکھ کر خاموشی سے ڈبیہ بند کر لی اور تپائی پر رکھ دی ـــــ میں یہ دیکھ کر چپکے سے اٹھا اور مولانا کے مکان (اس وقت مولانا دارالعلوم کے احاطہ ہی میں مقیم تھے) جا کر پان بنوا کر لے آیا۔ جیسے ہی میں نے پان کا ہاتھ بڑھایا اور مولانا نے میری طرف دیکھا، بے ساختہ مولانا کی زبان سے دعائیں جاری ہو گئیں۔ اس کے بعد دو تین منٹ تک بڑے کیف کے ساتھ دعائیں اور شاباشی دیتے رہے ـــــ اس وقت اللہ کی اس توفیق پر طبیعت بہت ہی مسرور ہوئی۔

اسی شفقت و محبت کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ میرا معمول ہمیشہ سے مولانا کے بالکل سامنے بیٹھنے کا تھا، ایک دن کسی وجہ سے میں اپنی جگہ تک نہیں پہنچ سکا تو مولانا کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ مولانا نے معمول کے مطابق درس شروع فرمایا، تھوڑی دیر کے بعد کچھ توقف فرمایا اور ادھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ مجھ پر نظر پڑی تو فرمایا، "مولوی صاحب! اپنی جگہ پر ہی آجاؤ! ورنہ طبیعت چلے گی نہیں!" میں جب کچھ جھجکا تو مولانا نے باصرار اپنی جگہ پر بلایا اور پھر درس شروع فرمایا۔

مولانا کی طرف سے یہ معاملہ یک طرفہ نہیں تھا، عام طور پر طلبہ کے دل میں مولانا کی بہت ہی تعظیم و محبت تھی ـــــ مجھے یاد ہے کہ مولانا جیسے ہی درجہ میں تشریف لاتے اور جوتیاں اتار کر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہم کچھ ساتھی فوراً انھیں سیدھی کرنے کے لیے جھپٹتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک جوتا کوئی سیدھا کرتا اور دوسرا کوئی اور۔

اسی مناسبت سے یاد آیا کہ آج سے تین سال پہلے جب کہ میں مدینہ منورہ میں تقریباً ایک سال گزار کر تعطیلات میں یہاں آیا تھا اسی زمانے میں ایک نکاح کی تقریب میں شرکت کے لیے دارالعلوم جانا ہوا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد اویس صاحب نکاح پڑھانے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سن کر میں مولانا کے انتظار میں مسجد کے دروازے ہی پر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا تشریف لائے۔ ملاقات ہوئی۔ مولانا کے ساتھ ساتھ مسجد میں داخل ہوا۔ مولانا نے جیسے ہی جوتے اتارے میں نے آہستہ سے اٹھا لیے اور اس کی کوشش کی کہ مولانا کو علم نہ ہو ـــــ

اور ایسا ہی ہوا۔ نکاح کے بعد جب مولانا واپسی کے لیے اٹھے تو میں نے چاہا کہ آگے بڑھ کر پہلے جوتے رکھ دوں۔ مگر مولانا نے ازراہ محبت آواز دی اور فرمایا کہ بھئی ہم بھی چل رہے ہیں، مجبوراً مولانا کے ساتھ ہی مسجد کے باہر نکلا۔ جیسے ہی میں نے مولانا کے جوتے رکھے مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بھرائے ہوئے لہجے میں فرمایا کہ مولوی صاحب! کیا غضب کرتے ہو۔ بھئی اب تو آپ مدینہ پاک سے آرہے ہیں! میں بھی بس اتنا ہی عرض کر سکا کہ حضرت! انہی جوتیوں کے طفیل تو وہاں حاضری نصیب ہوئی ہے —— یہ سن کر مولانا نے محبت سے لپٹا لیا، اور بہت دیر تک دعائیں دیتے رہے۔ مولانا کا اس دن کا مشفقانہ اور انتہائی محبت و اپنائیت بھرا معاملہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جس دن وہ ہماری والدہ مرحومہ کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے مرکز کی مسجد تشریف لائے تھے مولانا مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے اور بے ساختہ مجھے سینے سے لگا لیا اور بہت ہی تاثر کے ساتھ تعزیتی کلمات کہے۔ دعائیں دیں۔ خود میرے آنسو پونچھے اور کچھ دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھا۔

تدریسی خصوصیات

مولانا کا موضوع قرآن تھا۔ قرآن سے انھیں بے پناہ عشق تھا، اسی کی خدمت ان کی زندگی کا مشغلہ، بلکہ اسی سے ان کی زندگی کی لذت تھی —— ایک عجیب سرور اور کیف کے ساتھ درس دیا کرتے تھے۔ ان کی چند تدریسی خصوصیات کا ذکر ہم طلبہ کے لیے انشاء اللہ مفید ہوگا۔ مولانا سب سے زیادہ زور تفسیر القرآن بالقرآن پر دیا کرتے تھے۔ عام طور پر معمول تھا کہ زیر درس آیت تلاوت فرمانے کے بعد یہ بتلاتے کہ یہ مضمون قرآن مجید میں اور کس کس مقام پر آیا ہے؟ اکثر و بیشتر خود اپنے مصحف سے ان آیات کو بھی پڑھ دیتے۔ اس کے بعد اس کی تفسیر و تشریح شروع فرماتے۔ درس میں طلبہ کی سطح کی رعایت بہت فرماتے اور خصوصاً دین کے بنیادی اصولوں اور شریعت کے مجموعی مزاج اور روح پر زیادہ زور دیتے۔ اور "متجددین زمانہ" کی غلطیوں کی طرف بڑی وضاحت مگر لطافت کے ساتھ اشارے فرماتے۔

غیبی حقائق، معجزات، اور ایمان و اعمال کی قوت پر کبھی کبھی بہت تفصیل سے کلام فرماتے اور بہت ہی یقین و اعتماد کے ساتھ ان لوگوں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے جنھوں نے عقل و فلسفہ کا سہارا لے کر ان حقائق کا انکار یا ان کی تاویلیں کی ہیں —— اسی ضمن میں اس طرف بھی

توجہ دلاتے کہ علم کے ساتھ بلکہ علم سے پہلے ایمان و یقین کا حصول ضروری ہے۔ اس کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے — یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

کبھی کبھی اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ان عقل پرستوں کی خرافات پر بالکل تعجب نہیں ہوتا۔ یہ قرآن تک پہنچنے کے وہ راستے اختیار کرتے ہیں، جو قرآن سے قریب تو کیا کرتے، ہر آن اس سے دوری میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔ یہ شعر بھی عموماً پڑھا کرتے تھے ؎

یہ سوں فلسفی کی چناں اور چنیں رہی — مگر بات خدا کی جہاں تھی وہیں رہی

مولانا اس پر بہت زور دیتے تھے کہ قرآن اور اسلام صحابۂ کرام اور سلف صالح کا دامن چھوڑ کر ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا — بارہا یہ بات فرمائی کہ تمام غلطیوں کا منشا یہی ہے کہ لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے قرآن کو سمجھنا چاہا، اور سلف صالح کی فہم و تفسیر سے بے نیاز ہو گئے

اس اصول پر یقین، اور وسیع مطالعہ خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کی تصنیفات سے والہانہ اشتغال، اور حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صحبت و تلمذ نے، مولانا کو وہ اعتدال بخش دیا تھا جو اب بہت کم نظر آتا ہے۔

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ بزرگوں سے تعلق کے بعد ان سے علمی اختلاف کی جرأت نہیں ہو پاتی بلکہ اسے بغاوت و سرکشی گردانا جاتا ہے، یا اس کے برعکس علمی و طبعی اختلاف بزرگوں سے تعلق و استفادہ سے مانع اور بہت بڑے خیر سے محرومی کا باعث ہو جاتا ہے — مولانا کو اللہ نے وہ راہ اعتدال بخشی تھی جس پر چل کر وہ اپنے مشائخ و اساتذہ کا پورا پورا احترام، ان سے والہانہ محبت اور ان کی دلی تعظیم کے ساتھ ساتھ ان سے کہیں کہیں اختلاف بھی کرتے، — درس میں جب بھی ایسا موقع آتا تو حافظ ابن قیمؒ کا یہ مقولہ ضرور نقل کرتے جو انھوں نے اپنے استاذ و مربی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کی کسی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا تھا، شیخ الاسلام حبیبٌ الینا، ولکن الحق أحبُّ منہ (شیخ الاسلام ہمارے لیے انتہائی قابل محبت و احترام ہیں لیکن حق زیادہ قابل محبت ہے۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ راہ آسان نہیں۔ اس میں افراط اور تفریط دونوں کا اندیشہ ہے۔

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ علماء کی شان تو یہی ہے۔

مولانا کو اپنے اساتذہ و مربیین کے ساتھ جو تعلق تھا اور مولانا کے دل میں ان کی جو قدر و محبت تھی، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب مولانا درس میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر فرماتے تھے، ہمیشہ "ہمارے سید صاحب" کی تعبیر استعمال کرتے۔ اور ایسے انداز سے کہتے کہ سننے والوں کو لہجہ کی شیرینی و حلاوت صاف محسوس ہوتی۔

مولانا کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصنیفات اور ان کے مکتب فکر سے بڑا شغف تھا، خصوصاً اسلامی عقائد اور اسماء و صفات باری تعالیٰ کی تشریح میں وہ شیخین کے مسلک سے پوری طرح متفق بلکہ اس کے پرجوش داعی تھے۔

ایک مرتبہ مولانا سے ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ کے بارے میں بعض حضرات کے منفی رویہ کا سبب دریافت کیا تو مولانا نے بڑی تفصیل سے اس کی وضاحت کی، اس کا کچھ خلاصہ جو یاد رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عموماً اس قسم کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ براہ راست صاحب معاملہ کو نہیں جانچتے پرکھتے، بلکہ دوسروں کی باتوں پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بعض نادان دوستوں نے ان کو تصوف اور تقلید کا دشمن بتایا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس تصوف اور جس تقلید کے وہ دشمن تھے، تمام علماء حق اس کے دشمن ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں۔ مولانا نے اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مثال بھی دی اور یہ وضاحت بھی کی ضروری نہیں کہ ہر عالم ہر بات صحیح کہے بلکہ یہ تو ممکن ہی نہیں، کیونکہ یہ تو نبوت کا خاصہ ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ پورے اخلاص کے ساتھ جو باتیں صحیح ہوں انھیں قبول کر لیں اور جو صحیح معلوم نہ ہوں انھیں ترک کر دیں۔ کسی کی تعظیم و احترام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی ہر بات مان لی جائے خواہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہی ہو۔ اور نہ کسی کی اجتہادی غلطی سے اس کی عظمت میں کوئی کمی آتی ہے۔ — ہاں! یہ ترک و اختیار کا فیصلہ کتاب و سنت کی واضح دلیل اور مکمل اعتماد و اطمینان کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔

مولانا معقول سوالات کے جوابات بڑے انبساط سے دیا کرتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی فرماتے کہ مولوی صاحب! آپ کے سوال کا جواب طویل ہے؟ گھر آ جائیے تو اس موضوع پر گفتگو کر لیں۔

درس سے پہلے سبق کا مطالعہ کرنے کا پابندی سے معمول تھا، اگر کسی دن مطالعہ کا موقع نہ ملتا تو اس دن درس نہیں دیتے ـــــ یہ انتہائی تواضع کی بات ہے اور علمی امانت کی دلیل:

ایک اور خصوصیت مولانا کے درس کی حوالوں کی کثرت تھی، تفسیر روح المعانی، تفسیر قاسمی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر خازن، تفسیر ابو سعود، تفسیر قرطبی اور شیخین (ابن تیمیہ وابن قیمؒ) کی تفسیری تحریروں کے حوالے کثرت سے دیا کرتے تھے۔ طلبہ کو ان کے مزاجوں کے اختلاف کی رعایت کرتے ہوئے کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتے۔ جو طلبہ ان سے خصوصی تعلق رکھتے، تفسیر کے موضوع پر ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کتاب پڑھتا دیکھتے تو تنبیہ سے منع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں دارالعلوم کے کتب خانہ میں تفسیر احکام القرآن (جصاص رازی) کا مطالعہ کر رہا تھا اتنے میں مولانا آہستہ قدم تشریف لائے اور میری تپائی کے پاس خاموشی سے کھڑے ہو گئے، اچانک میری نگاہ مولانا پر پڑی، اور میں جلدی سے کرسی سے کھڑا ہو گیا، سلام اور مصافحہ کے بعد فرمایا "چشم بد دور، بڑی اونچی کتابوں کا مطالعہ ہو رہا ہے!" میں فوراً سمجھ گیا کہ مولانا کو میرے اس کتاب کے مطالعہ سے خوشی نہیں ہوئی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا تو فرمایا "کس کے مشورہ سے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے؟ اس پر بھی میں کچھ نہ بولا تو میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ "بھئی تفسیر میں تو ہم سے پوچھ کر ہی کتابیں پڑھا کرو! یہ کتاب ابھی تمھارے سمجھنے کی نہیں ہے۔ یہ تو محققین کے کام کی ہے" میں نے فوراً کتاب واپس جمع کر دی، پھر مولانا نے خود "تفسیر ابو سعود" نکلوا کر دی اور فرمایا کہ اسے پڑھو!۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے خوش ذوقی اور سلیقہ بھی بھرپور عطا فرمایا تھا، لباس، رہن سہن، چال اور گفتار ہر چیز مولانا کے سلیقے اور خوش ذوقی کا آئینہ تھی۔ پان کھاتے وقت اکثر یہ مصرعہ پڑھتے ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

درس کے دوران جب کبھی گھنٹہ ختم ہو جاتا تو ایک دم کہتے "یہ مرغ بے ہنگام" بڑا علم دشمن ہے۔

مولانا کو گلاب کا پھول بہت پسند تھا، میں کبھی کبھی صبح کو گھر سے ایک پھول مولانا کے لیے لے جایا کرتا مولانا اسے بڑی خوشی سے قبول فرماتے اور دعائیں دیتے۔ ایک دن میں پھول لے کر گیا، لیکن مولانا کو زکام میں مبتلا دیکھ کر پیش نہیں کیا، تھوڑی دیر بعد مولانا کی نظر میرے ہاتھ میں پھول پر پڑی، تو میں نے عرض کیا کہ "میں نے اس لیے نہیں پیش کیا کہ یہ نزلہ آور ہوگا"! مولانا نے فوراً

ٹوکا "ارے بھئی کیوں لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھنؤ ہی کی زبان کی ٹانگ توڑ رہے ہو" (مولانا کو "نزلہ آور" کی تعبیر پسند نہیں آئی تھی، یہ دسی کی طرف اشارہ تھا۔)

آخر میں ایک بات اور ذکر کردوں جو سب سے اہم اور اعلیٰ وارفع ہے، اور وہ ہے مولانا کی عقیدۂ توحید میں پختگی۔ مولانا کسی ایسی بات کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے جس سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، کا عقیدہ متاثر ہو اور عقیدہ توحید کو بچانے کے لیے جس کی تاویل و توجیہ کرنی پڑے وہ ہر ایسی بات کو بلا تاویل رد کر دینے کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وحدۃ الوجود وغیرہ عقائد کو صراحت کے ساتھ "غیر قرآنی تعبیر" کہا کرتے تھے، مولانا اپنے شاگردوں کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ "معانی اور تعبیرات" دونوں میں قرآن و حدیث کی حدود سے باہر نکلنا درست نہیں اور اس میں سنگین غلطیوں اور خطرناک گمراہیوں کا شدید خطرہ ہے۔

مولانا تو اپنی زندگی کو قرآن کی خدمت میں لگا کر قرآن کے معنے میں، قرآن والے سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس پوری زندگی کو قبول فرمائے۔ اور اس کی برکات ان کے نسبی و علمی خاندان کو نصیب فرمائے۔

مولانا کی زندگی میں ہم طلبہ کے لیے بڑا سبق اور نمونہ ہے۔ قرآن مجید سے والہانہ تعلق، قرآن کی روح کو سمجھنے، سمجھانے اور دل و دماغ میں اتار دینے کا جذبہ، قرآن کو سلف صالح اور صحابہ کرام کی فہم کے مطابق سمجھنے کی کوشش، علم و عشق کی جامعیت اور اپنے بڑوں کا بے حد احترام، اور چھوٹوں پر انتہائی شفقت، یہ سب صفات مولانا کا ورثہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس ورثہ کی قدر نصیب فرمائے اور اپنے تمام اساتذہ کا ادب و احترام، ان سے قلبی تعلق اور ان سے پورے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

Regd. No. 1 LW/NP-62

Monthly ALFURQAN

31, Naya Gaon West
Lucknow (U.P.)

VOL. 45 NO. 9 SEPTEMBER, 1977 Phone : 25547

الفرقان

لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۵/۰
پاکستان سے ۲۵/۰
بنگلادیش سے ۱۶/۰
(فی شمارہ) ۲/۵۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے —— ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے —— ۴ پونڈ

جلد (۴۵) | بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۷۷ء مطابق شوال و ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ | شمارہ (۱۰ و ۱۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجائے، ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

سخنہائے گفتنی

الفرقان کے بیشتر ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے گذشتہ مہینے لکھنؤ میں ہونے والے ناخوشگوار واقعات کا علم ہو چکا ہوگا — اس انسانیت سوز ہنگامہ میں جو زبردست جانی و مالی نقصانات کے علاوہ اپنے ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے بھی اس طرح کے اب تک کے ہنگاموں میں سب سے زیادہ ہولناک اور دلخراش حادثہ تھا، پرانے لکھنؤ کا بیشتر علاقہ قریباً ۱۵ دن تک مستقل کرفیو کی زد میں رہا اور آمد و رفت پر سخت پابندی کی وجہ سے عملی طور پر گویا بقیہ شہر سے کٹ کر رہ گیا —

لکھنؤ کی کاتب برادری جس میں الفرقان کے کاتب صاحب بھی شامل ہیں زیادہ تر اسی متاثرہ علاقہ میں آباد ہے۔ چنانچہ الفرقان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اکتوبر کا شمارہ جو پروگرام کے مطابق اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جانا چاہیے تھا کافی موخر ہو گیا — جب اکتوبر کی ۱۵ تاریخ تک بھی اس شمارہ کی اشاعت کی کوئی صورت ممکن نہ ہو سکی تو یہ مناسب سمجھا گیا کہ کچھ صفحات کا اضافہ کر کے اکتوبر و نومبر کا شمارہ مشترکہ شائع کر دیا جائے — لہٰذا دو ماہ کا یہ مشترکہ شمارہ ناظرین الفرقان کو مزید زحمت سے بچانے کے لیے صرف اسّی صفحات پر شائع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ یعنی دسمبر کے شمارہ میں اس کمی کی تلافی کر دی جائے گی — امید ہے ناظرین کرام ہمیں اس میں معذور تصور فرمائیں گے۔

الفرقان کے پاکستانی ناظرین سے

ہند و پاک کے مابین محصول ڈاک میں کئی گنا اضافہ کے باوجود ڈاک کی بدنظمی بدستور ہے — لاہور کے ایک تازہ خط سے معلوم ہوا کہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور میں ہر ماہ ایسے خطوط برموصول ہوتے ہیں جن میں الفرقان موصول نہ ہونے کی شکایت کی جاتی ہے —

اپنے پاکستانی ناظرین سے گزارش ہے کہ براہِ کرم پرچہ نہ ملنے کی اطلاع لاہور کے دفتر کے بجائے براہ راست دفتر الفرقان لکھنؤ کو دیجیے — اس طرح تعمیل میں عجلت بھی ہو گی اور سہولت بھی۔

نگاہِ اولیں

خطاب عید الفطر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روح کا غسل اور روح کا لباس

والد ماجد (حضرت مولانا نعمانی مدظلہ) کا معمول طویل مدت سے عیدین کی نماز دار العلوم ندوۃ العلماء کی طویل و عریض اور حسین و جمیل مسجد میں ادا کرنے کا ہے، نماز کے بعد خطاب کا بھی مستقل معمول ہے۔ لیکن گزشتہ سال مسلسل بیماری کی وجہ سے اور اس سے پہلے سال دونوں عیدوں کے موقع پر حجاز مقدس میں قیام کی وجہ سے ناغہ رہا ——— دو سال کے بعد اب اس سال اپنے معمول کے مطابق وہاں نماز ادا فرما سکے۔ ——— شہر کا منتخب طبقہ جس میں دین کی کچھ طلب ہے عیدین کی نماز دار العلوم ہی کی مسجد میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ ——— اس دفعہ چونکہ بعض حلقوں میں پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی کہ حضرت مولانا عید کی نماز دار العلوم کی مسجد میں پڑھیں گے اور خطاب بھی فرمائیں گے غالباً اس لیے اہل طلب کا مجمع ہمیشہ سے زیادہ تھا۔ آپ اپنی معذوری کی وجہ سے چونکہ نماز بیٹھ کر ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے امامت سے معذرت کی اور دار العلوم کے استاذ محترم مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی نے نماز پڑھائی ——— نماز کے بعد حضرت مولانا نے خطاب فرمایا جو ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔

ناظرین الفرقان کے لیے یہ خطاب ٹیپ ریکارڈ ہی سے کاغذ پر منتقل کیا گیا اور اور نگاہِ اولیں کے صفحات میں اس کو شائع کیا جا رہا ہے کاش یہ ممکن ہوتا کہ خطاب کے دوران مجمع کے تاثر کی جو کیفیت تھی اور آخر میں اجتماعی توبہ کے وقت،

پورے مجمع کا جو حال اور آہ و زاری اور آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا جو سماں تھا وہ بھی کسی طرح کاغذ پر نقل کیا جا سکتا —— راقم نے اس طرح کے مناظر کی کچھ جھلکیاں تاریخ کی کتابوں میں پڑھی ہیں لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا —— عام احساس یہ تھا کہ آج ہماری روحوں کا غسل ہو گیا، آج ہماری سچی عید ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ اُن سب بندوں کو جو اس توبہ میں شریک تھے استقامت، اور تقوے کی زندگی نصیب فرمائے اور اس کو مغفرت و جنت کا وسیلہ بنائے۔

تقریر کو ٹیپ ریکارڈ سے برادر زادہ محترم سعید الرحمٰن سنبھلی اور راقم نے کاغذ پر نقل کیا ہے، اور حضرت مولانا مدظلہٗ کی نظر ثانی کے بعد اس کو اشاعت کے لیے دیا جا رہا ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

سجاد نعمانی

الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا اَن ھدانا اللہ، لقد جاءت رسل ربنا بالحق، صلوٰت اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من تبعھم باحسان

میرے عزیز بھائیو! میرے دوستو! میرے بزرگو! آج تقریباً ۳۰ سال کے بعد میں یہاں اس وقت آپ حضرات کے سامنے بات کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو میرے لیے بھی نفع کا باعث بنائے اور آپ سب حضرات کو بھی اس سے فائدہ پہونچائے —— میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اُس کا حق یہ تھا کہ اگر ممکن ہوتا تو میں ہر بھائی سے الگ الگ مل کر وہ بات کہتا لیکن ظاہر ہے کہ اس کا کوئی امکان نہیں —— یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے اور اتنی بڑی تعداد میں میرے عزیز بھائیوں دوستوں کو یہاں جمع کر دیا ہے اور مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیا ہے اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے کہ میں صحیح اور حق بات کہوں اور وہی اس کو آپ کے دلوں میں اتار دے اور مجھے بھی اس سے فائدہ پہنچائے —— اِس وقت ہم آپ سب اللہ کی توفیق سے نہا دھو کر آئے ہیں۔ اتنے اہتمام سے سال میں بھی بھی نہانا دھونا نصیب نہ ہوا ہو گا۔ جن کو میسر ہوا ہو گا انھوں نے اچھے سے اچھا قیمتی صابن استعمال کیا ہو گا، اسی طرح آج ہم نے اللہ کے دیے ہوئے اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ جن کو میسر تھا انھوں نے عطر بھی لگایا ہے، اور اگر اس میں

ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا تو غلط نہیں کیا بلکہ بہت اچھا کیا، انشاء اللہ اس پر بھی ثواب ملے گا۔ آج کے دن کے لیے اللہ و رسول کا حکم یہی ہے کہ ہمارا جسم بھی صاف پاک ہو۔ اور ہمارے کپڑے بھی اچھے ہوں۔ دیکھنے والوں کو بھی اچھے لگیں ـــــ یہ تو اللہ کی پسند ہے، جس چیز کو وہ پسند فرمالے اور جس کا حکم دے وہی عبادت ہے ـــــ اس کے برخلاف حج میں اللہ کو یہ پسند ہے کہ حاجی میلا کچیلا، پراگندہ حال اور پراگندہ بال ہو۔ (حدیث میں اس کے لیے "الشعث التفل" کا لفظ آیا ہے) اور آج کے دن یہ پسند ہے کہ ہم صاف ستھرے ہوں، حلال طریقہ سے اللہ نصیب فرمائے تو ہمارے کپڑے اچھے اور خوشنما ہوں۔

اس کے بعد میں آپ سے کہتا ہوں ذرا سوچئے! یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہوا۔ اگرچہ اللہ و رسول کے حکم کی تعمیل میں ہوا مگر ظاہر ہے کہ اس سب کا تعلق ہمارے صرف اس جسم سے ہے۔

ہمارے اندر دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ ہمارا جسم اور ایک اس کے اندر روح۔ یہ کوئی دقیق فلسفہ یا منطق کی باریک بات نہیں ہے بلکہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ہم آپ جانتے ہیں بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ روح ہی اصل ہے اور اسی سے انسان کی زندگی ہے۔ جسم اصل نہیں آدمی مرجاتا ہے، اُس کے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہ ہاتھ اسی طرح رہتے ہیں پاؤں اسی طرح رہتے ہیں۔ بال بال اور ریشہ ریشہ اسی طرح رہتا ہے ـــــ ایک چیز جو نظر نہیں آتی بس وہ نہیں رہتی، غائب ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ جسم لاشہ ہو جاتا ہے۔ یہ چیز جو غائب ہو گئی۔ اسی کو ہم آپ روح کہتے ہیں، جب تک جسم میں روح ہے وہ آدمی ہے اور جب روح نہیں رہی تو وہ بے جان لاش ہے، گلنے سڑنے والا گوشت پوست ہے۔

تو میرے بھائیو! آج اب تک ہم نے جو نہانا دھونا کیا جو اچھے کپڑے پہنے اس سب کا تعلق صرف جسم کی صفائی اور جسم کی آرائش و زیبائش سے تھا۔ لیکن آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے وجود میں روح اصل ہے۔ روح ہی اصل ہے موت و حیات کے اعتبار سے بھی روح ہی اصل ہے۔ جس دن میں مرجاؤں گا اور روح نہیں رہے گی گھر والے نہیں چاہیں گے کہ ۲۴ گھنٹے بھی گھر میں میرا روح سے خالی جسم میری لاش رہے۔ اگر اسے گھر میں رکھا جائے تو تھوڑے ہی وقت میں اس میں بدبو آنے لگے گی اور بیوی بچے بھی نفرت کرنے لگیں گے۔

تو جسم کا یہ حال ہے اور روح کا یہ مقام ہے۔ بہر حال جسم فانی ہے مٹی ہو جانے والا ہے اور روح باقی رہنے والی ہے، تو میں نے عرض کیا کہ آج اب تک ہم نے جو کچھ کیا اُس کا تعلق جسم کی صفائی اور جسم کی آرائش و زیبائش سے تھا، لیکن روح کا مسئلہ جسم سے بہت زیادہ اہم اور بہت زیادہ قابل فکر ہے —— روح کی بھی صفائی ہوتی ہے، روح کا بھی غسل ہوتا ہے روح کی بھی آرائش و زیبائش ہوتی ہے۔ روح کا بھی لباس ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباسًا یواری سوأتکم وریشًا ولباس التقویٰ ذالک خیرٌ" اس آیت میں جسم کے لباس کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد روح کے لباس کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے اور اس کو "لباس التقویٰ" کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ یہ جسمانی لباس کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ اور بہت بہتر ہے "ولباس التقویٰ ذالک خیرٌ"

تو ایک کام یعنی جسم کی صفائی اور آرائش و زیبائش کا کام ہم نے آپ نے یہاں آنے سے پہلے ہی کر لیا، لیکن دوسرا کام جو اُس سے بہت زیادہ اہم ہے (یعنی روح کا غسل اور اُس کی آرائش و زیبائش) اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم میں سے کس کس نے کیا ہے، خدا کرے آپ وہ بھی کر کے آئے ہوں اور خوب نصیب ہوا ہو۔ اس کا خاص وقت تو رمضان مبارک کا پورا مہینہ تھا، وہ پورا مہینہ روح کے غسل کا تھا، اس کے تزکیہ اور آرائش و زیبائش کا تھا جو کل ہی ختم ہوا ہے۔

وہ بھائی بہت خوش نصیب اور بہت کامیاب ہیں جنھوں نے رمضان مبارک کے دنوں میں اور راتوں میں اپنی روح کو بار بار غسل دیا اور اس کی آرائش و زیبائش کی فکر کی، لیکن جو بھائی غافل رہے یا یہ کام جس طرح کرنا چاہیے تھا اُس طرح نہیں کیا اُن بھائیوں سے اور خود اپنے نفس سے بھی میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں کہ اب بھی اُس کا وقت باقی ہے اور بالخصوص یہ وقت اور یہ گھڑی اُس کے لیے بہت مبارک وقت اور بہت مبارک گھڑی ہے ہم آپ پاک صاف ہو کر اللہ کے گھر میں جمع ہیں۔ اللہ و رسول کے حکم کے مطابق ابھی ہم نے نماز ادا کی ہے۔

میرے بھائیو! اب میں جو کچھ عرض کرتا ہوں اُس کو خوب غور اور توجہ سے سنو! روح

کا غسل کیا ہے؟ میرے عزیز بھائیو! روح کا غسل ہے دل کی توبہ! اور روح کا لباس کیا ہے؟ "تقویٰ" قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "ولباس التقویٰ ذالک خیر" ـــــ میں پھر کہتا ہوں ہمارے آپ کے جسموں کی تو صفائی ہو گئی، وہ جسم جو گلنے والا ہے، جو سڑنے والا ہے۔ جس میں کیڑے پڑنے والے ہیں، اس کے لیے ہم کو جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ ہم نے کر لیا، اور میں پھر کہتا ہوں کہ اچھا کیا۔ آج کے لیے یہ بھی اللہ و رسول کا حکم تھا، اللہ تعالیٰ اس کو بھی قبول فرمائے ـــــ لیکن اس سے کہیں زیادہ فکر کی بات یہ ہے کہ ہم روح کا تزکیہ اور اُس کی صفائی کی فکر کریں، روح کو غسل دیں۔ روح کے زیب و زینت کی فکر کریں۔ اور وہ کیا ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ ـــــ اللہ و رسول ہی نے اس کا طریقہ بتایا ہے سچی توبہ! ـــــ توبہ کیا ہے؟ زندگی میں جو غلطیاں ہوئی ہوں، جو گناہ ہوئے ہوں۔ اور میں کہتا ہوں کوئی نہیں ہے ہم میں سے سوائے انبیائے کرام علیہم السلام کے اور فرشتوں کے جس سے گناہ نہ ہوئے ہوں ـــــ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا، میرا کیا منہ ہے جو ایسی بات کہوں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا، "اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَ اَیُّ عَبْدٍ لَّکَ مَا اَلَمَّا (یعنی اے میرے اللہ! تو معاف کردے اور بخشے تو رب ہی قصور والوں گنہگاروں کو بخش دے، معاف کردے۔ اور اے مالک کوئی ایسا بندہ نہیں جس سے گناہ نہ ہوا ہو) تو میں کہتا ہوں ہم سب گناہ گار ہیں۔ ہم سب قصوروار ہیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا "کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون" (یعنی تم سب خطاکار ہو گنہگار ہو اور گنہگاروں میں سے وہ اچھے اور خوش نصیب ہیں جو گناہوں سے سچی توبہ کر کے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست کرلیں)

بھائی! غلطی اور خطا قصور ہو جانا تو ہماری میراث ہے، ہمارے آپ کے مورث اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی غلطی ہوئی تھی، قصور ہو گیا تھا، قرآن مجید میں جا بجا اس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ان کی سچی توبہ کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ (اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ ان کی نسل کو سبق ملے اور گنہگاروں قصورداروں کے لیے ایک اچھی مثال قائم ہو۔)

یہاں میں ایک بات یہ بھی ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جب بڑوں سے اور

اللہ والوں سے غلطی ہو جاتی ہے، کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کے حضور میں روتے گڑگڑاتے ہیں اور سچے دل سے توبہ کرتے ہیں تو ان کو صرف معافی ہی نہیں ملتی بلکہ اُن کے درجات میں اور ترقی بھی ہو جاتی ہے —— آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی، پھر سچی توبہ نصیب ہوئی جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ تو اللہ کی طرف سے معافی بھی ملی اور درجات میں بے حساب ترقی ہوئی —— ہم اور آپ بھی خطادار اور قصوروار ہیں لیکن اگر سچی توبہ نصیب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت سے یقین کے ساتھ امید ہے کہ ہمیں معاف بھی کر دیا جائے گا، ہماری مغفرت بھی فرمادی جائے گی اور ان شاء اللہ ہمیں ترقی بھی نصیب ہو گی۔

آپ میں سے اکثر پڑھے لکھے حضرات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جانتے ہوں گے، بہت سے بھائیوں نے کم از کم نام سنا ہو گا۔ ہندوستان کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ لاکھوں اولیاء اللہ اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان میں کچھ وہ ہیں جنھیں اولیاء اللہ کی صف میں بھی خاص امتیاز حاصل ہے، جیسے خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ —— اسی طرح امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، جن کا زمانہ اب سے قریباً چار سو سال پہلے کا ہے۔ ان کے ایک خلیفہ خواجہ میر محمد نعمان نے انھیں خط لکھا، اپنے شیخ حضرت مجدد صاحب کو رو رو کے خط لکھا کہ میں بہت ہی ناکام و نامراد ہوں، بڑھاپا آگیا، عمر آخر ہو رہی ہے لیکن گناہوں سے پیچھا نہیں چھوٹتا، گناہ ہو جاتا ہے —— ہمارے آپ کے لیے تو یہ کوئی بات نہیں ہے، ہم تو گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں (بے گنہ نگذشت برمن ساعتے) لیکن اللہ کے خاص بندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر اُن سے گناہ ہو جائے تو وہ ایسا دکھ محسوس کرتے ہیں جیسے سانپ نے کاٹ لیا یا بچھو نے ڈنک مار دیا۔

تو خواجہ میر محمد نعمان نے حضرت مجدد صاحبؒ کو لکھا اور میرا خیال ہے کہ رو رو کے لکھا ہوگا کہ گناہوں سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ حضرت مجددؒ نے جواب دیا جو ان کے مکتوبات میں محفوظ ہے اس میں لکھتے ہیں کہ میر نعمان! ہر ایک سے کہنے کی تو بات نہیں ہے لیکن تمھیں لکھتا ہوں کہ اللہ کے بہت سے بندے وہ ہیں جن کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے کہ ان سے

گناہ سرزد ہو جاتا ہے پھر وہ اللہ کے حضور میں اس پر روتے ہیں، بلبلاتے ہیں معافی مانگتے ہیں
پھر اس رونے اور توبہ کرنے کے نتیجہ میں ان کو صرف معافی نہیں ملتی بلکہ ان کے درجات میں
بے حد وحساب ترقی بھی ہوتی ہے ان کو اللہ کا وہ قرب حاصل ہو جاتا ہے جو پہلے حاصل نہیں
تھا۔ ان بندوں سے اگر گناہ نہ ہو تو ان کی ترقی رک جائے اور وہ "ملکِ محبوس" ہو کر رہ جائیں۔

تو میرے بھائیو! اس وقت میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ
ہم اپنی روح کو غسل دیں، اللہ توفیق دے کہ روح کے لباس کی اور روح کو اچھا پہنانے کی
فکر کریں۔ اور وہ کیا ہے؟ بس دو چیزیں! ایک "توبہ" دوسری "تقویٰ" توبہ کیا ہے؟ وہ
یہ کہ ہم سے اب تک جو گناہ ہوئے — اور ہم سب گنہگار ہی ہیں — تو سچے دل سے ہم اللہ سے
اپنے گناہوں کے لیے معافی مانگیں اور دل سے یہ ارادہ کریں کہ آئندہ ان سے بچنے کی کوشش کریں گے۔
اگر ہم نے صرف معافی مانگی اور آئندہ کے لیے گناہ سے بچنے اور باز رہنے کا ارادہ نہیں کیا تو
یہ "توبہ" نہیں ہوئی، اس کا نام "استغفار" ہے۔ اور یہ گویا آدھی توبہ ہے — اور بلاشبہ
یہ بھی کام آنے والی چیز ہے لیکن ابھی یہ کام ادھورا ہوا۔ پوری "توبہ" نہیں ہوئی، توبہ کے
لیے ضروری ہے کہ معافی اور مغفرت مانگنے کے ساتھ یہ بھی ارادہ کرے اور اللہ سے توفیق
مانگے کہ اب انشاء اللہ اس گناہ کو نہیں کروں گا اور اس سے بچوں گا یہ توبہ ہے یہ اگر نصیب
ہو جائے تو بس روح کا پورا غسل ہو گیا — حدیث شریف میں ہے کہ "التائب من الذنب
کمن لا ذنب له" (گناہ کر کے توبہ کرنے والا بالکل اس طرح ہو جاتا ہے کہ جیسے اس سے
گناہ ہوا ہی نہیں) دوسری روایت کے لفظ ہیں "کیوم ولدته امه" (ایسا پاک صاف اور
بے گناہ ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو) اللہ تعالیٰ کا کیسا کرم ہے،
کیسا فضل ہے کہ ہم کتنے ہی گناہ کریں کتنی ہی سیہ کاریاں کریں اور پھر سچے دل سے توبہ
کر لیں تو اللہ تعالیٰ سب معاف فرما دیتا ہے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کرتا، درجے بڑھا
دیتا ہے، وہ گنہگار بندہ اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے — اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ
الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہمیں دو کام کرنے ہیں ایک "توبہ" اور دوسرا "تقویٰ"۔ تقویٰ کس

چیز کا نام ہے اس فکر کے ساتھ زندگی گذارنا کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور مرنے کے بعد ساری زندگی کا حساب دینا ہے۔ بس یہ جو زندگی ہے یہی تقویٰ کی زندگی ہے ـــــ اس توبہ اور تقوے کی زندگی کے ارادہ اور فیصلہ کے بعد بھی ہم سے گناہ ہو سکتے ہیں، ہم فرشتے نہیں ہو جائیں گے بھول ہو گی، غفلت ہو گی، نفس کا حملہ ہو گا، شیطان دھوکا دے گا، اور پھر غلطیاں ہوں گی، پھر گناہ ہوں گے۔ لیکن وہ بھول، وہ گناہ، وہ غلطی ہمیں تقوے سے محروم نہیں کردے گی۔ جب تقویٰ نصیب ہے تو وہ پھر ہمیں جگائے گا، پھر سچی توبہ نصیب ہو گی۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا " اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ " یعنی اہل تقویٰ کا حال یہ ہے کہ جب شیطان ان پر حملہ آور ہوتا ہے اور کوئی غلطی کوئی معصیت اُن سے ہو جاتی ہے " تَذَكَّرُوْا " تو ان کے اندر ایک چونک پیدا ہوتی ہے اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ہائے کیا ہو گیا، وہ چیختے ہیں، روتے ہیں، اللہ کے سامنے گڑگڑاتے اور بلبلاتے ہیں، اور پھر جو انھیں کرنا چاہیے وہ کرتے ہیں۔

اور پھر میں کہتا ہوں کہ اس رونے دھونے اور توبہ کرنے سے اُن کی مسلسل ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس ارشادِ الٰہی کو سمجھنے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

تو میرے بھائیو! بس یہی دو باتیں میں عرض کرتا ہوں اگر اتنا کر لیا تو انشاء اللہ روح کا پورا غسل ہو گیا اور یہاں معلوم ہو یا نہ ہو قبر میں جانے کے بعد معلوم ہو گا کہ اس غسل نے آپ کو کیسا پاک صاف کیا، اور حشر میں معلوم ہو گا کہ آج کی توبہ سے آپ کو کیا ملا، اور انشاء اللہ حشر میں آخری فیصلہ کے وقت معلوم ہو گا کہ یہی غسل آپ کے لئے جنت کا اور رضاء الٰہی کا وسیلہ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے اور آپ کو بھی نصیب فرمائے، مجھے بھی محروم نہ رکھے اور آپ کو بھی محروم نہ فرمائے۔

میں پھر کہتا ہوں، اس توبہ اور تقوے کی زندگی کے فیصلے کے بعد بھی ہم فرشتے نہیں بن جائیں گے، ہم سے پھر غلطیاں ہوں گی، پھر ہم سے گناہ ہوں گے، لیکن اس کے بعد پھر ہمیں توبہ کی اور نئے سرے سے تقوے کے فیصلہ کی توفیق ملے گی اور پھر ہمارا رحیم و کریم اللہ پھر ہمیں معاف فرمائے گا اور انشاء اللہ ہمارے درجات میں ترقی ہو گی۔ پھر یہ زہر ہمارے لئے تریاق بنے گا۔

اگر میری یہ بات آپ حضرات نے سمجھ لی تو اتنے ہی پر بس کرتا ہوں ــــــ میں نے کوئی بات اپنی نہیں کہی ہے اللہ و رسول ہی کا پیغام پہنچایا ہے ــــــ اے اللہ! جو بات میری زبان سے غلط نکلی ہو تو میرے بھائیوں کے ذہنوں سے بھی دھو دے اور مجھے معاف کر دے۔ اور جتنی بات صحیح کہی ہو اس کو قبول فرمالے اور اللہ تعالیٰ اُس پر عمل کرنے کی مجھے بھی توفیق دے!

آؤ اب ہم سب سچے دل سے اللہ کے حضور میں اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔" بہت سے گناہ وہ ہیں جو مجھے اور آپ کو اپنے اپنے یاد ہیں۔ اور بہت سے گناہ وہ ہیں جو ہمیں یاد بھی نہیں ہیں لیکن اللہ کے علم میں ہیں۔ اس کے دفتر میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کے لیے سچے دل سے اللہ سے معافی مانگیں۔ توبہ کریں اور آئندہ کے لیے ان سے بچنے کا ارادہ اور فیصلہ کریں!

ہاں! توبہ کے بعد عملی طور پر چند چیزوں کی پابندی خصوصیت سے ضروری ہو گی اور وہ اس بات کی علامت ہو گی کہ ہم نے سچے دل سے توبہ کی ہے اور توبہ کو قبولیت نصیب ہوئی ہے۔ اگر ان چیزوں کی پابندی بھی ہم سے نہ ہو سکی تو سمجھو کہ کچھ نہیں ہوا ــــــ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو اس محرومی سے بچائے!

پہلی چیز پورے اہتمام کے ساتھ پانچ وقت کی نماز کی پابندی ہے۔ ہم اللہ کے حضور میں اور اپنے دل میں یہ عہد کریں کہ انشاءاللہ اب کبھی نماز نہیں چھوٹے گی۔ اسلام میں نماز سب سے اہم اور اولین فریضہ ہے۔ حدیث شریف میں ترک نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ تو جن بھائیوں سے اب تک نماز کے بارہ میں کوتاہی ہوئی ہو وہ سچے دل سے عہد کریں کہ انشاءاللہ آئندہ کبھی نماز نہیں چھوٹے گی ــــــ شاید آپ بھائیوں کو سنکر تعجب ہو کہ پانچ وقت کی نماز کا درجہ عید کی نماز سے کہیں بڑا ہے۔ عید کی نماز چھوڑنے کی اتنی سزا نہیں ملے گی جتنی پانچ وقت کی نمازوں میں سے ایک وقت کی نماز چھوڑنے پر سزا ملے گی۔ تو میرے بھائیو اور میرے بزرگو ایک تو یہ عہد کر لو کہ نماز پابندی سے پڑھی جائے گی۔ اور جیسی اب تک پڑھی جاتی تھی انشاءاللہ اس سے بہتر پڑھی جائے گی اور ہم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اور دل کے حضور اور خشوع اور خضوع کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کریں گے۔

دوسری چیز زکوٰۃ ہے۔ قرآن پاک میں جا بجا نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا دونوں اسلام کا جز اور ایمان کی شرط ہیں۔ اور ان کے بغیر اسلام کا دعویٰ معتبر نہیں قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام پیغمبروں کی شریعت میں یہ دونوں چیزیں فرض کی گئی تھیں چاہے نماز کی ترکیب و کیفیت اور زکوٰۃ کی تفصیلات وغیرہ میں فرق ہو۔ یوں سمجھئے کہ ایک تو ہے ایمان لانا دل سے اور زبان سے، اور نماز اور زکوٰۃ یہ گویا عملی ایمان ہیں۔ اللہ و رسول کے نزدیک ایمان جب ہی معتبر ہے جبکہ نماز پڑھی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ" (یعنی اگر یہ کفار و مشرکین کفر و شرک سے توبہ کرلیں، ایمان لے آئیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہیں) تو معلوم ہوا کہ نماز و زکوٰۃ کے بغیر ایمان و اسلام کا دعویٰ اللہ کے یہاں معتبر نہیں۔ تو جن بھائیوں سے زکوٰۃ ادا کرنے میں کوتاہی ہوئی ہو وہ اللہ سے عہد کرلیں کہ انشاء اللہ اس کوتاہی کی تلافی کی کوشش کریں گے اور اللہ و رسول کے حکم کے مطابق اہتمام سے زکوٰۃ ادا کیا کریں گے —— امت میں نماز کے اہتمام اور پابندی میں بھی بہت کمی ہے لیکن زکوٰۃ کے بارہ میں اُس سے بہت زیادہ کوتاہی ہو رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے قرآن مجید میں بڑی سخت وعید ہے۔ فرمایا گیا ہے وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝" مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دولت سینت سینت کے رکھتے ہیں اور اللہ کے راستے اور اس کے حساب میں خرچ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ اُن پر فرض کی گئی ہے، ادا نہیں کرتے "فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" اے ہمارے پیغمبر انھیں بتا دیجیے سنا دیجیے کہ ان کے لیے بڑا سخت دردناک عذاب ہے۔" يَوْمَ يُحْمٰى

عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ " ان کی وہ دولت جہنم کی آگ میں تپائی جائے گی (جیسے سونا چاندی لوہا تپایا جاتا ہے) پھر اس سے ان بدبختوں کی پیشانیاں داغی جائیں گی، اُن کی کروٹوں پہ داغ دیے جائیں گے، پیٹھوں پر داغ دیے جائیں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ - یہ ہے وہ تمہاری دولت جسے تم نے سینت کر رکھا تھا اور اللہ کا حق کا حق ادا نہیں کیا تھا، اُس کی فرض کی ہوئی زکوٰۃ نہیں نکالی تھی — دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس آیت کی تشریح کے طور پر فرمایا ہے کہ جس کسی کو اللہ نے یہاں دولت دی اس کے بعد اس نے اسے راہ خدا میں صرف کرنے میں بخل کیا، زکوٰۃ نہیں نکالی تو اس کی وہ دولت قیامت میں زہریلا سانپ اور ناگ بنا کر اس کی گردن میں ڈال دی جائے گی اور وہ اسے ڈسے گی، اس کی وہی دولت اسے ڈسے گی اور ہزاروں برس تک یہ عذاب مسلط رہے گا۔ میرے بھائیو! اگر ابتک اس عذاب سے بچنے کی فکر نہیں کی تھی تو خدا کے لیے اب کر لو، اپنی جانوں پر رحم کھاؤ، اپنے کو خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے بچانے کی فکر کر لو۔ آج کے دن گھر کے بچوں کو بھی عیدی دے کے خوش کیا جاتا ہے، گھر کے نوکروں نوکرانیوں کو حتیٰ کہ گھر کی بھنگنوں کو بھی عیدی دے کے خوش کیا جاتا ہے، پڑوسیوں اور ملنے والوں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے میں آپ سے اور اپنے نفس سے بھی کہتا ہوں کہ خدا کے لیے کوشش کرو کہ آج کے دن ہمارا اللہ بھی راضی اور خوش ہو جائے۔

خدا کے بندو کوشش کرو کہ اللہ راضی ہو جائے اور اللہ کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک خوش ہو۔

بڑی محرومی اور بدنصیبی ہو گی اگر ہم نے گھر کے بچوں بچیوں کو خوش کیا، بھنگن اور دھوبن کو خوش کیا، اس پڑوس والوں کو بھی خوش کیا، لیکن اللہ کو اور اس کے رسول کو خوش کرنے کی فکر نہیں کی۔ ایک مسلمان کی اس سے بڑھ کر محرومی اور کیا ہو گی! — آؤ آج طے کرو کہ عمر بھر کی خطاؤں اور گناہوں سے توبہ کرنے کے بعد نماز پابندی سے ادا ہو گی، زکوٰۃ حساب سے اور اہتمام سے ادا ہو گی اور ابتک جو تقصیر ہوئی اُس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔

اگر خود معلوم نہ ہو تو علماء سے دریافت کرو کہ کیا طریقہ ہے اب تک کی کوتاہیوں کی تلافی کا ـــــ دو باتیں تو یہ ہوئیں (یعنی نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام) اور اس کے بعد تیسری بات ہے خاص کر موٹے موٹے گناہوں سے جو ہمیں آپ کو سب کو معلوم ہیں ان سے بچنے اور پرہیز کرنے کا عہد ـــــ اور اگر بالفرض اس کے بعد پھر گناہ ہو جائے پھر اللہ کی نافرمانی ہو جائے تو بہ ٹوٹ جائے تو پھر رو کر اللہ سے توبہ کرو۔ انشاء اللہ معافی یقینی ہے، یقینی ہے، یقینی ہے۔

یہ تو اللہ کا معاملہ ہوا دوسرا معاملہ بندوں کا ہے۔ دین کے دو شعبے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ بندے کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہو، دوسرا یہ کہ بندے کا معاملہ دوسرے بندوں کے ساتھ کیا ہو، ہمارے اوپر اللہ نے ہماری اولاد کا بھی حق مقرر کیا ہے ماں باپ کا بھی حق مقرر کیا ہے۔ عزیزوں رشتہ داروں کے بھی حقوق مقرر کیے ہیں، پڑوسیوں کے حقوق مقرر کیے ہیں ہر آدمی کا حق مقرر کیا ہے۔ بلکہ جانوروں کا بھی حق مقرر کیا ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جاتا بس یوں سمجھو کہ بندوں کی حق تلفی اور کسی بندہ پر ظلم و زیادتی بڑی ہی مہلک چیز ہے اللہ کی نافرمانی بھی یقیناً بڑی خطرناک چیز ہے لیکن اللہ رحیم و کریم ہے اس کے رحم و کرم سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ معاف فرما دے گا۔ دعا سے، توبہ سے، معاف فرما دے گا ـــــ لیکن ہم آپ تو اپنے حال اور مزاج کو جانتے ہیں، قیامت میں ہر بندہ سخت محتاج ہو گا، کوئی اپنا حق چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔ تو میرے بھائیو! یہ بھی فیصلہ کرو کہ کسی بندہ کا حق نہیں ماریں گے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے، ناحق کسی کا دل نہیں دکھائیں گے ـــــ اللہ کو راضی کرنے کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ اس کی نافرمانی نہ ہو، نماز، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ کا اہتمام کیا جائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کے بندوں کی ایذا رسانی نہ ہو، حق تلفی نہ ہو، اور اگر ہو جائے تو اس کی تلافی کی فکر کرو، معافی مانگو، خوشامد کرو، جس طرح کر سکو مرنے سے پہلے اس کی تلافی کر لو ـــــ اگر اس حال میں دنیا سے گئے کہ اللہ کو راضی کر لیا ہے اس کے بندوں کی حق تلفی نہیں کی ہے، تو پھر وہاں جا کر انشاء اللہ دیکھو گے تمہارا شمار اولیاء اللہ میں ہو گا۔ یہ کہنے میں ہرگز مبالغہ نہیں، اور قطعاً کوئی حرج نہیں۔ میں صاف کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ تم اس دن اولیاء اللہ میں ہو گے ـــــ یہ سمجھنا

بہت ہی غلط ہے کہ امت محمدیہ میں ولایت صرف چند بزرگوں کے حصہ میں آئی بس شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی ولی اللہ تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء، اور خواجہ علاء الدین صابر کلیری اور اسی طرح کے چند بزرگ ولی اللہ تھے اور اب ولایت کا مقام کسی کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ اللہ اللہ! امت محمدیہ میں ولایت کا اتنا قحط، اولیاء اللہ کی بس اتنی تعداد ——— قرآن مجید نے تو اعلان کیا ہے "اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ" یہ آیت اعلان کر رہی ہے کہ ہر صاحب تقویٰ مومن ولی اللہ ہے۔ پس اگر کسی بندہ کو ایمان نصیب ہے اور سچی توبہ اور احتیاط اور فکر والی زندگی نصیب ہے (اور اسی کا نام تقویٰ ہے) اور اسی حال میں وہ دنیا سے چلا جائے تو ایسا بندہ یقیناً ولی اللہ ہے ——— دنیا اُسے ولی نہ جانتی ہو، لیکن وہ بلاشبہ اللہ کے نزدیک اس کے ولیوں میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے نہیں آئے تھے کہ آپ کی کروڑوں کی امت میں بس چند یا چند سو یا چند ہزار ولی ہوں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" یہ تو حضور کے فیض کے ساتھ بڑی بدگمانی ہے اور بڑی تنقیص ہے۔ حضور تو اس لیے آئے تھے کہ جو آپ کا دامن تھام لے، جو آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے۔ جو آپ پر ایمان لائے، آپ کا دین قبول کرلے آپ کی پیروی کرے اللہ کا ولی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس نعمت سے ہمیں آپ کو محروم نہ رکھے۔ حضور تو اس لیے آئے تھے کہ آپ کا دین قبول کر کے آپ کے راستہ پر چل کے آپ کی امت کا ہر امیر بھی ولی ہو، فقیر بھی ولی ہو، کسان بھی ولی ہو، مزدور بھی ولی ہو۔ پڑھا لکھا بھی ولی ہو اور ان پڑھ جاہل بھی ولی ہو۔ لیکن ہماری بدقسمتی، ہم نے سمجھا کہ ولایت تو ہمارے حصہ میں آ ہی نہیں سکتی، بھلا ہم کہاں! اور ہمارا کیا منہ کہ ہم اس مقام کے بارہ میں سوچ بھی سکیں ہم اس لائق ہیں ہی نہیں ——— اللہ کے بندو! خدا کی قسم یہ شیطان کا وسوسہ ہے، یہ شیطان کا فریب ہے اُس مردود کا دھوکا ہے ——— واللہ آپ میں کا ہر شخص ولی ہو سکتا ہے۔ میں اس وقت خدا کے گھر میں ہوں، خدا کے حضور میں ہوں اُس کے فرشتے بھی یہاں موجود ہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں آپ سب اولیاء اللہ ہو سکتے ہیں ——— بس اتنی شرط ہے کہ سچے دل سے ہم آپ اللہ کے حضور میں توبہ کریں، ایمان کی تجدید کریں، ابھی اقرار کریں، عہد کریں،

کہ اللہ کے حکموں پر چلیں گے، گناہوں سے بچتے رہیں گے۔ اللہ کے بندوں کی حق تلفی اور ایذا رسانی سے بچتے رہیں گے۔ جب کوئی قصور و گناہ ہو جائے گا تو معافی مانگیں گے توبہ کریں گے۔ اگر یہ نصیب ہے، اور اللہ ہمیں اس کی توفیق دے، تو انشاء اللہ سب کچھ نصیب ہے۔ سبحانک اللّٰھم وبحمدک نشھد أن لا الٰہ الا انت نستغفرک و نتوب الیک نستغفرک و نتوب الیک، نستغفرک ونتوب الیک

آؤ ہم سب اللہ کے حضور میں سچے دل سے توبہ کریں! پہلے دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرلیں! میرے بھائیو! میں تم سے اور اپنی ذات سے جتنا قریب ہوں، اللہ اس سے بہت زیادہ مجھ سے اور آپ سے قریب ہے۔ اللہ موجود ہے، حاضر ناظر ہے، اس کے فرشتے موجود ہیں، ہم اللہ کے سامنے اپنے ایمان کی تجدید کریں، نئے سرے سے اللہ سے عہد کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا عہد کریں۔ آپ کے دین پر جینے اور اس پر مرنے کا عہد کریں، آپ کے دین کو اپنے اندر اور تمام دنیا میں زندہ کرنے کی کوشش کا عہد کریں۔ میرے بھائیو ہمتیں بلند کرو، اللہ کی قدرت اور اس کی رحمت کو سامنے رکھو کہ وہ رحمان ہے رحیم ہے، غفور ہے کریم ہے، شکور ہے، حلیم ہے۔ دعاؤں کا سننے والا ہے۔ گنہگاروں سیاہ کاروں کو پاک صاف کرنے والا ہے۔ آؤ ایسے کریم مولا کے حضور میں ایمان کی تجدید کریں، توبہ کریں اور دنیا و آخرت کی نعمتیں مانگیں۔

(دعا)

اے اللہ ہم آپ کے بندے آپ کے حضور میں حاضر ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم آپ پر ایمان لائے، ہم گواہی دیتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے نبی برحق ہیں، ہم ان پر ایمان لائے اور گواہی دیتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام جن کو آپ نے اس دنیا میں بھیجا سب آپ کے برحق نبی ہیں۔ اے اللہ ہمیں حقیقت ایمان نصیب فرما! —— اے اللہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد زندگی جیسی گذرنی چاہیے تھی ویسی نہیں گذری، جن اچھے کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا

ان کے ادا کرنے میں ہم سے بے حد کوتاہیاں ہوئیں اور جن بداعمالیوں سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا، ہم اُن میں مبتلا ہوئے، ہم نے تیری نافرمانی کی، ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا — ہم سراپا قصوروار گنہگار ہیں — اے اللہ سارے گناہوں اور قصوروں کا تیرے حضور میں اقرار کر کے ہم تجھ سے مغفرت اور معافی کے طالب ہیں — اے اللہ معاف فرما دے — اے اللہ تو معاف نہ فرمائے تو کہیں پناہ نہیں، تیری پکڑ سے کہیں پناہ نہیں، ہم مجرم ہیں تیرے حضور میں حاضر ہیں اور تو معاف فرمانے والا ہے، تو رحیم ہے کریم ہے۔ اے اللہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہ فرما جس کے ہم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے مستحق ہو چکے، ہمارے ساتھ وہ معاملہ فرما جو آپ کی شان کریمی اور شان رحیمی کے لائق ہے۔ اَللّٰهُمَّ عَامِلْنَا بِمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ وَلَا تُعَامِلْنَا بِمَا نَحْنُ اَهْلُهٗ اَنْتَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ وَاَهْلُ الْجُوْدِ وَاَهْلُ الْكَرَمِ وَاَهْلُ الْاِحْسَانِ۔

اے اللہ تو حاضر ناظر ہے تیرے فرشتے یہاں موجود ہیں، ہم تیرے حضور میں اپنے سب گناہوں سے جو ہم نے کیے توبہ کرتے ہیں توبہ کرتے ہیں توبہ کرتے ہیں۔ اور عہد کرتے ہیں کہ تیرے حکموں پر چلنے کی اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اے میرے اللہ تو اس میں ہماری مدد فرما، ہمیں ہمت دے اور استقامت عطا فرما۔ اے اللہ تو اگر بچائے گا تو بچ جائیں گے تو اگر حفاظت فرمائے گا تو حفاظت ہو جائے گی۔

اے اللہ اس وقت تک کے قصور اور گناہ معاف فرما دے! اور آئندہ کے لیے تقوے والی زندگی نصیب فرما، احسان والی زندگی نصیب فرما اچھے اعمال و اخلاق والی زندگی نصیب فرما وہ زندگی نصیب فرما جس سے تو راضی ہو وہ زندگی نصیب فرما جو تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے تھے اور جس سے ہم بہت دور ہو گئے۔ اے اللہ سب کچھ تیری قدرت میں ہے۔ تو نے مکہ کے مشرکوں میں سے کسی کو ابوبکر صدیق بنا دیا، کسی کو عمر فاروق بنا دیا۔ قوم کی قوم کو کفر و شرک کی گندگیوں سے نکال کر ولایت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا، اے اللہ تیری قدرت میں ہے کہ ہم کو بھی حقیقی توبہ بھی، انابت اور ایمان و تقویٰ والی زندگی نصیب فرما دے، اے اللہ ہمیں اپنا بندہ بنا لے، اپنا بندہ بنا لے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلِّ اللّٰهُمَّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

تفاسیر قرآن اور قرآنی علوم پر بہترین کتابیں

تفسیر حقانی مترجم

مولانا عبدالحق دہلویؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر چار جلدوں میں مکمل قیمت کامل سٹ مجلد ۱۲۶

تفسیر ماجدی

از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ قرآن پاک کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بے حد قابل قدر ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مفردات القرآن پر لغوی تحقیقات کو عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات نیز ان کی شریعتوں کے احکام وغیرہ کی تشریح و توضیح میں اسرائیلیات پر اعتماد کرنے کے بجائے بڑی کاوش و تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔

جلد اول ۔/۱۸　جلد دوم ۱۷/۔　جلد سوم ۔/۵

تفسیر مظہری اردو

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تفسیر اب تک عربی زبان میں چھپتی رہی اب اسے اردو زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

جلد اول ۔/۲۲ جلد دوم (زیر طبع) جلد سوم ۔/۲۷ چہارم ۔/۲۰ پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم، نہم، دہم ہر جلد ۔/۲۰ یازدہم ۔/۲۵ دوازدہم ۔/۲۵ آخری جلد ۔/۲۲

تفسیر حل القرآن

ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
تالیف: مولانا حبیب احمد کیرانویؒ

موجودہ ضروریات و حالات کے مطابق قرآن پاک کی جامع و لاجواب تفسیر۔ قیمت مکمل سٹ ۔/۱۰۰

قاموس القرآن

مکمل و مدلل قرآنی ڈکشنری
تالیف: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

بلا مبالغہ یہ کتاب علوم قرآنیہ و معارف قرآنیہ کی مختصر انسائیکلو پیڈیا ہے جس سے طلبا، مدرسین، مبلغین، مقررین، مصنفین اور عام شائقین قرآن کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ قیمت ۔/۱۵

تدوین قرآن

قرآن کی تدوین کب اور کیسے ہوئی؟ اور قرآن کی محفوظیت کس طرح ایک بے غبار تاریخی حقیقت ہے؟ از افادات مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ قیمت ۳/۵۰

قرآن اور تعمیر سیرت

از ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے
فلسفہ و نفسیات کے ماہر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی اس کتاب میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطہ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قیمت ۔/۱۰

قرآن اور تصوف

یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین ہی کی تصنیف ہے جو مصنف موصوف کا ایک عظیم شاہکار ہے اس کتاب کے مطالعہ سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۔/۶

قرآنی شخصیتیں

قرآن میں اول سے آخر تک جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے اُن کے بارے میں مختصر تحقیقی معلومات مولانا عبدالماجد دریابادی کے شاہکار قلم سے

قیمت ۲/۲۵

درسِ قرآن ——— محمد منظور نعمانی

مرکز والی مسجد۔ ۳ر شوال ۱۳۹۷ھ یکشنبہ

● ——— ازواج مطہرات نبوی کی ایک لغزش پر سخت عتاب و مواخذہ۔

● ——— اُن کے امتیازی مقام و مرتبہ کا بیان اور اس کے مطابق خصوصی ہدایات۔

● ——— لفظ "اہل بیت" کی تحقیق اور اس بارہ میں عام غلط فہمی کا ازالہ

[الفرقان کے گزشتہ سے پیوستہ شمارے (بابت اگست) میں اپنا حال عرض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "قرآن مجید کے ہفتہ وار مقامی درس کا جو سلسلہ علالت کی وجہ سے بہت مدت تک بند رہا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب پھر شروع ہو گیا ہے لیکن مرکز والی مسجد تک نہ جا سکنے کی وجہ سے اب وہ اپنے مکان ہی پر ہوتا ہے"۔

آخر رمضان مبارک میں اندازہ ہوا کہ تھوڑی سی تکلیف اور مشقت برداشت کر کے مرکز تک بھی جایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی فیصلہ کر لیا اور رمضان مبارک کے بعد سے یہ درس وہیں ہونے لگا ہے۔ نیز قرآن مجید کے ساتھ بخاری شریف کا درس بھی شروع کر دیا گیا ہے ——— رمضان مبارک کے بعد مرکز والی مسجد میں پہلا درس ۳ر شوال کو ہوا ——— وہ الفرقان کے ذریعہ اس کے ناظرین تک پہنچایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور درس دینے والے نیز سامعین و ناظرین کے لیے نافع بنائے۔]

اعوذ باللہ بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا
فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿۲۸﴾ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ
أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۲۹﴾ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ
لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿۳۰﴾ وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ
وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا
رِزْقًا كَرِيمًا ﴿۳۱﴾ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ
فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا
مَعْرُوفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ
الْأُولَىٰ ۖ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ
إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ
تَطْهِيرًا ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿۳۴﴾ (سورۃ الاحزاب ۳۳ آیات ۲۸ تا ۳۴)

اے نبی آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجیے کہ اگر تم دنیا اور اس کی زیب و زینت کی خواہاں ہو تو آؤ میں تم کو کچھ سامان دیکر خوبصورتی کے ساتھ آزادی دیدوں، رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ و رسول (کی رضا) اور دار آخرت کی طالب ہو تو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے اچھی زندگی (یعنی صبر و شکر اور قناعت و عبادت کی زندگی) گزارنے والیوں کیلیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اے نبی کی بیویو تم میں سے کسی سے اگر کوئی صریح ناشائستہ بات سرزد ہوگی تو اسے (عام عورتوں سے) دوگنی سزا دی جائے گی، اور یہ بات اللہ کے لیے بالکل آسان ہے۔ اور جو کوئی تم میں سے اللہ و رسول کی کامل فرمانبرداری اور نیکوکاری کا رویہ اپنائے گی تو ہم اس کو دوہرا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے اور اس کے واسطے ہم نے بڑی عزت اور قدر و قیمت والا سامان حیات تیار کر رکھا ہے۔

اے نبی کی بیویو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، (تمھارا خاص مقام و مرتبہ ہے اس لیے تمہیں خصوصیت سے ہدایت کی جاتی ہے کہ) اگر تم تقویٰ اور تقرب کے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو تم نرم زبان میں (نزاکت کے انداز میں) بات نہ کیا کرو، تاکہ وہ شخص جس کے دل میں بیماری ہو کسی طمع میں نہ پڑ جائے اور بات کہو ٹھیک مناسب۔

اور تم اپنے گھروں ہی میں رہا کرو، اور زینت و آرائش کی نمائش سے جس کا زمانہ جاہلیت میں چلن تھا تم پرہیز رکھو۔ اور (ذوق شوق اور سرگرمی سے) نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو اور (ہر معاملہ میں) اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرو ــــ اے اہل بیت نبوی اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر طرح کی آلودگی دور کر دے اور تم کو بالکل پاک صاف کر دے ــــ اور تمھارے گھروں میں جو اللہ کی آیات اور حکمت و شریعت کی باتیں تلاوت کی جاتی ہیں اور بیان کی جاتی ہیں ان کو (دل و زبان سے) یاد کرتی رہو (یہی تمھارا خاص وظیفہ رہے) (سورۂ احزاب ع ۴ آیت ۳۲ سے ۳۴ تک)

تفسیر و تشریح :-

۲۔ ۴ ہفتہ سے سورۂ احزاب کا سلسلہ چل رہا ہے، یہ آیتیں جن کی اس وقت تلاوت کی گئی اُس کے چوتھے رکوع کی آیتیں ہیں، اس سے پہلے دو رکوعوں کے درس میں غزوۂ احزاب کا اور اس سلسلے کے اہم واقعات کا اچھی خاصی تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے اور اسی سلسلہ میں یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور انتہائی مجرمانہ غداری کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانان مدینہ کو بالکل ختم کر دینے اور صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی اُن کی سازش اور کوشش کا اور پھر اس کی سزا اور اس کے نتیجہ میں توراۃ کے قانون کے مطابق اُن کے بالغ مردوں کے قتل عام اور ان کی جائدادوں اور اموال کی ضبطی کا (انہی کے مقرر کیے ہوئے حَکَم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی زبان سے) جو فیصلہ ہوا اور پھر جس طرح اُس پر عمل ہوا وہ سب پچھلے ہفتہ کے درس میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے ــــ بنو قریظہ کے اس واقعہ سے متعلق تیسرے رکوع کی آخری آیت یہ تھی "وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بعض صحابہ کرام پر اپنے اس انعام و احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ یہود بنی قریظہ کی زمینوں اور ان کے

باغات اور ان کے رہائشی مکانات اور ان کے تمام اموال کا اس نے تم کو وارث بنا دیا اُن کی شرارت اور غداری کے نتیجہ میں یہ سب چیزیں تمہارے قبضہ میں آ گئیں، تم کو ان کا مالک بنا دیا گیا۔

اس آیت کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ پچھلے ہفتے کہہ چکا ہوں، اس وقت کہنے کی بات یہ ہے کہ بنو قریظہ کے یہ یہودی بہت دولت مند تھے؛ اُن کی جائدادیں اور اُن کے ہر طرح کے اموال جب قانون شریعت کے مطابق مسلمانوں میں تقسیم کر دیے گئے تو جو لوگ مسلمانوں میں مالی اور معاشی حیثیت سے بہت کمزور تھے (جیسے فقراء مہاجرین) اُن کو بھی سہارا مل گیا اور اُن کا گزر بسر بھی کچھ آسودگی سے ہونے لگا ___ لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والوں کا حال وہی رہا جو پہلے تھا یعنی فقر و فاقہ کی زندگی (جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے پسند فرمایا تھا) کیونکہ آپ کے ہاں جو کچھ آتا تھا اس کو آپ دوسروں پر اور دوسرے مصارف میں صرف کر دیتے تھے۔

غالباً انہی حالات میں اور اسی ماحول میں ازواج مطہرات کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے حالات اچھے بنا دیے ہیں اور سب گھروں میں کچھ نہ کچھ خوش حالی آ گئی ہے تو ہم بھی حضور سے اس سلسلہ میں کچھ عرض کریں، چنانچہ سب نے باہم مشورہ کر کے حضور سے درخواست کی یہ درخواست زیورات کے لیے یا اچھے قیمتی کپڑوں کے لیے یا عمدہ اور بڑھیا قسم کے کھانوں کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف گزارہ کی کچھ سہولت کے لیے تھی اور بظاہر اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اپنی بیویوں کی اتنی سی دنیا طلبی بھی آپ کو سخت ناگوار ہوئی۔ آپ کا فقر و فاقہ اختیاری تھا، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا" کہ اے اللہ میرے گھر والوں کو بس اتنا رزق ملے کہ زندگی قائم رہے ___ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا کہ "میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے ایک دن کھانا ملے اور اس پر میں اللہ کا شکر کروں اور ایک دن کھانا نہ ملے بھوکا رہوں اور صبر کروں اور اللہ سے مانگوں" ___ تو حضور نے چونکہ اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے فقر و فاقہ ہی کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا اس لیے ازواج مطہرات کا صرف گزارے کی سہولت کے لیے درخواست کرنا بھی آپ کو بے حد ناگوار ہوا۔

ع جنکے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

آپ نے قسم کھائی کہ ایک مہینے تک سب بیویوں سے الگ اور بے تعلق رہیں گے اور ایک بالائی حجرے میں آپ نے قیام فرمالیا اور اسطرح کی تنہائی اختیار فرمالی، قریباً ایک مہینہ گزر گیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں جنکی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے۔ سب سے پہلی آیت یہ ہے ـــــ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ ...... أَجْرًا عَظِيمًا مطلب یہ کہ اے ہمارے پیغمبر آپ اپنی ان بیویوں سے صاف فرمادیجیے کہ تم سوچ سمجھ کے اپنے بارہ میں فیصلہ کرو اور دو باتوں میں سے ایک طے کرو، اگر تمھیں اس دنیا کی زیب و زینت اور یہاں کے عیش کی خواہش ہے تو تم میرے ساتھ نہیں رہ سکو گی، میرا اور میرے گھر کا حال تو یہی رہے گا، لہذا اس صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ میں خوبصورتی سے تم کو آزادی دیدوں اور کچھ دے کر رخصت کردوں ــــ اور اگر بجائے دنیا اور اس کے عیش و راحت کے تم اللہ و رسول کی رضا اور جنت اور اس کی نعمتوں کی طلبگار ہو تو پھر میں تمھارے ساتھ اور تم میرے ساتھ رہوگی اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تمھارے واسطے آخرت اور جنت میں "اجر عظیم" تیار کر رکھا ہے ـــــ ان دو راستوں میں سے تم کسی ایک کا انتخاب کرو۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا یہ حکم اور پیغام ازواج مطہرات کو پہنچایا اور سنایا، سب نے کہا کہ ہماری توبہ، ہمیں اللہ و رسول اور دار آخرت جنت ہی مطلوب ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو تنہا یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی نہایت روشن دلیل ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ازواج مطہرات کی صرف گزارہ کی سہولت کی درخواست کوئی گناہ کی بات نہ تھی، غیر معقول بات بھی نہیں تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی تعلق کی وجہ سے اُن کی اس ذرا سی لغزش پر اتنا سخت عتاب ہوا کہ حضور نے بے تعلقی اختیار فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اتنا سخت حکم آگیا کہ اگر ان کے دل میں کچھ بھی دنیا کی طلب ہو تو یہ بیوی بن کر آپ کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں، یہ آزادی یعنی طلاق لے لیں

اور اپنی راہ لیں ——

آگے اسی سلسلہ میں ارشاد فرمایا گیا —— یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ...... وَاَعْتَدْنَا لَھَا رِزْقًا کَرِیْمًا —— مطلب یہ ہے کہ تم اپنے کو دنیا کی اور عورتوں کی طرح مت سمجھو، ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجیت کی وجہ سے تمہارے لیے اللہ کا خاص قانون ہے اگر بالفرض تم سے کوئی ناشائستہ گنہگارانہ حرکت سرزد ہو جائے تو تم کو دوسری عام عورتوں کے مقابلہ میں دوگنی سزا دی جائے گی، دوگنا عذاب ہوگا اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہ ہوگا —— یعنی ہمارے نبی پاک کی زوجیت وغیرہ کوئی بھی چیز ہمارے ارادہ میں حائل نہ ہو سکے گی۔ ہمارا یہ ارادہ اور فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا —— یہ آیت لرزا دینے والی آیت ہے، اللہ کا قانون کتنا بے لاگ ہے —— اگر پیغمبر کی کسی بیوی سے گناہ ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ پیغمبر کے رشتہ زوجیت کی وجہ سے کوئی رعایت نہیں کی جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یُضٰعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ" اُن کو دوگنا عذاب دیا جائے گا —— اللہ اکبر ——

"قریباں را بیش بود حیرانی"۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اسی طرح اُن کی فرمانبرداری اور نیکوکاری کا اجر و ثواب بھی دوسری عام عورتوں کی بہ نسبت دوگنا دیا جائے گا —— یہ خصوصی رعایت اور الاؤنس غالباً اس لیے کہ ان کو دنیا کے عیش و راحت سے اپنے کو محروم رکھ کر نبی کی رفاقت میں مجاہدہ کی زندگی گزارنی ہوگی —— آگے ارشاد فرمایا "وَاَعْتَدْنَا لَھَا رِزْقًا کَرِیْمًا" اور ہم نے اُن کے لیے بڑی عزت اور قدر و قیمت والا رزق تیار کر رکھا ہے —— گویا یہاں کے مجاہدے اور فقر و فاقہ کے عوض جنت میں اُن کو خاص الخاص نعمتوں سے نوازا جائے گا۔

اسی سلسلہ میں آگے ارشاد ہے "یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ ...... الآیات" مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پیغمبر کی بیویو اگر تمہاری زندگی تقوے والی رہی تو تم دنیا کی اور عورتوں کی طرح نہیں ہو بلکہ تمہارا خاص مقام و مرتبہ ہے اور اُس کے تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ "فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ" یعنی جب تمہیں کسی سے کوئی بات کہنے کی ضرورت پیش آئے تو نرم و نازک نسوانی لہجہ میں کوئی بات نہ کرو اس میں اس کا امکان ہے کہ قلب و

روح کے بیمار کسی منافق کے دل میں کسی طمع کا جذبہ پیدا ہو جائے بلکہ کرّے انداز میں بات کرو "وَقُلْنَ قَوْلاً مَعْرُوْفاً" اور بات ٹھیک اور معقول کہو۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى۔۔۔" اور اے ازواج نبی تمھارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے گھروں ہی میں رہو اور جس طرح جاہلیت کے پہلے دور میں عورتیں اپنی زینت و آرائش کی نمائش کیا کرتی تھیں اس طرح کی کوئی بات ہرگز تم سے سرزد نہ ہو۔ "وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَأَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" اور اہتمام سے نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری رہو۔ اس آیت سے یہ بات زیادہ واضح ہو گئی کہ اس رکوع میں خصوصیت سے ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے جو احکام دیے گئے ہیں اور جن باتوں کی ہدایت اور تاکید کی گئی ہے (مثلاً یہ کہ وہ دنیا کی زیب و زینت کے بجائے اللہ و رسول کی رضا اور آخرت کو اپنا مطمح نظر بنائیں، اور کسی سے کچھ کہنا ہو تو نرم و نازک لہجہ میں نہ کہیں، بے ضرورت گھروں سے نہ نکلیں اور زینت و آرائش کی نمائش سے پرہیز کریں، نماز و زکوٰۃ کا اہتمام رکھیں اور ہر معاملہ میں اللہ و رسول کے حکم پر چلیں) تو یہ احکام امہات المومنین کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب ایمان والی خواتین کے لیے بھی احکام ہیں، ہاں ازواج مطہرات چونکہ ساری امت کی مائیں ہیں اور انھیں کو دنیا بھر کی ایمان والی خواتین کے لیے معلم اور نمونہ بننا تھا اس لیے اُن کو خصوصیت سے تاکید کی گئی اور انھیں بتایا گیا کہ تمھارے لیے اللہ کا قانون زیادہ سخت ہے" قربیا نرا بیش بود حیرانی"

اس کے آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" مطلب یہ ہے کہ اے ازواج نبی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر جو یہ سخت پابندیاں عائد کی گئی ہیں، اس کا مقصد خواہ مخواہ تمھیں زحمت میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ یہ سارے احکام اور یہ ساری ہدایتیں صرف اس لیے تم کو دی جا رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو بالکل مزکّٰی اور مصفّٰی کرنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ تمھارے اعمال و اخلاق میں اور تمھاری روحوں میں ذرا بھی میل کچیل نہ رہے۔

اس آیت میں ازواج مطہرات کو "أَهْلَ الْبَيْتِ" کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔

اس کے آگے کی آیت "وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ..." الآیۃ میں بھی ازواج مطہرات ہی سے خطاب ہے۔ —— الغرض یہاں "اہل البیت" ازواج مطہرات ہی کو کہا گیا ہے اور اصلاً یہ لفظ بیوی ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے فارسی میں "اہل خانہ" اور اردو میں "گھر والی" بیوی کو کہا جاتا ہے، حالانکہ گھر میں ماں بہنیں اور بیٹیاں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کو کوئی "گھر والی" نہیں کہتا —— خود اسی آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں بھی "بُیُوْتِکُنَّ" کے لفظ میں "بیوت" یعنی گھروں کی نسبت بیویوں ہی کی طرف کی گئی ہے، ان چیزوں کو اور آیت کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر کسی کو اس میں شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہاں "اہل بیت" سے ازواج مطہرات ہی مراد ہیں، اور یہی "اھل البیت" کے اصل معنی ہیں ——

—— سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بیان کیا گیا ہے، کہ اللہ کے فرشتے ان کے ہاں پہنچے، اور ان کو اور ان کی بیوی صاحبہ حضرت سارہ کو (جو انہیں کی طرح بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور اولاد کی امید کا امکان بھی نہیں رہا تھا) ان فرشتوں نے اللہ کی طرف سے بیٹا پیدا ہونے کی بشارت سنائی، تو بیوی صاحبہ نے تعجب کے ساتھ کہا "أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوْزٌ وَهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا" (کیا میرے اولاد ہو گی جبکہ میں بڑھیا ہو چکی ہوں اور یہ میرے میاں بھی بالکل بوڑھے ہو چکے ہیں؟) تو فرشتوں نے جواب میں کہا "اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ" (کیا اللہ کے امر اور حکم کے بارہ میں تم کو تعجب ہے؟ اللہ کی خاص رحمتیں اور برکتیں ہیں تم پر اے اہل بیت، وہ اللہ حمید و مجید ہے) تو اس آیت میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی صاحبہ کو "اھل البیت" کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے —— بہر حال قرآن مجید میں "اھل البیت" کا لفظ اصلاً بیویوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور سورۂ احزاب کی اس آیت "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" کے سیاق و سباق اور سلسلۂ کلام کو دیکھنے کے بعد اس میں شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہاں اس سے ازواج مطہرات ہی مراد ہیں اور اوپر کے سارے احکام اور ہدایات کی مخاطب وہی ہیں اور اس آیت میں انہی سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان ہدایات اور ان تمام پابندیوں سے اللہ تعالیٰ کا مقصد صرف یہ ہے

اللہ تعالیٰ تم کو ایسا پاک صاف کر دینا چاہتا ہے کہ تمھاری زندگیوں میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ لیکن پروپیگنڈے کی طاقت کیسی عجیب طاقت ہے، شیعہ صاحبان کے پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہے کہ "اہل بیت" کا لفظ سنکر سنیوں بلکہ اُن کے عالموں تک کا ذہن بھی اب ازواج مطہرات کی طرف نہیں جاتا بلکہ حضرت کی صاحبزادی سیدہ حضرت فاطمہ اور ان کے دونوں صاحب زادوں حضرت حسن اور حضرت حسین اور اُن کے شوہر حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہم) ہی کو "اہل بیت" سمجھا جاتا ہے۔ میں ابھی بتلاؤں گا کہ یہ حضرات بھی بلاشبہ "اہل بیت" میں شامل ہیں، لیکن "اہل البیت" کے لفظ کا اولین مصداق ازواج مطہرات ہی ہیں اور جیسا کہ میں نے تفصیل سے بتلایا سورۂ احزاب کی اس آیت میں "اہل البیت" کے لفظ سے اصلاً وہی مراد ہیں، ان آیتوں کی وہی مخاطب ہیں، لیکن پروپیگنڈے نے ہمارے ذہنوں کو اتنا متاثر کر دیا ہے کہ ہم بھی "اہل بیت" کا مطلب اور مصداق وہی سمجھنے لگے جو شیعہ حضرات بتلاتے ہیں۔

پروپیگنڈے کے اثر کی ایک دلچسپ مثال اور ہنسنے کے قابل ایک لطیفہ خود اپنا آپ کو سناتا ہوں میرے بچپن میں خود ہمارے گھر میں اور محلہ کے قریباً ہر گھر میں خاص طور سے عشرہ محرم میں ذکر شہادت کی اور مرثیہ خوانی کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں اس لحاظ سے ہمارے محلہ اور برادری کے عام لوگ نیم شیعہ تھے۔ میں بہت چھوٹی عمر سے ان مجلسوں میں جایا کرتا تھا، تو اُس زمانہ میں گویا میرا یہ ذہن بن گیا تھا کہ دنیا کا سب سے زیادہ خبیث اور پلید آدمی یزید تھا، جس نے حضرت امام حسین کو شہید کرایا۔ میں ابوجہل، ابولہب اور فرعون و نمرود وغیرہ کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن یزید کو دنیا کا سب سے زیادہ خبیث آدمی جانتا تھا۔ ــــ پھر جب میں ۸، ۹ سال کا ہو گیا اور ناظرہ قرآن شریف پڑھنے لگا اور ایک دن سبق میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت آئی "وَلَا يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ إِلَّا خَسَارًا" تو میں نے دل میں سوچا کہ او ہو! یزید اتنا خبیث تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو "يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ" کہا ہے یعنی بہت بڑا ظالم ــــ پھر خود دل میں یہ شبہ اور سوال پیدا ہوا، کہ یزید تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بہت بعد ہوا ہے، اس کا ذکر قرآن

شریف میں کیسے آگیا؟ پھر خود ہی اُس کا یہ جواب سمجھ میں آگیا کہ اللہ تعالیٰ کو تو سب باتوں کی پہلے سے خبر تھی، اس لیے اس نے قرآن شریف میں پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ یزید "ظالمین" ہو گا، یعنی بہت ہی بڑا ظالم ہو گا ——— خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا ——— میں یہ بتلا رہا تھا کہ اس آیت "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ہ" کے سیاق سباق اور سلسلۂ کلام کو پیش نظر کر لینے کے بعد کسی کو اس میں شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس میں لفظ "اہل البیت" کا مصداق ازواج مطہرات ہیں اور وہی اس کی مخاطب ہیں ——— شیعہ صاحبان کہتے ہیں کہ اس لفظ کا مصداق "پنجتن پاک" ہیں، اور وہ اس کی دلیل میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس آیت میں "عَنْکُمْ" اور "یُطَھِّرَکُمْ" میں جمع مذکر حاضر کی ضمیر "کُمْ" استعمال کی گئی ہے جو مردوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، اس لیے اس آیت میں خطاب ازواج مطہرات سے نہیں ہے۔ اور سیاق وسباق اور سلسلۂ کلام کے بارہ میں وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت دراصل اس جگہ نہیں تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن لوگوں نے قرآن کو ترتیب دیا انھوں نے گڑبڑ کر دی اور اس آیت کو سورۂ احزاب کی اُن آیتوں کے بیچ میں رکھ دیا جن کی مخاطب ازواج مطہرات تھیں ——— یہ شیعوں کا دراصل حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر بہتان ہے کہ انھوں نے قرآن میں اس طرح کی تحریف کر دی۔ اس کی تردید کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کی خود ضمانت فرمائی ہے اور قرآن پاک ہی میں اعلان فرمایا ہے کہ۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ہ" ——— اگر شیعہ صاحبان کی یہ بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ معاذ اللہ ان خلفاء ثلٰثہ کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بھی مجبور ہو گیا۔ انھوں نے قرآن میں گڑبڑ اور تحریف کر ڈالی اور خدا اُن کو نہ روک سکا، ظاہر ہے کہ جس آدمی میں عقل اور ایمان کا کوئی ذرہ ہو وہ ایسی بات نہیں مان سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان خلفاء ثلثہ کے زمانۂ خلافت کے بعد متصلاً حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت ہے اگر بالفرض اُن حضرات نے قرآن پاک میں کوئی تحریف اور گڑبڑ کی تھی تو اُن کا فرض تھا کہ وہ اس کی اصلاح کر دیتے، لیکن شیعوں کے پاس بھی ایسا کوئی

قرآن نہیں ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرات خلفاء ثلثہ والے قرآن کی معاذ اللہ تحریف یا غلطیوں کی اصلاح اور تصحیح کی ہو اور جس میں سورۂ احزاب کی یہ آیت کسی دوسری جگہ ہو —— حق یہ ہے کہ قرآن پاک کی جو آیت بلکہ جو لفظ جہاں ہے وہ وہیں کا ہے، وہ ہر قسم کی تحریف اور گڑبڑ سے محفوظ ہے —— لہٰذا یہ کہنا کہ یہ آیت کسی اور جگہ کی تھی، حضرات خلفاء ثلثہ نے اس کو یہاں رکھ دیا، اُن حضرات پر بہتان کے علاوہ قرآن پاک کے ساتھ گستاخی ہے اور اس کے بارہ میں بے اعتمادی کا اعلان بھی ہے۔

اور شیعہ حضرات کی یہ دلیل کہ "عنکم" اور "یطہرکم" میں "کُم" جمع مذکر حاضر کی ضمیر استعمال کی گئی ہے اس لیے اس کی مخاطب ازواج مطہرات نہیں ہو سکتیں —— اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ "اہل البیت" کی رعایت سے یہ ضمیر استعمال کی گئی ہے یہ لفظ مذکر ہے، اور خطاب کے انداز میں یہ تبدیلی ازواج مطہرات کی دلداری کے لیے کی گئی ہے، کیونکہ آیت کے ان الفاظ "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" کا مقصد ہی ازواج مطہرات کی دلداری اور اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و شفقت کا اظہار ہے، جس طرح کوئی اپنی اولاد کو یا کسی عزیز کو اصلاحی تنبیہ اور ڈانٹ کے بعد پیار کے انداز میں سمجھاتا ہے۔ تو انداز خطاب اور لب و لہجہ بھی بدل جاتا ہے —— اور شفقت اور اکرام کے موقعوں پر عورتوں کو جمع مذکر حاضر کے صیغہ سے مخاطب کرنا عربوں کا دستور ہے —— اسی لیے سلام کے موقع پر عورتوں کو "السلام عَلَيْكُنَّ" نہیں کہا جاتا بلکہ "السلام علیکم" کہا جاتا ہے۔ اور سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ سے فرشتوں کی جو گفتگو ذکر کی گئی ہے اس میں فرشتوں نے بھی ان کو جمع مذکر حاضر ہی کی ضمیر سے خطاب کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں —— "اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ" بہر حال احزاب کی اس آیت میں "اہل البیت" ازواج مطہرات ہی کو کہا گیا ہے اور بلاشبہ حضورؐ کی زوجیت کے طفیل میں یہ ان کی بہت بڑی فضیلت ہے۔

ہاں ایک بات رہ گئی، میں نے کہا تھا کہ حضورؐ کی صاحبزادی سیدہ حضرت فاطمہ زہرا اور اُن کے دونوں صاحبزادے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم بھی "اہل بیت" میں شامل ہیں

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ جب سورۂ احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا اور حضرت علی اور دونوں صاحب زادوں کو بلایا اور اُن کے اوپر اپنی کملی ڈالدی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا "اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا" (اے اللہ یہ سب میرے اہل بیت ہیں پس ان سے آلائش و گندگی دور کردے اور ان کو پاک صاف فرمادے) ——

تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حضور کا یہ عرض کرنا کہ "اللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اھلُ بَیْتِی" (اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں) اس کا مقصد اللہ کو یہ بتلانا اور خبر دینا تو ہو نہیں سکتا کہ اے اللہ یہ ہیں میرے اہل بیت بلکہ کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جس طرح تو نے میری ازواج کے بارہ میں جو عرف کے لحاظ سے میرے اہل بیت ہیں یہ ارادہ فرمایا ہے اور یہ طے فرمایا ہے کہ ہر قسم کی آلودگی اُن سے دور کی جائے گی اور ان کو پاک صاف اور بالکل مزکّٰی مصفیٰ کیا جائے اور تو نے اپنی کتاب پاک میں اس کا اعلان بھی فرمادیا، تو اے اللہ اس فضیلت اور سعادت میں میری اس اولاد اور ان قریبی عزیزوں کو بھی شریک فرمادے یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔

بہرحال ازواج مطہرات کے بارہ میں آیت کے نازل ہوجانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن چاروں حضرات کو اپنی کملی میں لیکر اور ان کو اپنے اہل بیت کہکر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ اس فضیلت اور سعادت میں ان کو بھی شریک کردیا جائے —— ہم دل سے یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کی یہ دعا ضرور قبول فرمائی اور آپ کی اس دعا کے نتیجہ میں یہ حضرات بھی اب "اہل بیت" ہیں اور "لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا" کی فضیلت میں ان کا بھی حصہ ہے۔

لفظ اہل بیت کے بارہ میں میں نے یہاں جو یہ بحث کی ہے یہ صرف آیت کی تشریح اور تفسیر سے متعلق تھی، ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ کسی کا درجہ گھٹایا یا بڑھایا جائے۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا حضور کی چہیتی صاحبزادی ہونے کی حیثیت سے جو درجہ اور مرتبہ ہے وہ امت میں کسی دوسرے کا نہیں اور اسی طرح رشتہ زوجیت کے لحاظ سے ازواج مطہرات کو

جو امتیاز و شرف حاصل ہے وہ صرف انھیں کا نصیب ہے۔ ان سب کا احترام سب کی عظمت اور سب کی محبت ہم پر فرض ہے، جس کے دل میں ان میں سے کسی کے بارہ میں کبھی کچھ میل ہو وہ محروم ہے۔

اب اس رکوع کی ایک آخری آیت باقی رہ گئی ــــ ازواج مطہرات کو وہ سب نصیحتیں فرمانے کے بعد جو اوپر کی آیتوں میں مذکور ہوئیں ــــ آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے ــــ "وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا" ــــ مطلب یہ ہے کہ اے ازواج نبی تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں اور شریعت کے جو احکام بیان کیے جاتے ہیں تم ان کو یاد کرو، ان کا ذکر مذاکرہ کرتی رہو، اس کو تم اپنا خاص وظیفہ بناؤ، اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے یعنی ہر ایک کا باطن بھی اس کے سامنے ہے اور وہ ظاہر سے بھی باخبر ہے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تو قرآن مجید کی آیات نازل ہوتی تھیں، اور اس کے علاوہ شریعت کے ان احکام کی بھی وحی ہوتی تھی جو قرآن پاک میں صراحۃً مذکور نہیں ہیں، مثلاً نماز کے اوقات، اس کی رکعتیں اس کا طریقہ اسی طرح مثلاً زکوٰۃ کی تفصیلات اور حلال و حرام کے بہت سے احکام ــــ اس آیت میں "الحِکْمَة" سے شریعت کے یہی احکام مراد ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک کی آیتیں نازل ہوتیں یا احکام نازل ہوتے تو آپ ان کو اپنے گھروں میں بھی سناتے اور بتلاتے۔ تو جس طرح مسجد نبوی آپ کا ایک مدرسہ تھا اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات کے حجرے یعنی ان کے گھر بھی آپ کی تعلیم گاہ تھے۔ اور آپ یقیناً اس کا اہتمام بھی فرماتے ہوں گے کہ اللہ کی طرف سے جو آیات اور احکام آئیں، آپ ازواج مطہرات کو ان کی تعلیم دیں، کیونکہ ان کو امت کی معلمات بننا تھا اور خاص کر امت کی خواتین کے لیے نمونہ بننا تھا۔ تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو آخری نصیحت اور ہدایت یہ فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے گھروں میں تم کو اللہ تعالیٰ کی آیات اور شریعت کے احکام کی جو تعلیم دیتے ہیں، اس کو اہتمام سے یاد کرو، یہی تمہارا خاص وظیفہ ہو! ــــ آگے جو فرمایا گیا "إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا" اس کا تعلق بظاہر اوپر کی سب ہدایتوں سے ہے ــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو وہ سب

ہدایتیں دیدی گئیں جن کی تمہاری اصلاح اور تزکیہ کے لیے ضرورت تھی اور یہ بھی تم پر واضح کردیا گیا کہ ان ہدایتوں کا مقصد تم کو مزکّیٰ مصفیٰ کرنا ہے۔ اور تمہارے درجات کو بلند کرنا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ تمہارا خاص وظیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئی ہوئی نعمت کتاب اللہ اور احکام شریعت کی امین اور حامل بننا ہے ____ اس سب کے بعد فرمایا کہ دیکھو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے یعنی تمہارا باطن اور ظاہر سب اُس کی نگاہ میں ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور دیکھتا رہے گا کہ تم ان ہدایات پر کس طرح عمل کرتی ہو۔

یہ بات میں کہہ چکا ہوں کہ ان آیتوں کی خاص مخاطب اگرچہ ازواج مطہرات ہیں لیکن یہ احکام سب کے لیے ہیں، اور تعلیم و تربیت کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ اپنے خواص کو مثلاً اپنی اولاد کو مخاطب کر کے تنبیہ کی جائے اور سخت انداز میں تنبیہ کی جائے اور سب کو سنایا جائے۔ تو ان آیتوں میں یہی حکمت استعمال کی گئی ہے تاکہ عام اُمتی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کس قدر بے لاگ ہے، اور وہ اپنی اصلاح کی فکر کریں۔

ہم میں سے ہر ایک کو سمجھنا چاہیے کہ ہم سب ان ہدایتوں کے مخاطب ہیں اور اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ان ہدایات اور احکام پر ہم کتنا عمل کر رہے ہیں ____ اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق دے اور آپ کو بھی۔

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

ربا (سود) ۲
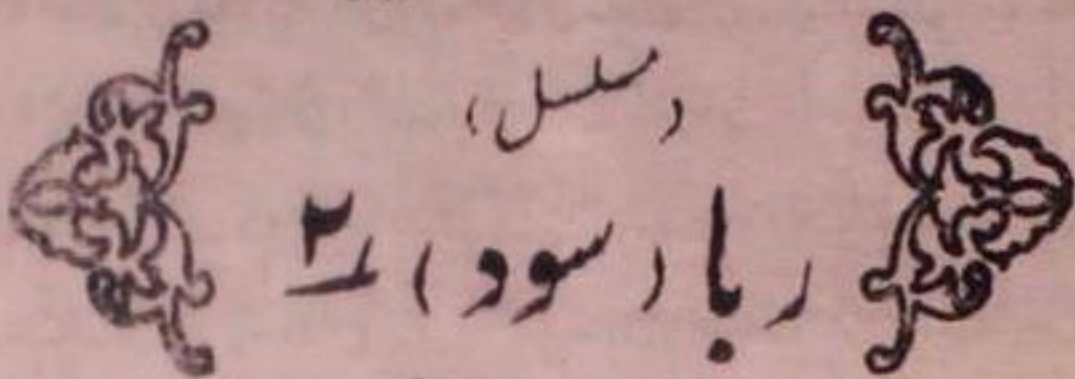
[ربا یعنی سود کے متعلق حدیثوں کی تشریح کا سلسلہ گزشتہ اشاعت میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے بارہ میں، اصولی اور تمہیدی گفتگو کے بعد چند حدیثوں کی تشریح کی جا چکی تھی، اس کا بقیہ ان صفحات میں ملاحظہ ہو۔]

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّبَا وَاِنْ كَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِيْرُ اِلٰى قُلٍّ

ـــــ رواه احمد وابن ماجه والبيهقي في شعب الايمان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے لیکن اس کا آخری انجام قلت اور کمی ہے۔

(مسند احمد، سنن ابن ماجہ، شعب الایمان بیہقی)

(تشریح) اگر حدیث کے لفظ عَاقِبَتَهٗ سے اخروی انجام مراد لیا جائے تو ظاہر ہے کہ کسی صاحب ایمان کو اس میں شک شبہ نہیں ہوگا، عالم آخرت میں پہنچ کر ہم سب دیکھ لیں گے کہ جن لوگوں نے سود کے ذریعہ اپنی دولت میں اضافہ کیا اور یہاں وہ لکھ پتی کروڑ پتی ہو گئے، آخرت میں وہ بالکل مفلس کوڑی کوڑی کے محتاج ہوں گے اور ان کی وہ دولت ہی اُن کے لیے وبال و عذاب ہو گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اطلاع دی ہے ——— اور اگر حدیث کا مطلب یہ لیا جائے کہ سود کے ذریعہ دولت خواہ کتنی ہی بڑھ جائے لیکن آخر کار دنیا میں بھی اس پر زوال آئے گا تو ظاہر بینوں کو تو اس میں شک اور کلام ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جن کو حقائق دیکھنے والی نگاہ دی ہے انھیں اس میں بھی کوئی شک شبہ نہ ہوگا۔ بکثرت ایسے واقعات مشہور ہیں کہ ایک شخص سود کے ذریعہ اپنی دولت میں اضافہ کرتا رہا اور وہ اپنے وقت کا قارون بن گیا، پھر کبھی اس شخص کی زندگی ہی میں اور کبھی اس کے بعد کوئی ایسا حادثہ رونما ہوا اور ایسی کوئی آفت آئی جس نے سارا حساب برابر کر دیا اور کبھی کبھی تو وہ لکھ پتی اور کروڑپتی دیوالیہ اور محتاج ہو کر رہ گیا۔ اور یہ بات سو فیصدی مشاہدہ اور تجربہ میں ہے کہ سود خور لوگ اس حقیقی راحت اور عزت و احترام سے یکسر محروم رہتے ہیں جو دولت کا اصل مقصد اور ثمرہ ہے، اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی سود خور سودی کاروبار کے ذریعہ خواہ کتنی ہی دولت پیدا کرے وہ دولت کے حقیقی لطف و ثمرہ سے ہمیشہ محروم ہی رہتا ہے، اس حساب سے وہ دولت مند ہونے کے باوجود مفلس اور تہی دست ہی ہے ——— قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو" (ربا اور سود سے کمائی ہوئی دولت کو اللہ تعالیٰ برکت سے محروم رکھتا ہے اور اس پر دیر سویر بربادی آتی ہے۔) حضرت ابن مسعودؓ کی اس حدیث میں اسی ارشاد خداوندی کی ترجمانی کی گئی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیَاْتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی اَحَدٌ اِلَّا اٰكِلَ الرِّبٰا فَاِنْ لَّمْ یَاْكُلْهُ اَصَابَهٗ مِنْ بُخَارِهٖ (وَیُرْوٰی مِنْ غُبَارِهٖ) ——— رواہ احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجة

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہر شخص سود کھانے والا ہوگا، (کوئی بھی اس سے محفوظ نہ ہوگا) اگر خود سود نہ بھی کھاتا ہوگا تو اس کے بخارات یا اس کا غبار ضرور اس کے اندر پہنچے گا۔ (مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اس ارشاد سے حضور کا مقصد مستقبل کے بارہ میں صرف ایک پیشین گوئی کرنا نہیں ہے

بلکہ اصل مقصد امت کو خبردار کرنا ہے کہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب سود کی وبا عام ہو جائے گی اور اس سے محفوظ رہنا بہت ہی دشوار ہو گا۔ لہٰذا چاہیے کہ ہر صاحب ایمان اور صاحب تقویٰ اس بارہ میں چوکنا رہے اور اپنے کو اس لعنت سے محفوظ رکھنے کی فکر اور کوشش کرتا رہے۔ یقیناً ہمارا زمانہ بھی وہی زمانہ ہے اللہ کے جو بندے سود کو لعنت سمجھ اور بتوفیق خداوندی اُس سے پرہیز کرتے ہیں وہ بھی اپنا غذائی سامان یا پہننے کا کپڑا جن دوکانداروں سے خریدتے ہیں ان کے کاروبار کا رشتہ بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی نہ کسی سودی سلسلہ سے ضرور ہے، آجکل کسی کاروباری سلسلہ کا اس سے محفوظ رہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا جنگل کے کسی درخت کا ہوا سے محفوظ رہنا۔ اللّٰھم احفظنا!

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبُرُّ بالبُرِّ والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ يداً بيدٍ فاذا اختلفت هذه الاجناس فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيدٍ۔		رواه مسلم

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونے کی بیع سونے کے بدلے اور چاندی کی چاندی کے بدلے اور گیہوں کی گیہوں کے بدلے اور جو کی جو کے بدلے اور کھجوروں کی کھجوروں کے بدلے اور نمک کی نمک کے بدلے یکساں اور برابر اور دست بدست ہونی چاہیے، اور جب اجناس مختلف ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔		(صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلذَّھَبُ بِالذَّھَبِ وَالْفِضَّۃُ بِالْفِضَّۃِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِیْرُ بِالشَّعِیْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلاً بِمِثْلٍ یَدًا بِیَدٍ فَمَنْ زَادَ اَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ اَرْبٰی اَلْاٰخِذُ وَالْمُعْطِیْ فِیْہِ سَوَاءٌ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونا سونے کے عوض اور چاندی چاندی کے عوض اور گیہوں گیہوں کے عوض اور جو جو کے

عوض اور کھجوریں کھجوروں کے عوض اور نمک نمک کے عوض ... برابر سرابر بیچا خریدا جائے — جس نے زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا تو اس نے سود کا معاملہ کیا (اور وہ سود کے گناہ کا مرتکب ہوا) اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس مضمون کی حدیثیں اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید خدری کے علاوہ حضرت عمر، حضرت عبادہ بن صامت حضرت ابو بکرہ، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہم) وغیرہ اور بھی متعدد صحابہ کرام سے مروی ہیں — ان کا مدعا اور مطلب یہ ہے کہ جن چھ چیزوں کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے (یعنی سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور، نمک) اگر ان میں سے کسی جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کیا جائے (مثلاً گیہوں دے کر اس کے بدلے میں گیہوں لیے جائیں) تو یہ معاملہ جب جائز ہو گا جب برابر سرابر اور دست بدست لیا دیا جائے، اگر کمی بیشی ہوئی یا لین دین دست بدست (ہاتھ کے ہاتھ) نہ ہوا بلکہ قرض ادھار کی بات ہوئی تو جائز نہ ہو گا بلکہ یہ ایک طرح کا سود کا معاملہ ہو جائے گا اور دونوں فریق سود کے مرتکب اور گنہگار ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں ان حدیثوں کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور اس سے پہلے زمانہ جاہلیت میں جس ربا (سود) کا رواج تھا اور جس کو "ربا" کہا جاتا تھا وہ قرض ادھار والا ہی سود تھا جس کی صورت (جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا) یہ تھی کہ جو سرمایہ دار مہاجن سودی کاروبار کرتے تھے، ضرورت مند لوگ ان سے قرض لیتے تھے اور طے ہو جاتا تھا کہ اتنے اضافہ کے ساتھ فلاں وقت تک وہ یہ قرض ادا کر دیں گے، پھر اگر مقررہ میعاد پر وہ ادا نہ کر سکتے تو اور مہلت لے لیتے اور اس مہلت کے حساب میں سود کی رقم میں اور اضافہ طے ہو جاتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ، اسی سودی کاروبار کا رواج تھا اور اسی کو "ربا" کہا جاتا تھا، قرآن مجید میں براہ راست اسی کو حرام قرار دیا گیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے خرید و فروخت کی بعض صورتوں کے بھی ربا کے حکم میں داخل ہونے کا اعلان فرمایا اور ان سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی — ان حدیثوں میں اسی کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ اور

مقصد و مدعا یہ ہے کہ جن چھ چیزوں کا مندرجہ بالا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے ان میں کسی جنس کا بھی اگر اسی جنس سے تبادلہ کیا جائے تو کسی طرف کمی بیشی نہ ہو بلکہ برابر سرابر ہو اور لین دین ہاتھ کے ہاتھ ہو، اگر تبادلہ میں کمی بیشی ہوئی یا لین دین ہاتھ کے ہاتھ نہ ہوا تو یہ ربوٰ اور سود کی ایک قسم ہوگی اور دونوں فریق گنہگار رہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے معمول کے مطابق اس حکم کی جو حکمت بیان فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تعیش اور "رفاہیت بالغہ" یعنی زیادہ بلند معیار اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی کو پسند نہیں فرماتا کیونکہ جو شخص بہت اونچے معیار کی اور تعیش کی زندگی گزارے گا وہ لازمی طور پر طلب دنیا میں زیادہ منہمک ہوگا اور آخرت کی زندگی کو بہتر بنانے اور روح کے تزکیہ کی فکر سے وہ اُسی حساب سے غافل ہوگا یا علاوہ ازیں معاشرہ میں زیادہ اونچ نیچ سے جو طرح طرح کے مفاسد پیدا ہوتے ہیں وہ بھی پیدا ہوں گے — اور تعیش اور اعلیٰ معیار زندگی ہی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز بڑھیا سے بڑھیا اور اعلیٰ معیار کی استعمال کی جائے، گیہوں اعلیٰ قسم ہی کا کھایا جائے، کھجوریں اعلیٰ قسم ہی کی کھائی جائیں، سونا اور چاندی اعلیٰ معیار ہی کی استعمال کی جائیں جس کی عملی صورت اکثر یہی ہوتی تھی کہ اگر اپنے پاس اعلیٰ درجہ کی چیز نہیں ہے بلکہ معمولی درجہ کی ہے تو وہ زیادہ مقدار میں دے کر ان کے بدلے میں اعلیٰ معیار کی تھوڑی مقدار میں لے لی جائے، — بہر حال کمی بیشی کے ساتھ ایک جنس کا اسی جنس سے تبادلہ عموماً تعیش اور اعلیٰ معیار زندگی کے تقاضے سے ہی کیا جاتا تھا تو اس کی ممانعت کے ذریعہ اس کے راستہ میں رکاوٹ ڈالی گئی اور ایک حد تک اس کا سدباب کیا گیا — واللہ اعلم باسرار احکامہ

حدیث میں صرف مذکورہ بالا چھ چیزوں کے بارے میں یہ حکم دیا گیا ہے لیکن امت کے فقہاء مجتہدین کا اس پر قریباً اتفاق ہے کہ ان چھ چیزوں کے علاوہ بھی جو چیزیں اسی نوعیت کی ہیں ان کا حکم بھی یہی ہے اگرچہ تفصیلات میں فقہا کی رایوں میں کچھ فرق و اختلاف ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَ بِلَالٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِتَمْرٍ

بَرْنِیٍّ فَقَالَ لَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم مِنْ اَیْنَ ھٰذَا؟ قَالَ کَانَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِیٌّ فَبِعْتُ مِنْہُ صَاعَیْنِ بِصَاعٍ فَقَالَ اَوَّہْ عَیْنُ الرِّبٰوا لَا تَفْعَلْ وَلٰکِنْ اِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَشْتَرِیَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَیْعٍ آخَرَ ثُمَّ اشْتَرِبِہٖ — رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ بلالؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت اچھی قسم کی (برنی) کھجوریں لائے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ یہ کہاں سے آئیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس گھٹیا قسم کی کھجوریں تھیں میں نے وہ دو صاع دے کر یہ برنی ایک صاع خرید لیں — آپ نے فرمایا آہ! یہ تو عین ربا ہوا، آئندہ ایسا کبھی نہ کرو، جب تم (کھجوروں سے) کھجوریں خریدنی چاہو تو پہلے اپنی کھجوریں بیچ دو۔ پھر اُن کی قیمت سے دوسری کھجوریں خریدو۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ (جو یقیناً اس سے ناواقف نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ربوٰ کو حرام قرار دیدیا ہے) انھوں نے جس طرح کھجوریں خریدی تھیں اس کو انھوں نے ربوٰ نہیں سمجھا تھا وہ "ربوٰ" قرض والے سود ہی کو سمجھتے تھے جس کو عام طور سے ربوٰ کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتلایا کہ کمی بیشی کے ساتھ کھجوروں کا تبادلہ بھی ربوٰ کے حکم میں ہے۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ قرض والا ربوٰ "حقیقی ربوٰ" ہے اور حضرت ابو سعیدؓ وغیرہ کی حدیثوں میں جس کو ربوٰ قرار دیا گیا ہے وہ "حکمی ربوٰ" ہے یعنی ربوٰ کے حکم میں ہے۔

عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ مُعَاوِیَۃَ بَاعَ سِقَایَۃً مِنْ ذَھَبٍ اَوْ وَرِقٍ بِاَکْثَرَ مِنْ وَزْنِھَا فَقَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْھٰی عَنْ مِثْلِ ھٰذَا اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ فَقَالَ لَہُ مُعَاوِیَۃُ مَا اَرٰی بِمِثْلِ ھٰذَا بَاْسًا فَقَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ مَنْ یَّعْذِرُنِیْ مِنْ مُعَاوِیَۃَ اَنَا اُخْبِرُہٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَھُوَ یُخْبِرُنِیْ عَنْ رَاْیِہٖ

لَا أُسَاكِنُكَ بِأَرْضٍ أَنْتَ بِهَا، ثُمَّ قَدِمَ أَبُو الدَّرْدَاءِ عَلَى عُمَرَ فَذَكَرَ لَهُ ذَالِكَ فَكَتَبَ عُمَرُ إِلَى مُعَاوِيَةَ أَنْ لَا تَبِيعَ ذَالِكَ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَزْنًا بِوَزْنٍ ——— رواہ مالک فی الموطا والنسائی فی سننہ

عطا بن یسار تابعی سے روایت ہے انھوں نے بیان کیا کہ حضرت معاویہؓ نے سونے یا چاندی کا ایک پیالہ (یا جگ) اُسی جنس کے اُس سے زیادہ وزن کے عوض فروخت کیا، تو حضرت ابو الدرداء نے اُن سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ آپ اس طرح کی بیع فروخت سے منع فرماتے تھے۔ اِلّا یہ کہ برابر سرابر ہو، تو حضرت معاویہ نے کہا کہ میرے نزدیک تو اس میں کوئی مضائقہ اور کوئی گناہ کی بات نہیں ہے ——— حضرت ابو الدرداء نے (سخت رنجیدہ ہو کر) کہا کہ مجھے معاویہ کے بارہ میں معذور سمجھا جائے۔ میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بتاتا ہوں اور وہ مجھے اپنی رائے بتاتے ہیں۔ (اس کے بعد خود حضرت معاویہ سے کہا کہ) میں تمہارے ساتھ اُس سرزمین میں نہیں رہوں گا جہاں تم ہو گے۔ اس کے بعد حضرت ابو الدرداء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ آئے اور آپ سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت معاویہ کو لکھا کہ اس طرح کی بیع فروخت نہ کرو، سونا چاندی وغیرہ کا اسی جنس سے تبادلہ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ دونوں طرف وزن یکساں اور برابر سرابر ہو۔ (موطا امام مالک۔ سنن نسائی)

(**تشریح**) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت معاویہؓ علاقہ شام کے حاکم (گورنر) تھے، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا قیام بھی وہیں تھا۔ اسی زمانہ میں حضرت معاویہ نے سونے یا چاندی سے بنا ہوا پانی کا ایک برتن (پیالہ یا جگ) بطور قیمت اُسی جنس سے وزن میں کچھ زیادہ لیکر فروخت کیا اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا، حضرت ابو الدرداء نے اُن سے ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے، حکم یہ ہے کہ سونے یا چاندی کی کوئی چیز اگر اسی جنس کے عوض بیچی یا خریدی جائے تو وزن میں کمی بیشی نہ ہونی چاہیے وزن برابر ہونا چاہیے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ کا خیال غالباً یہ تھا کہ سونے یا چاندی سے بنی ہوئی چیز (زیور یا برتن) اگر فروخت کیا جائے تو بنوائی کی اجرت کا لحاظ کر کے کچھ زیادہ لینا ناجائز نہ

ہو گا، اس بنا پر انھوں نے کہا کہ "میرے نزدیک تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے"۔
لیکن حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ کی یہ بات سخت ناگوار ہوئی کیونکہ انھوں نے حضورؐ سے جو کچھ سنا تھا وہ اس کی روشنی میں اس رائے یا اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔
بہرحال وہ ناراض ہو کر وہاں کی سکونت ترک کر کے مدینہ چلے آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے واقعہ بیان کیا، آپ نے حضرت معاویہ کو لکھا کہ شرعی حکم وہی ہے جو ابو الدرداء نے بتلایا لہٰذا ایسی خرید و فروخت نہ کی جائے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ربا (سود) کی اس دوسری قسم (ربائے حکمی) کے بارہ میں بھی صحابہ کرام میں کتنی شدت تھی اور اس بارہ میں کسی کی اجتہادی غلطی بھی ان کے لیے قابل برداشت نہیں تھی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ
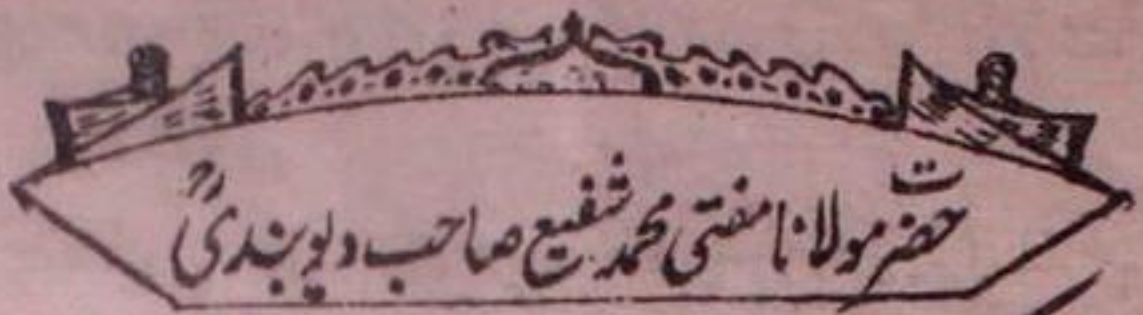
سود کی حقیقت ــــــ اور اس کے حرام ہونے کی حکمت

(الفرقان کی گزشتہ اشاعت اور اس شمارہ میں ربا (سود) سے متعلق احادیث کی تشریح کی گئی ہے، اس موضوع پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں سود سے متعلق جو بحث کی ہے اس کا ایک حصہ بھی اسی کے ساتھ الفرقان میں شائع کر دیا جائے ــــــ ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں)

اس موضوع پر گفتگو سے پہلے ایک بات پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، آج کل ربٰو چونکہ عام نظام تجارت کا رکن اعظم اور عمود بن گیا ہے، اس لیے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت سامنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا تجزیہ کرکے اس کے ہر پہلو پر علاحدہ علاحدہ سچائی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہیے، خلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے الجھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں پر بحث کے تین حصے ہیں!

اوّل یہ کہ قرآن و سنت میں ربٰو کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے۔

دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔

تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی برا سہی، لیکن آجکل کی دنیا میں وہ نظام معاشیات

و تجارت کا رکن اعظم بن چکا ہے، اگر قرآنی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظام بنک و تجارت کیسے چلے گا۔

اب سنیے کہ لفظ ربا۔ عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن سے قبل جاہلیت عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لین دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۂ نساء کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہ تورات میں بھی معروف تھے، اور تورات میں بھی اس کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ (وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ)

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف چلا آتا ہے اور اس پر لین دین کا رواج چل رہا ہے، اور قرآن اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و ربا حرام کیا گیا تھا۔ اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۸ھ ہجری میں سورۂ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابۂ کرام سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسرے معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو، بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابۂ کرام نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی، ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملات میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الادا تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھا اور مسلمان نزول ممانعت کے بعد اس کو دینا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیر مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۂ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لین دین بھی اب جائز نہیں،

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک اسلامی حکم

شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض، ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا عام طور پر معروف تھا وہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے اور اس کا لین دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں بلکہ قانون ملک کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپ نے رباد میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اشکال پیش آیا اور انہی میں ائمۂ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، ورنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اشتباہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی کا اختلاف ہوا،

اب سنئے عرب کا مروجہ ربا کیا تھا؟ امام تفسیر ابن جریرؒ نے حضرت مجاہد سے نقل کیا کیا ہے کہ جو ربا جاہلیت میں جاری تھا اور قرآن نے اسے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لیے قرض دے کر اس پر اصل راس المال سے زائد مقررہ زیادتی لیتے تھے اور اگر میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے (تفسیر ابن جریر ص ۶۲ ج ۳)

اندلس کے مشہور امام تفسیر ابو حیان غرناطی کی تفسیر بحر محیط میں بھی جاہلیت کے ربا کی یہی صورت لکھی ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام ربا تھا، اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع و شرا میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھار پر دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع و ربا کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر

روایات کے ساتھ منقول ہے۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا۔ الربوا فی اللغۃ الزیادۃ والمراد بہ فی الآیۃ کل زیادۃ لا یقابلہا عوض (ص ۱۰۱ جلد ۲) یعنی رباء کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض اُدھار اور اس کی میعاد ہو، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ رباء کی دو قسمیں ہیں ایک معاملاتِ بیع و شراء کے اندر رباء اور دوسرے اُدھار کا رباء، اور جاہلیت عرب میں دوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معین میعاد کے لیے دیتے تھے اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعادِ معین پر ادائیگی نہ کر سکا تو میعاد اور بڑھا دی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھا دیتے، یہی جاہلیت کا رباء تھا جس کو قرآن نے حرام کیا۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں رباء کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں۔

ھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ مال علی المستقرض	"یعنی وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لیے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اس کو مال سے زائد کچھ رقم ادا کرے گا"

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رباء کی تعریف یہ فرمائی ہے:۔

کل قرض جر نفعاً فھو رباء	"یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ رباء ہے"

یہ حدیث جامع صغیر میں ہے اور عزیزی نے اس کو حسن کہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام رباء ہے جو جاہلیت عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا جس کو قرآن کریم کی آیت مذکورہ نے صراحۃً حرام قرار دیا اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصومات میں اس کو نافذ فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال نہ اس میں کسی کو کوئی اشتباہ و اشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رباء کے مفہوم میں بیع و شراء کی چند صورتوں کو بھی داخل فرمایا جن کو عرب رباء نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع و شراء میں یہ حکم

دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر سرابر ہونا چاہیے اور نقد دست بدست ہونا چاہیے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی ربا ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور انگور ہیں۔

اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزابنہ[1] اور محاقلہ کے نام سے رائج تھیں آیات ربا نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ربا میں شامل قرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم، ص ۳۲۷ ج ۱)

اس میں یہ بات قابل غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت یہ ہے، یا ان کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کس کس صورت کو داخلِ ربا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا جس کی بناء پر فرمایا۔

ان اٰیة الربوا من اٰخر ما نزل	یعنی آیتِ ربا، قرآن کی آخری آیتوں میں
من القرآن وان النبی صلی اللہ علیہ	ہے اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے
وسلم قبض قبل ان یبینه لنا فدعوا	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اس لیے
الربوٰ والریبة،	اب احتیاط لازم ہے، ربا کو تو چھوڑنا ہی ہے
(احکام القرآن، جصاص، ص ۵۵۱ و تفسیر	جس صورت میں ربا کا شبہ بھی ہو اس کو بھی
ابن کثیر بحوالہ ابن ماجہ ص ۳۲۷ ج ۱)	چھوڑ دینا چاہیے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں ربا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، باقی اصل ربا، جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا اور حجۃ الوداع

---

[1] "مزابنہ" یہ ہے کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازہ سے فروخت کیا جائے اور "محاقلہ" یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم، جو وغیرہ کو خشک صاف کیے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازہ میں چونکہ کمی بیشی کا امکان رہتا ہے اس لیے اس کو منع کیا گیا۔ ۱۲ منہ

کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظمؓ کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظمؓ کو ربا، کی جن خاص صورتوں میں اشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا، کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے۔

مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظام تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انھوں نے فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ربا، کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لیے اس میں رائے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن ابن عربی نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنھوں نے اس فاروقی ارشاد کی بنا، پر آیات ربا، کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا۔

ان من زعم ان هٰذه الاٰية مجملة فلم يفهم مقاطع الشريعة فان الله تعالىٰ ارسل رسوله الى قوم هو منهم بلغتهم وانزل عليه كتابه تيسيرًا منه بلسانه ولسانهم والربا فى اللغة الزيادة والمراد به فى الاٰية كل زيادة لا يقابلها عوض"	"یعنی جس نے یہ کہا کہ آیت مجمل ہے، اس نے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے انھی کی زبان میں بھیجا، اُن پر اپنی کتاب آسانی کے لیے انھی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں، اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے۔"

اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ ربا، کی دو بڑی قسمیں ہیں، ایک اُدھار کا ربا، دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا۔ پہلی قسم وہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی اور اہل جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کمی زیادتی ربا، میں داخل ہے۔

اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا، کی دو بڑی قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر

اور دوسری، بغیر بیع و شراء کے اور زمانۂ جاہلیت کا ربا یہی دوسری قسم کا تھا اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ قرض جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے، اور قرض اُدھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو قرض اُدھار پر لیا دیا جاتا تھا اور اسی کو زمانۂ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراء میں کمی زیادتی یا اُدھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آئی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابۂ کرام کو اشکال پیش آیا اور فقہ کے اختلافات ہوئے۔
(معانی الآثار ص ۲۳۲ ج ۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرمایا ہے کہ ربا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم ربا ہے، حقیقی ربا قرض اُدھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم ربا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو ربا کہا گیا ہے اور ایک حدیث میں جو آیا ہے لا ربا الا فی النسیئۃ (رواہ البخاری) یعنی ربا صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ اُدھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب بحکم ربوا میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہوگئیں۔

اول یہ کہ نزول قرآن سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، قرض ادھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ قرآن میں حرمت ربا نازل ہوتے ہی سب صحابۂ کرام نے اس ربا کو

ترک کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ اشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں برابری شرط ہے، کمی بیشی ربا میں داخل ہے اور ان میں اُدھار کرنا بھی ربا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور، انگور ہیں اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروجہ اقسامِ بیع مزابنہ، محاقلہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو صراحتہً ربا میں داخل کر کے حرام قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرما دیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ جہاں ربا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہیے۔

چوتھے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی ربا جس کو فقہاء نے ربوا القرآن یا ربوا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے۔ جو عرب میں متعارف تھا یعنی قرض ادھار پر بحساب میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے ربا جو حدیث میں بتلائے گئے، وہ سب اسی ربا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں اور جو کچھ خلاف و اختلاف امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملاتِ ربا میں ہوا، پہلی قسم کا ربا جو ربا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امتِ محمدیہ میں بھی کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو ربا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی ربا ہے جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

ربا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رواج عام ہے

نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وسنت میں ربا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے،

اس کے بعد دوسری بحث اس کی ہے کہ ربا کی حرمت وممانعت کس حکمت ومصلحت پر مبنی ہے اور اس میں وہ کون سی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں جس کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے،

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخلوقات اور ان کے معاملات میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بچھو، بھیڑیا، شیر اور سنکھیا جیسے زہر قاتل میں بھی انسان کے لیے ہزاروں فوائد ہیں ؎

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب وملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع ومفید کہا جاتا ہے اور جن کے مفاسد ومضرات زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لیے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے اجتناب لازم ہے۔

ربا یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خوار کے لیے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع نقصان یا مفاسد ومصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقلمند کے نزدیک قابلِ نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیرپا یا دائمی ہو تو اس کو کوئی عقلمند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کرسکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو

بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا۔ چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے مگر وہ پوری ملت کے لیے مضر اور اُن کے امن وسکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لیے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا،

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالیے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خوار کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اُس کا رُوحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج پا جاتی ہے تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں،

رسم ورواج طبائع انسانی کے لیے ایک کلوروفارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم ورواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا۔ بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں تو پابندیٔ رسم ورواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتے،

سود و ربا اس زمانہ میں ایک وبائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑوے کو میٹھا سمجھنے لگی اور جو چیز پوری انسانیت کے لیے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں وبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بنا پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مضرت سے آگاہ کرتا رہے اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاحِ خلق کے ذمہ دار ہو کر آتے ہیں، وہ کبھی اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سنے گا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا ماننے والا اس وقت کوئی تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟

سود و ربا کو اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لیے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہلِ علم و فن بھی کبھی رسم و رواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سود و ربا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلقِ خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار رہو، اور وہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر یا یوں کہیے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے پھلتے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے تو اس کو جھٹلانے کے لیے ہمیں امریکہ اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں اور یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور اس کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لیے آپ کو مردم خوروں کے محلہ میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تازے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محلہ میں نہیں دوسرے محلوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مُردے پڑے ہوئے ہیں، جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو اور کچھ افراد یا ان کے جتھے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔ ....

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

آسمانِ علم و عرفان کے دو درخشندہ ستارے

حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ محمد یعقوب محدث دہلویؒ

ابو سلیمان حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت شاہ محمد یعقوب، دونوں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے نواسے ہیں۔ اضافی عزت و عظمت کے ساتھ ساتھ ذاتی اوصاف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، اور بقول نواب صدیق حسن خاں مرحوم اس پیشین گوئی کے مصداق تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کی تھی اور جو قول الجلی (سوانح حضرت شاہ ولی اللہ مؤلفہ شاہ محمد عاشق پھلتیؒ) میں مندرج ہے، ان دونوں بھائیوں کے فیوض و برکات آفاق گیر ہیں۔ خصوصاً اول الذکر نے جانشین حضرت شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلوی کی حیثیت سے ہند اور بیرون ہند میں اپنے لائق و فائق تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد چھوڑی جنھوں نے تدریس علم حدیث کی محفلیں مدتوں گرم رکھیں، اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ تا آنکہ آج اسی سلسلہ کی بدولت دیوبند و سہارنپور وغیرہ کی درسگاہیں علوم دینیہ خصوصاً علم حدیث کی صداؤں سے گونج رہی ہیں۔ آج کوئی مدرسہ اور تعلیمی ادارہ ایسا نہیں ہے جس میں علم حدیث پڑھایا جاتا ہو اور اس کا تعلق حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے نہ ہو۔

۱۲۵۸ھ میں ان دونوں بھائیوں نے مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی اور بالآخر جنت المعلیٰ میں یہ دونوں مدفون ہوئے۔

احکام العیدین مؤلفہ نواب قطب الدین خاں دہلویؒ کے دیباچے میں حضرت شاہ محمد

اسحٰق کی ہجرت کا نہایت موثر انداز میں ذکر ہے، اس کی زبان اگرچہ قدیم اُردو ہے مگر اس کے ہر ہر حرف سے بوئے محبت و اخلاص آرہی ہے۔ یہ کتاب چونکہ کمیاب ہوگئی ہے اور حضرت شاہ صاحب کی سنہ ہجرت میں بہت سے تذکرہ نویسوں نے غلطی کی ہے[1] اس لئے میں چاہتا تھا کہ اس دیباچہ کو تھوڑی سی تشریح کے ساتھ مضمون کی شکل میں شائع کرا دوں، اس میں ہجرت کی صحیح تاریخ بھی دیگر تفاصیل کے ساتھ موجود ہے۔ بعد کو خیال ہوا کہ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ اور ان کے بھائی شاہ محمد یعقوبؒ پر ایک مختصر مقالہ ہی چند معتبر تذکروں سے حالات اخذ کر کے مرتب کر دیا جائے۔

حکیم محمود احمد برکاتی مقیم لاہور نے شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان نامی کتاب میں حضرت شاہ محمد اسحاق کا ذکر کرتے ہوئے شروع میں جو چند جامع اور پر مغز الفاظ تحریر فرمائے ہیں، ان کو یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:-

"شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ، شاہ عبد العزیزؒ کے بڑے نواسے خلیفہ اور جانشین تھے۔ خانوادہ ولی اللّٰہی کے آخری عظیم و جلیل رکن، انیسویں صدی عیسوی کے بیشتر خدام حدیث نبوی کے شیخ تھے۔ شاہ ولی اللہ نے برسوں پہلے اپنے احفاد کے دائرۂ فیض کی وسعت کی جو پیش گوئی کی تھی اس کے مصداق شاہ محمد اسحٰق (اور انکے چھوٹے بھائی) ہی تھے"۔

حضرت شاہ صاحب کے مشہور تلامذہ کے تفصیلی حالات و سوانح انشاء اللہ دوسری قسط میں پیش کروں گا۔

اب میں پہلے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کا تذکرہ کرتا ہوں۔ آپ کے متعلق نواب صدیق حسن خاں قنوجی اتحاف النبلاء (صفحہ ۴۳۰-۴۳۱) میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اولاد امجاد اودا اے شاہ ولی اللہؒ کہ ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت و فرید دہر و وحید عصر در علم و عمل و عقل و فہم و قوت تقریر و فصاحت تحریر و تقویٰ و دیانت و

---

[1] چنانچہ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند مطبوعہ پاکستان میں صفحہ ۴۰۹ پر آپ کا سال ہجرت ۱۲۵۷ھ لکھا گیا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ اور تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرہ رحمانیہ مؤلفہ مولانا قاری محمد عبد الحلیم انصاری پانی پتی میں صفحہ ۴۲ پر ہے کہ "۱۲۵۹ھ میں یکایک حضرت شاہ صاحب کا ارادہ حج کا ہوگیا" حالانکہ شاہ صاحب پہلی مرتبہ حج کو ۱۲۴۰ھ میں گئے تھے اور واپس آگئے تھے۔ ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کی ہے۔

امانت و مراتب ولایت بود، و ہمچنیں اولادِ اولاد ۔

ایں خانہ تمام آفتاب است ایں سلسلہ از طلائے ناب است

در قول جلی از کلام ایشاں آوردہ کہ فرمودند "آگاہی آمد ایں فرزنداں کہ لطف الٰہی ایشاں را بما عطا کردہ است، ہمہ سُعدا اند۔ نوعے از ملکیت در ایشاں ظہور خواہد کرد۔ لیکن تدبیر غیب تقاضا می کند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در مکہ و مدینہ سالہا احیاء علوم دین نمایند و ہمہ جا وطن اختیار کنند۔ از طرف مادر نسب ایشاں بما متمکن باشند۔ زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبعی دارد۔ و انتقال جماعۂ کہ بوطن والدۂ ایشاں متمکن باشند بسر زمینے بالطبع مستحیل است، مگر بقسر قاسر" انتہی بلفظہٖ۔۔۔۔

محرر سطور گوید مصداق ایں آگاہی بظاہر وجہ بہر دو نواسۂ شاہ عبدالعزیز دہلوی است، مولوی محمد اسحق و مولوی محمد یعقوب کہ ہجرت از طرف دہلی کردہ در مکہ اقامت نمودند و سالہا باحیائے روایت حدیث باہل عرب و عجم پرداختند واللہ اعلم۔۔۔۔

(ترجمہ) "حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اولاد میں سے ہر ایک علم و عمل عقل و فہم قوت تقریر فصاحت تحریر تقوی و دیانت اور امانت اور مراتب ولایت میں بے نظیر وقت فرید دہر اور وحید عصر تھا اور ویسے ہی ان کی اولاد کی اولاد بھی کمال والی اور امتیازی شان رکھنے والی تھی ۔

ایں خانہ تمام آفتاب است ایں سلسلہ از طلائے ناب است

قول جلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا مجھ کو (بطور الہام) آگاہی ہوئی ہے کہ میرے یہ سب لڑکے جن کو اللہ کے لطف و فضل نے مجھے عنایت کیا ہے سب سعادتمند ہیں۔ ملکیت کی ایک نوع ان میں ظاہر ہوگی۔ لیکن غیبی تدبیر تقاضا کرتی ہے کہ (ہمارے خاندان میں) دو شخص ایسے پیدا ہوں کہ مکہ و مدینہ میں سالہا سال احیاء علوم کریں، اور وہیں پر اپنا وطن اختیار کریں۔ ان کا نسب ماں کی طرف سے ہم سے ملتا ہو۔ آدمی زادہ

اپنے مادری وطن کی جانب طبعی میلان و رغبت رکھتا ہے اور کسی جماعت کا اپنی والدہ کے وطن سے کسی دوسری سرزمین کی طرف منتقل ہونا بالطبع مستحیل (محال) ہے۔ مگر قسر قاسر (کسی بھی محرک) سے ہو تو دوسری بات ہے"۔

(نواب صدیق حسن فرماتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ اس آگاہی کا مصداق بظاہر شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسوں یعنی شاہ محمد اسحاق و شاہ محمد یعقوب کا وجود ہے کہ دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں اقامت پذیر ہوئے اور سالہا سال اہل عرب و عجم کے لئے احیائے روایتِ حدیث میں مشغول و منہمک رہے۔ واللہ اعلم"۔

مولانا حکیم عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"الشیخ الامام العالم المحدث المسند ابو سلیمان اسحاق ابن محمد افضل بن احمد العمری الدہلوی، المہاجر الی مکۃ المبارکۃ دفینہا

آپ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے تھے۔ آپ کی پیدائش بتاریخ ۸ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ یا ۱۱۹۷ھ بمقام دہلی ہوئی۔ آپ نے اپنے نانا کی گود میں پرورش پائی اور صرف، نحو، کافیہ تک مولانا عبدالحی بوڈھانویؒ بن ہبۃ اللہ بن نوراللہ سے پڑھی۔ اور تمام کتب درسیہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سے پڑھیں اور ان سے تحصیل کی، نیز ان سے حدیث بھی پڑھی پھر اپنے نانا شاہ عبدالعزیزؒ سے سند حاصل کی۔ آپ شاہ صاحب کے نزدیک بیٹے کے مانند تھے حضرت شاہ صاحب نے آپ کو اپنا جانشین بنایا اور تمام کتابیں اور سکنائی جائداد آپ کو ہبہ کردی، شاہ صاحب کے بعد آپ ان کے قائم مقام بنے اور آپ نے لوگوں کو بہت فائدہ پہونچایا۔ حرمین شریفین کا پہلا سفر ۱۲۴۰ھ میں کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے، آپ نے مکہ معظمہ میں حدیث کی سند شیخ عمر بن عبدالکریم المکی (م ۱۲۴۷ھ) سے حاصل کی۔ پھر آپ ہندوستان واپس آئے اور شہر دہلی میں درس حدیث کا سلسلہ سولہ سال تک جاری رکھا پھر ۱۲۵۸ھ میں اپنے بھائی شاہ محمد یعقوب اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مستقل طور پر مکہ معظمہ ہجرت کی اور دوبارہ حج دنیا کیے بعد مکہ معظمہ میں اقامت گزیں ہو گئے۔ آپ سے شریف محمد بن ناصر حازمی نے مکہ معظمہ میں علم حدیث حاصل کیا۔ ہندوستان کے اندر آپ کے بڑے بڑے تلامذہ ہوئے جیسے کہ شیخ عبدالغنی مجددی

فاروقی مہاجر مدینہ محدث دار الہجرۃ، میاں نذیر حسین محدثؒ، مولانا قاری عبد الرحمٰن انصاری پانی پتیؒ، مولانا سید عالم علی مراد آبادیؒ، مولانا مفتی عبد القیوم صدیقی بڈھانوی ثم بھوپالیؒ، مولانا نواب قطب الدین خاں دہلویؒ صاحب مظاہر حق، مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، مولانا عبد الجلیل شہید علی گڈھیؒ، مفتی عنایت احمد کاکورویؒ، مولانا احمد اللہ بن دلیل اللہ انامیؒ وغیرہم ان میں اکثر وبیشتر علم حدیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں سے بیشمار انسانوں نے اخذ حدیث کیا یہاں تک کہ ہندوستان میں ان کی سند حدیث کے علاوہ اور کوئی سند باقی نہیں رہی۔ "وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء"۔

مولانا شمس الحق دیانوی اپنی کتاب تذکرۃ النبلاء میں شیخ عبد اللہ سراج مکی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہ محمد اسحٰق صاحب کی وفات کے بعد ان کے غسل کے وقت فرماتے تھے کہ:

"واللہ انہ لو عاش وقرأت علیہ الحدیث طول عمری ما نلت ما نالہ"[1]

شیخ عمر بن عبد الکریم محدث مکی، علم حدیث اور علم رجال میں آپ کے کمال اور مہارت کی گواہی دیتے تھے، اور یوں فرمایا کرتے تھے: قد حلت فیہ برکۃ جدہ الشیخ عبد العزیز دھلوی ----- (ان کے اندر ان کے نانا شیخ عبد العزیز کی برکات اتری ہوئی ہیں)

آپ کے نانا حضرت شاہ عبد العزیز اکثر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے:۔

"الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحٰق"[2]

میاں نذیر حسین دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی ایسے عالم سے نہیں ملا جو شاہ محمد اسحٰق صاحب سے افضل ہو۔

آپ نے مکہ معظمہ میں وبائے عام کے اندر روزہ کی حالت میں، ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، اور جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار مبارک کے قریب دفن ہوئے۔

---

[1] "خدا کی قسم اگر وہ یعنی شاہ محمد اسحٰق زندہ رہتے اور میں تمام عمر ان کے پاس رہ کر حدیث پڑھتا تو اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا جس مقام پر وہ فائز تھے"

[2] حمد وستائش اس اللہ کیلئے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل و اسحاق عطا فرمائے (شاہ اسمٰعیل شہید فی سبیل اللہ اور شاہ محمد اسحاق مہاجر)

صاحب مقالات طریقت آپ کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:۔

"آپ ۸ ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ..... رجب ۱۲۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ جب دوسری مرتبہ حج کو گئے تھے تو ہجرت کی نیت سے گئے تھے از بس کہ شعار اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعت میں قوت آتی جاتی تھی نیتِ ہجرت کو مصمم کرکے تمام قبائل کو ہمراہ لے کر راہی مکہ معظمہ ہوئے، باوجودیکہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بسماجت تمام مانع آئے۔ چونکہ شوقِ ماھوالحق غالب تھا آپ ممتنع نہ ہوئے اور مکہ معظمہ جا کر وطن اختیار کیا اور بہ سبب کثرت کرم کے آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔"

آپ کے تلامذہ یہ ہیں:۔

(۱) مکہ معظمہ میں مولوی محمد صاحب وغیرہ (۲) جناب مولانا مولوی شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی مہاجر، ہندوستان میں تو بکثرت ہر ایک بلاد و امصار میں مرید و شاگرد بھرے ہوئے تھے جن میں سے چند یہ ہیں: (۳) مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (۴) مولانا حافظ قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی، (۵) فاضل یگانہ مولوی حافظ شیخ محمد صاحب ساکن تھانہ بھون، (۶) مولانا عالم علی صاحب ساکن نگینہ نزیل رامپور۔ آپ حضرت شاہ محمد اسحٰق کے خلیفۂ طریقت بھی ہیں اور سلسلہ علوم ظاہر و باطن کا آپ سے جاری ہوا (۷) نواب معلی القاب مولوی حاجی مہاجر متبع سنن سید الاوائل والاواخر، بحر مواج علوم دعرفاں نواب محمد قطب الدین خاں دہلوی، آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ماہ رجب ۱۲۸۹ھ میں ہوا۔ (۸) واقف اسرار خاندانِ شاہ ولی اللہ، مولانا حافظ حاجی مولوی عبد القیوم بڈھانوی نزیل شہر بھوپال۔

نواب قطب الدین خاں دہلوی احکام العیدین کے دیباچہ میں شاہ محمد اسحٰق صاحب کی ہجرت کے بارے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعد حمد و صلوٰۃ کے مسکین قطب الدین ابن محمد محی الدین خاں ہیچ خدمت سب

بھائی مسلمانوں کے التماس رکھتا ہے کہ میں ایک ... خادم جناب مکرم و معظم مسند المحدثین، مفید الطالبین، مجمع الفضائل، منبع الفواضل، جامع الاشفاق والاخلاق یعنی حضرت مولانا و مرشدنا مولوی محمد اسحٰق سلمہ اللہ تعالیٰ علی رؤس الحق والاتفاق نواسہ حضرت مولانا شیخ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز دہلویؒ کا ہوں، وقتیکہ جناب ممدوح یہاں تشریف رکھتے تھے تو اکثر خلق سوائے شہر اپنے کے راہ دور دراز سے بیچ خدمت آپ کے فیض اور صحبت کثیر البرکت آپ کے سے طرح طرح کے فائدے اٹھا کر شب و روز بہرہ یاب ہوتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز نے بھی خدمت عالی جناب موصوف سے موافق فہم ناقص اپنے کے اور توجہ دلی اور شفقت قلبی حضرت کی سے کہ بدرجۂ اتم حال کمترین پر ختم تھی، بہت طرح کے فائدے علوم دین کے حاصل کئے اور فیض یاب ہوا۔ اور حال فیض عام آپ کا اس طرح پر تھا جیسے اولیاء اللہ کی تعریف میں آیا ہے کہ اولیاء اللہ وہ ہیں کہ جن کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آوے۔ یہ بات جناب موصوف میں صاف پائی جاتی تھی، اور دل بھی چاہتا تھا کہ آپ کی زبان فیض بیان سے ہمیشہ ذکر خدا اور رسول کا سنا کیجئے۔ اور آپ کی صحبت میں شب و روز حاضر ہو کر فائدے دین کے حاصل کیا کیجئے۔ اور اکثر خیالات فاسدہ حاضر ہونے خدمت عالی اور زیارت جمال باکمال حضرت کے سے دور ہوتے تھے۔ اب جس دن سے کہ جناب ممدوح نے یہاں سے ہجرت کی ہے اسی دن سے چرچہ درس و تدریس علوم دینیہ کا تمام ہندوستان سے بہت کم ہو گیا ——— اور جو لوگ کہ جناب فیض مآب سے موافق حوصلہ اپنے کے فیض یاب ہوئے تھے ان کا یہ حال ہے کہ خیال صحبت بابرکت حضرت کی سے زندگی اپنی بسر کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ آنکھیں ہماری دیکھنے جمال باکمال جناب ممدوح کو ترستی ہیں، بموجب کلام استاد کے ؎

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اور بہ سبب درد جدائی آپ کی کے عجب حالت رہتی ہے، اس واسطے شدت

شوق میں حسب حال اپنے چند اشعار[1] نوک ریز خامہ ہوتے ہیں۔ اب یہاں سب صاحب بہ نظر انصاف و دیدہ غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ جن کی طرف ایک عالم رجوع ہو، اور وہ بھی بذاتہ صحبت عالم ہوں اور کسی طرح کی حاجت بھی بند نہ ہو، پھر وہ شخص دنیا کے عیش و آرام کو پرپشہ کے برابر نہ جانے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر طالب رضائے مولا اور تابع مرضیات کے ہو، یہ کام مقبول اور مخصوص لوگوں کا ہے، اور اس آیت کریمہ کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں: واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم ۝

اور جب آپ کے دل میں ہجرت کا ارادہ مصمم ہوا تو ہم نے عرض کیا کہ ہم کو کچھ نصیحت کیجئے۔ اس کے جواب میں مختصر کلام اور جامع ارشاد فرمایا:-

اُوصِیکُم بتقویَ اللّٰہِ والطَّاعۃِ وکثرۃِ الذِّکرِ والاستغفارِ والصَّلوٰۃ

---

[1] اس عبارت کے بعد تقریباً ۲۰ اشعار اردو و فارسی کے ہیں جو پر از سوز و گداز ہیں اور فراق و ہجر کے مضمون سے لبریز — ان میں سے چند اشعار منتخب کرکے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:-

اشعار

درد ہو اس کی کچھ دوا کیجئے — دل ہی بے چین ہو تو کیا کیجئے

سب گئے صبر و ہوش تاب و تواں — میں رہا ہوں تو کیا رہا ہوں میں

ہوش و حواس اڑ گئے جاتے ہی یار کے — کیا کیا گھمنڈ تھے ہمیں صبر و قرار کے

دل سا رفیق جس کا جدا ہو گیا ہو آہ — وہ اپنی بے کسی پہ نہ روئے تو کیا کرے

چشم گریاں، دل بریاں، غم ہجراں، لب خشک — ایک الفت سے تری ہو گئے آزار کئی

ایں مصیبت را حد و پایاں کجاست — ایں مصیبت نیست درد بے دواست

ہر طرف مستاں خراب افتادہ اند — زآتش ماتم کباب افتادہ اند

یاد آرند آں زمان بے غمی — صحبت ساقی و عیش و خرمی

ہر یکے را دل ازیں ماتم کباب — ہر یکے را دیدہ چوں ساغر پُر آب

ہر یکے چوں تشنہ خستہ جگر — از خود و از مستی خود بے خبر

عَلَى النَّبِيِّ الْمُخْتَارِ ——

(ترجمہ) یعنی میں نصیحت کرتا ہوں تم کو کہ ڈرتے رہنا اللہ تعالیٰ سے، بچنا گناہوں سے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے رہنا اور اس کی بہت یاد کرنا اور بہت استغفار کرنا اور بہت درود بھیجا کرنا نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم پر ——

پس جب آپ تشریف لے گئے تو بعض مخلصین کو یہ خیال ہوا کچھ ایسی چیز لکھئے کہ آپ کی یادگار ہو۔ چنانچہ میر ظہور علی صاحب نے کہ محب صادق ہیں یہ تاریخ لکھی ؎

مولوی اسحٰق صاحب باکمال　　ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہورؔ　　یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت
۱۲۵۸ھ

اور خواجہ احسن اللہ صاحب نے یہ تاریخ لکھی :-

مولوی اسحٰق صاحب فخر دیں　　تھا منور شہر جن کے نام سے
درس فرماتے تھے ہفتہ میں دو بار　　فہم سے ادراک سے الہام سے
عالم و جاہل سبھی چھوٹے بڑے　　بہرہ ور تھے ان کے فیض عام سے
کر گئے ہجرت مع اہل و عیال　　سوئے کعبہ شوق کے احرام سے
سچ تو یوں ہے جو کہ احسنؔ نے کہا　　شہر خالی ہو گیا اسلام سے

مصرعہ آخر سے سوائے لفظ اسلام کے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہ محمد اسحٰق کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب گرامی جو عربی زبان میں ہے تبرکاً اس مقالہ میں شامل کر دوں، یہ مکتوب گرامی حضرت مولانا حاجی احمد علی محدث سہارنپوری کی ایک قلمی بیاض سے لیا گیا ہے جو احقر کے پاس موجود ہے۔ یہ مکتوب گرامی صاحب مظاہر حق نواب قطب الدین خاں دہلوی کے نام ہے اس کو مع ترجمہ اس مقالہ میں شامل کیا جاتا ہے :-

شاہ محمد اسحٰق صاحب کا ایک مکتوب گرامی

من محمد اسحٰق الی النواب محمد قطب الدین سلمہ اللہ تعالیٰ بعد السلام والتحیۃ یعرفکم انا بالخیر و السلامۃ وصحتکم وعافیتکم من اللہ مسئول ومامول ، ان کتابکم الکریم

قد وصل والسرور به قد حصل + ندعو لکم الله بالخیر وصالح العمل والله یغفر لنا ولکم بلا مہل وایضاً یعرفکم ان الفلوس التی ارسلتم بواسطۃ المولوی عبد الحلیم قد علوان الی المنٰی قد وصلت لکن الی الآن فی مکۃ ما حصلت والمبالغ التی کانت عند عبد الله بائع الکتب عندکم وصلت ام لا + خبّرونا بھذا الامر وحالُ بیع الکتب والامتعۃ والحوائج قد عرفنا من کتابکم الذی وصل + والحافظ احمد علی السہارنفوری بعد السلام یعرف ان رجلاً اسمہ محمد ضامن الحاج ساکن غازی فور + قد جاء من جہت کلکتہ لقینی فقال ان رجلاً من البنکالہ فی الکلکتہ قال لی ان تُبلّغوا منّی الی فلان یعنی الحقیر ان الکتب التی ارسلتموھا الی الکلکتہ قد ضاعت + ثم وصل الینا کتاب المولوی فرحت علی کتب فیہ ان المرکب لحق الطوفان والطغیان کسر المسطول وکسرت الواح المرکب من جانب الدبوسہ وملاء الماء فی المرکب بقدر قامۃ الرجل + قد ضاع الاسباب والکتب ۔ انتہٰی ۔ لکن ما عرفنا ان الکتب التی ارسلنا قد غرقت فی البحر ام وصل الیہا ماءُ فی الحاحققوا بواسطۃ الکتاب من الشیخ نبی بخش التاجر فی الکلکتہ ومن المولوی فرحت علی بوطنہ +

والسلام علیکم

(ترجمہ مکتوب عربی)

"من محمد اسحٰق الی النواب محمد قطب الدین سلمہ اللہ تعالیٰ بعد السلام والتحیہ معلوم ہو کہ ہم بخیر و عافیت ہوں اور آپ کی صحت و عافیت بدرگاہ الٰہی مطلوب ہے۔ آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا اور اس سے خوشی حاصل ہوئی۔ میں آپ کے لئے خیریت اور اعمال صالحہ کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی مغفرت جلد از جلد اول دہلہ میں فرمائے۔ اور یہ بات بھی لکھتا ہوں کہ وہ رقم جو آپ نے مولوی عبدالحلیم کے ہاتھ بھیجی تھی، معلوم ہوا ہے کہ وہ منیٰ تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن اس وقت تک مکہ معظمہ نہیں پہنچی ہے۔ عبداللہ کتب فروش کے ذمہ جو روپیہ تھا وہ ملا یا نہیں؟ اس بات کی اطلاع دو۔ کتابوں اور چیزوں کی بیع اور حوائج کا حال ہمیں آپ کے اس خط سے معلوم ہوا جو مل گیا۔ اور حافظ احمد علی محدث سہارنپوری

بعد السلام اطلاع کرتے ہیں کہ ایک شخص جن کا نام حاجی محمد ضامن ہے اور جو غازی پور کے رہنے والے ہیں وہ کلکتہ کی طرف سے یہاں آئے ہیں انھوں نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ ایک بنگالی نے مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ میری طرف سے فلاں شخص یعنی مجھ محمد اسحٰق کو یہ بات پہنچا دینا کہ جو کتابیں تم نے کلکتہ بھیجی تھیں وہ ضائع ہو گئیں۔ پھر میرے پاس مولوی فرحت علی کا خط پہنچا اس میں لکھا تھا کہ جہاز طوفان اور طغیانی سے دوچار ہو گیا تھا، اس کا مستول ٹوٹ گیا تھا، جہاز کے تختے دبوسہ[۱] کی طرف سے ٹوٹ گئے تھے اور جہاز میں آدمی کے قد کی برابر پانی بھر گیا تھا، تمام اسباب و کتب ضائع ہو گئے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ کتابیں کہ جن کو ہم نے بھیجا تھا وہ پانی میں غرق ہو گئیں یا ان تک فقط پانی پہنچ گیا۔ اس کا حال خط کے ذریعہ سے نبی بخش تاجر کتب کو کلکتہ خط بھیج کر اور مولوی فرحت علی کو ان کے وطن خط بھیج کر تحقیق کریں ——— والسلام علیکم"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ نے اپنی روانگی کے وقت اپنی کتابیں مکہ معظمہ کو بھیجنے کا انتظام براہ کلکتہ کیا ہوگا۔ خود جب جہاز سے گئے تھے اس میں کتابوں کے جانے کا انتظام نہ ہو سکا ہوگا۔ اس لئے اغلب یہ ہے کہ اس مکتوب میں ہندوستان سے روانہ کی ہوئی اپنی کتابوں کا ذکر ہے ——— چنانچہ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کی ہجرت کے وقت ان کی کتابوں کا ذکر تذکرہ رحمانیہ میں اس طرح کیا گیا ہے:۔

"صاحب سوانح (قاری عبدالرحمٰن پانی پتی) نے ایک مرتبہ صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سے خود فرمایا کہ جو کتب خانہ حضرت شاہ صاحب نے بوقت ہجرت اپنے ساتھ لیا اس کا وزن نو۹ من تھا۔ اس کے علاوہ جتنا ذخیرہ باقی تھا اس کے متعلق مجھے اور نواب قطب الدین خاں صاحب کو حکم دیا کہ یہ سب نیلام کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم دونوں نے یہ خدمت انجام دی۔"

ماخوذ از تذکرہ رحمانیہ صنہ ۵۰-۵۱

(مؤلفہ قاری عبدالحلیم انصاری پانی پتی)

تصانیف | حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کی تصانیف تعداد میں بہت کم ہیں، اب تک جن تصنیفات کا علم ہو سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

---

[۱] دبوس کے معنی مصباح اللغات اور غیاث اللغات میں گرز آہنی کے بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں پر غالباً جہاز کے کسی حصہ کو مراد لیا گیا ہے۔

(۱) ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح (۲) مختصر فارسی رسالہ شعب الایمان (۳) مسائل اربعین،[۱]
(۴) مأۃ مسائل[۲]۔

آخر الذکر دو کتابوں کے متعلق حکیم محمود احمد برکاتی کا خیال ہے کہ وہ شاہ محمد اسحٰق صاحب کی نہیں ہیں لیکن داخلی اور خارجی متواتر شہادتوں سے یہ امر ثابت اور واضح ہے کہ یہ دونوں کتابیں شاہ محمد اسحٰق صاحب ہی کی تالیف ہیں[۳]۔

اولاد شاہ محمد اسحٰق صاحب کے ایک صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادہ کا نام سلیمان تھا وہ نوعمری میں وفات پا گئے تھے۔ ایک صاحبزادی امۃ الغفور مولانا مفتی عبد القیوم ؒ بڈھانوی ثم بھوپالی سے بیاہی گئی تھیں۔ ان سے ایک دختر اور دو صاحبزادے، ایک حافظ مولوی محمد یوسف اور دوسرے حافظ مولوی محمد ابراہیم تھے۔ حافظ محمد یوسف لاولد رہے۔ حافظ ابراہیم کے لڑکے حافظ محمد اسمٰعیل اور دو لڑکیاں حبیبہ اور ام سلمہ ہوئیں۔ حافظ محمد اسمٰعیل کے ایک فرزند حافظ محمد احمد ہوئے۔ ان کے بھی ایک فرزند حافظ محمد مصطفےٰ ہوئے جو بھوپال میں مقیم ہیں اور صاحب اولاد ہیں، ام سلمٰی مولوی قاضی محمد شعیب بن قاضی محمد یحییٰ بن قاضی محمد ایوب پھلتی کو بیاہی تھیں جن سے مولانا محمد زبیر صدیقی بھوپال میں ہیں، اور صاحب اولاد ہیں۔ حبیبہ سید عباس علی کو بیاہی تھیں ان سے سید جعفر علی لاہور میں مقیم ہیں۔

شاہ محمد اسحٰق کی دوسری صاحبزادی شاہ اہل اللہ کے پرپوتے شاہ محتشم اللہ کو بیاہی تھیں،

---

[۱] مسائل اربعین کے متعلق جمہور علی گڈھ کے حبیب الرحمٰن خاں شروانی نمبر میں محمد عبد الصبور خاں شروانی خان زماں خاں شروانی رئیس بھیکن پور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ سے بیعت تھے۔ اپنے ۳۶ مسائل شرعیہ کو سوالات کی صورت میں پیر و مرشد کے حضور میں پیش کیا۔ ممدوح نے انھیں شاہ محمد اسحٰق کے سپرد فرمایا شاہ (محمد اسحٰق صاحب) نے مذکورہ سوالات کے جواب لکھ کر اپنی طرف سے مزید چار مسائل کا اضافہ کر دیا، یہ مجموعہ شائع کر دیا گیا اور مسائل اربعین یعنی چہل مسائل کے نام سے آج تک مشہور و موجود ہے۔"

[۲] تراجم علمائے حدیث میں ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے آپ کی تالیفات میں رسالہ تذکرۃ الصیام کا بھی ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

[۳] شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان،

شاہ محمد الله کے صرف ایک فرزند مولوی عبد الرحمٰن کا علم ہے، یہ مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے "المسوّیٰ" کا نسخہ ان ہی مولوی عبد الرحمٰن کے ورثاء سے حاصل کیا تھا۔ شاہ محمد اسحٰق صاحب کی تیسری صاحبزادی شاہ رفیع الدین کے نواسے مولوی سید نصیر الدین مجاہد (شہید ۱۸۴۰ء در غزنی) کو بیاہی تھیں ان کے دو صاحبزادے مولوی عبد اللہ اور مولوی عبد الحکیم تھے۔[1]

اب حضرت شاہ محمد یعقوب دہلویؒ مہاجر مکی کے کچھ حالات درج کئے جاتے ہیں۔ نزہۃ الخواطر صفحہ ۵۳۴-۵۳۵ پر ان کے متعلق جو کچھ تحریر ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :-

شاہ محمد یعقوب محدث بن محمد افضل عمری دہلویؒ مہاجر مکی شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے چھوٹے نواسے تھے۔ آپ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے نانا کی گود میں ہی پرورش پائی اور نانا ہی سے شرح کافیہ الجامی کے تین سبق پڑھے۔ اور ان سے جلالین شریف جمل قدمی کی حالت میں پڑھی۔ اس کے علاوہ تمام کتب درسیہ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ سے پڑھیں۔ آپ کو اپنے نانا حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ سے علم حدیث اور طریقت میں اجازت ملی۔ آپ نے مدتوں تک دہلی کے اندر درس حدیث اور افادہ علوم کی محفل گرم رکھی۔ پھر اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحٰق کے ساتھ ہجرت کی۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی اور خواجہ احمد بن یٰسین نصیر آبادی اور بہت سے علماء نے آپ سے علم حدیث کو حاصل کیا۔[2]

آپ کی وفات ۲۷ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۲ھ کو جمعہ کے دن مکہ معظمہ میں ہوئی جیسا کہ مہر جہاں تاب[3] میں تحریر ہے :-

---

[1] ماخوذ از "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان" صفحہ ۱۵۵-۱۵۶ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی۔

[2] "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان" میں مقالات طریقت، امیر الروایات اور ارشاد محمدی کے حوالے سے ان چند حضرات کو بھی اجازت یافتگان اور فیض یافتگان شاہ محمد یعقوب میں شمار کیا ہے، یعنی مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، مولانا عبد العزیز جعفریؒ، مولانا مفتی عبد القیوم بوڈھانویؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ مولانا محمد زمان شہیدؒ اور مولانا محمد سعید عظیم آبادیؒ ——

[3] مؤلفہ حکیم فخر الدین خیالی حسنی رائے بریلوی۔ (قلمی)

صاحب مقالات طریقت نے آپ کے حالات اس طرح تحریر کئے ہیں :۔

"آپ شاہ محمد اسحٰق صاحب کے چھوٹے بھائی اور شاہ عبد العزیز کے نواسے اور خلیفہ طریقت تھے، آپ ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تین سبق شرح ملا جامی کے اپنے نانا صاحب سے پڑھے۔ فرماتے ہیں کہ ان کی تعلیم کا عجب طریقہ تھا۔ کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ابواب علوم مفتوح ہوتے تھے۔ آپ نے اکثر علوم شاہ رفیع الدین صاحب سے حاصل کئے، اور تفسیر جلالین حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے جبل قدمی کے وقت پڑھی۔ آپ نے اپنے برادر بزرگ کے ہمراہ ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی، جب تک دہلی میں رہے گوشہ عزلت میں رہتے تھے اور ابنائے روزگار کی طرف کبھی رجوع نہیں کیا، مکہ معظمہ میں بھی آپ کا یہی حال تھا۔ تھوڑی سی آمدنی میں جو کسب حلال سے فراہم ہوتی تھی اوقات گذاری کرتے تھے۔ مکان میں فرصت کے وقت ریشم کھولا کرتے تھے اور شب و روز عبادت خالق اور ہدایت خلائق میں مصروف رہا کرتے تھے طالبان خدا کو مقصود تک پہنچاتے تھے۔

مکہ معظمہ میں ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ جمعہ کے دن وفات ہوئی۔ آپ کی عمر بیاسی سال ہوئی، حافظ مورتی صاحب مہتمم شہر بھوپال نے آپ کی تاریخ وفات اس آیت کریمہ سے نکالی ہے :۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۱۲۸۲ھ

جمعہ کے دن بھی صبح کی نماز آپ نے تیمم سے ادا کی اور اشراق و چاشت بھی پڑھی۔ دوپہر ڈھلے جب حرم محترم میں اذان ہوئی اس وقت روح مبارک پرواز کر گئی، حسب وصیت جنت المعلیٰ میں شاہ محمد اسحٰق صاحب کے مزار کے قریب آپ کو دفن کیا گیا۔ جنازے کی نماز میں ایسی کثرت ہوئی کہ تمام حرم کی دوکانیں بند ہو گئیں، کھڑے رہنے کو بہت دشواری سے جگہ ملتی تھی حرم شریف سے جنت المعلیٰ تک اتنی خلقت تھی کہ قدم اٹھانا مشکل تھا، جنازے کو ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آخر وقت آپ نے جس قدر امانتیں رکھی تھیں سب لکھوا دیں اور فرمایا کہ تیس ریال نقرئی میرے تکیے کے نیچے ہیں اس میں تجہیز و تکفین ہو۔ کچھ دھوم دھام نہ ہو تکلف نہ ہو، اسی طرح عمل ہوا۔

صاحب مقالات طریقت لکھتے ہیں کہ اب حرم محترم میں آپ کے داماد مرزا امیر بیگ

صاحب اور آپ کی دختر اور مولوی خلیل الرحمٰن بن مرزا امیر بیگ آپ کے نواسے موجود ہیں، اور مولوی عبدالرحمٰن بن حافظ محتشم بن مولوی محمد معظم المعروف بہ مولوی محمدی بن مولوی مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ بن شاہ عبدالرحیم بن شیخ وجیہ الدین شہید، نواسے مولانا محمد اسحٰق کے آپ کے خلیفہ اور جانشین مکہ معظمہ میں موجود ہیں۔"

شاہ محمد یعقوبؒ کی ایک دختر کا نکاح مرزا امیر بیگ سے ہوا تھا[۱]۔ ان کے صاحبزادے مولوی خلیل الرحمٰن تھے۔

سر سید احمد خاں اپنی کتاب آثار الصنادید میں شاہ محمد یعقوب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"علم و فضل میں بھی کم پایہ نہیں رکھتے تھے خلقِ جمیل و صفاتِ جزیل اور قناعت و استغنا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی بطور ہدیہ پیش کش لایا، کچھ قبول نہ کیا، جو سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں اس میں بسر اوقات کرتے ہیں خواہ بہ تنگی خواہ بہ وسعت۔ اور حسب استعداد اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے رہتے ہیں اس کم استعدادی میں توفیق ایسے امور خیر کی ایسے ہی مردان خدا کا کام ہے۔ آپ نے ہمراہ اپنے برادر مرحوم کے ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں توطن اختیار کیا۔ جب تک شاہجہان آباد میں رہے گوشۂ عزلت میں پابدامن رہتے تھے اور ابنائے روزگار کی طرف کبھی رجوع نہ رکھتے تھے اور یہی حال ہے اس بلاد میں کہ کچھ وجہ قلیل میں جو کسی کسب حلال سے بہم پہنچا ہے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں اور اوقات شبانہ روزی کو عبادت خالق زمین و آسماں میں بسر کرتے ہیں۔ حق جل و علیٰ ایسے زبدۂ اہالی روزگار کو تا دیر سلامت رکھے کہ اپنے خاندان عالیشان کے یادگار ہیں۔ آمین یا رب العالمین۔"[۲]

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان نامی کتاب میں حکیم محمود احمد برکاتی شاہ محمد یعقوب صاحب کے بارے میں مقالات طریقت کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں:۔

"ثقات کہتے ہیں کہ استعداد ظاہر کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی آیۃ کے معانی بیان کرتے تو وہ مضامین عالی بیان کرتے کہ سامعین حیران و ششدر رہ جاتے۔ پہروں وہی بیان چلا جاتا۔ قوت باطن کا یہ حال کہ ادھر سبق حدیث شریف کا بھی ہو رہا ہے ادھر توجہ بھی جاری ہے ــــ امانت داری ایسی کہ یعقوب امین مشہور ہو گئے تھے۔"　(ماخوذ از مقالات طریقت)

۱؎ امیر الروایات میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بیان کردہ ایک واقعہ میں حضرت شاہ محمد یعقوب کے داماد مرزا امیر بیگ کا ذکر آیا ہے، اس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میں نے بھی والد مرحوم کے ہمراہ مکہ معظمہ میں ان کی زیارت کی تھی۔" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صـ ۱۷۵۔

۲؎ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صـ ۱۷۵

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ اور ان کا سفر حج

[ہمارے ملک کے جلیل القدر محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہٗ نے چند سال پہلے "اعیان الحجاج" کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی تھی جو اس زمانہ میں شائع ہو گئی تھی، اس میں مولانا نے تاریخ کی کتابوں سے امت کے بلند پایہ حضرات کے سفر حج کے واقعات اور اُن کے مختصر سوانح بھی لکھے تھے ـــــ اسی کی دوسری جلد ممدوح نے اب لکھی جو ابھی حال میں پریس سے نکل کر آئی ہے، اس میں ۲۰۰ اکابر امت کے حج کے واقعات اور ساتھ ہی ان سب کے مختصر سوانح بھی لکھے گئے ہیں ـــــ اسی میں سے مولانا ممدوح کی اجازت سے مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ اور ان کے سفر حج کا تذکرہ الفرقان کے اِن صفحات میں درج کیا جا رہا ہے، موسم حج کا قریب بھی ہے ـــــ امید ہے کہ ارباب شوق انشاء اللہ اس تذکرہ سے لذت اندوز ہوں گے]

مولانا عبدالرحمٰن جامی

درس نظامی کی مشہور و معروف کتاب شرح جامی کی بدولت آپ کے نام سے مدارس کا بچہ بچہ واقف ہے، شرح کافیہ کے علاوہ بزرگوں کے تذکرہ میں آپ کی کتاب نفحات الانس، اور آپ کی مثنویاں تحفۃ الاحرار و سبحۃ الابرار نیز سلسلۃ الذہب نہایت پاکیزہ اور مشہور کتابیں ہیں،

آپ نہایت بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ بہت عالی مقام عارف و صوفی بھی تھے،

مولانا سعد الدین کاشغری سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے، اور انھیں سے خلافت بھی حاصل تھی۔

اس سلسلہ کے شہرۂ آفاق بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار سے آپ کو بے پایاں عقیدت تھی، اور ان کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوتے تھے، خواجۂ احرار کی مدح میں آپ کا یہ شعر، یوسف زلیخا پڑھنے والوں کو یاد ہوگا ؎

چوں[1] فقر اندر لباس شاہی آمد   بتدبیر عبید اللّٰہی آمد

مولانا جامی شیخ کامل اور عارف صادق ہونے کے باوجود جلدی کسی کو مرید نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ تحمل بارِ شیخی ندارم (پیر بننے کا بوجھ مجھ سے نہ اٹھے گا) لیکن آخر عمر میں چاہتے تھے کہ کوئی طالب صادق ملے تو اس کی تربیت فرمائیں، فرماتے تھے کہ کوئی سچا طالب نہیں ملتا،

مولانا جامی کی علمی جلالت کا شہرہ دور دور تک تھا، چنانچہ ترکی کے سلطان بایزید خاں نے قاصد بھیج کر آپ کو ترکی آنے کی دعوت دی، مگر آپ نے معذرت کر دی۔ (شذرات)

اسی طرح دکن کے ملک التجار خواجہ محمود گاوان نے جب بیدر میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کیا تو اس کی صدارت کے لیے، مولانا جامی سے درخواست کی تھی، اور کہا جاتا ہے کہ مولانا آمادہ تھے، مگر کسی وجہ سے نہ آسکے، (نزہتہ) ۔۔۔۔۔ مولانا نے اپنے اس شعر میں محمود گاوان ہی کی طرف اشارہ کیا ہے، ؎

ہمرہ[2] قافلۂ ہند رواں کن کہ رسد   شرف عز و قبول از ملک التجارش

مولانا جامی کا حج ایک تاریخی حج تھا۔ آپ نے وسط ربیع الاول ۸۷۷ھ میں جب حج کا ارادہ کیا تو خراسان کے بہت سے اکابر مانع ہوئے، اور عرض کیا کہ یہاں ہر روز آپ کی توجہ سے مسلمانوں کے ایسے اہم اہم کام انجام پاتے ہیں، جن میں ہر ایک کا ثواب پاپیادہ حج کے برابر ہوگا۔

---

[1] جب فقر بادشاہی لباس میں جلوہ گر ہوا، تو عبید اللّٰہی تدبیر سے ہوا۔

[2] ہندوستانی قافلہ کے ساتھ روانہ کرتا کہ وہاں کے ملک التجار کی طرف سے عزت و قبولیت کا شرف حاصل ہو۔

مولانا نے مزاح کے انداز میں جواب دیا کہ جی ہاں، مگر چونکہ پیادہ پا حج کرتے کرتے بہت تھک گیا ہوں، اس لیے چاہتا ہوں کہ اب سواری سے حج کر آؤں۔

بہرحال مولانا ۱۰ ربیع الاول ۸۷۷ھ کو ہرات سے روانہ ہوئے، اور نیشاپور، سبزوار، بسطام، دامغان، سمنان، اور قزوین ہوتے ہوئے ہمدان پہونچے، تو ہمدان کے حاکم شاہ منوچہر نے نہایت اخلاص و نیازمندی سے آپ کا استقبال کیا، اور آپ کے پورے قافلہ کو تین دن تین رات اپنے یہاں مہمان رکھا اور شاہانہ طور پر میزبانی کے فرائض انجام دیے، اس کے بعد ایک بڑی جمعیت کے ساتھ اس قافلہ کو بغداد کی سرحد تک پہونچانے آیا، تاکہ کردستان کے خطرناک علاقہ میں اہل قافلہ کو کوئی گزند نہ پہونچے، وسط جمادی الاخری میں قافلہ بغداد پہونچا، چند دنوں کے بعد مولانا نے کربلا میں مشہد حضرت حسین کی زیارت کی، پھر بغداد لوٹ آئے، ....

بغداد میں چار مہینے قیام کرنے کے بعد مولانا جامی نے حجاز کا رخ کیا، اور آخر شوال میں نجف پہونچے اور حضرت علی کے مزار کی زیارت کی، موقع پر آپ نے ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:-

قد بدا مشہد مولای اُینخو اجملی[1]　　　کہ مشاہد شد از ال مشہدم انوار جلی

ذی قعدہ کے شروع میں یہاں سے رختِ سفر باندھا، اور مدینہ کے لیے روانگی ہوئی، راستہ میں آپ نے ایک قصیدہ تصنیف کیا جو بہت سے معجزات نبوی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا مطلع یہ ہے ؎

یا رب[2] مدینہ است ایں حرم کز خاکش آید بوئے جاں
یا ساحتِ باغ ارم یا عرصۂ روض الجناں

۲۲ دن کے بعد مدینہ منورہ پہونچے، اور روضۂ نبوی کی زیارت کرنے کے بعد مکہ روانہ ہوئے، دس دن کے بعد ۶ ذی الحجہ کو مکہ پہونچے، اور حج کے تمام مناسک اور شرائط و آداب بجالانے

---

[1] میرے اونٹ کو بٹھاؤ کہ میرے مولا کا مزار نمودار ہوا۔ اس مزار سے کھلے انوار نظر آرہے ہیں۔

[2] اے رب یہ حرم مدینہ ہے اس کی خاک سے بوئے جاناں آرہی ہے۔ یا یہ باغ ارم کا میدان یا باغ جناں کا صحن ہے۔

کے بعد ۱۵ ذی الحجہ کو شام کے لیے براہ مدینہ روانہ ہوئے، راستہ میں ایک غزل لکھی، جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

چو حلقہ در کعبہ بصد نیاز گرفتم دعائے حلقہ گیسوئے مشکبوئے تو کردم[1]

۲۵ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ پہونچ کر دوبارہ روضۂ اطہر کی زیارت اور صلوٰۃ و سلام پڑھنے کی سعادت حاصل کی، ۲۰ کو وہاں سے کوچ کیا، اور محرم کے اخیر عشرہ میں دمشق پہونچے اور وہاں چالیس دن قیام کیا،

اس مدت میں قاضی محمد خیضری[2] سے احادیث کی سماعت کی، اور سند لی، قاضی صاحب نے نہایت خاطر داری، اور عزت و اکرام کے ساتھ مہمانداری کا حق ادا کیا، ۱۴ ربیع الاول کو دمشق سے رخصت ہو کر بارہ دن میں مولانا حلب آئے۔

وہاں کے اکابر نے بھی آپ کا بڑا اعزاز و اکرام کیا، اور ہدیے پیش کیے، ۲۰ ربیع الثانی کو حلب سے آگے بڑھے تو محمد بیگ تین سو سوار ساتھ لے کر کردستان اور خطرناک علاقوں میں قافلہ کی حفاظت کے لیے تبریز تک آپ کے ساتھ رہا،

تبریز میں بھی اکابر علماء، اور اعیان نے بہت پرتپاک استقبال کیا، اور اعزاز و اکرام کے ساتھ پورے قافلہ کو نہایت عمدہ مکانات میں ٹھہرایا، پھر اصرار کر کے مولانا کی ملاقات وہاں کے حاکم حسن بیگ سے کرائی۔

حسن بیگ نے شاہانہ ہدیے اور نذرانے پیش کیے، اور باصرار تمام درخواست کی کہ آپ اب تبریز ہی میں اقامت فرمائیں، مولانا نے والدہ کی سن رسیدگی کا بہانہ کر کے خراسان کی راہ لی، ۲۰ جمادی الاولیٰ کو تبریز پہونچے تھے، اور ۱۳ جمادی الاخریٰ کو وہاں سے چل کر ۲۸ شعبان ۸۷۸ھ کو ہرات پہونچے، مرزا سلطان حسین اس وقت مرو میں تھا، آپ کی بخیریت واپسی کی خبر اس کو ملی تو اپنے خاص معتمد کے ہاتھ بہت سے تحفے، اور اظہار اخلاص و نیازمندی پر مشتمل ایک خط بھیجا، جس کی ابتدا اس شعر سے کی تھی ؎

---

[1] جب میں نے در کعبہ کا حلقہ بصد عجز و نیاز پکڑا تو تیرے حلقہ گیسو کی مہک کی میں نے دعا کی۔

[2] قاضی محمد خیضری، حافظ ابن حجر کے شاگردوں میں ممتاز محدث ہیں۔

اھلا بمقدمک الشریف فانہ[1] فرح القلوب و نزھۃ الارواح

عین اسی وقت امیر نظام الدین علی شیر کا رقعہ بھی پہونچا، جس میں یہ رباعی درج تھی۔

رباعی

انصاف بدہ اے فلک مینا فام[2]	تا زیں دو کدام خوب تر کرد خرام
خورشید جہاں تاب تو از جانب صبح	یا ماہ جہاں گرد من از جانب شام

مولانا جامی نے ۸۹۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا،

ہم طالب علموں پر، شرح جامی کے واسطے سے مولانا کا بڑا احسان ہے۔ اس لیے بے اختیار آپ کا تذکرہ طویل ہو گیا ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم

مولانا جامی نے جب تک حج نہیں کیا تھا اس وقت تک وہ زیارت حرمین کے لیے بہت مضطرب اور بے چین تھے، ان کا دل شوق سے لبریز، اور اس تمنا میں ان کی آنکھیں اشک ریز تھیں، ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

کے بود یارب[3] کہ رو در یثرب و بطحا کنم	گہ بمکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

اور سلسلۃ الذہب میں فرماتے ہیں

کے بود[4] کہ میان منبر و قبر	کردہ صد چاک جیب خرقۂ صبر
گرد آں منزل بہشت نشان	رفتہ با دیدۂ سرشک فشان

---

[1] مبارک ہو تیرا آنا اس لیے کہ وہ دلوں کی مسرت اور روح کی فرحت ہے۔

[2] انصاف کر اے مینا رنگ کے آسمان کہ ان دونوں میں سے کس کی چال اچھی رہی۔ صبح کی جانب سے آنے والے آفتاب جہاں تاب کی۔ یا شام کی جانب سے طلوع ہونے والے اور دنیا جہاں میں گھومنے والے میرے چاند کی۔

[3] خداوندا وہ وقت کب آئیگا جب میں یثرب و بطحا کی طرف رخ کروں گا، کبھی مکہ میں منزل اور کبھی مدینہ میں قیام کروں گا۔

[4] کب وقت آئے گا کہ قبر و منبر کے درمیان خرقۂ صبر کے گریبان کو صد چاک کیے ہوئے اس بہشت نشان منزل کے گرد باچشم گریاں جاؤں گا۔

کے بود کز برائے روز بہی[1] | خاطرِ پُر امید دست تہی
رو دراں قبلہ گاہ حشمت و ناز | پیش سینہ نہادہ دست نیاز
دمبدم در معنیٰ سفتہ | خالی از لاف دعوے گفتہ
اَیْ نَبِیَّ اللّٰہ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ | اِنَّمَا الْفَوْزُ وَ الْفَلَاحُ لَدَیْکَ
بسلام آمدم جوابم دہ | مرہمے بر دل خرابم نہ
بس بود جاہ و احترام مرا | یک علیک از تو صد سلام مرا

اور مولانا کی یہ تمنا جب پوری ہوئی، تو ان الفاظ میں حق تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر بجالائے

داد مرا نعمتِ توفیقِ حج[2] | مَن قَرَعَ الباب وَ لَجَّ وَلَج
در حرم خویش مرا رہ نمود | زنگِ ظلام از دلِ گمرہ زدود
داد مرا در حرم خود مقام | ساخت مرا طائفِ بیت الحرام

مولانا نے اس سعادت کے حصول کے بعد مناسکِ حج میں ایک منظوم رسالہ تصنیف فرمایا ہے، آخری اشعار اسی رسالہ سے لیے گئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ بہرائچ میں میرے مطالعہ سے گذرا ہے، اس نسخہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خانہ کعبہ، منیٰ اور عرفات وغیرہ کی قلمی تصویریں بھی دی ہوئی ہیں۔

---

[1] کب وقت آئے گا کہ بھلائی کے دن کے لیے پر امید دل اور خالی ہاتھ لیے —— تیرے ناز و حشم کے قبلہ گاہ کے روبرو دست نیاز سینہ کے اوپر رکھے ہوئے —— ہردم ایک معنی کے موتی پروتے ہوئے، لاف زنی سے خالی ہو کر کہتے ہوئے —— کہ اے اللہ کے نبی سلام تم پر کامیابی اور فلاح آپ ہی کے یہاں ہے —— سلام لیکر آیا ہوں، مجھے جواب دیجیے، میرے زخمی دل پر مرہم رکھ دیجئے —— میرے سو سلام پر آپ کا ایک جواب میرے جاہ و احترام کے لیے بہت کافی ہے۔

[2] مجھکو حج کی توفیق کی نعمت عطا فرمائی۔ جو کوئی دروازہ کھٹکھٹائے اور اصرار کرے تو اندر داخل ہو ہی جاتا ہے —— اپنے حرم کا مجھ کو راستہ دکھایا، گمراہ دل سے تاریکی کا زنگ دور کیا —— مجھکو اپنے حرم میں قیام کی جگہ دی، مجھے بیت الحرام کا طواف کرنے والا بنایا،

محمد منظور نعمانی

تبلیغی جماعت کے خلاف بریلوی یلغار

حیدرآباد کے علاقہ سے ایک صاحب نے (جنھیں اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جماعت کی دینی جد و جہد میں شرکت کے ذریعہ اپنی زندگی کی اصلاح اور آخرت کی فکر نصیب فرمائی ہے) بڑے دکھ اور درد کے ساتھ اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "بریلوی سلسلہ کے افلاں مولوی صاحب ہمارے علاقہ میں آئے اور ۲۰-۲۵ دن ٹھیر کے مسلسل تقریریں کیں اور ہر تقریر میں تبلیغی جماعت کے خلاف اعتراضات اور اتہامات کی بوچھار کی اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ جماعت گمراہوں کی بلکہ کفار اور دشمنان رسول کی جماعت ہے۔ اس کے پاس بھی نہ جائیں، بلکہ ڈٹ کر اس کی مخالفت اور مقابلہ کریں، ان لوگوں کو اپنی مسجدوں میں ٹھیرنے کی اور بات کرنے کی اجازت نہ دیں بلکہ مسجدوں میں ان کو آنے بھی نہ دیں ...... وغیرہ وغیرہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بہت سے لوگ جو تبلیغی جماعت اور اس کے کام کی نوعیت سے واقف نہیں تھے وہ ان باتوں سے متاثر بھی ہوئے اور انھوں نے مخالفت شروع کر دی ہے اور بعض حلقوں اور مسجدوں میں کام کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے خطوط ملک کے مختلف اطراف سے مسلسل آتے رہتے ہیں، وہ لوگ مجھ سے مشورہ چاہتے ہیں کہ ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ میں کچھ اصولی باتیں الفرقان میں لکھ دی جائیں۔ واللہ الہادی الی سبیل الرشاد

قرآن مجید میں بار بار یہ واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق

کے وقت جب شیطان اپنی متکبرانہ سرکشی کی وجہ سے بارگاہ خداوندی سے ملعون و مردود قرار پایا تو اُس نے درخواست کی کہ مجھے قیامت تک کی مہلت دیدی جائے (اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ) اس کو مہلت دیدی گئی' اُسی وقت اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اس آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے اور اپنے لشکر میں شامل کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا (لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ)۔ چنانچہ اُس کی یہ کوشش ہر دور میں جاری رہی، قرآن پاک ہی میں ہے کہ اس دنیا میں جب بھی اللہ کی طرف سے کوئی نبی و رسول ہدایت کا کام اور پیغام لیکر آئے اور انھوں نے لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف بلایا تو ہمیشہ شیطان اور جنوں اور انسانوں میں سے اُس کے چیلے اُن کے مخالف اور دشمن بن کے کھڑے ہوگئے (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ) سب سے آخر میں ہمارے آقا و ہادی خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور آپ نے مکہ معظمہ میں توحید اور دین حق کی دعوت کا کام شروع کیا تو شیطان ہی نے مکہ کے اشرار ابوجہل و ابولہب وغیرہ کو آپ کی مخالفت پر کھڑا کردیا (جس کی تفصیل ہر پڑھے لکھے مسلمان کو کچھ نہ کچھ معلوم ہے)

آپ کے دور میں، اور آپ کے بعد بھی ایک مدت تک شیطان اپنی ہزار کوششوں کے باوجود آپ کے امتیوں اور آپ پر ایمان لانے والوں کو گمراہ نہیں کرسکا، لیکن اس کے بعد مختلف اسباب سے لوگوں کے ایمان اور علم و عمل میں کمزوری آئی تو وہ شیطانی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکے اور خود مسلمانوں میں طرح طرح کی اعتقادی گمراہیاں اور اعمال و اخلاق میں خرابیاں شیطانی کوششوں کے نتیجہ میں پیدا ہوتی رہیں اسی کے ساتھ اللہ کے کچھ بندوں کو توفیق ملتی رہی کہ وہ اُن کی اصلاح کی اور شیطانی اثرات سے اُن کو بچانے کی فکر اور کوشش کریں ــــ ضلالت اور ہدایت کے یہ دونوں سلسلے تسلسل کے ساتھ جاری رہے اور جاری ہیں ــــ اگرچہ حق پرستوں اور حق کے داعیوں کو کبھی کبھی سخت پریشانیاں بھی پیش آئیں اور بظاہر شیطانی کوششوں نے حق اور اہل حق کے لیے فضا کو بہت زیادہ ناسازگار اور زہر آلود بھی کردیا (جیسا کہ کبھی کبھی انبیا

علیہم السلام کو بھی پیش آیا) لیکن آخری نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا کہ اللہ کی مدد سے داعیان حق و ہدایت کامیاب ہوئے (جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا)

امت محمدیہ میں حق و باطل اور ہدایت و ضلالت اور اولیا الرحمٰن و اولیا الشیطان کی کشمکش کی تاریخ کا خلاصہ یہی ہے جو ان سطروں میں عرض کیا گیا — اس لیے یقین رکھنا چاہیے کہ جب بھی اور جہاں بھی اللہ کے بندوں کی اصلاح و ہدایت کی کوشش ہوگی شیطان اور اُس کی ذریت کی طرف سے اُس کی مخالفت اور مزاحمت بھی ضرور ہوگی۔ اور خاصکر ہماری اس صدی میں بریلوی سلسلہ کے علمبرداران تکفیر نے اس مشن کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کام کے لیے یہ لوگ پیدا کیے گئے ہیں

ہر کسے را بہر کارے ساختند

میل اورا در دلش انداختند

قریباً ساٹھ سال سے میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ جب کسی اللہ کے بندے یا کسی جماعت اور طبقہ نے امت محمدیہ کو شیطانی اثرات سے بچانے اور فسق و فجور اور شرک و بدعت اور خدا فراموشی اور آخرت کی طرف سے بے فکری کی گندگی دلوں سے نکالنے کی کوشش کی اور اللہ کے بندوں کو کچھ ہدایت ہونے لگی تو یہ بریلوی اُس کے پیچھے پڑ گئے طرح طرح کے بہتان لگائے، طوفان اُٹھائے اور تکفیر کے تیر برسائے —

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور اُن کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ اکابر علماء دیوبند و سہارنپور وہ ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے کو امت محمدیہ کی دینی خدمت و اصلاح کے لیے وقف کر دیا تھا اور بلاشبہ یہ حضرات اور ان کے رفقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ کے دین کے وفادار سپاہی اور لشکری تھے اور اُن کی قلبی، قلمی اور زبانی ساری جد و جہد اسی مقصد کے لیے تھی کہ امت محمدیہ شیطانی اثرات و جراثیم سے محفوظ رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے اور آپ کے نقش قدم کی پیروی کرے۔ (اور ان کی ان کوششوں کے نتیجے آج نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مشرق و مغرب میں ہر دیکھنے والے کو نظر آتے ہیں)

لیکن تکفیر کے علمبردار، اِن ناخداترسوں نے (جو دانستہ یا نادانستہ بلاشبہ شیطان کے آلۂ کار ہیں) اِن حضرات کے خلاف پروپیگنڈہ کیا کہ یہ معاذ اللہ دشمنِ رسول ہیں، اُن کی طرف وہ عقیدے اور وہ باتیں منسوب کیں جن کے بارہ میں خود اِن حضرات نے بار بار لکھا ہے کہ جو شخص ایسے عقیدے رکھے یا ایسی باتیں کہے یا لکھے وہ اسلام سے خارج ہے — پھر علماء دیوبند کی طرف سے بلامبالغہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اسی حقیقت کا اظہار کیا گیا اور ایسی وضاحت کی گئی جس کے بعد کسی کے لیے بدگمانی بلکہ شک شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی، لیکن ان ناخداترسوں کے رویہ میں آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا اسی طرح اب سے قریباً اسّی سال پہلے جب اویس دوراں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی دعوت و تحریک پر مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کی ایک جماعت "ندوۃ العلماء" کے نام سے قائم ہوئی اور اس نے امت مسلمہ کی اصلاح اور خاص کر اس کے خواص اور علماء کے درمیان اتحاد اور تعاون و اشتراک عمل کے لیے ایک تحریک کی شکل میں جد و جہد شروع کی تو بریلوی حلقہ کے سرخیل "اعلحضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی" تکفیر کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کے خلاف صف آراء ہوگئے، اُن کے ایک سوانح نگار نے (جو اُن کے خلیفہ بھی ہیں) فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ اعلحضرت نے قریباً سو رسالے ندوہ کی مخالفت اور تردید و تکفیر میں لکھے اور اس تحریک کو ختم کر کے دم لیا (ذکر رضا)

ندوۃ العلماء کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے شروع شروع میں جوابدہی کی گئی اور بتایا گیا کہ جن باتوں کو ہماری تکفیر کی بنیاد بنایا جارہا ہے، ہم اُن سے قطعاً بری ہیں، ہم توحید، رسالت آخرت، قرآن مجید، اور تمام ضروریات دین پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلک اہل السنۃ کے پابند ہیں — لیکن تکفیر کی مشین گنوں سے گولہ باری اس کے بعد بھی اسی طرح جاری رہی۔

ان تجربوں نے یقین دلا دیا ہے کہ اِن بریلوی حضرات کو جواب دینے اور صفائی پیش کرنے کی کوشش فضول ہے، تبلیغی کام کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اخلاص کے ساتھ صرف اللہ کی رضا اور اجر آخرت کو مطمح نظر بنا کر اپنی اصلاح اور دین کی اور امت کی خدمت کا وہ کام

کرتے رہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے اُن کو توفیق دی ہے اور دینی نقطۂ نظر ہے جس کے صحیح اور مقبول ہونے میں کسی ایسے شخص کو شبہ نہیں ہو سکتا جو کتاب و سنت کا علم بھی رکھتا ہو اور تبلیغی جماعت کے اصول اور طریق کار کو بھی اچھی طرح جانتا ہو[1]۔

تبلیغی جماعت اور اُس کے کام کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ امت محمدیہ میں ایمان والی زندگی عام ہو جائے

اس مقصد کے لیے جماعت کا ایک خاص عملی پروگرام ہے جس میں مندرجہ ذیل چند باتوں پر خصوصیت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

(۱) اسلام کی اولین بنیاد کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پر ایمان نصیب ہو جائے ــــــ اس کلمہ کی کما حقہٗ عظمت دل میں آجائے ــــــ اس میں جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے اُس پر قلب و روح کو یقین و اطمینان نصیب ہو جائے ــــــ زندگی اُس کے سانچہ میں ڈھل جائے۔

(۲) نماز زندگی کا جز بن جائے ــــــ اُس کو حتی الامکان صحیح طور پر اور اچھے سے اچھے طریقہ سے ادا کرنے کا اہتمام ہونے لگے ــــــ اُس میں برابر ترقی کی (یعنی ظاہراً و باطناً کمّاً و کیفاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ادا کرنے کی فکر اور کوشش ہوتی رہے۔

(۳) ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق دین سیکھنا ضروری سمجھے اور سیکھنے کی فکر اور کوشش کرے۔

(۴) اللہ کا ذکر و فکر (جس میں تلاوت، دعا، استغفار، درود شریف وغیرہ بھی شامل

---

[1] تبلیغی جماعت اور اُس کے کام کے بارہ میں علماء حق میں سے کسی کو اگر کوئی اشکال ہوا ہے تو اس کی بنیاد ہمیشہ کوئی غلط فہمی یا بعض کام کرنے والوں کی غلطیاں ہوئی ہیں۔

ہیں) ہماری عادت اور کم از کم صبح و شام کا وظیفہ بن جائے۔

(۵) ہمارے اخلاق اور ہماری معاشرت (یعنی اللہ کے بندوں کے ساتھ ہمارا معاملہ اور رویہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ہو جائے۔ (جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم حتی الوسع بندگانِ خدا کی خدمت اور راحت رسانی کی فکر کریں اور کسی کی ہم سے حق تلفی نہ ہو، کسی کو نقصان یا تکلیف نہ پہنچے۔)

(۶) ہم اس کی عادت ڈالیں اور مشق کریں کہ ہمارا ہر کام بس اللہ کی رضا کے لیے اور آخرت کے اجر و ثواب کے لیے ہو (تبلیغی کام کرنے والوں کی خاص زبان میں اس کو "اخلاص اور تصحیح نیت" کہا جاتا ہے)

(۷) اور سب سے آخری بات یہ کہ مذکورہ بالا ۶ چیزیں اپنے اندر پیدا کرنے اور مشق کے ذریعہ ان کو بڑھانے اور ترقی دینے اور دوسروں کو ان کی دعوت و ترغیب دینے کے لیے جماعتوں کے ساتھ حسب موقع دور یا قریب کا، سواری سے یا پیدل سفر کیا جائے — یہ جماعتیں گویا چلتی پھرتی تربیت گاہیں و خانقاہیں اور دعوتی و تبلیغی قافلے ہوں، اس کے ذریعہ دین کی راہ میں تکلیفیں اٹھانے اور اپنی کمائی خرچ کرنے کی بھی عادت پڑے اور اپنے دین میں پختگی اور مضبوطی آئے۔

تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اپنی سطح کے مطابق جانتا ہے کہ تبلیغی اجتماعات اور تبلیغی سفروں میں خصوصیت سے انہی چند باتوں کی دعوت دی جاتی ہے اور انہی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو جماعتیں کسی اجتماع سے یا تبلیغی کام کے کسی مرکز سے روانہ ہوتی ہیں اُن کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ انہی باتوں کی ہدایت دی جاتی ہے اور طریقہ کار بتلایا جاتا ہے — اور امید کی جاتی ہے کہ دین اور اہل دین سے اتنا تعلق پیدا ہو جانے کے بعد، اللہ کی توفیق سے اپنی پوری زندگی کی اصلاح کی فکر انشاء اللہ ضرور پیدا ہو جائے گی — اور اکثر یہی تجربہ ہوتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کیا یہ باتیں اور یہ کام کفار اور دشمنانِ رسول کے کرنے کے ہیں ؟

دریں سلسلہ کے جو مولوی صاحبان اس تبلیغی کام کو کفر و گمراہی اور اس جماعت کو کفار اور دشمنانِ رسولؐ کی جماعت بتلاتے ہیں، اُن کے معاملہ کو تو بس خدا کے سپرد کرنا چاہیے۔ لیکن جو بیچارے سیدھے سادے ناواقف مسلمان اُن کی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں وہ یقیناً ہمدردی اور ترحم کے مستحق ہیں، ان کے لیے دل سے دعا کرنی چاہیے۔ اور اُن سے خود مل کر بات کرنی چاہیے اور اخلاص و دردمندی کے ساتھ اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دہلی کا ایک سفر کرلیں جہاں اس کام کا مرکز ہے اور اس کام کو اور اُس کے کرنے والوں کو اللہ کی دی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں یا کم از کم قریب میں ہونے والے کسی اجتماع میں شریک ہوں ——— انشاء اللہ غلط فہمیاں دور ہوں گی اور خدا نے چاہا تو وہ بھی آپ کے ساتھ دین کی خدمت و دعوت اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جائیں گے۔

آخر میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے باتوفیق بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنا ہے کہ آپ کی نظر صرف اس پر رہنی چاہیے کہ آپ کا کام اور آپ کی دینی محنت صرف اللہ کی رضا اور اجرِ آخرت کی امید پر ہو اور کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو ——— اس لحاظ سے ہمیشہ خود اپنا جائزہ لیتے رہیے ——— اگر یہ چیز نصیب ہے تو ساری دنیا اگر بالفرض آپ کے خلاف ہو اور آپ کو کافر و زندیق قرار دے تو آپ کا کچھ نہیں بگڑتا، آپ کا اللہ آپ سے راضی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک خوش ہے ——— اور اگر خدانخواستہ آپ کی نیت میں کھوٹ ہے، کسی دنیوی مقصد یا نفسانی جذبہ سے یہ تبلیغی کام کیا جا رہا ہے یا بے احتیاطی و بے پروائی یا جہالت و ناواقفی کی وجہ سے آپ تبلیغ میں غلط باتیں کرتے ہیں (جیسا کہ کبھی کبھی بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے)، تو پھر ہرگز خیریت نہیں ہے۔ اس صورت میں اگر بالفرض ساری دنیا آپ کی معتقد ہو جائے اور آپ پر تعریفوں کے ہار پھول چڑھائے تو خود آپ کا انجام اچھا نہیں ہے ——— اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص عطا فرمائے اور اپنی اصلاح اور نجات کی فکر ہمارے قلوب پر غالب کر دے اور اپنے خاص کرم سے ہماری حفاظت اور اصلاح فرمائے۔

Regd. No. 1 LW/NP-62

Monthly A FURQAN

31, Naya Gaon West
Lucknow (U. P.)

VOL. 45 NO. 10, 11, OCT. & NOV., 1977

Phone : 25547

الفرقان لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۵/-
پاکستان سے ۲۵/-
بنگلہ دیش سے ۱۶/-
فی شمارہ ۱/۵۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
محصول ڈاک میں زبردست اضافہ
کے بعد اب نئی شرح یہ ہے
بحری ڈاک سے ۲ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۴ پونڈ

جلد (۴۴) | بابت دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ | شمارہ ۱۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ ر تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع اگلے مہینے کی ۱۰ تاریخ تک آجانا چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ۔ لاہور

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

شیخ محمد بن عبدالوہاب۔ "الفرقان" اور ہمارے بعض اکابر:-

حال ہی میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے "کلیۃ الدعوۃ و اصول الدین" کے ایک متعلم کی طرف سے مندرجہ ذیل استفساری مکتوب موصول ہوا ہے ــــ مکتوب نگار نے خود بھی فرمائش کی ہے اور راقم سطور نے بھی مناسب سمجھا کہ "الفرقان" ہی کے صفحات میں اس کا جواب دیا جائے۔

مخدوم و معظم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی! دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

کچھ دنوں سے ذہن میں ایک اشکال ہے جس کا تعلق شیخ محمد بن عبدالوہاب کی شخصیت سے ہے۔ میں اپنی ذاتی معلومات اور مطالعہ کی بنا پر اُن کو ایک مصلح، خادم دین اور توحید و سنت کا علمبردار سمجھتا رہا، مجھے یاد آتا ہے کہ الفرقان میں بھی ان کا تذکرہ متعدد بار اسی حیثیت سے آیا ہے۔ بلکہ شاہ ولی اللہ نمبر کے ایک مضمون میں تو اُن کو مجددین میں شمار کیا گیا ہے۔ انہی وجوہ سے جب کسی کو ان کی تضلیل کرتے ہوئے سنا یا پڑھا تو یہی خیال ہوا کہ یہ صاحب اہل حق حاملین توحید و سنت میں سے نہیں ہیں بلکہ شرک کے جراثیم زدہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن حال ہی میں ایک ساتھی نے بتلایا کہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

نے اپنی کتاب "المصدقات" میں اُن کو "اہل السنہ" سے خارج قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں ردّ المحتار کے حوالہ سے علامہ ابن عابدین شامی کی ایک عبارت بھی نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارہ میں اُن کی رائے اور اُن کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ ـــــ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ نے اپنی تصنیف "الشہاب الثاقب" میں شیخ اور اُن کی جماعت کے خلاف اور بھی زیادہ سخت لکھا ہے ـــــ پھر میرے اُن ساتھی نے یہ دونوں کتابیں (المصدقات اور الشہاب الثاقب) مجھے دیکھنے کے لیے بھی دیں ـــــ میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعہ وہی ہے جو انھوں نے مجھ سے بیان کیا تھا ـــــ

اِن اکابر کی یہ رائے معلوم ہونے کے بعد قدرتی طور پر ذہن میں اشکال پیدا ہوا ـــــ دل میں یہی آیا کہ آپ کی طرف رجوع کروں ـــــ انشاء اللہ آپ کی وضاحت میرے لیے اطمینان بخش ہوگی ـــــ میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ الفرقان ہی میں تحریر فرمادیں۔ اس طرح فائدہ عمومی بھی ہوگا اور وہ محفوظ بھی ہو جائے گا۔

دریافت طلب یہ امر ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ اگر آپ کے نزدیک وہ اہل حق میں سے ہیں تو پھر ان اکابر کی ان تحریروں کے بارہ میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں اور آپ کے نزدیک ان کی کیا بنیاد ہے ـــــ ؟

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ والسلام

یہ سوال خود راقم سطور کے ذہن میں بھی کبھی کبھی پیدا ہوا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس بارہ میں الفرقان ہی میں کچھ لکھ دیا جائے لیکن اس کی نوبت ابتک نہیں آئی ـــــ اب یہ خط اس کا محرک بن گیا ـــــ واللہ الموفق للصواب والسداد

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ کسی شخصیت کے بارہ میں اچھی یا بری رائے اُس سے متعلق معلومات اور اطلاعات کی بنا پر قائم کی جاتی ہے، اور مختلف لوگوں کی معلومات اور اطلاعات کسی شخص کے بارہ میں مختلف بھی ہوسکتی ہیں، اُس کی وجہ سے رایوں کا مختلف

ہو جانا قدرتی بات ہے۔ اور ایسا اختلاف باپ بیٹوں اور استادوں، شاگردوں میں بھی ہو سکتا ہے۔
——— آپ کو معلوم ہوگا کہ فرقۂ صابئین کی عورتوں سے نکاح کے جواز وعدم جواز کے بارہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ اور اُن کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف و امام محمد کی رایوں میں اختلاف ہے، جو فقہ حنفی کی درسی کتابوں ہدایہ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ جواز کے قائل ہیں اور اُن کے یہ صاحبین ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔

اس اختلاف کی بنیاد یہی ہے کہ امام اعظم کی اطلاع یہ ہے کہ صابئین اپنے کو کسی صاحب کتاب پیغمبر کی امت کہتے ہیں لہٰذا وہ یہود و نصاریٰ کی طرح "اہل کتاب" ہیں سے ہیں، اور قرآن مجید نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا ہے ——— اور صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمدؒ) کی اطلاع یہ ہے کہ یہ فرقہ کواکب پرست ہے، مجوسیوں کی طرح مشرک ہے، کسی آسمانی کتاب اور پیغمبر سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لہٰذا ان کی عورتوں سے نکاح کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔

اسی طرح بہت سے راویان حدیث کے بارہ میں ائمہ جرح و تعدیل کی رایوں میں جو شدید اختلاف ہے کہ ان میں سے ایک کسی راوی کو "ثقہ عادل" قرار دیتا ہے اور دوسرا اسی راوی کو "کذاب دجال" بتلاتا ہے۔ تو اس سب کی بنیاد اپنی اپنی معلومات و اطلاعات کا فرق و اختلاف ہی ہے۔

اور ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شخص کے بارہ میں ایک صاحب نظر عالم بلکہ ایک امام وقت نے ایک زمانہ میں اچھی اطلاعات کی بنیاد پر بہت اچھی بلکہ عقیدت مندانہ رائے کا اظہار فرمایا، پھر جب اس کے خلاف باتیں اُن کے علم یا مشاہدہ میں آئیں تو اپنی پہلی رائے کے بالکل خلاف رائے ظاہر کی ——— امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں امت کے جلیل القدر امام حضرت عبداللہ بن المبارک کا (جو امام بخاری اور امام مسلم کے استاذ الاساتذہ ہیں) ایک قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ——— پہلے مجھے عبداللہ بن محرّر سے ایسی عقیدت تھی کہ اگر مجھ سے کہا جاتا کہ جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، تمھیں اختیار ہے اگر چاہو تو ابھی اس میں جا سکتے ہو، اور چاہو تو عبداللہ بن محرّر سے ملاقات اور ان کی زیارت کر سکتے ہو، تو میں یہ پسند کرتا کہ پہلے عبداللہ بن محرّر سے ملاقات کر لوں اس کے بعد جنت میں جاؤں ——— لیکن جب میں اس شخص سے ملا اور اس کو قریب سے دیکھا تو میری نظر میں اُس کی قیمت ایک مینگنی کی برابر بھی نہیں رہی (صحیح مسلم۔ مقدمہ)

الغرض کسی شخص کے بارہ میں اچھی یا بری رائے کی بنیاد اُس سے متعلق معلومات اور اطلاعات ہی پر ہوتی ہے ـــــ ہمارے سب اکابر کے مقتدا اور شیخ المشائخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے ایک استفتا کیا گیا، اس میں بہت سے سوالات تھے ایک سوال شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارہ میں بھی تھا ـــــ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ

"محمد بن عبدالوہاب کے عقائد کا مجھکو حال معلوم نہیں" (فتاویٰ رشیدیہ)

کسی دوسرے وقت آپ سے کسی اور شخص نے استفتا کیا کہ "وہابی کون لوگ ہیں اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کا کیا عقیدہ تھا اور کون مذہب تھا، اور وہ کیسا شخص تھا، اور اہل نجد کے عقائد میں اور سنی حنفیوں کے عقائد میں کیا فرق ہے؟" ـــــ تو اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا

"محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں، ان کے عقائد عمدہ تھے اور مذہب ان کا حنبلی تھا، البتہ اُن کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور اُن کے مقتدی اچھے ہیں، مگر ہاں جو حد سے بڑھ گئے اُن میں فساد آگیا ہے، اور عقائد سب کے متحد ہیں، اعمال میں فرق حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کا ہے" (فتاویٰ رشیدیہ)

ان دونوں فتووں میں سے کسی پر بھی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے ـــــ لیکن قرین قیاس بلکہ ظاہر یہی ہے کہ پہلا جواب اُس زمانہ کا ہے جبکہ حضرتؒ کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد اور حالات کے بارہ میں کچھ علم نہیں تھا ـــــ پھر جب کسی قابل اعتماد ذریعہ سے معلومات حاصل ہوئے تو آپ نے اُن کے متعلق یہ دوسری رائے ظاہر کی ـــــ بہرحال کسی شخص کے بارہ میں رایوں کا اس قسم کا اختلاف معلومات اور اطلاعات کے اختلاف ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارہ میں ایک دوسری یہ واقعی حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اُن کی دعوت و تحریک صرف وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف یا تبلیغی دوروں تک محدود نہیں تھی بلکہ جہاد بالسیف بھی اس کا ایک جز تھا ـــــ وہ قبروں کو سجدہ کرنے، نذر نیاز چڑھانے اُن سے مرادیں مانگنے اور اس طرح کے تمام مشرکانہ افعال کو بت پرستی کی طرح شرک اور اُن کے

مرتکبین کو مشرک قرار دیتے تھے، اسی طرح "تارکین صلوٰۃ (بے نمازیوں) کو (امام احمد بن حنبل کے مسلک کے مطابق) خارج از اسلام کافر سمجھتے تھے۔ اور اس طرح کے سب لوگوں کے بارہ میں (جو اپنے کو مسلمان کہتے ہوں اور کسی طرح کے کفر یا شرک کے مرتکب ہوں) اُن کا نقطۂ نظر اور رویہ (جو ان کی کتابوں میں پوری صراحت اور صفائی کے ساتھ لکھا ہے) یہ تھا کہ ان کو قرآن و حدیث کے حوالوں سے پہلے اللہ و رسول کا حکم پہنچایا جائے اور ناصحانہ طور پر سمجھانے کی کوشش کی جائے، اور پوری طرح حجت کا اتمام کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی باز نہ آئیں تو پھر بشرط استطاعت ان کے خلاف جہاد کیا جائے ــــــ

اپنے اس نقطۂ نظر کی بنیاد پر وہ یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ "مسلمانوں" میں سے (مذکورہ بالا قسم کا) کفر و شرک ختم کرنے کے لیے اور صحیح اسلام پر اُن کو لانے کے لیے سیاسی اور حکومتی اقتدار حاصل کیا جائے۔ اور علاقۂ نجد کی ایک ریاست ("درعیہ" کی آل سعود کی حکومت) جس نے اُن کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اس سیاسی اور حربی مہم کی علمبردار بن گئی تھی، لیکن اُس کے قائد اور روح رواں شیخ محمد بن عبدالوہاب ہی تھے، اُن کے بعد اُن کی اولاد کا یہی کام اور مقام تھا۔

آس پاس کی اکثر ریاستوں سے ان کی جنگیں بھی ہوئیں جن میں تحریک کے ابتدائی دور میں اکثر و بیشتر ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور "درعیہ" کی آل سعود کی حکومت کی حدود کافی وسیع ہو گئیں ــــــ پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے بڑھ کر حرمین شریفین پر بھی قبضہ کر لیا اور وہاں بھی حکومت کی طاقت سے اپنے دینی و مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق انھوں نے اصلاحات نافذ کیں، مزارات پر قبے توڑ ڈالے، اور اس طرح کے اور بھی اقدامات کئے ــــــ اس سلسلہ میں مختلف بلاد و امصار اور مختلف علاقوں کے ان علماء کی طرف سے اُن کی شدید مخالفت ہوئی اور فتوے جاری ہوئے جو اُن سے مذہبی اور مسلکی اختلاف رکھتے تھے ــــــ اور ان میں سے بہتوں نے اس مخالفت میں وہی روش اختیار کی اور اسی طرح کا پروپیگنڈہ کیا جیسا کہ ہمارے ملک میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مخالف علماء نے شرک و بدعات کے خلاف ان کی جد و جہد اور "تقویۃ الایمان" کی تصنیف و اشاعت کے بعد کیا تھا ــــــ جس کا سلسلہ راہ خدا میں ان کی شہادت پر قریباً ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک چل رہا ہے۔

پھر جن ریاستوں یا حکومتوں سے آل سعود کی حکومت کا ٹکراؤ ہوا (جس کی اصل طاقت اور روح بلاشبہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک ہی تھی) اور علیٰ ہذا جن حکومتوں نے اس دعوت و تحریک کو اپنے لیے سیاسی خطرہ سمجھا، انھوں نے بھی اس کا راستہ روکنے اور عالم اسلامی میں اس کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکانے کے لیے اُن کے خلاف مذہبی پروپیگنڈے ہی کو حکومتی ذرائع سے آگے بڑھایا، اور اس تدبیر سے انھوں نے اپنے مقصد میں یقیناً بڑی کامیابی حاصل کی۔

حکومتی اور سیاسی پروپیگنڈہ باز کیسے شاطر اور کتنے ناخدا ترس ہوتے ہیں اور بالکل بے اصل بات کو عوام میں پھیلا دینے اور اُس کا یقین اُن کے دلوں میں اتار دینے میں کیسے کامیاب ہو جاتے ہیں، اس کا تجربہ اور مشاہدہ خود ہم نے ہندستان کی جنگ آزادی کے دوران کیا ہے ــــ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور "جمعیۃ علمائے ہند" سے تعلق رکھنے والے اُن کے خاص رفقا کو جو شخص جانتا ہے (اور الحمدللہ راقم سطور بھی اُن کے نیازمندوں میں ہے) اُس کو ایسے یقین کے ساتھ معلوم ہے جس کی بنا پر شرعی حلف کے ساتھ بیان کرنا اس کے لیے جائز ہے کہ یہ حضرات انگریزوں کی حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ کو اپنے حق میں "جہاد فی سبیل اللہ" سمجھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے پہلی جنگ عظیم ۱۴-۱۸ء کے بعد سے اور تحریک خلافت کے آغاز سے انڈین نیشنل کانگرس کی جنگ آزادی کی حمایت بلکہ اس میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں جیلوں میں جاتے اور ہر طرح کی تکلیفیں اٹھاتے تھے ــــ لیکن مسلمانوں ہی میں سے اُن کے سیاسی مخالفین نے، خدا سے بے خوف اور آخرت کے محاسبہ سے بالکل بے پروا ہو کر جو پروپیگنڈا اُن کے خلاف کیا، اُس کا یہ نتیجہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بیچارے جاہل عوام ہی نہیں بہت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے اور روزہ نماز سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھی سمجھتے تھے کہ یہ "جمعیتی مولوی" کانگرس سے اور ہندو سیٹھوں سے تنخواہ پاتے ہیں، اسی لیے کانگرس کی حمایت کرتے ہیں ــــ سیاسی پروپیگنڈہ بازوں سے بس خدا کی پناہ!

شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت و جماعت کے خلاف اُن کے مذہبی اور سیاسی مخالفین کا پروپیگنڈہ کتنا کامیاب ہوا اُس کا اندازہ اُن سب حضرات کو ہوگا جن کو پچھلی صدی کے مسلمانوں کی تاریخ سے کچھ واقفیت ہے۔ سوچنے سمجھنے والے کچھ اندازہ اس سے بھی کر سکتے ہیں

کہ اس پروپیگنڈہ ہی کے نتیجہ میں وہابی کا لفظ ایک مذہبی گالی بن گیا۔

اس سلسلہ کی قابل ذکر اور لائق عبرت سنی سنائی اور کتابوں میں پڑھی ہوئی باتیں تو بہت سی ہیں، یہاں میں دو واقعے ذکر کرتا ہوں جن سے میں خود گزرا ہوں۔

(۱) میں نے جب ہوش سنبھالا اور اس طرح کی باتیں سننے سمجھنے کے لائق ہوا (جبکہ میری عمر ۸۔۱۰ سال کی ہوگی) تو اپنے وطن بلکہ اپنے خاص ماحول میں ایک مشہور عام اور مسلمہ واقعہ کی طرح برابر یہ سنا کہ کوئی شخص عبدالوہاب نجدی تھا وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا دشمن تھا کہ اس نے روضۂ اقدس میں اس ناپاک غرض سے سرنگ لگائی تھی کہ حضورؐ کے جسد اطہر کو (معاذ اللہ) نکال کے اس کی بے حرمتی اور توہین کرے۔ اس زمانہ کے مسلمان بادشاہ کو خواب میں حضورؐ کی زیارت ہوئی اور آپ نے اس کو یہ بات بتلائی، اس نے فوراً اٹھ کے تلاش اور کھدائی کرائی تو سرنگ کا پتہ چل گیا اور وہ نجدی عبدالوہاب پکڑا گیا اور اس کو قتل کیا گیا[۱]

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اپنے بچپن میں یہ واقعہ بار بار سنا اور اس طرح سنا کہ اس زمانہ میں مجھے اس کے بارہ میں کبھی شک بھی نہیں ہوا ـــــ مجھے معلوم نہیں کہ یہ قصہ کہیں اور بھی اس طرح مشہور تھا یا نہیں، لیکن میرے وطن اور خاص کر میرے بچپن کے ماحول میں یہ عام لوگوں کی زبانوں پر تھا، اور جہاں تک اب مجھے یاد ہے وہ اس کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ گویا یہ ایک مسلمہ تاریخی

[۱] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ جاہل عوام، "عبدالوہاب نجدی" ہی کو "وہابیت" کا موجد اور اصل مجرم جانتے تھے اور انہی کو گالیاں دے کر دل کا بخار نکالتے تھے۔ یہ اس بات سے بالکل ناواقف تھے کہ بزرگوں کی قبروں پر بنے ہوئے قبوں کو توڑنے والی اور قبروں کو سجدہ کرنے، نذر نیاز چڑھانے، اُن سے مرادیں مانگنے اور اس طرح کے دیگر مشرکانہ اعمال و اطوار کے خلاف علم جہاد بلند کرنے والی شخصیت در اصل شیخ عبدالوہاب" کے بیٹے شیخ محمد کی تھی جو تاریخ میں "شیخ محمد بن عبدالوہاب" کے نام سے معروف ہیں ـــــ اُن کے والد شیخ عبدالوہاب حنبلی بھی اگرچہ اپنے وقت کے بڑے عالم اور فقیہ تھے لیکن وہ اپنے خاص مزاج اور مسلک کی وجہ سے اپنے بیٹے شیخ محمد کی برپا کی ہوئی تحریک اور جدوجہد سے عملاً الگ رہے بلکہ انھوں نے اپنے کو الگ اور یکسو رکھنے کے لیے اپنے اصل وطن "عیینہ" کی سکونت ترک کر کے اُسی علاقہ کے ایک دوسرے شہر "حریملا" میں سکونت اختیار کر لی تھی، کیونکہ "عیینہ" شیخ محمد کی تحریک کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ بات ہر اُس شخص کے علم میں ہے جو اس خاندان کی تاریخ سے کچھ واقفیت رکھتا ہے۔

واقعہ ہے جو سب کے علم میں ہے ـــــ اب یہ مجھے یاد نہیں کہ کب یہ بات میرے علم میں آئی کہ یہ بالکل بے اصل، دشمنوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے۔

دوسرا واقعہ جو میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے یہ ہے کہ خاص مکہ معظمہ کے ایک معمر بزرگ نے (جو بے علم عامی نہیں بلکہ صاحب علم بھی تھے) خود راقم سطور سے بیان فرمایا کہ یہ نجدی "کلمہ شریف کے بارہ میں) کہا کرتے تھے کہ " لیس محمدٌ رسول اللّٰہ" قُلْ "لا الٰہ الا اللّٰہ" (یعنی محمد رسول اللہ کیا ہوتا ہے، بس لا الٰہ الا اللّٰہ" کہو ـــ

ظاہر ہے کہ اس بات کے قطعاً بے بنیاد اور سو فیصد جھوٹ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور اب تو ہر شخص خاصکر حجاز مقدس کا جانے والا ہر متنفس جانتا ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ ان نجدی وہابیوں کے توسرکاری جھنڈے پر بھی پورا کلمہ شریف" لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" لکھا رہتا ہے۔ یہی ان کا شعار، نشان اور اُن کی دعوت وتحریک کی اصل واساس ہے نیز اُن کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اس کا شاہد ہے۔

میں یہاں یہ بھی واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مکہ مکرمہ کے جن معمر بزرگ نے یہ بات مجھ سے بیان کی تھی، میرا خیال ہے کہ انھوں نے ہرگز دانستہ غلط بیانی اور بہتان تراشی نہ کی ہوگی بلکہ حجاز مقدس کی موجودہ نجدی حکومت کے دور سے پہلے اپنی پوری زندگی میں انھوں نے یہی سنا ہوگا (کیونکہ ان نجدیوں کے مذہبی اور سیاسی حریف اُن کے خلاف ایسی ہی باتیں اڑایا کرتے تھے اور پروپیگنڈہ نے فضا ایسی بنادی تھی کہ لوگ یقین کرلیتے تھے) تو ان بزرگ کے دل ودماغ میں اسی زمانہ میں یہ باتیں بیٹھ گئی ہوں گی ـــــ واللہ اعلم

بہرحال یہ دو مثالیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سیاسی اور مذہبی مخالفین نے اُن کے اور اُن کی دعوت کے متعلق کس کس طرح کا پروپیگنڈا کیا اور عالم اسلامی کے عوام وخواص اُس سے کتنے متاثر ہوئے۔

اس کے بعد میں اصل سوال کے بارہ میں عرض کرتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ "التصدیقات" حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی کوئی مستقل تصنیف

نہیں ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ اب سے ۷۰-۷۲ برس پہلے ۱۳۲۵ھ میں مدینہ منورہ کے بعض علماء نے ایک خاص واقعہ کی وجہ سے (جس کی تفصیل طوالت طلب اور یہاں غیر ضروری ہے) جماعت دیوبند اور اس کے اکابر کے عقائد و نظریات اور اُن کے مسلک و مشرب سے متعلق کچھ تحریری سوالات حضرت مولانا سہارنپوریؒ کے پاس بھیجے تھے —— مولانا نے اُن کے جوابات لکھے اور جماعت کے دوسرے اکابر نے بھی اُن کی تصدیق و توثیق کی۔ پھر ان سوالات و جوابات اور تصدیقات کا مجموعہ اردو ترجمہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اسی کا نام "التصدیقات" ہے —— ان سوالات میں بارھواں سوال یہ تھا۔ (ذیل میں سوال و جواب کا صرف اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے)

بارھواں سوال ۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مال آبرو کو۔ اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب، اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا —— اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے، اور کیا سلف اور اہل قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے سائل کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ

ہمارے نزدیک اُن کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے کہ —— "خوارج ایک جماعت ہے شوکت والی جنھوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے، کہ امام کو باطل یعنی کفر یا ایسی معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہمارے جان اور مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں ...... (آگے فرماتے ہیں) اُن کا حکم باغیوں کا ہے (پھر یہ بھی فرمایا) ہم اُن کی تکفیر صرف اس لیے نہیں کرتے کہ ان کا یہ فعل تاویل سے ہے اگرچہ باطل ہی سہی"

اور علامہ شامی نے اس کے حاشیہ میں فرمایا ہے "جیسا کہ ہمارے زمانہ میں عبدالوہاب کے تابعین سے سرزد ہوا، کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوئے۔ اپنے کو حنبلی مذہب بتلاتے تھے لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو ان کے عقیدہ کے خلاف ہو وہ مشرک ہے اور اسی بنا پر انھوں نے اہل سنت اور علمائے اہل سنت کا قتل مباح سمجھ رکھا

تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شوکت توڑ دی۔۔۔۔۔۔۔ باقی رہا سلف اہل اسلام کو کافر کہنا سو حاشا کہ ہم ان میں سے کسی کو کافر کہتے یا سمجھتے ہوں۔ الخ

اس جواب سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے احوال و عقائد کے بارے میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی خود اپنی کوئی خاص واقفیت اور تحقیق ہے یا انھوں نے "شیخ" کی یا ان کے متبعین میں سے کسی کی کوئی کتاب دیکھ کر رائے قائم کی ہے ـــــ بظاہر انھوں نے اپنے جواب میں سوال کرنے والے صاحب کے بیان پر اعتماد کیا ہے (جو ایک مدنی عالم تھے) نیز صاحب "رد المحتار" علامہ ابن عابدین شامی کے بیان کو بھی مولانا نے اس کا مؤید پایا ـــــ اور ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص کے اقوال و احوال وہ ہوں جو مندرجہ بالا سوال میں اور علامہ شامی کے بیان میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین کے بیان کیے گئے ہیں تو اس کے بارے میں شرعی حکم وہی ہوگا جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے لکھا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اُس سیاسی اور مذہبی پروپیگنڈے کے نتیجے میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، حرمین شریفین میں اور اکثر دوسرے بلاد اسلامیہ میں بھی ان اہل نجد اور اُن کی دعوت و تحریک سے متعلق اسی طرح کی بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب باتیں عام طور سے مشہور تھیں ـــــ شیخ احمد ابن زینی دحلان (متوفی ۱۳۰۴ھ) نے (جو اپنے دور میں مکہ مکرمہ کے اکابر علماء شوافع میں سے تھے) اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" میں (جو چودھویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی ہے) شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اُن کے متبعین کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اگر وہ صحیح اور ثابت مان لیا جائے تو ایک مسلمان کا خون کھولا دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔[2]

---

[1] علامہ ابن عابدین شامی، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بیٹوں پوتوں اور شاگردوں کے معاصر ہیں جو دعوت اور تحریک کی قیادت میں شیخ کے گویا خلفاء تھے اور اُن کی جو عبارت یہاں جواب میں نقل کی گئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمین شریفین پر آل سعود کی حکومت کا قبضہ اور پھر اس قبضہ کا خاتمہ علامہ شامی کے زمانہ ہی میں ہوا ـــــ شیخ احمد زینی دحلان کے بیان کے مطابق حرمین شریفین پر نجدی حکومت کا قبضہ ۱۲۲۰ھ سے ۱۲۲۶ھ تک رہا۔ خلاصۃ الکلام صفحہ ۲۳۵

[2] اس کتاب کے صرف ایک صفحہ (۲۳۰) کے چند جملے یہ ہیں (صرف ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)۔ جب کوئی شخص محمد بن عبدالوہاب کے دین میں داخل ہونا چاہتا تو یہ اُس سے کلمۂ شہادت پڑھوانے کے بعد کہتا کہ اس بات کی بھی

——— اس طرح کی باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ حرمین شریفین کے لوگ اِن اہل نجد کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے (جو ۱۳۱۶ھ سے ۱۳۳۳ھ تک مسلسل ۱۷-۱۸ برس مدینہ منورہ میں مقیم رہے) اپنی کتاب "الشہاب الثاقب" میں شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کی جماعت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

گواہی دو اور اقرار کرو کہ تم اب تک کافر تھے اور تمہارے ماں باپ بھی کافر تھے اور وہ کفر ہی کی حالت میں مرے ہیں؛ اور اگلے زمانوں کے بہت سے اکابر علماء کا نام لیکر کہتا تھا کہ ان کے بارے میں بھی کہو کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ سب کافر تھے۔

اور وہ (محمد بن عبد الوہاب) ہر اس شخص کو کافر کہتا تھا جو اُس کا پیرو نہ بنے اگرچہ وہ اعلیٰ درجہ کا متقی ہو اور ان کو قتل کر ڈالنا اور ان کے اموال کا لوٹنا حلال جانتا تھا ...... اور مختلف الفاظ و عبارات سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں اور آپ کی توہین کرتا تھا۔

اور اُس کے بعض متبعین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) "میری یہ لاٹھی محمد سے بہتر ہے اس سے سانپ مارا جاسکتا ہے اور اس طرح کے بہت سے کام اس سے لیے جاسکتے ہیں اور محمد تو مر چکے اب وہ کسی کام نہیں آسکتے اور اُن سے کوئی نفع نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ......

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا اس کو ناگوار ہوتا تھا اور اُس کے سننے سے اُس کو اذیت اور تکلیف ہوتی تھی۔

اور اس سب سے پہلے شیخ دحلان نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ

محمد بن عبد الوہاب کے دل میں نبوت کا دعویٰ کرنے کا منصوبہ تھا اور اگر اُس کو علانیہ دعوائے نبوت کرنے کا موقع ملتا تو وہ کھلم کھلا نبوت کا دعویٰ کرتا۔ شیخ دحلان نے ان میں سے کسی الزام کے لیے بھی شیخ محمد بن عبد الوہاب کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس کے برعکس ان میں سے ہر بات کی تردید خود ان کی یا اُن کے شاگردوں کی کتابوں میں موجود ہے ——— راقم سطور کا گمان یہی ہے کہ مخالفانہ پروپیگنڈے کے نتیجہ میں یہ باتیں اس قدر مشہور ہو گئی تھیں کہ کہنے یا لکھنے سے پہلے ان کی تحقیق بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اور اس عام شہرت ہی کی بنا پر ان کو بے تکلف کہا اور لکھا جاتا تھا۔ شیخ دحلان جیسے حضرات کے بارے میں آسانی سے یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے دانستہ اتنی سنگین بہتان تراشی کی ہو، کوئی شخص جو آخرت کے محاسبہ پر یقین رکھتا ہو ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔ واللہ اعلم۔

بارہ میں لکھتے ہوئے اہل عرب و اہل حرمین کا یہ حال لکھا ہے کہ

اہل عرب کو خصوصًا اُس سے (محمد بن عبدالوہاب سے) اور اُس کے اتباع سے دلی بغض تھا اور ہے اور اس قدر ہے کہ نہ اتنا قوم یہود سے ہے نہ نصاریٰ سے نہ مجوس سے نہ ہنود سے۔ صـ۴۲

اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے ۱۳۲۵ھ سے پہلے حج و زیارت کے لیے کم از کم تین سفر حرمین شریفین کے کیے تھے[1] اور وہاں کے اکابر علما، و اعیان سے آپ کی ملاقاتیں بھی رہی تھیں تو اس کا پورا امکان ہے کہ وہاں کی اس فضا سے آپ بھی متاثر ہوئے ہوں —— اور اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا کہ مولانا نے شیخ محمد بن عبدالوہاب یا اُن کے حلقہ کے کسی عالم کی کوئی تصنیف دیکھی ہو یا اُن میں سے کسی سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کی نوبت آئی ہو، اور اس کی بنا پر یہ رائے قائم ہوئی ہو۔

لیکن اس تحریر کے قریبًا ۲۰ سال بعد جب ۱۳۴۴ھ میں آپ نے حجاز مقدس کا آخری سفر فرمایا اور پھر ہجرت کی نیت کر کے مدینہ منورہ ہی میں قیام فرمالیا تو حسن اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حرمین شریفین پر سلطان نجد عبدالعزیز بن سعود کا (گویا شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت کا) قبضہ ہوچکا تھا —— اسی زمانہ میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سلسلہ کے مشہور عالم شیخ عبداللہ بن بلیہد بھی (جو سعودی حکومت کی طرف سے حجاز مقدس کے قاضی القضاۃ تھے) مدینہ طیبہ میں مقیم تھے اور ان کا مکان اتفاق سے حضرت مولانا کی قیام گاہ سے قریب ہی تھا، اُن سے مسلسل ملاقاتوں گفتگوؤں اور اُن کے احوال کے مشاہدہ کے بعد شیخ محمد بن عبدالوہاب کی طرف منسوب اس نجدی جماعت کے بارہ میں مولانا کی جو رائے قائم ہوئی وہ انھوں نے اُسی زمانہ میں لاہور کے مشہور روزنامہ "زمیندار" کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کے نام ایک مکتوب میں لکھی تھی، یہ مکتوب اُسی زمانہ میں "زمیندار" میں شائع ہوا تھا۔ اور اُس کے بعد "اکابر کے خطوط" نامی کتاب میں بھی شائع ہوچکا ہے —— اس میں مولانا سہارنپوریؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

قاضی القضاۃ شیخ عبداللہ بن بلیہد جن کا مکان میرے مکان کے قریب ہی ہے، اُن سے

---

[1] پہلا سفر [illegible] میں دوسرا [illegible] میں اور تیسرا [illegible] میں

اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اور دینی مسائل میں گفتگو بھی ہوتی ہے، اکثر بڑے عالم ہیں، مذہب اہل سنت وجماعت رکھتے ہیں، ظاہر حدیث پر جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا طریق ہے عمل کرتے ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ الاسلام ابن قیم کی کتابوں کو زیادہ محبوب اور پیش نظر رکھتے ہیں، ہمارے علماء کے نزدیک بھی یہ دونوں بزرگ بڑے مرتبہ کے عالم ہیں ــــ بدعات اور محدثات سے نہایت متنفر ہیں، توحید و رسالت اپنے ایمان کی جڑ قرار دے رکھا ہے ــــ الغرض میں نے جہاں تک خیال کیا اہل سنت کے عقائد سے ذرا بھی انحراف نہیں، اور اکثر اہل نجد قرآن شریف پڑھے ہوئے ہیں، کثرت سے حفاظ ہیں، صلوٰۃ باجماعت کے نہایت پابند ہیں۔ آجکل مدینہ منورہ میں سخت سردی کا زمانہ ہے۔ مگر اہل نجد صبح کی نماز میں پابندی کے ساتھ آتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ بہرحال اس قوم کی حالتِ دینی نہایت اطمینان بخش دیکھی ہے"

(اکابر کے خطوط ص۱۱-۱۲)

اس مکتوب کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۲۵ھ میں کسی مدنی عالم کے سوال کے جواب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اور ان کی جماعت کے بارہ میں جو لکھا تھا (جو "التصدیقات" میں شائع ہوا ہے) اس کی بنیاد ذاتی علم و واقفیت پر نہیں تھی، بلکہ سائل کے بیان اور عام شہرت کی بنا پر (جس کی ایک حد تک تائید علامہ شامیؒ کے بیان سے بھی ہوتی تھی) مولانا نے جواب لکھا تھا ــــ لیکن اس کے بعد جب اس جماعت کے خواص علماء اور عوام کو آنکھوں سے دیکھا اور ان کے عقائد اور اعمال و احوال کا براہ راست علم اور مشاہدہ ہوا تو مولانا کی رائے وہ قائم ہوئی جو مندرجہ بالا مکتوب میں قلمبند فرمائی۔

راقم سطور کے نزدیک بالکل یہی معاملہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، حضرت مولانا کا قیام ۱۳۱۶ھ سے ۱۳۳۲ھ تک مدینہ منورہ میں رہا۔ اور اس زمانہ کے اپنے تجربہ اور احساس کی بنا پر مولانا کا یہ بیان "الشہاب الثاقب" ہی کے حوالہ سے اوپر نقل ہو چکا ہے کہ "اہل عرب شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اُن کے متبعین سے یہود و نصاریٰ اور مجوس و ہنود سے بھی زیادہ نفرت و عداوت رکھتے تھے ــــ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ شیخ احمد زینی

دحلان کی "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر السنیۃ" اور نجدی وہابیوں کے خلاف دوسرے عرب علماء کی اس طرح کی متعدد کتابیں شائع ہو کر قریب قریب ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں پہنچ چکی تھیں جن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت و جماعت کے بارہ میں اسی طرح کی سخت اشتعال انگیز باتیں لکھی گئی تھیں جن کا نمونہ "خلاصۃ الکلام" کے صرف ایک صفحہ کے چند جملے نقل کر کے پچھلے صفحات میں ایک حاشیہ میں پیش کیا جا چکا ہے۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ یہی چیزیں اس نجدی جماعت کے بارہ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کے معلومات کا ذریعہ تھیں۔ ان معلومات اور اطلاعات نے اُن کے قلب میں اس جماعت کے خلاف وہ شدید غیظ و غضب پیدا کر دیا تھا جس کی شدت "الشہاب الثاقب" کا مطالعہ کرنے والوں کو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

یہ سطریں لکھتے ہوئے راقم سطور کا ذہن حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے اس واقعہ کی طرف منتقل ہو گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ حضرت ہارون فی الواقع قصوروار نہیں تھے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو قصوروار سمجھ کر اُن کے خلاف اس طرح غیظ و غضب کا اظہار فرمایا کہ اُن کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ کر کھینچنے لگے اور اس غصہ اور جلال کی نے ان کو واقعہ کی تحقیق کی بھی فرصت نہیں دی ـــــ پھر بعد میں حقیقت حال معلوم ہو جانے پر استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا رب اغفر لی ولاخی وادخلنا فی رحمتک وانت ارحم الراحمین ٥

اس عاجز کو شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ان کی جماعت کے بعض دیگر علماء کی کچھ کتابوں کے مطالعہ کا بھی موقع ملا، اُن کی تاریخ اور سوانح کے سلسلہ میں بھی بعض چیزیں پڑھیں، ان کے بعض سخت مخالفین کی تصانیف بھی دیکھی ہیں ـــ ان سب چیزوں کے مطالعہ کے بعد راقم سطور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت سے متعلق ایک استفتا کا جواب دیتے ہوئے مختصر الفاظ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہایت محققانہ اور منصفانہ رائے ہے ـــــ حضرتؒ کا وہ جواب اوپر بھی نقل کیا جا چکا ہے ـــ ناظرین اس کو ایک دفعہ پھر پڑھ لیں

(فتاویٰ) محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں، اُن کے عقائد عمدہ تھے اور مذہب حنبلی تھا البتہ اُن کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں، مگر ہاں جو حد سے بڑھ گئے اُن میں فساد آ گیا ..... الخ فتاویٰ رشیدیہ حصہ اول

کتاب المعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

خرید و فروخت کے متعلق احکام و ہدایات

پھلوں کی فصل تیاری سے پہلے نہ بیچی خریدی جائے :-

عن عبداللہ بن عمر قال نھٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الثمار حتّٰی یبدو صلاحھا، نھی البائع والمشتری ۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

وفی روایۃ لمسلم نھٰی عن بیع النخل حتی تزھُوَ وعن السنبل حتی یبیضّ و یامن العاھۃ

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا پھلوں کی بیع سے اس وقت تک کہ ان میں پختگی آجائے، آپ نے بیچنے والے کو بھی منع فرمایا اور خریدنے والے کو بھی ۔۔۔۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اور اسی حدیث کی صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے منع فرمایا کھجوروں کی فصل کی بیع سے جب تک ان پر سرخی نہ آجائے اور کھیت کی بالوں کی بیع سے جب تک ان پر سفیدی نہ آجائے اور تباہی کا خطرہ نہ رہے۔

(تشریح) جس طرح ہمارے ملک اور ہمارے علاقوں میں آم کے باغوں کی فصل آم تیار

ہونے سے پہلے، بہت پہلے بھی فروخت کردی جاتی ہے اسی طرح مدینہ منورہ وغیرہ عرب کے پیداواری علاقوں میں کھجور یا انگور کے باغات اور درختوں کے پھل تیاری سے پہلے فروخت کردیے جاتے تھے اور کھیتوں میں پیدا ہونے والا غلہ بھی تیاری سے پہلے فروخت کردیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی۔ کیونکہ اس میں خطرہ اور امکان ہے کہ فصل پر کوئی آفت آجائے مثلاً تیز آندھیاں یا آسمان سے گرنے والے اولے غلہ کو یا پھلوں کو ضائع کردیں یا اُن میں کوئی خرابی اور بیماری پیدا ہوجائے تو بیچارے خریدنے والے کو بہت نقصان پہنچ جائے گا، پھر اس کا بھی خطرہ ہے کہ قیمت کی ادائیگی کے بارہ میں فریقین میں نزاع اور جھگڑا پیدا ہو ــــ بہرحال اس بیع فروخت میں یہ کھلے ہوئے مفاسد اور خطرات ہیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ــــ آگے درج ہونے والی حدیثوں میں اس کی مزید وضاحت ہے۔

عن انس قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى تزهى، قيل وما تزهى؟ قال حتى تحمر، وقال ارأيت اذا منع الله الثمرة بم يأخذ احدكم مال اخيه ــــ رواه البخاري ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا تا آنکہ اُن پر رونق آجائے، عرض کیا گیا کہ رونق آجانے سے کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ سرخی آجائے۔ (اس کے بعد) آپ نے ارشاد فرمایا کہ بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ پھل عطا نہ فرمائے (یعنی بحکم خداوندی کسی آفت سے پھل تیار ہونے سے پہلے ضائع ہوجائیں) تو بیچنے والا کس چیز کے عوض میں (خریدنے والے) اپنے بھائی سے مال وصول کرے گا۔
(صحیح بخاری و مسلم)

(تشریح) علماء نے لکھا ہے کہ اگر پھل میں ایسا نقصان ہوگیا ہے کہ خریدار کو کچھ بھی نہیں بچا سب برباد ہوگیا تو باغ فروخت کرنے والے کو چاہیے کہ قیمت بالکل نہ لے اور لے چکا ہے تو واپس کردے اور اگر ایسا نہیں بلکہ کچھ نقصان ہوگیا ہے تو اس کا لحاظ کرکے قیمت میں تخفیف اور کمی کردے۔ اِن احکام کی رُوح یہ ہے کہ ہر ایک کی خیرخواہی اور مناسب حد تک ہر ایک کے مفاد

کی حفاظت کی جائے۔

عن انس قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع العنب حتّٰی یسودّ

وعن بیع الحبّ حتی یشتدّ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا انگور (کی فصل) فروخت کرنے سے تاوقتیکہ اُس پر سیاہی نہ آجائے، اور غلہ (کا کھیت) فروخت کرنے سے اس وقت تک کہ دانہ سخت ہو جائے اور پک جائے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ طیبہ میں وہی انگور پیدا ہوتا تھا جو اُسی وقت تیار ہوتا تھا جب اُس پر سیاہی آجائے اس لیے آپ نے سیاہی آنے سے پہلے فصل فروخت کرنے سے منع فرمادیا ـــــ اِس زمانہ میں مدینہ طیبہ میں سیاہ انگور بھی بہت پیدا ہوتا ہے اور سفید بھی اور نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے ـــــ اس حدیث میں بھی پھلوں کے ساتھ غلہ کے کھیتوں کے بارہ میں بھی حکم دیا گیا ہے کہ دانہ تیار ہونے سے پہلے کھیت کا غلہ فروخت نہ کیا جائے۔

چند سالوں کے لیے باغوں کی فصل کا ٹھیکہ نہ دیا جائے:۔

عن جابر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع السنین وامر بوضع الجوائح ـــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا (باغ کو) چند سالوں کے واسطے فروخت کرنے سے اور آپ نے حکم دیا ناگہانی آفات (کے نقصان) کو وضع کر دینے کا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) باغ کی فصل کئی سال کے لیے فروخت کرنے سے اسی لیے منع فرمایا گیا کہ معلوم نہیں کہ پھل آئے گا بھی یا نہیں اور باقی رہے گا یا خدا نخواستہ کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہو جائے گا ـــــ ایسی صورت میں بیچارے خریدار کو سخت نقصان پہنچے گا اور وہ قیمت ادا کرنا نہ چاہے گا جس سے نزاع اور جھگڑا پیدا ہو گا جو سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ دوسرا حکم اس حدیث میں

یہ دیا گیا کہ اگر باغ کی فصل فروخت کی گئی اور پھلوں پر کوئی آفت آگئی تو باغ کے مالک کو چاہیے کہ نقصان کا لحاظ کر کے قیمت میں کمی اور تخفیف کر دے۔

ظاہر ہے کہ ان سب احکام کا مقصد اہل معاملہ کی خیر خواہی اور ان کو باہمی اختلاف و نزاع سے بچانا اور ایک دوسرے کی ہمدردی و غمخواری اور ایثار و قربانی کا عادی بنانا ہے۔

جو چیز فی الحال اپنے پاس نہ ہو اُس کی بیع نہ کی جائے:-

کاروباری دنیا میں حضور کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا اور ہمارے زمانہ میں بھی ہوتا ہے کہ تاجر کے پاس ایک چیز موجود نہیں ہے لیکن اُس کے طالب خریدار سے وہ اُس کا سودا اس امید پر کر لیتا ہے کہ میں کہیں سے خرید کر اس کو دیدوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی بیع سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ اس کا امکان ہے کہ وہ چیز فراہم نہ ہو سکے یا فراہم ہو جائے مگر خریدار اس کو پسند نہ کرے، اس صورت میں فریقین میں نزاع اور جھگڑا ہو سکتا ہے۔

عن حکیم بن حزام قال نہانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن ابیع ما لیس عندی ـــــــــ رواہ الترمذی

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس سے منع فرمایا کہ جو چیز میرے پاس موجود نہیں ہے میں اس کی بیع فروخت کا کسی سے معاملہ کروں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) یہ حکیم بن حزام ایک دولتمند تاجر تھے سنن نسائی اور سنن ابی داؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضور سے دریافت کیا تھا کہ بعض اوقات کسی چیز کا خریدار میرے پاس آتا ہے اور وہ چیز میرے پاس موجود نہیں ہوتی تو میں اُس سے معاملہ کر لیتا ہوں اور بازار سے وہی چیز خرید کے اُس کو دیدیتا ہوں ـــــــ تو آپ نے فرمایا کہ جو چیز تمھارے پاس موجود نہیں ہے اُس کی بیع فروخت نہ کرو۔

اگر غلہ وغیرہ خریدا جائے تو اُٹھا لینے سے پہلے اُس کو فروخت نہ کیا جائے:-

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ابتاع

طعاماً فلا یبیعہ حتی یستوفیہ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص غلہ (وغیرہ) خریدے تو جب تک اس کو اپنے قبضہ میں نہ لے لے اس وقت تک کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ کوئی جھگڑا اٹھنا پیدا نہ ہو۔ اس حدیث میں اگرچہ صرف طعام (یعنی غلہ) کا ذکر ہے لیکن تمام اموال منقولہ کا یہی حکم ہے۔

مضطر (سخت ضرورت مند) سے خرید و فروخت کی ممانعت :-

بعض اوقات آدمی فقر و فاقہ یا کسی حادثہ کی وجہ سے یا کسی ناگہانی پریشانی میں گھر جانے کی وجہ سے اپنی کوئی چیز بیچنے کے لیے یا کھانا وغیرہ کوئی چیز خریدنے کے لیے سخت مجبور اور "مضطر" ہوتا ہے ـــــ ایسے وقت بے درد تاجر اس شخص کی مجبوری اور اضطراری حالت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث میں اسی کو "بیع مضطر" کہا گیا ہے اور اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

عن علی قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع المضطر وعن بیع الغرر وعن بیع الثمرۃ قبل ان تدرک ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا "مضطر" کی خرید و فروخت سے، اور ایسی چیز کی بیع سے جس کا ملنا یقینی نہ ہو اور پھلوں کی تیاری سے پہلے اُن کی بیع فروخت سے۔" (سنن ابی داؤد)

(تشریح) "مضطر کی بیع" کی تشریح اوپر کی جا چکی، اس کی ممانعت کا مقصد یہ ہے کہ ایسے مجبور و مضطر آدمی سے خرید و فروخت کا تاجرانہ معاملہ نہ کیا جائے بلکہ اُس بھائی کی خدمت اور اعانت کی جائے ـــــ دوسری چیز جس سے اس حدیث میں ممانعت فرمائی گئی ہے "بیع غَرَر" ہے یعنی ایسی چیز کی بیع جو فروخت کرنے والے کے ہاتھ میں نہیں ہے اور اس کا ملنا یقینی نہیں ہے، جیسے کہ کوئی جنگل کے ہرن کی یا کسی پرندکی یا دریا کی مچھلی کی اس امید پر بیع کرے کہ شکار کر کے فراہم کر دوں گا "یہ بیع غَرَر" ہے اور اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے کیونکہ بیچی جانے والی چیز نہ بائع کے پاس موجود ہے اور نہ اس کا ملنا یقینی ہے اور مل بھی جائے تو نوعیت کے بارہ میں نزاع و اختلاف کا خطرہ ہے ـــ تیسری چیز جس کی اس حدیث میں ممانعت فرمائی گئی ہے تیار ہونے سے پہلے پھلوں [illegible]

مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

کاروانِ اہلِ فضل و کمال

تلامذۂ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی مہاجرؒ

حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بعد ۱۸-۱۹ سال تک دہلی کے اندر شمع درس و تدریس کو روشن رکھا۔ اور رجب ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تو وہاں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری رہا۔ مگر دو تین سال کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ ہندوستان اور حجاز میں آپ کے تلامذہ کی یقیناً ایک کثیر تعداد ہو گی، مگر آپ کے تلامذہ میں جو مشہور و معروف شخصیتیں ہیں اور تاریخ و تذکرہ کی کتابوں سے جن کے حالات معلوم ہو سکے ہیں ان کو یکجا جمع کرنے کی ضرورت تھی۔ احقر نے مناسب سمجھا کہ حضرت شاہ صاحب کے تذکرے کے بعد (جو الفرقان کے گزشتہ شمارہ میں شائع ہو چکا ہے) ان کے تلامذہ کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ آپ کے تلامذہ میں چند حضرات کی تو مستقل سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں مثلاً حضرت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ کے حالات میں "تذکرہ رحمانیہ"[1] مؤلفہ قاری عبدالحلیم انصاری پانی پتیؒ، سوانح عمری حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ مؤلفہ حکیم محمد عمر جرتھالویؒ اور "الحیاۃ بعد المماۃ" سوانح عمری میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ مؤلفہ قاضی نظف حسین مظفر پوریؒ۔

میں نے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے تلامذہ کے حالات میں اختصار کو مدنظر رکھا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ کوئی ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔

---

[1] محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب "مولانا محمد احسن نانوتویؒ" کے صفحہ ۱۸۱ پر "تذکرہ رحمانیہ" کا مؤلف خواجہ الطاف حسین حالیؔ کو بتایا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے :۔

نزہتہ الخواطر جلد ہفتم و ہشتم ۔ تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرہ رحمانیہ۔ مقالات طریقت تذکرہ علمائے ہند فارسی مؤلفہ مولانا رحمان علی ۔ سوانح عمری مولانا شیخ محمد تھانویؒ ۔ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند مرتبہ محمد ایوب قادری۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولانا حافظ محمد علی حیدر علوی کاکورویؒ ۔ تذکرہ کاملان رامپور۔ تراجم علمائے اہل حدیث مؤلفہ ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی تاریخ مظاہر جلد اول مرتبہ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم ۔

مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ

الشیخ العالم الفقیہ المجوّد عبدالرحمٰن بن محمد الانصاری الپانی پتی ـــــــــ

پہلے آپ نے اپنے والد ماجد سے علم نحو اور عربیت کے رسائل پڑھے ۔ پھر قاری سید امام الدین نخشبی امروہیؒ[1] سے شاطبی ، مشکوۃ شریف ، طریقۃ المحمدیہ اور علم فرائض کو پڑھا اور ان سے سبعہ کی قرأت بھی سیکھی ۔ بعدہٗ دہلی پہونچے اور عربی علم ادب کی کچھ کتابیں مولانا رشید الدین دہلویؒ سے پڑھیں۔ مولانا سید محمد دہلویؒ سے شرح عقائد للتفتازانی مع حاشیہ خیالی پڑھی ۔ مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے سوائے دورۂ حدیث کے باقی تمام کتب معقولات و منقولات پڑھیں ۔ پھر آپ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے وابستہ ہو گئے اور ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر مرکز عنایات بنے ۔ افتاء و تدریس کی صلاحیت حاصل کی ۔ بعد فراغت شہر باندہ چلے گئے ۔ وہاں نواب ذوالفقار الدولہ نے جو اس نواح کے نواب تھے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا ۔ آپ نے ۱۲۷۳ھ تک باندہ میں قیام کیا ۔ پھر اپنے وطن پانی پت آ گئے اور وہاں پر درس و افادہ میں کلیتاً مصروف و مشغول رہے ۔ آپ اپنے تمام اوقات کو خدمت قرآن و حدیث میں صرف کرتے تھے ۔ اہل علم کے لیے آپ کا نفع عام تھا ۔ آپ کے زمانے کے علماء حنفیہ میں کوئی بھی ایسی نمایاں شخصیت نہیں ہے ۔ جس نے

---

[1] تذکرۂ رحمانیہ میں قاری صاحب کے امروہہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے ۔ قاری صاحب نے سند تجوید و قرأت حاصل کرنے کے علاوہ امروہہ میں بخاری کے بھی چند پارے قاری امام الدین نخشبی امروہیؒ سے پڑھے تھے ۔

آپ سے استفادہ نہ کیا ہو۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ مؤلف نزہۃ الخواطر فرماتے ہیں کہ میں ۱۳۱۲ھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے حدیث مسلسل بالاولیۃ سنی۔ نیز میں نے ان کے سامنے اس نسخہ میں جس پر حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ شیخ محمد سعید سنبل کی اولیات پڑھیں۔ اس کی تمام مرویات کی انھوں نے مجھے اجازت دی۔ اور میرے لیے برکت کی دعا کی۔

آپ نے بہت سے رسائل تصنیف کیے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتیؒ نے آپ کے سوانح و حالات میں تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرۂ رحمانیہ ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کی حسب ذیل عبارت سے بھی قاری صاحب کی اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے جو استاد کی نظر میں ان کو حاصل تھی۔

"شاہ محمد اسحاق صاحبؒ جب دہلی سے روانہ ہو کر قطب صاحبؒ میں ٹھہرے اور تمام عمائد شہر دہلی مشایعت کو وہاں تک پہونچے تو ایک اہل حدیث عالم نے جو حضرت شاہ صاحب کی موجودگی تک اپنے آپ کو حنفی کہا کرتے تھے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت دہلی کو علم سے خالی کیے جا رہے ہیں۔ اپنا کوئی جانشین مقرر فرما دیجیے۔ عمائد دہلی نے بھی اس قول کی ہمنوائی کی مگر حضرت شاہ صاحب کچھ خاموش رہے۔ دوسری بار عرض کیا گیا تب بھی آپ چپ رہے۔ تیسری مرتبہ سب کے اصرار پر فرمایا "ہم نے قاری عبدالرحمٰن اور نواب قطب الدین خاں کو حدیث پڑھا دی ہے ان سے استفادہ کرو۔" (تذکرۂ رحمانیہ صفحہ ۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"یکایک حضرت شاہ صاحبؒ کا ارادہ حج کا ہو گیا۔ اس وقت قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی بموجب حکم شاہ صاحب باندہ میں علوم دینیات کی خدمت پر مقرر ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے سفر حج کی اطلاع بھیجی تو آپ فوراً دہلی چلے آئے۔ اور اپنے شیخ کی خدمت

۱؎ رأس الاذکیاء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے جو حضرت قاسم العلوم والمعارفؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ سے بھی اجازت حدیث حاصل کی تھی۔ (تذکرۃ الکرام و تذکرۃ الصالحین المعروف بہ تذکرۂ رحمانیہ)

میں عرض کیا کہ مجھے حضور کی مفارقت گوارا نہیں ہو سکتی، اگر اجازت ہو تو ساتھ ہی چلا چلوں، مگر حضرت شاہ صاحب نے یہ فرماکر روک دیا کہ نہیں تمہیں ابھی بہت سے کام انجام دینے ہیں۔"

مولانا نواب قطب الدین خاں محدث دہلویؒ (صاحب مظاہر حق)

مولانا حکیم سید الحیٰ حسنی نزہۃ الخواطر میں آپ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

(الشیخ العالم الصالح الفقیہ المحدث قطب الدین بن محی الدین الحنفی الدھلوی ــــــ آپ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق ابن افضل عمریؒ سے فقہ و حدیث کی کتابیں پڑھیں اور مدت دراز تک ان کی خدمت میں رہے۔

آپ بڑے زاہد، متورع اور قانع وعفیف واقع ہوئے تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی طرف آپ کو بہت رغبت تھی، علمی مباحثہ اور مذاکرہ کی طرف بھی خصوصی میلان تھا۔ فقہ و حدیث میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں۔ لوگوں نے آپ کے درس و فتاویٰ اور تصنیفات سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا ہے۔

صاحب مقالات طریقت نواب صاحب کی شخصیت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:۔

"اگر کوئی شخص چندے ان کی (نواب قطب الدین کی) خدمت میں جاکر اوقات و عادات کو قلبند کرے تو ایک دوسری کیمیائے سعادت (تیار) ہو جائے۔"

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جامع التفاسیر (اردو) (۲) مظاہر حق شرح مشکوٰۃ شریف بزبان اردو (چہار جلد) (۳) ظفر جلیل شرح حصن حصین (اردو) (۴) معدن الجواہر (۵) آداب الصالحین (۶) الطب النبوی (۷) توفیر الحق (۸) تنویر الحق۔

ان کے علاوہ بھی آپ کے بہت سے رسائل ہیں ــــــ

(۹) جامع الحسنات (۱۰) تحفۃ السلطان (فی مناقب خلفاء الراشدین) (۱۱) تحفۃ الزوجین۔ (۱۲) تحفۃ الاحباء (۱۳) سراج القلوب (۱۴) مانعۃ الزنا

(۱۵) وظیفہ مسنونہ[1]

نواب قطب الدین خاں دہلویؒ کے مریدوں اور شاگردوں میں سے دہلی کے اندر یہ حضرات مشہور و معروف ہوئے۔

(۱) مولانا عبدالقادر صاحب (۲) مولانا رحیم بخش عرف مفتی محمد مسعود (۳) مولانا خواجہ ضیاء الدین جو شاگرد رشید ہونے کے ساتھ ساتھ خلیفۂ طریقت بھی تھے اور خلقت کی ہدایت میں مصروف رہتے تھے۔

نواب صاحب نے عمر کے آخری حصے میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور ۱۲۸۹ھ میں مکہ معظمہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ نے ۵۰ سال کی عمر پائی۔

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی مہاجر مدنیؒ

الشیخ العالم الامام المحدث عبدالغنی بن ابی سعید بن الصفی العمری الدہلوی۔

آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے[2]۔ ماہ شعبان ۱۲۳۴ھ میں بمقام دہلی آپ کی ولادت ہوئی۔ پہلے آپ نے قرآن مجید حفظ کیا بعدہٗ نحو اور عربی مولانا حبیب اللہ دہلویؒ سے پڑھی۔ پھر فقہ و حدیث کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ابو سعید مجددیؒ سے کتاب مؤطا امام محمد پڑھی اور مشکوٰۃ شریف شاہ مخصوص اللہ ابن شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے پڑھی۔ اپنے والد ہی سے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ بھی اخذ کیا، اور ان کے ہمراہ ۱۲۴۹ھ میں سفر حرمین شریفین کیا اور حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ وہاں شیخ محمد عابد سندھیؒ اور ابو زاہد اسمٰعیل ابن ادریس رومی سے سند حدیث حاصل کی۔ پھر ہندوستان آئے اور تدریس حدیث

---

[1] احکام العیدین بھی نواب صاحب کی کتاب ہے جو احقر کے مطالعہ میں رہی ہے اور اس وقت بھی موجود ہے۔ تعجب ہے کہ نزہۃ الخواطر اور مقالات طریقت (مؤلفہ محمد عبدالرحیم ضیاء) میں احکام العیدین کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

[2] مقالات طریقت میں آپ کی وفات کا مہینہ رجب لکھا ہے اور یہ کہ آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔

میں مشغول ہو گئے۔ بہت سے علماء نے آپ سے اخذ علم حدیث کیا جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

جب ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ انقلاب برپا ہوا اور انگریز دار السلطنت دہلی پر دوبارہ قابض ہوئے اور انھوں نے تشدد کے ساتھ باشندگانِ دہلی پر حکومت کی تو آپ اپنے بڑے بھائی اور خانقاہ سے تعلق رکھنے والے خاندانی افراد کے ساتھ ارض حجاز کی طرف متوجہ ہوئے۔

مکہ معظمہ میں حاضر ہو کر رکن و حطیم میں تجدید عہد کی اور پھر مدینہ میں قیام فرمایا۔ آپ کی جلالت شان پر ہند و حجاز کے لوگوں کا اتفاق ہے۔ سنن ابن ماجہ پر آپ نے انجاح الحاجۃ کے نام سے ایک نفیس حاشیہ لکھا ہے۔

... محرم بروز سہ شنبہ ۱۲۹۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

الشیخ العالم الفقیہ المحدث احمد علی بن لطف اللہ الحنفی الماتریدی السہارنپوری ——

آپ سہارن پور میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کا سفر اختیار کیا۔ اور شیخ مملوک علی صاحب نانوتویؒ سے تحصیل علم کی۔ حضرت شیخ وجیہ الدین سہارن پوریؒ سے سند حدیث حاصل کی جو مولانا عبد الحی بڈھانویؒ کے شاگرد تھے، اور مولانا بڈھانویؒ حضرت شاہ عبد القادرؒ کے شاگرد تھے۔ پھر آپ مکہ معظمہ گئے اور سعادت حج سے بہرہ مند ہوئے[1]۔ وہاں آپ نے

---

[1] آپ کی ایک قلمی بیاض حاصل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۲۵۹ھ میں سفر حج کو گئے تھے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ مہاجر مکی سے صحاح ستہ پڑھیں اور ان سے اجازت بھی حاصل کی[1] پھر مدینہ منورہ پہونچ کر خاک درِ رسول صلعم کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ پھر اس کے بعد آپ ہندوستان واپس آئے یہاں درس و تدریس

---

[1] شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم نے تاریخ مظاہر جلد اول میں مولانا احمد علی سہارن پوری کے بارے میں جو ارقام فرمایا ہے یہاں اس کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے مزید معلومات حاصل ہوں گی۔

"حضرت مولانا (احمد علی سہارن پوری) کا تذکرہ مقدمہ اوجز اور مقدمہ لامع الدراری میں حواشیٔ بخاری کے ذیل میں مختصر طور پر مذکور ہے۔ مولانا نے تعلیمی سلسلہ کافی عمر گذر جانے کے بعد شروع فرمایا لیکن جب شروع کیا تو طالب علمی کا حق ادا کر دیا۔ حدیث پاک سید المحدثین حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے پڑھنے کا اشتیاق و ارادہ تھا کہ اسی دوران میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت فرما گئے (آپ نے مکہ معظمہ پہونچ کر حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی) اور جملہ کتب حدیث اپنے دست مبارک سے لکھ کر پڑھیں۔ جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ صبح کی نماز کے بعد سے ظہر کی نماز تک حرم شریف میں حدیث پاک کی کتب نقل کرتے اور ظہر سے عصر تک حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے پڑھتے۔ حدیث پاک کی تمام کتابیں اسی طرح پڑھیں۔ حضرت مولانا نہایت خوش نویس تھے۔ ان کے دست مبارک کی لکھی ہوئی کتب کی بندے نے بھی زیارت کی ہے۔ مولانا نور اللہ مرقدہ کا ابوداؤد شریف کا کامل نسخہ حضرت (مولانا خلیل احمد) قدس سرہ کے پاس بذل المجہود کی تالیف کے زمانہ میں ساتھ ساتھ رہا۔ مولانا نے ۱۲۶۰ھ میں دہلی میں مطبع احمدیہ قائم کر کے اپنی جد و جہد اور مساعی جمیلہ سے حدیث پاک کی کتب طبع کرانی شروع فرمائیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

کا سلسلہ قائم کیا اور تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ آپ نے اپنی ساری عمر صحاح ستہ کی تدریس و تصحیح میں گذاری۔ خاص طور پر صحیح بخاری کی تدریس و تصحیح میں زیادہ وقت گذارا۔ چنانچہ مسلسل دس سال تک بخاری شریف کی تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے اور اس پر مقدمہ اور ایک مبسوط حاشیہ بھی لکھا۔

آپ کی وفات مرض فالج میں ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو سہارنپور میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مولانا نے جو مطبع دہلی میں قائم فرمایا تھا اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کا سب سے پہلا مطبع ہے جس نے حدیث کی کتابیں طبع کرائیں۔

بخاری شریف کا تحشیہ بھی مولانا نے خود ہی فرمایا تھا۔ البتہ آخر کے پانچ سپاروں کا تحشیہ مولانا ہی کے شاگرد رشید قاسم العلوم والخیرات حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف کے حواشی بھی مولانا احمد علی نے تحریر فرمائے تھے۔ آخر زمانے میں کلکتہ میں تدریس کتب حدیث کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا کا قیام مدرسہ مظاہر علوم میں بھی ۱۰ سال رہا ہے۔ اس مدت میں بلا معاوضہ درس حدیث دیا۔ دو طلبا کا کھانا آپ کے یہاں مقرر تھا۔ سالانہ جلسہ انعامی میں بخاری شریف کے کبھی ۵ نسخے کبھی ۳ عدد کبھی دو عدد نسخے مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ مدرسہ کی اعانت خود بھی بڑے حوصلے سے فرمایا کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیا کرتے تھے چنانچہ مدرسہ قدیم اور مسجد کے لیے دس ہزار کی رقم کا مہیا ہو جانا زیادہ تر آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

حضرت مولانا کا وصال بمرض فالج ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ شنبہ کے دن ہوا اور اپنے جدی قبرستان متصل عیدگاہ (سہارنپور) میں تدفین ہوئی۔ حضرت مولانا کی عمر شریف تقریباً ۷۲ سال ہوئی۔

مولانا احمد علیؒ کے سانحۂ ارتحال سے دو یوم قبل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا وصال ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو ہوا۔

مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خطاب عید الفطر

یہ خطاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا

حضرات! آج عید الفطر کا دن ہے۔ عید کی اس مبارک تقریب میں جی چاہتا ہے کہ عید منانے والوں کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

امت مسلمہ کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قوم کی تنظیم کی تھی اس کو دنیا کی دوسری تمام قوموں پر فوقیت و برتری حاصل تھی جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

هو اجتباكم وما جعل عليكم في الدين من حرج ملة ابيكم ابراهيم هو سمّاكم المسلمين من قبل وفي هذا ليكون الرسول شهيداً عليكم وتكونوا شهداء على الناس۔ (الحج ۱۶)

اللہ نے تمہیں برگزیدگی کے لیے چن لیا اس نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ملت ابراہیمی تمہاری ملت قرار پائی اُس نے تمہارا نام مسلم رکھا، پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تمہارے لیے حق کا گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے گواہ ہو۔

آیت میں امت کی جن خصوصیات کا ذکر ہے انھیں کی وجہ سے اس کو تمام قوموں پر فوقیت و برتری دی گئی تھی، ان میں سے ہر خصوصیت پر مستقل اور تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے جس کا یہ موقع نہیں اس وقت ایک ایسی خصوصیت پر کچھ عرض کرنا ہے جو انھیں کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی اور جس کی طرف بالعموم توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

رمضان کی ۱۷ تاریخ جمعہ کا دن ہے، بدر کا میدان کارزار گرم ہے، دشمن اس امت کو نیست و نابود کر دینے پر تلے ہیں۔ اللہ کا رسول سربسجود زار وقطار رو رہا اور اس کی بقا کے لیے ان الفاظ میں دعا کر رہا ہے۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ	اے اللہ اگر مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت
من اھل الاسلام فلا تعبد	ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر پھر خالص،
فی الارض[1]	تیری عبادت نہ کی جائے گی

دعا کے الفاظ سے نہ صرف رسول اللہ کی اس امت کے ساتھ بے پایاں محبت وشفقت ظاہر ہوتی ہے بلکہ ایک اہم خصوصیت کا بھی ثبوت ملتا ہے وہ یہ کہ امت مسلمہ کی ہلاکت و بربادی سے روئے زمین پر خالص اللہ کی عبادت نہ ہو سکے گی جس پر دنیا کا وجود قائم ہے دوسری قوموں کی ہلاکت و بربادی سے دنیا کی ان چیزوں کا نقصان ہے جن میں ان کا عمل دخل زیادہ ہے اور یہ نقصان بھی اس درجہ کا ہے کہ جیسے دو شریک کار ہوں تو ایک کے فوت ہونے سے دوسرا اس کی تلافی کرتا رہے لیکن امت مسلمہ کی ہلاکت و بربادی سے ایک ایسی عظیم شئی کا نقصان ہے کہ جس پر دنیا کا وجود قائم ہے اور جس میں اس امت کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ اگر یہ عظیم شئی (خالص اللہ کی عبادت) نہ ہو تو پھر دنیا اپنے پاؤں پر نہ کھڑی رہ سکے گی بلکہ قیامت کے جھٹکے اس کو زیر و زبر کر دیں گے، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جبکہ روئے زمین پر خالص اللہ کا نام لینے والے نہ باقی رہیں گے

لا تقوم الساعۃ حتی لا یقال فی الارض	قیامت اسی وقت قائم ہوگی جبکہ زمین
اللہ اللہ[2]	میں اللہ اللہ نہ کہا جائے۔

دوسری روایت میں ہے

لا تقوم الساعۃ علی احد یقول	قیامت کسی ایسے شخص پر قائم ہوگی جو
اللہ اللہ[3]	اللہ اللہ کہتا ہو۔

---

[1] مسلم کتاب الجہاد باب الامداد بالملائکۃ [2] ج ۱ ص ۸۳ [3] مسلم مشکوٰۃ باب لا تقوم الساعۃ الا علی شرار الناس

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا وجود قائم و برقرار رکھنے کے لیے امت مسلمہ کا وجود ناگزیر ہے۔

من هذا يعرف ان بقاء العالم ببركة العباد الصالحين[1]	دنیا کا باقی رہنا صالح بندوں کی برکت سے ہے۔

امت مسلمہ کی اس خصوصیت کا اظہار حضرت ربعی بن عامر نے اس وقت بھی کیا تھا جبکہ وہ یزدگرد شاہ ایران کے پاس سفیر بنکر گئے تھے، اس نے سوال کیا کہ تم کیوں آئے ہو؟ —— جواب میں حضرت ربعیؓ نے فرمایا!

الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الى عبادة الله ومن ضيق الدنيا الى سعتها ومن جور الاديان الى عدل الاسلام[2]	اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے رہائی دیکر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کی جو ایمانی تربیت کی تھی اور اس کی روح کو جو غذا و قوت پہونچائی تھی اس کے نتیجہ میں یہ خصوصیت بہت سی ان صفات کے ساتھ نمایاں ہوگئی تھی جو دنیا کی دوسری قوموں میں مفقود تھیں —— مثلاً

(۱) کسی مخلوق سے مرعوب نہ ہونا۔ خالص اللہ کی عبادت نے امت مسلمہ کا سر اس قدر اونچا کر دیا تھا کہ وہ کسی مخلوق کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ تھی چنانچہ مسلمانوں کا وفد جب حبشہ کے نجاشی بادشاہ کے پاس پہونچا تو اس کا دربار لگا ہوا تھا دائیں جانب عمرو بن العاص اور بائیں جانب عمارہ تھے پادری بھی دائیں بائیں بیٹھے تھے عمرو اور عمارہ نے بادشاہ سے شکایت کی کہ یہ لوگ کسی بڑے سے بڑے کو بھی سجدہ نہیں کرتے ہیں —— پادریوں نے زور دے کر بادشاہ کو سجدہ کرنے کے لیے کہا۔ لیکن وفد کے قائد حضرت جعفرؓ نے صاف جواب دیا

لا نسجد الا لله[3]	ہم اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے

۱؎ حاشیہ مشکوٰۃ حدیث مذکور، ۲؎ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج۷ ۳؎ ایضاً ج۳

(۲) شجاعت و جانبازی۔ خالص اللہ کی عبادت نے امت مسلمہ کے دل میں ایسی شجاعت اور راہ خدا میں جانبازی کا ایسا جذبہ بھر دیا تھا جس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس جنت کی طرف بڑھو جس کی وسعت آسمان و زمین ہے" یہ سنکر ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ کیا جنت کی وسعت آسمان و زمین ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں، بلکہ میری تمنا ہے کہ میں جنت میں پہنچ جاؤں —— آپ نے فرمایا ہاں ہاں تم پہنچ جاؤ گے۔ وہ چند دانے کھجور کے نکال کر کھانے لگے، پھر خود ہی کہا کہ اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو کافی وقت لگے گا پھر ان سب کھجوروں کو پھینک کر میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی[۱]۔

(۳) ضمیر کی ملامت۔ خالص اللہ کی عبادت نے امت مسلمہ کا ضمیر اس قدر حساس اور بیدار بنا دیا تھا کہ برائی اور گندی باتوں کا کیا ذکر، بسا اوقات مباح باتوں پر بھی وہ ملامت کے لیے تیار ہو جاتا تھا جو اس کے نزدیک کسی وجہ سے نامناسب ہوتی تھیں۔

حضرت عمرؓ کی بیوی نے (غالباً قحط کے زمانہ میں) گھی خریدا تو پوچھا یہ کیسے خریدا ہے؟ جواب دیا کہ آپ کی تنخواہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، میں نے اپنی ذاتی رقم سے خریدا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

ما انا بذائقتہ　　　　میں اس کو ہرگز نہیں چکھوں گا۔

چنانچہ گھی اور چکنائی والی چیزوں کو اس وقت تک نہیں استعمال کیا جب تک دوسرے لوگ نہ استعمال کرنے لگے

فما اکل سمنا ولا سمینا حتی احل الناس[۲]	گھی اور گھی سے بنی ہوئی چیزیں آپ نے نہیں کھائیں یہاں تک کہ دوسرے لوگ کھانے لگے۔

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ اپنے کسی بچہ کے ہاتھ میں تربوز دیکھا تو فرمایا۔

بخ بخ یا ابن امیر المومنین تاکل　　　　تھو! تھو!! (اظہار نفرت کے الفاظ) تم

---

[۱] مسلم و مشکوٰۃ کتاب الجہاد　[۲] ابن جوزی تاریخ عمر الباب الثالث والثلاثون

الفاکھۃ وامتہ محمد ہزلی[۱]

امیر المومنین کے بیٹے ہو کر پھل کھا رہے ہو اور محمدؐ کی امت (غذائی سامان کی کمی کی وجہ سے) لاغر و نحیف ہو رہی ہے۔

بچہ روتا ہوا بھاگا، لوگوں نے کہا کہ اس نے پیسہ سے نہیں خریدا بلکہ کھجور کی گٹھلیاں دے کر خریدا ہے۔[۲]

(۴) **اللہ و رسول کی محبت و فدائیت** ۔ خالص اللہ کی عبادت نے امت مسلمہ کے دل میں اللہ اور رسول کی ایسی محبت بھر دی تھی کہ ان کے مقابلہ میں مال کی تو کیا حیثیت ہوتی جان کی اور عزیز سے عزیز تعلقات کی کوئی قیمت نہ تھی۔

غزوۂ احد میں ایک انصاریہ عورت کے باپ بھائی اور شوہر سب شہید ہو گئے، قیام گاہ سے نکل کر پوچھنے لگی کہ اللہ کے رسول کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا بحمد اللہ خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے دکھا دو۔ جب دیکھ لیا تو بولی

کل مصیبۃ بعدک جلل[۳] آپ کی سلامتی کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

حضرت خبیبؓ صحابی کو جب پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ بتاؤ کیا تمھیں پسند ہے کہ محمدؐ تمھاری جگہ ہوں اور تمھیں چھوڑ دیا جائے۔ حضرت خبیب نے کہا خدا کی قسم میں اس کو بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔[۴]

اس میں شک نہیں کہ امت مسلمہ میں یہ خصوصیت اور اس کے ساتھ مذکور قسم کی صفات بہت کم ہو گئی ہیں لیکن اس گئی گذری حالت میں بھی ایک امانت اس کے پاس ایسی محفوظ ہے کہ جس سے دنیا کی تمام قومیں خطرہ محسوس کرتی ہیں اور وہ ہے "دنیا چلانے کا نقشہ" جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت میں محفوظ ہے۔

اس "نقشہ" سے دنیا کی قومیں تو خائف ہیں ہی خود ابلیس بھی بدرجہ خائف ہے چنانچہ ۱۹۳۶ء کی مجلس شوریٰ میں دنیا کے شیاطین نے جمع ہو کر ان خطرات کو پیش کیا جو ابلیسی نظام کے لئے تشویش

---

[۱] ابن جوزی تاریخ عمر [۲] الریاض النضرۃ ج ۲ [۳] ابن اسحٰق و ابن خلدون ج ۲ [۴] ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۶۳

کا باعث ہیں، کسی نے جمہوریت کا نام لیا، کسی نے اشتراکیت کے بارے میں کہا، لیکن صدر مجلس ابلیس نے سب کی بات ختم کر کے اس اصل خطرہ سے آگاہ کیا جس کے تصور سے اس کے جسم پر لرزہ طاری اور راتوں کی نیند حرام ہے چنانچہ علامہ اقبال نے یہ پوری داستان ابلیس کی زبانی اس طرح بیان کی ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے　　جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ　　کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن مرد آزما مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات　　ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

غرض یہ ہے امت مسلمہ اور یہ تھیں اس کی خصوصیات اور صفات، جن کو ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کا شعور و احساس اور فکر و بیداری نصیب فرمائے۔

سید مظہر علی ادیب ایم اے علوم اسلامیہ

عورت اور فکر معاش

فاضل مضمون نگار نے لاہور کے ماہنامہ "بتول" اور پاکستان کے بعض دوسرے جرائد و اخبارات میں "پردہ" کے موضوع پر مضامین لکھے تھے ـــــ ان مضامین کا مجموعہ ـــــ "پردے میں رہنے دو" ـــــ نام سے شائع ہوا جو تبصرہ کی فرمائش کے ساتھ الفرقان کو بھی بھیجا گیا ہے، الفرقان میں تبصرہ کا باب بہت مدت سے بند ہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کا پہلا مضمون ـــــ "عورت اور فکر معاش" الفرقان میں شائع کر دیا جائے، اس طرح کتاب کا اچھا تعارف ہو جائے گا اور ایک مفید مضمون ناظرین تک پہنچ جائے گا۔

آج کل ہمارے ملک کے اکثر اخبارات رسالے اور ڈائجسٹ مختلف قسم کے اشتہارات، مضامین اور "پردہ" کی مخالف خواتین و حضرات کے "انٹرویو" شائع کر کے خواتین کو اپنے روایتی گھر کو خیرباد کہنے اور پردہ ترک کر کے مردوں کے "شانہ بشانہ" ملکی ترقی میں "بھرپور حصہ لینے" پر بہت زیادہ اکسا رہے ہیں۔ بعض مقبول اخباروں اور رسالوں نے تو خواتین کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ صفحے مخصوص کر رکھے ہیں اور ان صفحات کی زینت بننے والے مضامین عموماً پردہ کی مخالفت اور ترک پردہ کی حمایت میں ہوتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما بھی اپنی اپنی جگہ

اس کتاب کے صفحات ۱۲۸ ہیں، قیمت ۴ روپے ہے، ملنے کا پتہ یہ ہے:۔
مکتبۃ الادیب ۱۸ فتح شیر روڈ نیا مزنگ لاہور

اسی ضمن میں اپنا کردار بڑی "خوبی" سے ادا کر رہے ہیں۔ بعض مولوی حضرات بھی خصوصاً جو رسائل و جرائد برائے "خواتین" سے منسلک ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت فاطمہ زہرؓا حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ وغیرہ کے جنگ کے موقعوں پر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے واقعات کا سہارا لے کر خواتین کو "ملی خدمات" کے لیے ابھار رہے ہیں۔ حالانکہ خواتین کی جنگوں میں شرکت (ایمرجنسی ہنگامی حالات کے) مستثنیات میں سے ہے۔ جسے عام بے پردگی کی دلیل کی حیثیت سے نہیں پیش کیا جا سکتا۔ مصر، عراق اور ایران جیسے مسلم ممالک کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جہاں خواتین نے یورپ کی تقلید میں اپنی باہیں اور پنڈلیاں دونوں ننگی کر دی ہیں۔

ان تمام ترغیبات اور اکساہٹوں کے نتیجہ میں دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے عزیز ملک پاکستان میں بے پردگی، بے حیائی، بد اخلاقی اور بدنظمی کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ خواتین میں پردہ ترک کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لازمی طور پر ملازمت اختیار کرنے کا رجحان بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ بعض پیشے یا عہدے جن پر مرد ہمیشہ سے فائز رہے ہیں، صرف خواتین ہی کے لیے مخصوص قرار دیے جا چکے ہیں۔ دکانوں، ملوں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالکین اور دوسرے نجی تجارتی اداروں اور سرکاری و نیم سرکاری دفتروں کے منتظمین اپنی "ہمہ گیر ترقی" کے لیے خواتین کی دریافت پر نہ صرف فرحاں و شاداں نظر آتے ہیں بلکہ نازاں بھی ـــــــ نازاں خصوصاً اس لیے کہ جس زمین و آسمان کے مالک نے تو عورتوں کے دائرہ عمل کو "وقرن فی بیوتکن" کا حکم دے کر گھر تک محدود کر دیا اور ادھر انسانوں میں سب سے افضل انسان محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لعن اللہ المتشبہات من النساء بالرجال فرما کر خواتین کے میدانِ عمل کو "مختصر" کر دیا جب کہ ان صاحبِ فراست حضرات نے خواتین کے دائرہ عمل کو ماشاء اللہ وسعت بخشی اور ان کے میدانِ عمل کو نئی پہنائیاں عطا کیں اور اس طرح خواتین کو قعرِ پستی سے نکال کر "کامیابی کی انتہائی بلندیوں" سے ہمکنار کرنے کا شرف حاصل کیا۔

پیشتر ازیں کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ خواتین کا غیر مردوں کے "دوش بدوش" دفتروں اور کارخانوں میں کام کاج کرنا کس طرح ایک غیر اسلامی فعل ہے اور اس عمل سے بذاتِ خود عورت پر، خاندان پر اور معاشرہ پر کس قدر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میں ذیل میں وہ

چار سوال پیش کرتا ہوں جو ایک خاتون امید وار سے بوقت انٹرویو پوچھے گئے (مشرق، ۲ جولائی ۱۹۶۱ء) ان کے سرسری مطالعہ سے آپ بخوبی اندازہ لگالیں گے کہ کامیابی کی وہ کون سی بلندی یا چوٹی ہے جہاں یہ حضرات صنفِ نازک کو لے جانا چاہتے ہیں۔

۱۔ آپ برقعہ اتار دیجیے ہم آپ کا "اچھی طرح" جائزہ لینا چاہتے ہیں
۲۔ گوگلز (چشمہ) اتار دیجیے! ہم آپ کی آنکھوں کا رنگ روپ دیکھنا چاہتے ہیں۔
۳۔ سامنے دیکھ کر ہمارے سوالوں کا جواب دیجیے شرمانے کی کوئی بات نہیں اب تو آپ کو ان باتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔
۴۔ کیا آپ "ہر قسم" کا کام کرسکتی ہیں؟

سورۂ نور (آیت ۳۰) میں مالک دو جہاں ارشاد فرماتے ہیں ..... " اور ظاہر نہ کریں اپنی زینت" (یعنی آرائش بناؤ سنگار، توش رنگ و خوش وضع لباس وغیرہ ——— (اور یہی وہ تمام چیزیں ہیں جو دفاتر میں ملازمت اختیار کرنے والی خواتین کے لیے ضروری ہیں، بلکہ بعض ادارے تو "دل کش شخصیت" اور جسم کے بعض ضروری حصوں کی صحیح صحیح پیمائش کی بھی شرط لگاتے ہیں۔) مگر اپنے شوہروں، یا باپوں یا بیٹوں یا شوہروں کے بیٹوں یا بھائیوں یا بھتیجوں یا بھانجوں یا میل جول کی عورتوں یا غلاموں کے سامنے یا اپنے مرد ملازموں کے سامنے جو عورت کی ضرورت سے مستغنی ہو چکے ہوں یا ان نابالغوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کے بھیدوں سے ناآشنا ہیں۔" (سورۂ نور آیت ۳۰)

مندرجہ بالا تفصیلی فہرست میں کہیں بھی ملوں یا فیکٹریوں کے مالکین، تجارتی اداروں کے متنظمین یا بنکوں اور فرموں کے منیجر حضرات کا "ذکرِ خیر" نہیں آیا اور نہ ہی ان میں سے کوئی فرد "نابالغوں" یا "عورت سے مستغنی" حضرات کے زمرہ میں آتا ہے۔ اب ایسی صورت میں عورتوں کا غیر مردوں کی معیت میں بنکوں، فرموں، ہوائی جہازوں، ملوں اور فیکٹریوں وغیرہ میں کام کاج کرنا صریحاً احکام خداوندی کی خلاف ورزی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی مصلحت کی بنا پر اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو وہ اسے ایک نظر دیکھ سکتا ہے۔ اب جب کہ عورتیں

بے پردہ ہو کر نامحرموں کے ساتھ گھل مل کر دفاتر میں کسب معاش کریں تو حضور اکرمؐ کی یہ عورت کو "ایک نظر" دیکھنے کی رعایت یا اجازت کے کیا معنی؟

سورۃ النور (۳۰) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اے نبی مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کریں....." حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا "اے علیؓ ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو پہلی نظر تمھیں معاف ہے۔ مگر دوسری نظر کی اجازت نہیں" —— اسی طرح حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا کہ نظر پھیر لو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ دفاتر کی ملازم خواتین کے معاملہ میں ہر وقت نظریں نیچی بھلا کیوں کر رکھی جا سکتی ہیں وہاں تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہی اپنا مدعا یا مقصد سمجھایا جا سکتا ہے۔ پھر پہلی نظر کے بعد دن یا رات بھر میں سینکڑوں، ہزاروں بار دوسری نظر ڈالی جاتی ہے اور یوں ہم کھلے بندوں احکامِ خداوندی و فرمودہ ہائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

سورۃ الاحزاب (۵۹) میں ارشاد رب تعالیٰ ہے "اے نبی اپنی بیوی اور اپنی بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادر کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں" قرآن مجید کے تمام مفسرین نے اس آیت کریمہ کا ایک ہی مفہوم بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر اپنی چادریں لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانک لیا کریں، اب آپ خود ہی اندازہ فرمائیے کہ کیا دفتروں میں اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتیں اپنے چہروں کو ڈھانک کر کام کر سکتی ہیں؟ کرتی ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ بعض پیشوں کے اختیار کرنے میں ہماری بہو بیٹیوں کو نہ صرف اپنے چہروں کو بے نقاب کرنا پڑتا ہے بلکہ سر کے علاوہ دیگر مقام ہائے زینت کو بھی اچھی طرح نہیں ڈھانکا جا سکتا یہ سب کچھ خلاف قوانین خداوندی نہیں تو اور کیا ہے؟

سورۃ الاحزاب (۵۳) میں اللہ تعالیٰ اجنبی مردوں کو حکم فرماتے ہیں۔— "اور جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کی اوٹ سے مانگو اس میں تمھارے دلوں کے لیے بھی زیادہ

پاکیزگی ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی" جب اجنبی مرد بنک کی کھڑکی سے ملازم لڑکی سے لین دین کرتے ہیں یا جب غیر مرد دوکانوں پر جاکر "شوگرل" یا سیلز گرل سے سودا سلف خریدتے ہیں تو کیا وہ واقعی پردہ کی "اوٹ" سے یہ تمام معاملات طے کرتے ہیں؟ جب ہمارے ہوائی جہازوں میں سفر کرنے والے اجنبی مرد ایک مسلمان ایر ہوسٹس سے کوئی شے (بعض اوقات شراب تک) طلب کرتے ہیں تو کیا وہ ایسا کرتے وقت اپنے چہروں پر کوئی پردہ ڈال لیتے ہیں یا ضروریات طلب کرنے سے پہلے بطور "اوٹ" کسی دروازے کے پیچھے چلے جاتے ہیں؟ نہیں تو پھر یہ سب کچھ جائز ہوا یا ناجائز؟

مندرجہ بالا سورت ہی میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "اگر تم خدا ترس ہو تو بات میں لگاوٹ کا انداز نہ پیدا ہونے دو کہ جس کے دل میں کچھ روگ ہو وہ کوئی غلط امید باندھ بیٹھے بلکہ سیدھے سیدھے طریقہ سے بات کرو" ادھر ایک سیلز گرل، اشتہاب اسسٹنٹ، ریسپشنسٹ RECEPTIONIST یا کلرک معلومات خاتون کے لیے اولین شرط یہی ہے کہ اس کی آواز میں حلاوت ہو، لہجے میں لگاوٹ اور باتوں میں گھلاوٹ ہو تاکہ گاہک یا ملاقاتی مایوس نہ لوٹے۔ کیا پھر بھی خواتین کے لیے اس قسم کے پیشے اختیار کرنا جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہم سب جانتے ہیں نماز جمعہ اسلام کی اجتماعی زندگی میں مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ واحد نماز ہے جس کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔" مومنوں جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کی طرف جھپٹ جایا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو....." لیکن نبی اکرمؐ کا صاف حکم ہے کہ عورتوں پر نماز جمعہ واجب نہیں ہے ——— جنازہ کی مشایعت انسانی و اسلامی ہمدردی کے اعلیٰ ترین کاموں میں سے ہے۔ مگر عورتوں کو اس سے بھی روکا گیا ہے۔ عیدین میں بھی عورتوں کی شرکت فرض نہیں ہے۔ عورتوں کا قبروں پر بھی جانا ممنوع ہے۔ حج ایک اہم اجتماعی فریضۂ دین ہے اگرچہ یہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے تاہم حتی الامکان عورتوں کو طواف کے موقعہ پر مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روکا گیا ہے۔ مقام غور ہے کہ جب ہمارا مذہب اسلام مسجد جیسی پاکیزہ جگہ پر، نماز جیسی مقدس عبادت میں جنازوں اور قبروں کی حاضری میں جب کہ ہر شخص کے سامنے موت کا تصور ہوتا ہے، اور صنفی جذبات تقریباً مفقود سی ہو جاتے ہیں، مردوں اور عورتوں کی سوسائٹی کا مخلوط

ہونا پسند نہیں کرتا تو کیا وہ دفتروں اور کارخانوں میں اختلاطِ صنفین کو جائز قرار دے گا جس رسولِ پاکؐ نے عورتوں کو خوشبو لگا کر مردوں کے پاس سے گزرنے پر لعن طعن کی ہو، وہ پاک رسولؐ جو سگے بھائی بہنوں، میاں بیوی اور ماں بیٹے کو پاس کھڑے ہو کر نماز تک ادا کرنے سے روکتا ہو وہ بھلا کسبِ معاش کے لیے مرد و زن کے بے باک یا آزاد اختلاط کو کب پسند کر سکتا ہے؟

اوّل تو ایک اسلامی معاشرہ میں کسبِ معاش عورتوں کی ذمے داری ہی نہیں ہے۔ کسبِ رزق مردوں کا کام ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مردوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ "الرجال قوامون علی النساء" یعنی مرد عورتوں کے قوام و نگراں ہیں۔ پھر مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت بخشی گئی ہے (النساء ۳۴) اس کی وجہ بتاتے ہوئے اسی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم" یعنی اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا (محنت سے کمایا ہوا) مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں (نہ کہ عورتیں مردوں پر) اسلام نے عورتوں کو کسبِ رزق کے دھندے سے آزاد رکھنے ہی کی وجہ سے انھیں مردوں پر زیادہ حقوق دیے ہیں مثلاً مہر، خلع، طلاق، نان نفقہ کھلانے پلانے، لباس اور مکان کی ذمہ داری وغیرہ

عورت کا نفقہ اس کے شوہر ہی پر واجب نہیں ہے بلکہ شوہر کے نہ ہونے کی صورت میں باپ بھائی بیٹے اور دوسرے سرپرستوں پر واجب ہے۔ عورت کو مہر یا وراثت کی شکل میں ملے ہوئے مال پر پورا قبضہ اور اختیار دیا گیا ہے۔ عورت خود کتنی ہی مالدار کیوں نہ ہو اس کا نان نفقہ شوہر ہی کے ذمے رہتا ہے اور وہ اسے قانوناً حاصل کر سکتی ہے۔ اگر اس کا شوہر اس کو نان نفقہ نہ ادا کرے یا اس کا انتظام کیے بغیر کہیں غائب ہو جائے تو عورت قانونی طور پر اپنا نفقہ اس کی جائیداد سے حاصل کر سکتی ہے۔ مرد کے نام پر قرض لے سکتی ہے۔ اور اس کی ادائیگی کا ذمے دار شوہر ہو گا۔ علاوہ ازیں وراثت کے قانون کے تحت عورت کو باپ، شوہر، اولاد اور دوسرے قریبی رشتے داروں سے ترکہ میں حصہ ملتا ہے۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان حقوق و مراعات کی وجہ سے عورت کی اقتصادی حالت مردوں سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔ الغرض ایک اسلامی

معاشرہ میں ماسوائے غیر معمولی حالات کے کسب معاش عورت کی ذمے داری نہیں ہے۔ (البتہ قربِ قیامت کی بے شمار نشانیوں میں سے عورتوں کا مردوں کے ساتھ کسب معاش میں شریک ہونا برائی کے طور پر ایک نشانی بتایا گیا ہے) ویسے بھی عورت اپنی مخصوص جسمانی ساخت، مزاج، فطرت ذہن، قوت اور نفسیات کے اعتبار سے سیاست، تجارت، صنعت و حرفت اور لڑائی دنگے کے کاموں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ ان کاموں میں حصہ لینے کی غرض سے بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں تو پیدا کر سکتی ہے مگر براہِ راست اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالے بغیر ان دھندوں میں شرکت نہیں کر سکتی اگر کہیں دو چار عورتوں کو آپ کرسیاں سنبھالے یا کلیدی عہدوں پر فائز دیکھ رہے ہیں تو وہ بس نام کی ہیں اصل کام تو ان مردوں کے ہاتھ میں ہے جنھیں عرف عام میں "انتظامیہ" کہا جاتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا ۱۹۶۲ء میں ہمارے پے کمیشن کے ممبران نے حکومت سے سفارش کی تھی کہ سی ایس پی (C.S.P) اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر خواتین کو فائز نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا عہدہ پیغمبر کا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہبری یا رہنمائی کے لیے اس دنیا میں ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر بھیجے لیکن ان میں سے ایک بھی عورت نہ تھی۔

اس بات کو ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی تسلیم کرے گا کہ ایک اہم ذمے دار عہدہ کے لیے (مثلاً سربراہ مملکت، فوج کا کمانڈر، پولیس افسر اور جج وغیرہ) ہمیں ہمہ وقت چاق و چوبند تیار اور مستعد شخص درکار ہے۔ ادھر عورت ہر ماہ ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ کے لیے درد سر، تکان، اعضا شکنی، اعصابی کمزوری، اضمحلال طبیعت، خرابی ہضم، بعض حالات میں قے اور متلی، عضلات میں سستی، ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے کی قوت میں کمی، طبیعت میں چڑچڑا پن، زیر ناف درد، سینے میں درد اور ٹیس اور ذہنی پراگندگی وغیرہ کا شکار رہ کر اس قسم کے عہدوں کو سنبھالنے یا ان سے متعلقہ ذمے داریوں یا فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے قابل بھی نہیں رہتی۔ پھر اگر عورت شادی شدہ ہے تو وہ زمانۂ حمل کے آخری ایک مہینہ سے لے کر بچے کی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد تک گھریلو ہلکے پھلکے کام کاج کے قابل بھی نہیں رہتی ہے۔ اس عرصہ

میں اس سے کسی قسم کی سخت جسمانی یا دماغی محنت کی توقع رکھنا محض عبث ہے۔

دنیا کے تمام عظیم شاعروں، ادیبوں، فن کاروں، قلم کاروں اور دوسرے معروف مفکروں نے عورت کو ہمیشہ بلا امتیاز رنگ وروپ، مذہب وملت، ایک مشفق، نازبردار اور خیراندیش ماں، ایک ہمدرد وغم گسار بہن، ایک پاک دامن وعفت مآب بیٹی، ایک اطاعت گزار وفاشعار شریک حیات، ایک باحیا وپاکیزہ نفس بہو، ایک مخلص وجاں نثار سہیلی، یا پھر ایک دل کو لبھانے والا، بار بار روٹھ جانے اور من جانے والا حسین وجمیل محبوب، وغیرہ ہی کے روپ میں جانا اور پسند کیا۔ اُن عظماء میں سے کسی نے بھی عورت کو بحیثیت ایک سیاست داں، فوجی کمانڈر، پولیس افسر، وزیر، سفیر یا دفتری کلرک، چپراسی یا چوکیدار نہ جانا نہ پسند کیا۔ ان سب کے نزدیک یہ مقدس ہستی اپنی خصوصیات کی بنا پر دلوں پر تو حکمرانی کر سکتی ہے لیکن کسی ملک کی باگ ڈور نہیں سنبھال سکتی۔ اس مقصد کے لیے کردار کی تمام خصوصیات مثلاً حوصلہ، جرأت، شجاعت، قوت، طاقت، ہمت، دلیری، تدبیر، قوتِ عمل، استقلال، بردباری، سنجیدگی، بلند خیالی عمیق فکری وغیرہ، قدرت نے عورت سے زیادہ مرد کو دی ہیں۔ مختصراً خواتین کا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پردہ کو خیرباد کہہ کر دفتروں اور کارخانوں کا رخ کرنا سراسر ایک غیر اسلامی اور نامناسب فعل ہے (غیر معمولی حالات میں مثلاً شوہر یا باپ کی بیماری یا موت کی صورت میں اگر کوئی عورت پردہ کی حدود میں رہ کر، اپنے مخصوص جسم، ذہن، قوت اور نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے، روزی کمائے تو اسلام اس سے منع نہیں کرتا) اسلام دین فطرت ہے جب کوئی شخص یا قوم اس دین فطرت کے تجویز کردہ اصول یا اس کی مقررہ حدود کو توڑتی ہے تو وہ نقصان اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ عورت کی کسب معیشت میں شرکت، ایک تحریک کی صورت میں، جب کہ کتنی ہی صریح آیات قرآنی، مستند احادیث نبوی اور ثابت شدہ تعامل صحابہ وتابعین کی تصریحات کے منافی ٹھہری تو انسانی زندگی پر اس فعل ناقص کے نقصانات مرتب ہونے بھی ضروری ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اخبارات (خصوصاً انگریزی) اور دوسرے رسالے "ڈائجیسٹ" وغیرہ قارئین کو یہ بتا کر سفید جھوٹ بول رہے ہیں کہ خواتین کے پردہ ترک کرنے اور اپنے گھر بار کو خیرباد کہتے ہوئے دفتروں اور کارخانوں میں ملازمت اختیار کرنے سے گھر بار، بچوں پر اور معاشرہ پر کوئی ناخوشگوار

اثر نہیں پڑتا حالانکہ حقائق بالکل اس کے برعکس ہیں۔ میں ذیل میں متعدد ملکی وغیر ملکی اخبارات ودیگر طبی اور ادبی رسائل وجرائد کی خبروں، مضمونوں، مقالوں اور جائزوں پر مبنی کچھ ایسے حقائق اور چند ایسے اعداد وشمار پیش کرتا ہوں جن کے مطالعہ سے قارئین خود ہی اندازہ لگا لیں گے کہ وہ قوم یا افراد جنھوں نے قرآنی ہدایات کے صریحاً خلاف "عمل کی فطری تقسیم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عورت کو کسب رزق کے لیے" گھر سے نکال کر دفتر میں لا کھڑا کیا ہے۔ کیسے کیسے ہولناک نتائج سے دوچار ہیں۔

"چیسر" (CHESSER) رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہر تین میں سے ایک خاتون نکاح سے پہلے ہی جوہر عصمت کھو چکی ہوتی ہے۔ انگلستان میں ہر سال اوسطاً ۸۰ ہزار عورتیں ناجائز اولاد کو جنم دیتی ہیں۔ امریکہ کے شہر نیویارک اور شکاگو میں بدکاری کے دو سو اڈے قائم ہیں۔

(کوہستان ۲۶-۷-۶۲)

امریکہ کے متعلق کنزے (KINSEY) رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مردوں میں سے ۸۴ فیصدی اور عورتوں میں سے ۵۰ فیصد بلا تکلف ناجائز تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ اسی رپورٹ کے اندازہ کے مطابق امریکہ میں ناجائز بچوں کا تناسب پانچ میں ایک ہے۔

("پردہ" سید ابوالاعلیٰ مودودی)

دنیا کے دیگر ممالک، مسلم وغیر مسلم، میں جہاں کہیں بھی خواتین میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے حالت چنداں مختلف نہیں ہے۔ کوئی بھی آجر اپنی ملازماؤں کو ہر ماہ سات آٹھ روز کے لیے رخصت دینا برداشت نہیں کر سکتا۔ لہذا بے چاری ملازم خواتین کو ایام حیض میں بھی ہر طرح کا ہلکا بھاری کام کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ طبی نقطۂ نظر سے ان دنوں میں عورت کو بڑے آرام اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ پیہم ہیجان اور مسلسل تحریک کی وجہ سے ایک محتاط اندازے کے مطابق آج کل ۸۰ فیصد عورتوں کو ایام ماہواری سخت درد اور تکلیف سے آتے ہیں۔ اسی طرح بچے کی پیدائش سے پہلے اور بعد میں مناسب آرام اور احتیاط کے فقدان کی وجہ سے خواتین میں زچگی سے متعلق شدید پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ۹ ماہ سے ڈھائی برس کی عمر تک کے بچوں کو کسی حال میں

بھی ماں سے جدا نہیں کرنا چاہیے یہاں تک کہ اگر خدا نخواستہ بچہ بیمار پڑ جائے اور شفاخانہ میں داخل کرنا پڑے تو ماں کو اس کے پاس ہی رہنا چاہیے (امروز ۲ مئی ۷۶ء۔ جدید تحقیق)

پھر یہ بات بھی اب پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ ماں کے دل کی دھڑکن میں ایک قسم کی موسیقی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بچے جو اپنی ماؤں کے دل کی طرف چمٹ کر سوتے ہیں جلد سو جاتے ہیں (پاکستان ٹائمز ۵ مئی ۱۹۷۶ء)

تمام ماہرین طب اس بات پر متفق ہیں کہ ماں کا دودھ بچے کے لیے بہترین غذا ہے۔ اب بتائیے کہ وہ بچے جو اپنی ماؤں کی ملازمت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہی "نرسنگ ہومز" یا سرکاری تربیت گاہوں کے حوالے کر دیے جائیں یا جو کرایہ کی نرسوں اور آناؤں کی گود میں پرورش پائیں اور بجائے ماں کے دودھ کے خارجی غذاؤں سے اپنا پیٹ بھریں اور راتوں کو کبھی ماں کے "دل کی دھڑکن سے پیدا ہونے والی موسیقی" سے محروم رہیں اپنا دماغی یا ذہنی توازن قائم رکھ سکتے ہیں؟ امریکہ میں ایسی ہی ماؤں کے آج چار کروڑ بچے اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ ماہرین نفسیات ان کے علاج معالجے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ (مشرق ۱۶ اکتوبر ۷۶ء) ان ماہرین نفسیات کو کون بتائے کہ ماں کی مامتا اور شفقت ہی ان بے گناہ معصوم ہستیوں کا واحد علاج ہے۔ انگلستان میں بچوں کی افسردگی (DEPRESSION) کے بارے میں بچوں کے ماہر ڈاکٹر ایلاے فرومر نے "برٹش میڈیکل جرنل" (مارچ ۱۹۷۶ء) میں لکھا ہے کہ بچوں میں افسردگی عام طور پر خیال کیے جانے والی حد سے کہیں زیادہ عام ہے۔ جو بچے درد شکم، بے خوابی، چڑچڑاپن، خوف اور طبیعت میں اضطراری کیفیت کی شکایت کریں تو سمجھ لیجیے کہ وہ "افسردگی" کا شکار رہیں اور یہ افسردگی عام طور پر ماں کے جدا ہونے کے خوف سے ...... پیدا ہوتی ہے۔" جدید تحقیق کے مطابق جو بچے ماں کی شفقت سے محروم رہتے ہیں انھیں اکثر ایسی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔

فطری آغوش تربیت سے محروم نرسنگ ہومز سرکاری پرورش گاہوں یا کرایہ کی نرسوں اور آیاؤں کی گود میں پلنے والے یہ بچے آپ سمجھ سکتے ہیں بڑے ہو کر کس سیرت و اخلاق کے مالک ہوں گے۔ دنیا جانتی ہے کہ اپنے پاؤں کے نیچے جنت رکھنے والی ماں اور صرف ماں ہی گھر پر رہ کر بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا اہتمام کر سکتی ہے۔ نپولین نے ایک مرتبہ کہا تھا "تم مجھے

ایک اچھی ماں دے دو میں تمھیں ایک اچھی قوم دے دوں گا" جب باپ کی طرح ماں بھی گھر کو خیرباد کہہ کر کمانے کھانے کے جھمیلے میں پھنس کر بچوں کی تعلیم و تربیت کی جانب سے لاپرواہ ہو جائے تو بچوں کا ذہن مختلف قسم کی آوارگیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ان میں غیر ذمے داری، آوارگی عیش پرستی، جنسی بے راہ روی اور دوسری اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

امریکہ کے متعلق فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن F-B-I کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں ۶۵ء کے مقابلہ میں سنگین جرائم میں ۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح قتل و غارت، اغوا، جسمانی مار پیٹ، ڈاکہ زنی، دھوکہ دہی اور کار چرانے کے جرائم میں بالترتیب ایک، دو، چار، پانچ، چھ اور سات فیصد اضافہ ہوا ہے۔ بنک یا دکان لوٹنے کے واقعات میں ۱۲ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح نوجوان لڑکیوں میں بھی آوارگی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ وہاں کی عورت کو حیا، شرم، غیرت یا عزت و ناموس سے اب دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ آج وہ نہ صرف مردوں کے ساتھ دفتروں اور کارخانوں میں کام کرتی ہے بلکہ ان کے ساتھ ہوٹلوں، پارکوں، نائٹ کلبوں اور دیگر تفریح گاہوں میں رات اور دن خوب رنگ رلیاں مناتی ہے، سگریٹ پیتی ہے، شراب نوش کرتی ہے، جوا کھیلتی ہے، اسمگلنگ کرتی ہے، ڈاکہ ڈالتی ہے، جیب تراشتی ہے، غرض وہ تمام عیوب جو کبھی صرف مردوں میں پائے جاتے تھے ان تمام میں وہ خود ملوث ہے۔ جرمنی میں آوارہ لڑکیوں کے لیے علاحدہ جیل خانے قائم کیے گئے ہیں۔ (پاکستان ٹائمز ۳۰ جولائی ۱۹۶۷ء)

انسانی عمل کی فطری تقسیم کو توڑ کر جہاں انسان نے اور بہت سے نقصانات اٹھائے وہاں اسے ایک یہ نقصان بھی اٹھانا پڑا کہ وہ اپنا خاندانی نظام تباہ و برباد کر بیٹھا۔ خاندان کی اصل معمار عورت ہے۔ مرد تو صرف سامان تعمیر فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب اصل معمار ہی موجود نہ ہو تو سامان تعمیر کی فراہمی سے کیا حاصل؟ انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک میں آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے۔ بظاہر دولت پرستی معلوم ہوتی ہے۔ گھر دنیا بھر کی نعمتوں اور دوسری مادی آسائشوں کے ساز و سامان سے بھرا دکھائی دیتا ہے لیکن ——— ان گھروں کے مکین خاندانی اتحاد، یک جہتی، ہم آہنگی، محبت، ادب اور رواداری جیسے ضروری انسانی جذبات

سے عاری ہونے کی وجہ سے ایک انتہائی کرب انگیز زندگی گزار رہے ہیں۔ بیوی کے لیے شوہر کی خدمت، بچوں کے لیے اپنے والدین کی اطاعت اور والدین کے لیے اپنی اولاد کی پرورش و نگہداشت ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔ عورت کی معاشی خودمختاری نے اسے نفس پرست، ازدواجی ذمے داریوں سے متنفر اور خاندانی زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں گھر سے منتقل ہو کر دفتروں اور کارخانوں کی نذر ہو گئی ہیں۔ گھر کی پسند و ناپسند پر خاوند سے طلاق طلب کر لیتی ہے۔ شوہر کے محض خراٹوں سے تنگ آ کر اس سے علاحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ امریکہ میں آج کل روزانہ ایک ہزار سے زائد طلاقیں لی جاتی ہیں۔ (روزنامہ جنگ ۱۳ فروری ۱۹۷۰ء)

طلاق کو خواتین میں شادی کے بغیر ہی زندگی سے "پورا پورا لطف" اٹھانے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ اب "ماں" بننے سے بھی گریز کرنے لگی ہیں اس لیے کہ بچہ جننے سے ان کے حسن میں فرق آ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ عورت کو خاندانی نظام سے الگ کر کے معاشی اور دوسری بیرون خانہ سرگرمیوں میں مصروف کرنے کا منطقی نتیجہ ہے۔

یہ ہے وہ "ترقی" اور "خوشحالی" جو امریکہ اور دنیا کے دوسرے "عظیم" ملکوں نے عورت کو کسب معیشت میں شریک کر کے حاصل کی ہے اور جس کی تعریف میں ہمارے ہاں کے اخبارات و دیگر رسائل و جرائد آئے دن کالم کے کالم سیاہ کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جب کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے خلاف سرکشی کی ہے اسے نقصان ہی اٹھانا پڑا ہے۔ کوئی بتائے کہ عورت نے "وقرن فی بیوتکن" کا مذاق اڑا کر اور "گھر" کی بجائے "دفتر" کو بسا کیا لیا؟ اگر اپنے لیے جسمانی و ذہنی بیماریاں، ان گنت نفسیاتی الجھنیں، بدنامی، ذلت، اور خواری مول لی تو باقی دنیا کو بے حیائی، بے شرمی، حرام کاری، جنسی بے راہ روی، اور دوسرے سنگین اخلاقی جرائم سے بھر دیا اور دوسرے معصوم بچوں کا مستقبل الگ تاریک کر دیا۔ انسان آج اپنی ذہنی پریشانی کے تاریک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ خوفناک حادثے، تباہ کن زلزلے، سیلاب، طوفان اور وبائیں اس پر ٹوٹ پڑی ہیں آخر یہ سب کچھ کیوں؟ صرف اس لیے کہ انسان نے اپنے پیدا کرنے والے خدا کے بتائے ہوئے راستوں کو چھوڑ کر خود اپنی متعین کردہ راہوں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ اس مضمون کے لکھنے سے میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ پاکستانی عورتیں اپنے گھر یا اپنے

ملک کی اقتصادی حالت بہتر کرنے کے کاموں میں حصہ ہی نہ لیں۔ اول تو اپنے گھر اور ملک کی ترقی و خوشحالی میں اس سے بڑھ کر ان کا کیا حصہ ہو سکتا ہے کہ وہ گھر پر رہ کر بچوں کی صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں۔ کیا پاکستان کی کوئی عورت بھی پاکستان کی ترقی و خوشحالی میں اس عورت سے بڑھ کر حصہ لینے کا دعویٰ کر سکتی ہے جس نے قائد اعظم جیسی عظیم شخصیت کو جنم دیا ہو اور گھر پر رہ کر اس کی صحیح تربیت کی ہو؟ پاکستان کی چار کروڑ عورتیں اگر تمام کی تمام مل کر دفتروں اور کارخانوں میں ملازمتیں اختیار کر کے پاکستان کی خدمت کا دعویٰ کریں تب بھی وہ اس خدمت کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکتا جو اس عورت نے پاکستان کے لیے سرانجام دی جس نے علامہ اقبال جیسی ہستی کو جنم دیا اور اسے بجائے معیار زندگی بلند کرنے کے معیار انسانیت بلند کرنے کا سبق دیا! پھر مانا آپ کے پاس امور خانہ داری اور دوسری گھریلو ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے بعد کچھ وقت بچ جاتا ہے اور آپ روپیہ کما کر ہی اپنے گھر اور ملک کی اقتصادی حالت بہتر کرنا چاہتی ہیں تو کیا ضروری ہے کہ آپ دفتروں اور کارخانوں ہی کا رخ کریں؟ کیا آپ اسلامی حدود میں رہ کر یہ کام نہیں سرانجام دے سکتیں۔ سلائی، بنائی، کڑھائی، کروشیا ورک، تصنیف و تالیف، تعلیم و تدریس وغیرہ کے ذریعے سے بھی معقول آمدنی ہو سکتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سادگی پسند اور کفایت شعار خواتین جو گھر پر رہ کر چھوٹی چھوٹی گھریلو دستکاریوں اور مندرجہ بالا شریفانہ ذرائع سے روزی کما رہی ہیں ان خواتین سے کہیں زیادہ خوشحال ہیں جو دن رات دفتروں اور کارخانوں کے مالکوں یا افسروں کی ماتحتی کرتی ہیں اور ان کی کڑوی کسیلی باتیں سنتی ہیں۔

دفتروں اور کارخانوں میں مردوں کے ساتھ کام کرنے کی خواہشمند بہنوں کو اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی نہیں فراموش کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ برعکس مغربی ممالک کے جہاں حیا و شرم غیرت و حمیت دقیانوسی ڈھکوسلے بن کر رہ گئے ہیں اور جہاں لوگ اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ ان کے نزدیک نکاح کے بغیر کسی مرد کا کسی عورت سے تعلق رکھنا کوئی معیوب فعل نہیں رہا ہے۔ اور جہاں "بدنامی" "شہرت" خیال کی جاتی ہے، ہمارے ملک میں خدا کا شکر ہے بدنامی سے بہت ڈرا اور خوف کھایا جاتا ہے۔ ایک عورت بدنام ہونے پر شدید نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ادھر غیر مردوں کے ساتھ کام کاج کرنے کی وجہ سے بدنام ہوئے بغیر رہنا نہیں

جاسکتا کیونکہ یہ بالکل فطری چیز ہے لہٰذا اس کا تو جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات "یہ سکینڈل" اتنی ہمہ گیر صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ لڑکی کا سارا خاندان بدنام، ذلیل اور خوار ہو جاتا ہے۔ اپنوں اور غیروں کے طعنے اور تشنے گھر والوں کو کھائے لیتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ لڑکی زندگی بھر ایک اچھے بر سے محروم رہ جاتی ہے۔ ایسے میں آپ خود ہی سوچئے کہ آپ اور ملک کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے کون سی جگہ موزوں ہے۔ گھر یا دفتر؟

خدا کے لیے معیارِ زندگی بلند کرنے کے خبط میں اپنے گھروں کو "راحت کدوں" میں مت تبدیل کیجیے اس لیے کہ ان راحت کدوں سے صرف عیش پسند، کام چور، بزدل، بے غیرت، بے حوصلہ، سست، کاہل اور ظالم انسان تو بن کر نکل سکیں گے لیکن ان راحت کدوں سے درجہ اول کے انسان نہ تو کبھی ابھرے ہیں نہ ابھریں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے جملہ مسائل کو اسلامی حدود میں رہتے ہوئے حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

یادِ رفتگاں

محمد منظور نعمانی

مولانا محمد یوسف بنوری علیہ الرحمہ

۱۸ اکتوبر منگل کا دن تھا، صبح فجر کی نماز سے میں فارغ ہی ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ـــــــ ٹیلی فون کرنے والے دار العلوم ندوۃ العلماء کے پندرہ روزہ ترجمان "تعمیر حیات" کے اڈیٹر عزیز مکرم مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی تھے، انھوں نے بتلایا کہ

"مولانا علی میاں نے فرمایا ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع دیدوں کہ رات یہاں دار العلوم میں پاکستان ریڈیو سے مولانا محمد یوسف بنوری صاحب کے انتقال کی خبر سنی گئی ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ مولانا مرحوم "اسلامی مشاورتی کونسل" کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے تھے، وہیں یہ حادثہ واقع ہوا۔ ـــــــ"

اس وقت صرف اتنی ہی بات معلوم ہو سکی ـــــ ایسی کسی اطلاع کا پہلا حق یہی ہے کہ دل و زبان سے "اناللہ وانا الیہ راجعون" کہا جائے اور جانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت کی استدعا کی جائے ـــــ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور دعا نصیب ہوئی، آئندہ بھی اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے حق کے مطابق دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے اور قبول فرمائے۔

۱۸ اکتوبر کی اس پہلی اطلاع کے بعد سے حادثہ کی تفصیل کا انتظار رہا، نومبر کے دوسرے ہفتہ میں "دار العلوم اکوڑہ خٹک" (پشاور) کا ماہنامہ "الحق" آیا سب سے پہلے اسی واقعہ کی درج ذیل تفصیل معلوم ہوئی۔

پاکستان کے دار الحکومت "اسلام آباد" میں جنرل ضیاء الحق کی قائم کی ہوئی "اسلامی مشاورتی کونسل" کا اجلاس ہو رہا تھا، مولانا مرحوم اس کے اہم رکن تھے، اجلاس کی شرکت کے لیے کراچی سے تشریف

لائے ہوئے تھے، صاحبزادے مولوی محمد سلمہ ساتھ تھے، گورنمنٹ ہاسٹل کے ایک کمرہ میں قیام تھا۔۔۔ ۱۴ اکتوبر (جمعہ) اور ۱۵ اکتوبر (شنبہ) کی درمیانی شب میں کونسل کے اجلاس سے ساڑھے نو بجے کمرہ پر تشریف لائے۔ رات اپنے معمول کے مطابق گزاری، ۱۵ اکتوبر (شنبہ) کی صبح غسل خانے میں تھے، اچانک ایک دھچکا سا لگا جس سے گلا کچھ بھینچ سا گیا۔ ڈاکٹری معائنہ کے لیے پولی کلینک اسلام آباد تشریف لے گئے وہاں سے گیارہ بجے واپسی ہوئی۔

مولانا نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دی، "البلاغ کراچی" کے مدیر مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا سمیع الحق صاحب (مدیر "الحق") کمرہ ہی پر موجود تھے مولانا اُن حضرات سے بے تکلف باتیں کرتے رہے، ان حضرات نے اصرار بھی کیا کہ اس وقت آپ زیادہ بات نہ کریں آرام فرمائیں لیکن مولانا نے یہی فرمایا کہ نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے

ساڑھے بارہ بجے دوبارہ سخت اٹیک ہوا، جسم پسینہ سے شرابور ہوگیا، چہرہ کا سرخ رنگ زرد پڑ گیا، فرمایا کہ اس وقت بالکل نئی کیفیت محسوس ہو رہی ہے، ۔۔۔۔ زبان پر استغفر اللہ استغفر اللہ کا ورد جاری ہوگیا۔۔۔۔ مشاورتی کونسل کے چیئرمین جسٹس افضل چیمہ صاحب بھی موجود تھے، سی، ایم، ایچ پہنچانے کا پروگرام بنا، ایمبولنس آنے میں بہت دیر لگی، ۱ بجکر ۲ منٹ پر آپ سی، ایم، ایچ کے آفیسرز وارڈ کے ایمرجنسی روم میں داخل کیے گئے، وہاں پہنچکر طبیعت کافی بحال ہوگئی، سب لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور ایک درجہ میں اطمینان سا ہوگیا۔۔۔۔ دوسرے دن اتوار اور اُس کے بعد والی رات کو بھی آپ یہیں زیر علاج رہے۔ غالباً اتوار اور پیر کی درمیانی رات میں تیسرا اور آخری اٹیک ہوا، اور پیر کی صبح ۵ بجے کے لگ بھگ واصل بحق ہوگئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

"الحق" کے مدیر مولانا سمیع الحق صاحب نے آگے لکھا ہے کہ

> وفات اپنے اندر شان ابوذری لیے ہوئے تھی، ایسی حالت میں کہ ملت کا یہ غمگسار ملت کے درد و غم ہی کے سلسلے میں حالت سفر میں تھا، اور وفات کے وقت قریب کوئی عزیز بھی نہیں تھا (کیونکہ ہسپتال کی طرف سے کسی عزیز کو ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی) اسی حال میں آخرت کا یہ سفر ہوا۔۔۔۔۔۔۔ (آگے لکھا ہے کہ) یہ امر بے حد افسوس اور حیرت کا باعث ہے کہ ہسپتال کی طرف سے کسی عزیز کو اطلاع نہیں دی گئی، پہلی اطلاع کئی گھنٹے بعد جنرل ضیاء الحق صاحب چیف مارشل لا

ایڈمنسٹریٹر کو دی گئی، اُن کے توسط سے چیئرمین اسلامی کونسل کو اور اُن کے بعد عزیز و اقارب کو۔
مولانا کی میت کو ہسپتال سے راولپنڈی مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب کی اقامت گاہ جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ والے آ یا گیا، موصوف ہی کے اہتمام سے یہیں آخری غسل دیا گیا اور تجہیز و تکفین ہوئی، جامعہ اسلامیہ میں لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا ——— اکوڑہ خٹک گیارہ بجے اطلاع ہوئی وہاں سے دارالعلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند) نیز اُن کے صاحبزادے مولانا سمیع الحق صاحب مدیر "الحق" اور دوسرے حضرات ۲ بجے جامعہ اسلامیہ راولپنڈی پہنچے، ظہر کے بعد ۳ بجے مولانا عبدالحق صاحب کی اقتدا میں نماز جنازہ ہوئی، اس کے بعد آپ کا تابوت ایرپورٹ لیجایا گیا اور ہوائی جہاز سے کراچی پہنچکر رات کو ۹ بجے کے بعد نیو ٹاؤن میں آپ کے قائم کیے ہوئے "مدرسہ عربیہ اسلامیہ" اور آپ کی بنوائی ہوئی جامع مسجد کے ایک جانب آپ کو خدا کی رحمت اور اس زمین کے سپرد کر دیا گیا جو بنی آدم کا آخری ٹھکانا ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ

کچھ احوال وصفات اور بعض خدمات:-

اب سے ۵۲ سال پہلے (۱۳۴۵ھ) دارالعلوم دیوبند میں راقم سطور کی تعلیم کا آخری سال تھا اسی سال کے ختم پر کچھ واقعات قضا و قدر کے فیصلہ کے نتیجہ میں ایسے پیش آئے کہ دارالعلوم کے صدر المدرسین امام العصر حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دارالعلوم کے متعدد اساتذہ کو دارالعلوم سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لینا پڑا ——— بظاہر یہ واقعہ بہت ہی نامبارک تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت نے اس شر سے یہ خیر پیدا فرمایا کہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) کے ایک معمولی سے "مدرسہ تعلیم الدین" کے ذمہ داروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ہندوستان کا دوسرا "دارالعلوم دیوبند" یا "جامعہ اسلامیہ" بنانے کا فیصلہ کر لیا اور ضروری انتظامات کر کے ان سب حضرات کو اجتماعی طور سے وہاں بلا لیا، ان حضرات کے ساتھ دارالعلوم کے مختلف درجات کے طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد چلی گئی ——— اس طرح ۱۳۴۶ھ میں گجرات کے علاقہ میں یہ عظیم الشان "جامعہ اسلامیہ" قائم ہو گیا ——— مولانا بنوری بھی ان طلبہ میں سے تھے

نوٹ: آخری نماز جنازہ تدفین سے پہلے کراچی میں ہوئی۔

جو دارالعلوم دیوبند چھوڑ کے ڈابھیل کے اِس جدید "جامعہ اسلامیہ" میں چلے گئے۔ اُس وقت وہ غالباً متوسطات پڑھ رہے تھے، انھوں نے دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ہی میں پڑھا ــــــ علمی استعداد کے لحاظ سے وہ طلبہ میں بہت ممتاز اور فائق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے طالب علمانہ شوق اور محنت کے ساتھ ذہانت اور قوت حافظہ کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا، مزید برآں ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی خاص فضل تھا کہ حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہ کے ساتھ عام رشتۂ تلمذ کے علاوہ اُن کو گہرا قلبی تعلق بھی تھا اور حضرتؒ کی بھی اُن پر خاص نظر عنایت تھی۔ پھر اس طالب علمی سے فراغت کے بعد بھی انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے وابستہ اور حضرت ہی کی خدمت میں رہ پڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایسا ہی کیا ــــــ راقم سطور کا اندازہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے جتنا علمی فائدہ مولانا بنوری نے حاصل کیا اتنا حضرت کے کسی دوسرے شاگرد نے حاصل نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد سب سے پہلے آپ نے حضرت کی سوانح حیات عربی زبان میں "نفحۃ العنبر" کے نام سے لکھی، نیز قرآن مجید کے مشکلات سے متعلق آپ کے خاص افادات کو اپنے تفسیری مقدمے کے ساتھ "مشکلات القرآن" کے نام سے شائع کیا ــــــ

فصیح عربی تحریر وتقریر پر اُن کو شروع ہی سے وہ قدرت تھی جو ہمارے حلقہ کے بہت کم اہل علم کو ہوتی ہے اور یہ بھی غالباً حضرت الاستاذ قدس سرہ کے فیضانِ خاص کا نتیجہ تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد وہ ڈابھیل ہی رہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ جامعہ اسلامیہ" کے وہی شیخ الحدیث اور صدر المدرسین، یعنی حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہ کے جانشین ہوئے۔

پاکستان منتقلی اور اس کے بعد:-

مولانا مرحوم کا اصل وطن قریہ بنور (پشاور) تھا، (امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جلیل القدر خلیفہ خواجہ سید آدم بنوریؒ کی آپ اولاد میں ہیں) ۱۹۴۷ء میں جب ایک ملک کے دو ملک (ہند اور پاکستان) بنے، اُس وقت آپ "جامعہ اسلامیہ" ڈابھیل کے شیخ الحدیث تھے۔ آپ نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ نہیں فرمایا، یہیں رہے اور کئی برس تک رہے ــــــ بعد میں یہ بات

سامنے آئی کہ آپ کی وہاں زیادہ ضرورت ہے اور امید ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ زیادہ کام لے گا تو آپ پاکستان منتقل ہو گئے۔ پہلے کچھ عرصہ تک "دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار" (حیدرآباد سندھ) میں استاذ حدیث رہے۔ پھر طے کیا کہ خاص کراچی میں ایک ایسی دینی درسگاہ قائم کی جائے جو "دارالعلوم دیوبند" کا بدل اور اس کی بنیادی خصوصیات کی حامل ہو۔ پھر اللہ کی توفیق سے اس کی بنیاد ڈالی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اور اپنے عزم و ہمت اور جاں نبازی و قربانی سے بہت تھوڑی مدت میں (صرف ۲۰-۲۲ سال میں) ہر حیثیت سے اس کو وہاں پہنچا دیا جہاں تک آغاز میں اپنے تخیل کی پرواز بھی نہیں رہی ہو گی —— راقم سطور کو اپنی اس رائے بلکہ اپنے اس علم کے ظاہر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ کا قائم کیا ہوا اور پروان چڑھایا ہوا کراچی کا یہ "المدرسة العربية الاسلامية" جس کی عمر ابھی ۲۵ سال بھی نہیں ہے علمی اور تعلیمی لحاظ سے اپنے سرچشمہ دارالعلوم دیوبند سے آگے جا چکا ہے اولاد اگر کمالات میں آگے بڑھ جائے تو ماں باپ کو رنج و حسد نہیں ہوتا خوشی ہی ہوتی ہے اور گویا اُن کی مراد پوری ہوتی ہے۔

مولانا مرحوم کا قیام جب تک "جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" میں رہا، ملاقات کے مواقع پیدا ہوتے رہتے تھے، پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد جہاں تک معلوم ہے وہ کبھی ادھر تشریف نہیں لائے، راقم سطور نے دو دفعہ اُدھر کا سفر کیا، دونوں ہی دفعہ بہت مختصر ملاقات کا موقع مل سکا۔ ہاں گزشتہ دس پندرہ برس میں حجازِ مقدس میں حج کے موقع پر یا رمضان مبارک میں قریبًا ہر سال اللہ تعالیٰ نے بڑے اطمینان کی ملاقاتیں اور یکجائی کے مواقع میسر فرمائے، وہ سفرِ حج کے علاوہ اکثر ماہ رمضان میں بھی عمرہ کے لیے اور مسجد حرام یا مسجد نبوی میں اعتکاف کی غرض سے حجازِ مقدس کا سفر فرماتے تھے، اور ۱۹۶۲ء کے بعد سے "رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ" کی رکنیت کے طفیل قریبًا ہر سال اس بے مایہ اور سیہ کار کو بھی حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہوتی رہی —— مولانا کے ساتھ مبارک ترین طویل اجتماع اور یکجائی کا موقع اب سے دو سوا دو سال پہلے ۱۳۹۵ھ کے رمضان مبارک میں نصیب ہوا، جبکہ اُس کے آخری عشرہ میں مولانا مرحوم اور اللہ کے اور بھی بہت سے نیک بندے مسجد نبوی (مدینہ منورہ) کے ایک دالان میں معتکف تھے اور اس سیہ کار نے بھی اسی دالان میں مولانا کے بستر کے قریب ہی

رہ کر اس امید پر وہ عشرہ گزارا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اچھے بندوں کے قرب کی برکات سے محروم نہ فرمائے گا۔ اور نشاٹ قوم لا یشقی جلیسھم ـــــ پھر اس کے دو ہی مہینے بعد اُس سال کے حج میں بھی مکہ معظمہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی مدرسہ صولتیہ کی سہ پہر کی مجلس میں کئی بار ملاقات ہوئی اور یہی آخری ملاقات تھی ـــــ اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو باہمی حسن ظن اور اخلاص و محبت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی۔ اس لیے ہر ملاقات میں روح کو لذت و مسرت نصیب ہوتی تھی میری نظر میں مولانا مرحوم علم میں اور خاصکر علم حدیث میں بہت بڑے تھے اس لیے میرا رویہ اُن کے سامنے وہی رہتا تھا جو علمی اکابر کے سامنے رہنا چاہیے، لیکن اتفاق سے میری عمر مولانا سے کچھ زیادہ تھی[1] اور حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہ کے رشتۂ تلمذ کے لحاظ سے بھی مجھے قدامت حاصل تھی اس لیے مولانا کا معاملہ اور برتاؤ میرے ساتھ وہ تھا جو اہل علم کا اُن معاصرین کے ساتھ ہوتا ہے جن کو وہ اپنا بڑا سمجھتے ہیں، حالانکہ میں ہرگز اس کا مستحق نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا میں بہت سے کمالات جمع کر دیے تھے لیکن علم کا کمال دوسرے کمالات پر غالب تھا، ـــــ اُن کا سب سے بڑا علمی کارنامہ جامع ترمذی کی شرح "معارف السنن" ہے، جس کی ۶ ضخیم جلدیں اب سے کئی سال پہلے چھپکر شائع ہو چکی ہیں، ان ۶ جلدوں میں کتاب کے قریبًا صرف چوتھائی (¼) حصے کی شرح ہوئی ہے، سو چوتھائی کے قریب کتاب باقی ہے، اس کی تکمیل کے لیے کم از کم اتنی ہی جلدیں اور لکھی جائیں ـــــ لیکن ادھر کئی سال سے مولانا مرحوم عملی جدوجہد کے بعض ایسے کاموں میں مصروف اور منہمک ہو گئے جن کی وجہ سے "معارف السنن" کی تصنیف کا کام ان سالوں میں بالکل نہیں ہو سکا ـــــ میں نے کسی سے سنا تھا کہ مولانا کا خیال یہ ہے کہ جامع ترمذی کے اہم حصہ کی شرح کا کام پورا ہو گیا اس لیے کتاب کی تکمیل کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے ـــــ اب سے دو سال پہلے رمضان مبارک ۱۳۹۵ھ میں جب مدینہ منورہ میں پورا ایک عشرہ مولانا کے ساتھ رہنے کا موقع اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) تو میں نے مولانا سے اس بارہ میں بھی گفتگو کی اور اصرار

---

[1] مولانا بنوری مرحوم کی پیدائش ۱۳۲۶ھ کی بتلائی گئی ہے اور میری شوال ۱۳۲۳ھ کی ہے۔

کیا کہ "معارف السنن" کی باقی جلدیں بھی ضرور لکھیں۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ فی الحال میں اس کا "مقدمہ" لکھ رہا ہوں، اس سے فارغ ہونے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ کتاب کی تکمیل کی بھی کوشش کروں گا —— اس گفتگو کے بعد جو دو سال گزرے ان میں مولانا کی جو دوسری عملی مصروفیتیں رہیں ان کے پیش نظر راقم سطور کا اندازہ ہے کہ "معارف السنن" کا کام ان دنوں میں بالکل نہ ہو سکا ہو گا۔ خدا کرے کہ "مقدمہ" ہی پورا ہو چکا ہو۔

"معارف السنن" کے مطالعہ سے مولانا بنوری مرحوم کی علمی خصوصیات اور خاص کر فن حدیث میں اُن کے رسوخ و تبحر اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہ کی خاص تحقیقات سے واقفیت کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ بھی اس عاجز کے نزدیک "معارف السنن" ہی ہے۔

مولانا کی مجاہدانہ مہمات اور عملی خدمات کے سلسلہ میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ، پاکستانی پارلیمنٹ اور حکومت پاکستان سے قادیانیوں کے "غیر مسلم اقلیت" قرار دیے جانے کا فیصلہ کرا لینا ہے، مرحوم اس دینی مطالبہ کی تحریک کے مسلمہ اور متفقہ قائد اور امام تھے —— جس ملک کی حکومت کا سب سے پہلا وزیر خارجہ قادیانیت کا کھلا علمبردار اور مبلغ سر ظفر اللہ خاں رہا ہو اُس حکومت سے یہ منوا لینا اور ملک کے دستور میں شامل کرا دینا کہ —— "مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مسیح موعود ماننے والے اور اُس پر ایمان لانے والے مسلمان نہیں ہیں، بلکہ پاکستان کی دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی طرح ایک غیر مسلم اقلیت ہیں اور پاکستان میں ان کی قانونی حیثیت ایک غیر مسلم اقلیت ہی کی ہے" —— اتنا عظیم کارنامہ ہے جس کو نصرت خداوندی کا "معجزہ" ہی کہا جا سکتا ہے —— یہ محاذ مولانا مرحوم ہی کی قیادت میں فتح ہوا اور اس کا اثر پورے عالم اسلامی پر پڑا۔

جب سے مولانا سے واقفیت ہوئی اور ہندوستان و پاکستان یا حجاز مقدس میں جب کبھی ملاقات ہوئی ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو کمال علمی کے ساتھ علم کے مطابق عمل کے اہتمام، اخلاص للہ، خشیت و انابت، ورع و تقویٰ اور ان سب کے ساتھ دین کا درد بھی بھرپور عطا فرمایا تھا —— اور جس بندہ میں اللہ تعالیٰ یہ اوصاف جمع فرما دے بلاشبہ اُس کو وراثتِ نبوت کا بڑا حصہ نصیب ہوا۔

مولانا نے اپنے اساتذہ و اکابر کے طریقہ پر مدرسہ کے ساتھ "خانقاہ" سے بھی استفادہ کیا تھا، راقم سطور نے باوثوق ذریعہ سے سنا ہے کہ پہلے مولانا نے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا شفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔ ایک زمانہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اصلاحی تعلق رہا تھا۔ غالباً اس کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور جیسا کہ معلوم ہوا ہے حضرت نے اجازت سے بھی سرفراز فرمایا۔

مولانا کے مزاج میں "شدت فی امر اللہ" بھی بدرجۂ کمال تھی جس بات کو دین کے خلاف اور جس فکر و خیال کو ناقابل درگزر زیغ و ضلال سمجھتے، اُس کے خلاف جنگ کرنا اپنے لیے ضروری سمجھتے، اور کوئی مصلحت اور کسی کی ملامت کا خوف اور اپنی شخصیت و مقبولیت کو سخت سے سخت نقصان پہنچنے کا خطرہ بلکہ یقین بھی اُن کو اس اقدام جنگ سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس سلسلہ کی مولانا کی تحریروں میں کبھی کبھی اعتدال اور حکمت کی کمی بھی محسوس ہوتی تھی —— آخر میں اب سے صرف سال ڈیڑھ سال پہلے مولانا مودودی کے بعض افکار و نظریات پر بھی سخت تنقید کی —— ان کا حال اس معاملہ میں وہی تھا جو مرحوم مولانا محمد علی جوہر نے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کہا تھا

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

جن لوگوں کو مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے انھیں چاہے اُن کی بعض رایوں اور طرز و طریق کار سے اتفاق نہ ہو لیکن اس میں شک نہ ہوگا کہ وہ یہ سب کچھ ادائے فرض کی نیت سے اس احساس کے ساتھ کرتے تھے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو جرم مداہنت کا مجرم ہوں گا اور آخرت میں خداوند ذوالجلال کے سامنے مجھے اس کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام حسنات و خدمات کو قبول فرمائے اور ہماری اور ان کی سب غلطیوں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ اللھم اغفر لنا وارحمنا وعاملنا بما انت اھلہ ولا تعاملنا بما نحن اھلہ انت اھل المغفرۃ و اھل الجود و اھل الکرم و اھل الاحسان۔

Regd. No. L LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 45 NO. 12 DECEMBER, 1977 Phone : 25547